جلد45 • شمارہ 08 • اگست 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

بھیگے ہوئے موسم کا نیا شمارہ حاضر ہے۔ اگست ہمارے لیے ہر سال یومِ آزادی اور خوشیوں کا پیام لے کر آتا ہے۔ ادارے کی طرف سے قارئین کو یومِ آزادی مبارک مگر اس برس ملک کا بہت بڑا حصہ سیلابی پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ خشک سالی ہو تو ہم برسات کی دعائیں مانگتے ہیں، برسات ہوتی ہے تو ہر طرف سوگ کا سا سماں طاری ہو جاتا ہے۔ شہروں کی بات الگ ہے۔ وہاں شادیانے بجائے جاتے ہیں، تفریحی مقامات پر ہر عمر کے لوگوں کے ہجوم نظر آتے ہیں لیکن ملک کی بیشتر دیہی آبادی پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ مکان اپنے ساز و سامان سمیت بہہ جاتے ہیں، مویشی مر جاتے ہیں، انسانوں کی دردناک ہلاکتوں کی خبریں آتی ہیں۔ بعض مقامات پر پوری پوری بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ کر رزقِ آب ہو جاتی ہیں۔ یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔ جب کھل کر بارش ہوتی ہے، یہی ہوتا ہے۔ ٹھنڈے کمروں میں شاندار کرسیوں پر براجمان لیڈروں کے منشی ایسے درد بھرے پیغامات لکھ کر دیتے ہیں کہ دل موم ہو جائے۔ لیڈر وہ پیغام پڑھ دیتے ہیں... اسی اثنا میں پانی اتر جاتا ہے۔ الم رسیدہ لوگ اپنے پیاروں کی لاشیں دفناتے ہیں، اجڑی ہوئی طویل و عریض کھیتیوں کو پھر سے آباد کرنے میں جُت جاتے ہیں۔ لیڈر اپنے وعدے اور عوام اپنے دکھ بھول جاتے ہیں۔ یہ کھیل برسا برس سے یوں ہی چل رہا ہے۔ دریائی گزرگاہوں کے اطراف میں جو ہولناک تباہی پھیلتی ہے، اس کا ہم شہری تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آج تک کسی حکمراں نے مستقل بنیادوں پر اس تباہی و بربادی کا سدِباب نہیں کیا۔ سب کچھ وقتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لیے بنائے جانے والے سول ادارے اربوں روپے ڈکارنے کے باوجود غائب ہوتے ہیں۔ ہاتھ پیر پھولنے لگتے ہیں تو فوج کو بلا لیا جاتا ہے... فوج کیا کیا کرے گی... سرحدوں کی حفاظت، دہشت گردی کے خلاف معرکہ آرائی، اندرونِ ملک آپریشن، سیلاب کے ماروں کی داد رسی، زلزلوں میں امدادی مہمات! سب کچھ فوج ہی کو کرنا ہے تو اقتدار پر خاندانی اجارہ داریوں اور وزیروں مشیروں کے لاؤ لشکر کا کیا جواز ہے۔ لوٹ مار دنیا بھر میں ہوتی ہے۔ وہاں لوگ چند فیصد کھاتے ہیں، بقیہ مجوزہ منصوبوں میں لگاتے ہیں۔ یہاں کی ریت ہی انوکھی ہے۔ ہر ایک سب کچھ کھا جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ کاش ہمارے حکمراں عقل کے ناخن لیں اور عوام کے غضبناک ہونے سے پہلے اپنے چلن درست کر لیں ورنہ آنے والا وقت ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا اور اب آیئے کھٹی میٹھی باتوں کی طرف، اپنی رنگا رنگ محفل میں جو جی ہے آپ کے خطوط سے۔

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کا تبصرہ گھما پھرا کے ''ماہنامہ جاسوسی کا دیدار 4 جولائی کو نصیب ہوا۔ سرورق کے رنگوں کی جانب دھیان دینے کا شکریہ، امید ہے معیار برقرار رہے گا۔ اوکاڑہ سے مسز فاروق بلوچ کا محبت بھرا خط جاسوسی کی زینت بنا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کو پی پی برتھ ڈے۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے آمین۔ باقی سب کی کاوش بھی اچھی رہی، تبصرے دل کو چھو گئے گھما پھرا کے۔ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔ جی ہاں میں بات کر رہا ہوں رومانس کے بے تاج بادشاہ، ایکشن کے مغلِ اعظم جناب طاہر جاوید کی نئی تحریر انگارے کی جس کو جیسا سوچا تھا اس سے کئی گنا بڑھ کر پایا ہے۔ ایک سر پھرے ہیرو کی تو کیا ہی بات ہے مگر ابھی تو اسٹوری کا آغاز ہے کہ مصداق آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا گھما پھرا کے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی آوارہ گرد کا مطالعہ کیا۔ واہ جی واہ! کیا کہنے شہزی صاحب کے تو اکیلا ہی دس دس پر بھاری ہے۔ ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والوں کو جو نقصان اس بار شہزادا احمد خان عرف شہزی نے پہنچایا، ٹھنڈ پڑ گئی کلیجے میں۔ ٹکراؤ میں مریم کے خان نے جنگ زدہ پڑوسی ملک کی بعد از جنگ واقعات کی بہت اچھی منظرکشی کی ہے گھما پھرا کے۔ ماجد جیسے لوگوں کا دین ایمان صرف پیسا ہوتا ہے۔ پیسا پیسا کرتے ہیں۔ اور پیسے پر ہی مرتے ہیں وہ۔ جبار توقیر کی دلدل میں بھی دولت نے دو جانیں نگل لیں اور ایک کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ انسان اشرف المخلوقات تو ہے لیکن جب وہ اپنی ذات سے گر جاتا ہے تو حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بے ضمیر جمال دتی نے اپنے انداز کے برخلاف تحریر لکھی اور بہترین لکھی۔ سکندر شاہ جیسے لوگ اپنے سے نیچے کے لوگوں کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹیاں لیکن وہ شاید اس مجسم حقیقت کو یکسر فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ وہ چیونٹی جب ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔ لیفو نے بھی جو کیا بالکل ٹھیک کیا گھما پھرا کے۔ رقصِ اجل میں منظر امام ایک بار پھر ایک حساس موضوع کے ساتھ آن وارد ہوئے اور ہمیشہ کی طرح ایک معاشرتی فکر جگانے کی کوشش کی مگر اس قوم کو جگانا تو واپڈا کے بس میں بھی نہیں رہا اب جنریٹر جو آ گئے ہیں بلکہ اب تو سولر سسٹم ہے۔ قطرۂ خون میں قاتل دستیاب تو ہوا مگر گھما پھرا کے۔ اگر کیون بھی عارضی تلاشی کے بعد واپس چلا جاتا تو مارتھا کا قاتل صاف بچ نکلتا۔ سلیم انور کی تحریر خمیازہ میں بوڑھے نے انتقام کے لیے بالکل صحیح وقت کا انتظار کیا اور آخر وہ نواسی کے قاتل کو انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ بدقسمتی میں مارٹن فینک جلد بازی میں اپنی قسمت کا غلط فیصلہ کر بیٹھا اگر وہ دوبارہ قرعہ کا انتظار کرتا تو یقیناً زندہ سلامت گھر لوٹ سکتا تھا مگر اس کی موت اٹل تھی تو کیسے ٹل سکتی تھی؟''

لاہور سے زویا اعجاز کی میٹھی یادیں ''مون سون مہینے کا جاسوسی 4 جولائی کی تپتی ہوئی صبح گیارہ بجے موصول ہوا۔ ٹائٹل حسبِ سابق تکونی کشمکش

کا آئینہ دار تھا۔ ذاکر انکل کی پینٹ کردہ حسینائیں یوں تو دلکشی و نزاکت کا پیکر ہوتی ہیں لیکن جیولری میں ان کی چوائس بہت باغی ہوتی ہے۔ اداریہ روشنیوں کے شہر میں زبردستی مسلط کیے گئے اندھیروں کا نوحہ تھا۔ چائنیز ڈاٹ چائنیز میں مسز فاروق بلوچ کی کمینٹس بہت دلفریب تھیں۔ احسان سحر حسب معمول شاعرانہ موڈ میں تھے۔ بہت عمدہ اندازِ بیان تھا۔ غلام یاسین کو خوش آمدید۔ معراج محبوب عباسی کا نیوز بلیٹن منفرد کاوش تھی۔ وڈے شاہ جی، آپ نے 27 سے 28 میں ترقی کا راز تو بتا دیا لیکن ہر گزرتا ماہ و سال آپ کو مزید فارم میں لا رہا ہے، اس راز سے کب پردہ اٹھائیں گے؟ ابتدائی صفحات پر رائٹر مغلِ اعظم کی تحریر انگارے نے جاسوسی پر دو سال سے چھائے کہر و جمود کو بہار میں تبدیل کر دیا ہے۔ سپر ہٹ آغاز۔ لازوال اندازِ بیان۔ قیصر چودھری ہمارے موسٹ فیورٹ ولن ریاض ہٹلر کے قبیلے کا باسی نظر آیا۔ وہی زہریلا انداز اور ختم مزاجی۔ ایک عجیب سی انسیت محسوس ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کی شاندار منظر نگاری نے دل میں کئی میٹھی یادیں ازسرِنو جگا دیں۔ آوارہ گرد میں شہزی نت نئے ہنگاموں میں ملوث نظر آ رہا ہے لیکن جانے کیوں اس ناول کا کوئی بھی کردار تا حال دل میں کوئی خصوصی مقام حاصل نہیں کر سکا۔ سرورق کے دونوں رنگ خوب تھے۔ رزاق شاہد کو ہلر نے عاصم جیسے عقل کے اندھوں کو بہت شاندار پیرائے میں نصیحت دی جو بلی کو دودھ کی رکھوالی پر مامور کر کے اپنے نفع و نقصان سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ بہت سنسنی خیز رہی تاہم اندازِ بیان میں کہیں کہیں کاشف زبیر کی جھلک محسوس ہوتی رہی۔ دلدل میں اوور کانفیڈینس کا شکار انور ہاشمی خود اپنے تمام تر مصائب کا ذمے دار تھا۔ پرچی میں اس بار جلیل کی مشہور زمانہ پھرتیاں اور شوخیاں مفقود تھیں۔ کہیں روزہ تو نہیں لگ رہا تھا اسے؟ سانحہ پشاور کے تناظر میں لکھی گئی رقصِ اجل نے دل بے حد بوجھل کر دیا۔ ہماری انفرادی و اجتماعی کوتاہیوں نے ہمارا نشیمن برباد کیا ہے۔ بدقسمت بھی بہت زبردست تحریر رہی۔ ایسے سائنس فکشن باقاعدگی سے شامل کرتے رہا کریں۔"

محمد کبیر عرف شہزادہ کوہسار مری کی الزام تراشیاں "لو جی ہم پہلے تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ ارے ارے حیران نہ ہوں۔ پہلا تبصرہ مطلب 2015ء کا پہلا تبصرہ۔ اب آپ پوچھیں کے اتنا عرصہ کہاں غیر حاضر رہے۔ کیا کہا نہیں پوچھیں کے؟ چلو کوئی گل نئیں۔ ہمیں کون سا بتانا تھا۔ آٹھ تاریخ کو آخری پیپر دے کر جاسوسی لیا۔ مگر یہ کیا ٹائٹل پر تو رمضان میں بھی عید کا سا سماں نظر آیا۔ تینوں کردار ہی ہنس رہے ہیں مگر بغور دیکھنے پر تینوں ہی روتے ہوئے لگے۔ قاسم رحمان ویلکم بیک۔ مسز فاروق ایسے دیرینہ قارئین کے تبصرے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ کاظمی صاحب اٹھائیس سال کے ہو گئے مگر بقول شاعر ابھی بھی وہی بچپنا ہے وہی تخریب کاری ہے۔ معراج محبوب، مسٹر جان جاناں اور ہارٹ کیچر کے تبصرے بہت زبردست لگے۔ اب بات ہو جائے طاہر جاوید کی انگارے کی، پولیس گردی سے ڈاکو یا باغی بننے والا پرانا پلاٹ اور دیہاتی پس منظر دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی۔ تاہم موجودہ ہیرو ان کے دیگر ہیروز کے برعکس مارشل آرٹس کا ماہر ہے۔ چنانچہ امید ہے اس بار ایکشن دیسی اسٹائل کے بجائے ذرا ہٹ کر ہوگا۔ چودھری قیصر کا کردار بہت مضبوط ہے امید ہے یہ بھی ڈپٹی ریاض سے ہٹ کر ہوگا۔ طاہر صاحب کی منظر کشی حسب معمول جادوئی ہے۔ رزاق شاہد کی رنگوں میں دوسری تحریر پسند آئی۔ تاہم پورے خاندان کو قتل کرنے کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ گل کی تلاش سے شروع ہو کر تلاش پر ہی ختم ہو گئی۔ تاہم بیچ کے واقعات دلچسپ رہے۔ کاشف زبیر کی پرچی اور جبار توقیر مرحوم کی دلدل بھی ہماری پسندیدگی کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہیں۔ پرچی کی پسندیدگی کی وجہ مزاح کے علاوہ سسپنس سے بھرپور ہونا تھا اور دلدل کا نی مختلف اندازِ تحریر کی وجہ سے پسند آئی۔ (بہت شکریہ وجہ پسندیدگی بتانے کا) اب ہو جائیں کچھ شکوے شکایات اور تجاویز جو کہ ہمارا تبصرہ لکھنے کی اصل وجہ ہیں۔ گو کہ اس سے پہلے بھی ہم بارہا آپ کو مختلف طرح کی تجاویز دے چکے ہیں مگر آپ کے کان پر محاورے والی جوں تک نہیں رینگی۔ ہماری کیا آپ نے کبھی کسی کی بھی تجویز کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا مگر ہماری بھی ادارے سے ایسی دلی وابستگی ہے کہ اپنی آرا دینے سے باز نہیں رہ سکتے۔ ہم نے اپنی ایک مختصر تحریر میل کی تھی بارہا پوچھنے پر اتنا جواب آیا کہ ایڈیٹر تک پہنچ گئی ہے مگر اس کے بعد کسی قسم کا جواب ندارد۔ بہت بار ہمارے اور دیگر لوگوں کے میل کیے گئے تبصروں کو کسی نے دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔ (یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ جو میل ہم تک پہنچتی ہیں وہ ہم ضرور پڑھتے ہیں) اگر آپ نے میلو چیک ہی نہیں کرنی ہوتیں تو براہ کرام میل ایڈریس کے ساتھ یہ بھی جلی حروف میں لکھوا دیں کہ ہمیں میل چیک کرنے کی فرصت نہیں ہوتی سو بہتر ہے کہ کاغذ قلم تک ہی محدود رہیں یا ڈھیر سارا وقت نکال کے ہمیں بار بار کال کر کے میل کھولنے کی درخواست ضرور کریں۔ ہو سکتا ہے آپ کو ہمارا طنزیہ انداز ناگوار گزر رہا ہو مگر اس میں اپنائیت بھی ہے اور غصہ بھی۔ تبدیلی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مستقل قارئین اتنے عرصے تک ایک جیسا فارمیٹ دیکھ کر بور ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری پہلی تجویز یہ ہے کہ ینگ رائٹرز کارنر کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں نئے لوگ مختصر تحریریں لکھ سکیں۔ اس سلسلے سے آپ کو بہت اچھے اچھے رائٹرز مل سکتے ہیں۔ (آج تک کسی نے مختصر تحریر لکھ کر نہیں بھیجی اور کتابی سائز ناول کی گنجائش نہیں) ہم نے فیس بک پر کہانی دنگل کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں پندرہ کے قریب مختصر تحریریں پوسٹ کی گئیں۔ جو تقریباً سبھی جاسوسی کے معیار کو دیکھا جائے تو اوسط درجے سے بڑھ کر ہی تھیں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ پرانے شماروں میں زیادہ پسند کی جانے والی تحریریں توشۂ خاص کے طور پر دوبارہ شامل کی جائیں۔ کیونکہ ترجمہ تحریریں بہت کم لوگ پڑھتے ہیں۔ ان تجاویز پر عمل کرنے سے آپ کے اخراجات بھی کم ہوں گے اور تبدیلی خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہوگی۔" (لکھیں ضرور لکھیں مگر خدا کے واسطے مختصر توشۂ خاص ارسال کریں۔ کوئی چیز قابلِ اشاعت ہوتی ہے تو لگ جاتی ہے جو نہیں ہوتی اس کا جواب کیا دیں؟ مگر پھر بھی ہم تمام وجوہات سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ جو قاری دوبارہ لکھیں تو ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھیں۔ جو ہم نے لکھنے والوں کو بتاتے رہتے ہیں)

لاہور سے فاروق انجم ساحلی کی فریاد "ٹائٹل پر لڑکی کی تصویر خوب صورت تھی لیکن باقی مناظر پر ذاکر صاحب نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ جو

بزرگ چشمہ لگائے دکھائی دیتے ہیں وہ پہلے بھی کسی ٹائٹل پر تھوڑے نہ بڑے سائز میں موجود تھے ویسے بھی وہ کرم دین صاحب غیر واضح ہیں۔ ذاکر صاحب سے گزارش ہے کہ آئندہ وہ چہرہ نہ بنائیں۔ خطوط کی محفل کافی جامع اور بھرپور تھی۔ فہرست میں کہانیوں کے عنوانات اور تصاویر کے ڈیزائن خوشنما اور جاذب نظر تھے۔ ایک اہم بات تو رہ ہی گئی۔ کراچی میں قیامت خیز گرمی سے ہلاک ہونے والے افراد کے متعلق دلی افسوس ہوا۔ حکومتیں لوڈشیڈنگ کے خاتمے کے صرف دعوے کرتی ہیں۔ ہماری کہانیاں کون سے کنوئیں میں ہیں تاکہ ہم بھی اسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں۔ اب تو کچھ اور بھی بھیج دی گئی تھیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔'' (بس دعا کریں ہم اس کنوئیں میں اتر جائیں اور آپ کی کہانیاں نکال لائیں)

ضلع دیر سے اعظم خان کی تجویز ''4 جولائی کو جاسوسی ملا۔ سیدھا چینی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسلام آباد سے سید شکیل صاحب نے خوش آمدید کہا۔ جھنگ سے مرتضیٰ صاحب نے تائید کی۔ واہ کینٹ سے بلقیس صاحبہ نے تبصرے کی تعریف کی۔ آپ تینوں کا بے حد شکریہ۔ زیادہ تر قارئین نے میرے موقف کی تائید کرتے ہوئے مسیحا کے خاتمے پر سکھ کا سانس لیا۔ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے قارئین کی آرا کا پاس کیا۔ (ہمارے پیش نظر قارئین کی رائے زیادہ اہم رہی ہے) پشاور کی طاہرہ گلزار صاحبہ کو انعام جیتنے پر مبارک باد دیتا ہوں لیکن دلدل اور بھرم پڑھ کر اگر اب بھی وہ مردوں سے نفرت کرتی ہیں تو حق بجانب نہیں ہوں گی کہ کس طرح ان دو کہانیوں میں خواتین نے مردوں کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کیا۔ ویسے مرد اور خاتون تو گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں لیکن آج کل تین پہیوں والی گاڑیاں بھی ایجاد ہو چکی ہیں۔ چینی نکتہ چینی کے بعد پہلا صفحہ کھولا تو انگارے پر نظر پڑی۔ اب یہ فیصلہ مشکل تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔ خیر قرعہ فال انگارے کے نام نکلا۔ زبردست کہانی ہے۔ پلاٹ بڑا جاندار ہے۔ کیونکہ ہمارے ماحول سے مطابقت رکھتا ہے۔ پورے پاکستان میں آپ جہاں بھی جائیں آپ کو یہ کردار نظر آئیں گے۔ آغاز بھی اچھا ہے۔ موجودہ گرمی اور ٹینشن کے دور میں جب ہم پرچی جیسی دلپذیر کہانیاں پڑھیں گے تو یقیناً کچھ وقت کے لیے سب کچھ بھول جائیں گے۔ بے حد خوب صورت کہانی تھی، پڑھ کر مزہ آیا۔ آوارہ گرد کی اس قسط میں شہزی صاحب نے کچھ زیادہ ہی منہ زوری دکھائی جب ایک بین الاقوامی تنظیم کے مرکز سے اس طرح نکلے کہ ٹارزن کی یاد تازہ ہو گئی۔ رزاق صاحب کی بھرم بہت پُراثر رہی۔ دلدل بھی اچھی رہی۔ اگرچہ ابتدا میں مزاحیہ رنگ لیے ہوئی تھی لیکن آگے جا کر یہ کہانی بھی بھرم کی طرح ہو گئی۔ جہاں لالچ نے ہاشی کو قاتل بنایا۔ وہاں عورت کی ازلی فطرت نے ہی دوسری عورت کے ارمانوں کا خون کیا۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ بھی ہمارے معاشرے کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جہاں مال و دولت ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مال کہاں سے آیا۔ اقلیم علیم صاحب کے بارے میں چارسدہ کے مسٹر جانان نے جو تجویز دی ہے، وہ اچھی ہے۔ کیونکہ زبردست لکھاری ہیں۔ انہوں نے آخری کہانی سسپنس کے لیے لکھی تھی جو کہ پاکستان میں منشیات فروشی کے پس منظر میں تھی اگر وہ دوبارہ ان ہو جائیں تو یقینی طور پر مصنفین کی کمی کسی حد تک پوری ہو گی۔'' (آپ لوگ ہی زور ڈالیے، ہم تو اپنی سی کوشش کر چکے)

کاشف عبید کاوش کا بٹہ سوزی بنگرام سے اظہار تشکر ''7 جولائی یعنی منگل کے دن دوپہر کے وقت گھر کے ساتھ ہی موجود ڈاک خانے کا چکر لگایا تو پوسٹ ماسٹر صاحب نے بلا کر لفافہ تھمایا اور دستخط کرنے کو کہا۔ میں نے دستخط کیا اور لفافہ دیکھا تو وہ جاسوسی ڈائجسٹ کا تھا۔ گھر آ کر کھولا تو خوشی سے نہال ہو گیا۔ کیونکہ رسالے کے ساتھ انعامی شمارے کا سرٹیفکیٹ بھی تھا۔ خوشی خوشی سب گھر والوں کو دونوں چیزیں دکھائیں۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ میں کس منہ سے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔ (اسی منہ سے کر دیں) کہ آپ لوگوں نے مجھے قرعہ اندازی میں شامل کر کے میرا نام بھی نکلوایا۔ میں ادارے کی ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔ ویسے ناچیز کا مشورہ و درخواست ہے کہ جاسوسی میں ایک سلسلہ انعام بھی ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟ جون کا شمارہ اچھا تھا اور جولائی کے شمارے کے بارے میں سچ کہوں تو سرورق اس بار کچھ خاص نہ تھا۔ فہرست معمول کے مطابق جبکہ اداریہ پُرفکر تھا۔ انگارے کا پہلا حصہ بہترین تھا۔ امید ہے آگے بھی اچھی کہانی ثابت ہو گی۔ آوارہ گرد کی پندرھویں قسط اچھی تھی۔ بھٹی صاحب کہانی اچھی جا رہی ہے مبارک ہو۔ سرورق کا پہلا سوتی بھرم بہترین کہانی تھی۔ ساتھ دوسرا سوتی ٹکراؤ مریم کے خان صاحبہ نے ایک اچھی کہانی لکھی۔ اب کی بار شمارہ اتنا ہی پڑھ پایا ہوں اور کہانیاں بعد میں پڑھوں گا۔ چھوٹی نگارشات کم مگر مزے دار تھیں۔''

بہاولپور سے مظہر سلیم ہاشمی کا التفات ''جولائی کا شمارہ عین اپنی سالگرہ کے دن یعنی 5 جولائی کو بطور برتھ ڈے گفٹ ملا۔ سرورق دیکھ کر ایک مرتبہ تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا، وجہ ظاہری بات ہے انگارے کے اشتہار کی عدم موجودگی تھی۔ فہرست میں انگارے دیکھنے کے بعد سکون سے ٹائٹل کو گھورا۔ حسینہ دیکھی بھالی سی محسوس ہوئی۔ (پڑوسن ہوگی) ہیرو نما ولن بھی زخم خوردہ ہونے کے باوجود مسکراتا پایا۔ مجموعی تاثر اچھا رہا۔ اداریہ حسب سابق ایک حساس مسئلے کا آئینہ دار تھا۔ غلام حسین نوناری، افتخار حسین اعوان، اسد عباس اور دیگر تمام لوگوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے طویل عرصے بعد میری آمد پر خوش آمدید کہا۔ ہارٹ کیچر کا مسیحا پر اور بلقیس خان کا تبصرہ مجموعی طور پر بے حد پسند آیا۔ مسٹر جان جاناں کی اس بات کی ہم بھی تائید کرتے ہیں کہ اقلیم علیم صاحب سے کوئی تحریر لکھوائی جائے۔ مرتضیٰ احتشام حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ کہانیوں کا آغاز اس شاہکار سے کیا جس کا کئی ماہ سے بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ آتش فشاں کے بعد اگر کسی تحریر نے پہلی قسط سے ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے تو وہ انگارے ہے۔ پہلی قسط کا اختتامیہ سنسنی اور سسپنس سے بھرپور تھا۔ طاہر جاوید واقعی جذبات نگاری میں ملکہ رکھتے ہیں، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد چند تکنیکی خامیوں کے باوجود سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ کہانی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ صفحات کم پڑ گئے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام کی رقص اجل اور جمال دستی کی بے ضمیر بے حد پسند آئیں۔ معاشرے کی برائیوں کی عکاس دونوں تحریریں زبردست رہیں۔ امجد رئیس کی رنگ وفا میں جفا کا رنگ زیادہ نمایاں رہا۔ تراجم میں قطرۂ خون اور بھوت کی واپسی سراغ رسانی کے حوالے سے اعلیٰ تھیں جبکہ سراغ اور تلاش بھی کافی دلچسپ رہیں۔ بدقسمت کا اسکیچ اور تعارف جتنا اچھا تھا تحریر اس

پائے کی ہرگز نہ تھی۔ اسکیچ سے یاد آیا کہ آج کل جاسوسی کے اسکیچز کون بنا رہا ہے؟ (مظہر انصاری) کاشف زبیر نے اس مرتبہ جلیل میاں کو بھتے کی پرچی کے ساتھ پیش کیا۔ مسکراہٹوں، قہقہوں اور کھلکھلاہٹوں سے بھرپور اس داستان نے خوب محظوظ کیا۔ جلیل کی شادی کے آثار اب کافی قریب دکھائی دے رہے ہیں۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ عزم و ہمت کی یہ داستان نہایت خوش کن رہی۔ یاسر اور اس کی ماں کے کردار کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا۔ ماضی کے اوراق سے پیش کردہ جبار توقیر کی تحریر دلدل اس ماہ کا توشۂ خاص ثابت ہوئی۔ حرص کی دلدل میں ڈوبے لوگوں کی داستان نہایت المناک رہی۔ ہلکے پھلکے مزاح نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ امید ہے کہ آپ معراج رسول صاحب کی فائل میں موجود دیگر غیر مطبوعہ تحریروں سے بھی وقتاً فوقتاً مزید پیش کریں گے۔'' (یقیناً)

میانوالی سے احسان سحر کی حقیقی باتیں ''ٹائٹل کافی خوب صورت تھا۔ اس دفعہ دونوں مرد مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ یعنی معاملہ سب اوکے کا ہے تبھی تو صنفِ نازک کے ہونٹوں سے بھی پھول ہی جھڑ رہے تھے۔ موسم کوئی بھی ہو، ہر ایک کا اپنا رنگ اور انداز ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ صحیح معنوں میں اس دفعہ تبصروں میں دلچسپی محسوس ہوئی جہاں طنز اور حسد نہیں تھی۔ قاسم الرحمان کا ہلکا پھلکا تبصرہ اچھا لگا۔ اوکاڑہ سے مسز فاروق بلوچ کی محبتیں اچھی لگیں۔ محبتیں جیسی بھی ہوں اچھی ہی لگتی ہیں اور ان کی قدر بھی کرنی چاہیے۔ معراج محبوب عباسی کی خبریں بھی اچھی رہیں اور اچھی اسی وجہ سے کہ نہ سیاست کا ذکر تھا نہ سیاست دانوں کا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار جی دل جلایا نہ کرو، مردوں سے اتنی نفرت کیوں یہی مرد پاک فوج کی صورت میں قربان ہو کر وطن کی حفاظت نہیں کر رہے، خیر چھوڑیں۔ ہارٹ کیچر کا تبصرہ اچھا تھا۔ وڈے شاہ جی بھی اس بار خوب برسے۔ (بس موصوف نے برسنے ہی کی ٹھان لی ہے) سب سے پہلے بھرم سے آغاز کیا۔ مصنوعی اور حقیقی رشتوں میں یہی تو فرق ہے۔ مصنوعی رشتے نزدیک ہو کر بھی دور ہی ہوتے ہیں اور حقیقی رشتے دور ہو کر بھی قریب ہوتے ہیں۔ سلیم اور ثمینہ بے غیرتی کی اعلیٰ مثال تھے۔ آنکھیں بند کر لینے سے نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ سجھائی دیتا ہے۔ بدقسمت، جلد بازی ہمیشہ کام بگاڑ دیتی ہے۔ فینک بھی جلد بازی نہ کرتا تو خوش قسمت ٹھہرتا۔ پرچی، اس دفعہ جلیل میاں پرچی کے ساتھ ساتھ شادی کے مسئلے پر بھی ڈٹے ہوئے تھے۔ پرچی کا دھندا تو حل ہوگیا پر شادی کا ابھی کھٹائی میں ہے۔ ہائے رے شادی جس سے میں ابھی تک بھاگتا ہوں۔ قطرۂ خون اور ایک بیوی سے تنگ شوہر کا ماجرا۔ رنگِ وفا، وفا اور بے وفائی کو پرکھنے کا انوکھا طریقہ۔ انگارے، پولیس تو کرپٹ ہے۔ پر ان کا دماغ خراب کرنے والے ہمارے لیڈر ہیں جو قوم کے نام نہاد غمگسار ہیں۔ سب جرائم پیشہ اور ڈاکو لوگ ہمارے لیڈر بن کر ملک کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔ آوارہ گرد، میں بھی شہزی کی بڑھتی ہوئی ہنگامہ خیزیاں عروج پر ہیں۔ آرک ایک کٹھ پتلی کا ختم ہونا باعثِ اطمینان تھا اب بڑے بڑے سورما میدان میں اتریں گے۔ دلدل مرحوم جبار توقیر کا خوب صورت ناول، جو وقت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور چلتا رہے گا کیونکہ ہوس اور لالچ پرانے نہیں ہوتے۔ رقصِ اجل منظر امام، ہمیشہ کی طرح معاشرے کی کھلی تصویر دکھاتے نظر آئے۔ یہاں دیکھ سب رہے ہیں، عمل کوئی نہیں کرنا چاہتا وہ عوام ہوں یا لیڈر اور لیڈر تو آتے ہی اپنے لیے ہیں کرسیوں پر۔''

ساگر لوکر کی چشمہ بیراج سے بہتی باتیں ''جاسوسی کو دیکھتے ہی جو رونق چہرے پر آئی اور جو مسرت دل میں دوڑی، وہ چٹھی نکتہ چینی میں اپنا خط نہ پا کر غمگینی اور مایوسی میں بدل گئی۔ قتیل شفائی کے شہر سے قاسم صاحب کو اول آنے پر بہت مبارک۔ غلام یٰسین، معراج عباسی اور شکیل کاظمی کی آمد اچھی لگی۔ بلقیس خان آپ کا منیر نیازی سے کیا رشتہ ہے؟ طاہرہ گلزار کی ہمت اور لگن کو سلام جو ہر ماہ باقاعدگی سے حاضری دیتی ہیں۔ کشمیر جنت نظیر کے باسی افتخار حسین کی آمد دل کو بھاتی ہے۔ آخر انتظار ختم ہوا۔ انگارے آ ہی گئی۔ ایک ہی نشست میں ختم کی۔ ایسا لگا جیسے ہم کرداروں کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ قیصر جیسے لوگ پتا نہیں پولیس میں بھرتی کیسے ہو جاتے ہیں۔ ہماری پولیس اتنی بری بھی ہو سکتی ہے، اندازہ نہ تھا۔ انگارے نے پہلی ہی قسط سے رونے اور رلانے کا سامان کر دیا ہے۔ پلیز ہتھ ہولا رکھیں ساڈا تاں نکا جیہا دل ہے۔ آوارہ گرد بھی بہت خوب چل رہی ہے۔ مولا جٹ کی مار دھاڑ پسند آ رہی ہے۔ مسٹر آرک کو مار کر شہزی نے دل شاد کر دیا۔ البتہ ثریا کے انجام نے خون کے آنسو رلائے۔ رقصِ اجل، منظر صاحب نے وہ منظر کشی کی کہ ہماری آنکھیں اور سوچ کے نئے در کھول دیے ہیں۔ پرچی، ہمیشہ کی طرح جلیل نے مزہ دوبالا کر دیا۔ دلدل ایک نئے لکھاری کی تھی مگر بہت زبردست تھی ایسی لگی جیسے کہنہ مشق کی تحریر ہو۔ (محترم جبار توقیر بہت زبردست سینئر رائٹر تھے) بھوت کی واپسی بھی مزیدار کہانی تھی۔ بھرم، سرورق کی کہانی واقعی حق دار تھی۔ نئے نئے لکھاریوں کو بھی سرورق پر موقع دیں، اچھا لگا ہے۔ ٹکراؤ مریم کے خان کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔''

کھیوڑا سے شفقت محمود کی حاضری ''جاسوسی میں میرا یہ پہلا تبصرہ ہے۔ 5 جولائی کو بمشکل جاسوسی مل پایا اور 5 جولائی کو سورج کی گرمی اور ٹائٹل کی زردی ناقابلِ برداشت تھی اور پھر انگارے کی پہلی قسط نے مزید ماحول گرما دیا۔ انگارے میں مغل صاحب نے کمال کی پولیس محکمہ کی درگت بنائی ہے اور کہانی کی صورت میں حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے انگارے للکار کی طرح خوب چلے گی۔ تنویر ریاض کی سراغ میں قتل کا سراغ لگانے والے نے کمال کر دیا۔ بدقسمت میں فینک کی احمقانہ جلد بازی اسے موت سے نہ بچا سکی۔ محترم کاشف زبیر کی پرچی بہت عمدہ تھی۔ جلیل نے اس دفعہ انتہائی آسانی سے کیس حل کر لیا۔ لیکن پتا نہیں اس کی شادی کب ہوگی؟ اور کاشف زبیر صاحب کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ کافی علیل ہیں اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ (آپ نے کہاں سے سن لیا؟) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد بھی بہت اچھی تھی۔ بے ضمیر میں فیضو کا انتقام بہت پسند آیا۔ بھرم، رزاق شاہد کوہلر کی کہانی ہمارے معاشرے کی بھیانک حقیقت تھی، بہت پسند آئی۔ منظر امام کی اسٹوری رقصِ اجل، انتہائی اچھی تھی۔ اسکول کے سامنے کی منظر کشی کی گئی تھی۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ پڑھ کر یہ لگا جیسے یہ اپنے ہی ملک کی رُوداد ہو۔ انتہائی وحشت ناک حقیقت۔ بردہ فروشی اور اسمگلنگ کے مکروہ دھندے ہیں۔ ملوث عناصر ننگِ ملت، ننگِ آدمیت، سفاک درندے ہوتے ہیں۔ باقی کہانیاں بھی شاندار تھیں۔''

بے نام صاحب، نامعلوم مقام سے لکھتے ہیں ''جولائی کا شمارہ قدرے تاخیر کے ساتھ 6 تاریخ کو جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل پر حسینہ کی قاتل مسکان دل

کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر گئی۔ صنفِ وجاہت کا نمائندہ زخم کھا کر بھی مسکرا کر اپنی ہمت و جوانمردی کا ثبوت پیش کر رہا تھا جبکہ دلن آنکھوں پر چشمہ لگائے ان کی مسکان پر انگارے چبا رہا تھا۔ مجموعی طور پر ماہِ رواں کا ٹائٹل خوب صورت و دلکش رہا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی شاہکار تخلیق انگارے سے آغاز کیا۔ انگارے میں شاہ زیب پاکستان آتے ہی پولیس کی بربریت کا شکار ہو گیا۔ قیصر چودھری کا کردار دیوی کے ریاض ہٹلر جیسا خوفناک اور ظالم لگا۔ انگارے کا نام ہی نہیں واقعات بھی انگارے کی طرح دہکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پرچی مزاح سے بھرپور باذوق قارئین کے لیے عید کا تحفۂ خاص ثابت ہوئی۔ سرورق کے رنگوں میں رزاق شاہد کوہلر کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ بھرم ہوس پرست اور غلیظ نفسانی خواہش رکھنے والے آستین کے سانپ کی تحریر جس نے دوستی جیسے پاک رشتے کی آڑ میں ایک خاندان کو نہایت سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے دوست کے اندھے اعتماد کو کرچی کرچی کر ڈالا۔ عاصم نے بدلہ لیا مگر جب اس کا مکمل خاندان ہی اجڑ گیا تو بدلے کا کیا فائدہ۔ ٹکراؤ مریم کے خان نے خوب صورتی سے واقعات کو ترتیب دیا۔ جبار توقیر کی تحریر دلدل زبردست رہی۔ شگفتہ جملوں نے مزاح پیدا کیا۔ منظر امام کی رقصِ اجل بھی بہترین ثابت ہوئی۔'' (خط کے آخر میں اپنا نام اور جگہ کا نام ضرور لکھیں)

ورابن کلان سے مرحا گل کی خوشی'' ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ چونک اٹھے۔ ٹائٹل گرل کافی خوش و خرم بالکل ماڈل ایان علی کی طرح عوام میں گھری نظر آئی۔ محفل میں انٹری دی۔ محمد مرتضیٰ احتشام کی ڈھارس پر دوبارہ لیٹر لکھا ورنہ... بلقیس خان کی مبارک باد دل سے قبول... زبردست تبصرہ تھا خوشگوار سا۔ زویا جی کہاں چھپی ہوئی ہیں کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ 2 ڈائجسٹوں نے ہمارے گھر کے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ جی ہاں 10 جولائی کو انعامی شمارہ بھی مل گیا تھا۔ اپنا لگا بندھا رسالہ تو 5 کو مل جاتا ہے ورنہ میں تو انعامی شمارے سے ناامید ہو چکی تھی لیکن اس پر 2 جولائی کی تاریخ دیکھ کر ڈاکیے کی غلطی لگی سو... ادارے کے شکر گزار تھے ایسا اعزاز بخشنے کا ورنہ ہم ناچیز ابھی تک بھول بھلیوں میں تھے۔ تھوڑا سا کھول کر ویسے ہی پیک شدہ یادگار کے طور پر رکھ دیا۔ کہانی انگارے اف کیا زبردست کہانی ہے۔ کاغذ پر موتی بکھیرنے کے الفاظ نہیں تھے کہاں مغل صاحب کہاں ہم اتنی گہرائی لفظ لفظ میں ویسے ہیروئن سامنے نہیں آئی امید ہے کہ اگلی قسطوں میں ظاہر ہو جائے گی۔ رزاق شاہد کوہلر جست لگا کر رنگوں میں بھی پہنچ چکے تھے۔ اندازہ نہیں تھا ویسے صاحب ڈی آئی خان سے تعلق رکھتے ہیں شاید؟ مریم کے خان اس دفعہ پھر بازی لے گئیں ونڈرفل۔ دلدل پڑھ کر افسوس ہوا، ہر طرف غداری تھی۔ بے ضمیر جمال دستی کیا خوب اندازِ تحریر ہے۔ فیضو نے عقلمندی کا کام کیا ویلڈن۔ رقصِ اجل گرفت قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ آوارہ گرد میں بیگم صاحبہ کا ذکر نہ پا کر مزہ نہیں آیا۔ شہزی کا سب کچھ ممکن ہو جانا ناقابلِ یقین؟ مسفرہ حسین کراچی سے لکھتی تھیں، وہ اب کیوں نہیں لکھ رہیں کیا وجہ ہے پلیز کوئی جانتا ہے تو... مغربی کہانیوں میں رنگِ وفا مزہ دے گئی۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے عبادت کاظمی کی تعریف'' اس مرتبہ جاسوسی کے فراق میں ہم لمبی لمبی آہیں بھرتے رہے اور جاسوسی کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح 9 تاریخ کو ملا۔ خوشی کے مارے دوڑے گھر کی جانب مگر بارش کی وجہ سے پھسل گئے اور... خیر جاسوسی کو بھیگنے نہ دیا جبکہ خود کا حال نہ پوچھیے... سرورق پر غالباً شکیل بھائی کی پڑوسن مسکرا رہی تھی اور بیک سائڈ پر وڈے شاہ جی غم کی تصویر بنے تھے کہ بھائی کوئی ہماری بھی سنے۔ محسن علی طاب آپ نے وضاحت نہیں کی کیلی گیلی کیا ہو گئی؟ ہمیشہ کی طرح وڈے شاہ جی کا تبصرہ اچھا تھا۔ مرحا گل آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی چلو کوئی تو اپنے شہر کا بھی ہے۔ سید محی الدین اشفاق ویلکم بیک جناب آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ محمد کبیر عباسی یار بہت خوب صورت ہو آپ کاش میں مل پاتا آپ سے۔ ماہ تاب گل رانا، تفسیر عباس بابر، سید شکیل، اعجاز احمد اور دیگر فرینڈز آپ سب کی محبت کا شکریہ۔ انگارے کو پا کر خوشی سے چیخ نکل گئی کیونکہ اس انگارے کے انتظار میں ہم خود ایک جلتا انگارہ بن گئے تھے۔ انگارے ٹاپ پر رہی۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ موت در موت یہ کہانی افسردہ کر کے چھوڑتی ہے۔ ثریا کی موت نے غم زدہ کر دیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شہزی کے ماں باپ زندہ ہیں۔ پہلا رنگ میں سلیم نے دوستی کو داغ دار کیا خیر انجام بھی وہی ملا۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی تھی۔ مریم کے خان، اس دفعہ مزہ نہیں آیا آپ کی کہانی میں نہ جانے کیوں... منظر امام ہمیشہ اچھوتے موضوع کے ساتھ آتے ہیں، سانحہ پشاور پر لکھی گئی کہانی نے رُلا کر رکھ دیا۔ کاشف زبیر پرچی کے ساتھ اچھے رہے اور سب سے زیادہ مزہ دلدل کہانی نے دیا اور جولائی کے شمارے میں جبار توقیر نے رنگ بھر دیے۔''

عذرا ہاشمی کی تبصرہ نگاری'' طویل غیر حاضری کے بعد گلشن مکتوبات میں قدم رنجہ فرما ہونے کا خیال طاہر جاوید صاحب کو دیکھ کر آیا جو فاتح شہنشاہ کی طرح شاہ زیب چیمپئن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ شاہ زیب یورپ کی کسی ایجنسی کے تربیت یافتہ ہیں اور اس کے مفادات کے لیے زبردست تباہ کاری مچا کر ان کے دشمنوں کے دانت کھٹے کر چکے ہیں اور وعدے وعید کے بعد ایک عام شہری کی طرح جی رہے ہیں۔ اسی لیے وہ چیمپئن بھی ہیں اور انہیں کوئی پہچانتا بھی نہیں ہے۔ محمد قاسم رحمان ابتدائی تبصرے میں براجمان تھے۔ مسز فاروق بلوچ کا تبصرہ انتہائی جاندار و شاندار تھا۔ سید شکیل حسین کاظمی اور معراج محبوب عباسی صاحب کے خطوط اچھے لگے۔ محمد اختر بیگ صاحب ہماری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ آوارہ گرد میں اس بار ایکشن سے بھرپور قسط پڑھنے کو ملی، بہت مزہ آیا۔ عبدالرب بھٹی صاحب آپ سے ایک بات پوچھنے کی جسارت کرنی تھی کہ چند اقساط سے متواتر شہزی کو عابدہ کے متعلق واضح اور کھلی دھمکیاں ملنے کے باوجود شہزی اس کے لیے عملی حفاظتی اقدام کیوں نہیں اٹھا رہا؟ یا اس کے اغوا کے بعد عملی اقدام اٹھائے جائیں گے۔ تیسری بیسٹ اسٹوری پرچی تھی۔ کافی عرصے بعد جلیل کی واپسی ہوئی تو کشتی کو قرار آیا۔ چوتھے نمبر پر جمال دستی صاحب کی بے ضمیر تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی بھرم مجموعی طور پر پانچویں نمبر پر رہی، ننگِ انسانیت کرداروں کو بے نقاب کرتی اچھی اسٹوری تھی۔ دلدل اچھی لگی۔ نجمہ اور انور ہاشمی کا انجام تو ٹھیک ہوا لیکن بے چاری نخی کے

ساتھ بڑی ناانصافی کی ان دونوں نے۔ بھوت کی واپسی بھی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ رقصِ اجل، سانحہ پشاور کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر کا پلاٹ تو بہت اچھا تھا اور قابلِ تعریف تھا مگر شاید منظر امام صاحب گرفت مضبوط نہ رکھ سکے۔ اکبر خان کا منہ بولی ماں کی تلاش پر خودکش دھماکا حلق سے نہیں اترا۔ ورنہ کہانی کے مکالمے اور دہشت گردی کا سلوشن بہت اچھا رہا۔ سرورق کی دوسری کہانی ٹکراؤ میں مریم کے خان اچھی کہانی کے باوجود بھرپور رنگ نہ جما سکی۔ آغاز بہت اچھا انجام بھی درست مگر درمیان میں واقعات کی ترتیب الجھن زدہ تھی۔''

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی محبتیں۔ ''8 جولائی کو جاسوسی موصول ہوا۔ ٹائٹل پر سبھی ہنستے نظر آئے۔ صنفِ نازک اور دونوں مخالف صنف۔ اپنی محفل میں پہنچے ویسے ہمارے جاسوسی کے تمام ساتھی کسی کو یاد نہیں رکھتے۔ دیکھ لیں۔ مابدولت کی غیر حاضری کسی نے بھی محسوس نہیں کی۔ (نہیں۔ ہم نے تو محسوس کی) محمد قاسم موجود تھے پہلی لائن میں۔ مسز فاروق بلوچ خوش آمدید۔ محمد قاسم آپ کی بات سے متفق ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ دیدہ دلیر میں سراغ رساں نے عمدہ طریقے سے قاتل کو پکڑا کہ اس کی چالاکی بھی کام نہ آسکی۔ قطرہ خون، اچھی کہانی تھی۔ بھوت کی واپسی، میں بیٹی تو سراغ رساں تھی ہی مگر ماں بھی اچھی سراغ رساں ثابت ہوئی اور جیراللہ کا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا۔ تجسس سے بھرپور شاہکار کہانی بدقسمت آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اینڈ کلائمکس پر تمام ہوا۔ بے ضمیر لوگوں میں رہ کر بھی فیضو نے ایمان کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سکندر شاہ کو صحیح انجام کو پہنچا کر برائی کا خاتمہ کر دیا۔ رقصِ اجل، منظر امام کی حقیقت پر مبنی تحریر اکبر خان نے اپنا حق ادا کرتے ہوئے جان تو دے دی مگر غلط ہاتھوں میں جا کر برا کیا۔''

کندیاں، میانوالی سے نادر سیال کی رُوداد' جاسوسی 6 جولائی بروز سوموار کو تپتی دھوپ، جسم پسینے سے تر، روزے کی حالت میں ملا۔ اس وقت میرا بہت برا حال تھا مگر جاسوسی مجھے ایک خوش گوار ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی طرح محسوس اور ایسا لگا کہ جسم میں ایک نئی جان آگئی ہو، رسالے میں اتنا کھویا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب سورج غروب ہوا اور کب افطار کا ٹائم ہوا۔ دوستوں کی محفل کا رخ کیا۔ سب سے پہلے جناب محمد قاسم رحمان پر نظر پڑی جو سب سے پہلے موجود تھے۔ طاہرہ گلزار جی، گیلے کاغذ کی طرح ٹھہری ہے زندگی اپنی نہ لکھتا ہے کوئی نہ جلاتا ہے کوئی۔ رہی بات گھاس چرنے کی تو طاہرہ صاحبہ گرمی اتنی تھی کہ دماغ بالکل بھی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ زندگی میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ محمد مرتضیٰ احتشام دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ آپ دوستوں کی دعاؤں سے انشاء اللہ ایک دن کھلی فضا میں سانس لینا نصیب کرے گا۔ واہ کینٹ، بلقیس خان آپ مجھے رب کے حضور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میرے لیے یہ اعزاز بھی بہت ہے۔ رہی بات قید کی تو گزشتہ 6 سالوں سے جیل میں سڑ رہا ہوں۔ ایک سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ سید محی الدین اشفاق دو مہینوں سے آپ کہاں گم تھے کچھ تو بتایا ہوتا، مرحا گل مرحلہ جی، ہم بھی آخر کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ہم بھی جاسوسی ذہن رکھتے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگلی قسط میں کیا ہونے والا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم تحریر نہیں کرتے۔ مسٹر جان جاناں، معاف کیجیے گا آپ کا نام ہی کچھ ایسا ہے ورنہ ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ کسی کو جانِ جاناں کہہ کر مخاطب کریں۔ آپ نے ٹائٹل گرل کی بہت زیادہ نہیں تعریف کر دی؟ اوکاڑہ، مسز فاروق بلوچ آنٹی، آپ کا قصور نہیں یہ جاسوسی سے رشتہ ہی کچھ ایسا بندھ جاتا ہے کہ زندگی بھر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ آپ آتی رہا کریں محفل میں، خوش آمدید۔ اب رخ کرتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ آوارہ گرد پڑھی جو ایکشن سے بھرپور تھی۔ طاہر جاوید مغل کے قلم سے لکھی ہوئی انگارے جس میں مغل صاحب نے شاہ زیب کو متعارف کرایا جو پاکستان میں تیرہ سال بعد آیا اور آتے ہی اس کو مغل صاحب نے مشکل میں ڈال دیا۔ یقیناً اچھی قسط وار ثابت ہوگی آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کے تعریفی ٹوکرے ''ماہ جولائی کا جاسوسی ایک بہت ہی خوب صورت اور عمدہ سرورق کے ساتھ 2 تاریخ کو کراچی کے کچھ ٹھنڈے ہوتے موسم میں ملا۔ محفل میں پیارے بھائی محمد قاسم رحمان پہلے نمبر پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ کہانی میں کچھ معیار نظر آنا چاہیے۔ مسز فاروق بلوچ صاحبہ کو جاسوسی میں خوش آمدید، بہت عمدہ پیرائے میں لکھا گیا تبصرہ بہت ہی عمدہ رہا۔ حسن افضال، غلام ٹیلین، محسن طالب مختصر تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھے۔ میانوالی سے احسان سحر اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ لیکن بھائی جیسا آپ دوسروں کے لیے محسوس کرتے ہو ویسا آپ کے دل میں بھی حسد ہوتا ہے۔ افتخار حسین بھائی ماں کا دکھ بہت بڑا دکھ ہے اللہ پاک آپ کو صبر کی توفیق عطا کرے، آمین۔ معراج محبوب عباسی بہترین خبریں پیش کرتے نظر آئے۔ سید شکیل حسین کاظمی کا عمدہ تبصرہ سچ کہا کہ ہر کہانی دیوتا جیسی نہیں ہوتی پر ہر کہانی للکار، گرداب اور پرواز جیسی بھی نہیں ہوسکتی۔ مسٹر جانِ جاناں اور انور یوسف زئی کے بھی عمدہ تبصرے تھے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ رزاق شاہد کوہلر بھرم لے کر آئے۔ بہت عمدہ کہانی تھی جس میں دوست دوستی کی آڑ میں گھناؤنا کھیل، بہن بھائی کے مقدس رشتے کی پامالی اور 9 افراد کے اندوہناک قتل پر مشتمل تحریر کافی جاندار رہی۔ ٹکراؤ مریم کے خان کے قلم سے اچھوتی تحریر صوفیہ نے بہت مشکل حالات میں بھی مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ آوارہ گرد کی قسط میں اس بار بہت ایکشن دیکھنے میں ملا جہاں شہزی نے ڈپٹی روشن جیسے خبیث فطرت کو انجام تک پہنچایا۔ سراغ، تنویر ریاض کی بہت ہی عمدہ تحریر رہی۔ کاشف زبیر پرچی لے کر آئے بہت ہی نائس تحریر تھی۔ رنگِ وفا امجد رئیس لے کر آئے۔ ایلن نے کارلا سے جان چھڑانے کا عمدہ طریقہ استعمال کیا۔ سکندر علیم کی تلاش بھی اچھی رہی۔ جبار توقیر دلدل لے کر آئے جہاں انسان کے لالچ کو عیاں کیا گیا۔ اگر ہاشمی مخلص کے ساتھ گزارہ کر لیتا تو عیاشی کرتا لیکن نجمہ کے حسن نے اسے عقل سے پیدل کر دیا۔ باقی تمام چھوٹی تحریریں عمدہ ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی شاہکار کہانی انگارے بہت ہی عمدہ اور لاجواب تحریر ہے۔ میں نے اس کو سب سے آخر میں سکون سے پڑھا یہ اپنی پہلی قسط سے ہی بتا رہی ہے کہ یہ بہت آگے جائے گی۔''

چارسدہ سے جانِ جاناں کی کاوش ''جاسوسی حسبِ معمول 4 تاریخ کو ہاتھ لگا۔ ٹائٹل وہی حسینہ، پلکوں کا جھالر اور زلفوں کی آبشار گرائے سفید

موتیوں کی نمائش لگائے بیٹھی تھی۔ پس منظر میں بڑے میاں عینک لگا کے افسردگی کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ برابر کر رہے تھے جبکہ چھوٹے میاں چہرے پر زخم سجائے مسکرا رہے تھے۔ فہرست میں انگارے کا نام پڑھتے ہی کہانی کی طرف چھلانگ لگا بیٹھے۔ لگتا ہے کہانی کافی دھوم مچائے گی۔ شاہ زیب کے اندر پتا نہیں کون سی آگ لگی ہے جسے اس نے تھپک تھپک کر سلا دیا ہے اور جو بہت کچھ بھسم کر دینے والا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد اپنی سیکنڈ فیورٹ یعنی آوارہ گرد پڑھی۔ بھئی واہ مزہ آیا۔ شہزی نے مسٹر آرک کے اسپیکٹرم کی جو بینڈ بجائی، بے چارہ وزیر جان مہینوں تک بلبلاتا رہے گا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ شہزی کو اپنے والدین اور اپنی شناخت کے بارے میں تھوڑی بہت جانکاری مل گئی۔ اگلی قسط میں مزید رازوں سے پردہ اٹھنے کا امکان ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی پرچھائیں واقعی بہت خوب صورت اور ہلکی پھلکی کہانی تھی۔ جلیل کو اس بار نہایت آسانی سے اور بنا کسی پاپڑ بیلے خطیر رقم ہاتھ لگی مگر شادی کے معاملے میں ہنوز دلّی دور است۔ مریم کے خان کی ٹکراؤ بھی کافی خوب صورت تھی۔''

کراچی سے رضوان تنولی کی آمد'' اسٹال کے ان گنت چکر لگائے، انتظارِ لذت کا دیدار کیم کو نصیب ہوا۔ سرورق کی دراز زلفوں والی نیم خوابیدہ سانولی ساورتی بے چاری مشٹنڈے بدمعاشوں کے رحم و کرم پر گویا ایک انار اور 2 بیمار۔ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ تخت طاؤس پر فائز میرے 17 سالہ دوست قاسم رحمان مبارک باد وزارت کا خوش اسلوب قلمدان مسز فاروق بلوچ نے عمدگی سے سنبھالا۔ احسان سحر کا خوش رنگ گل پاش تبصرہ پڑھ کر من کے جلترنگ بج اٹھے۔ عزیزی طاہرہ گلزار انعامی جاسوسی ملنے کی خوشی میں مٹھائی یا ریوڑیاں کھلاؤ۔ افتخار حسین اعوان اینڈ بلقیس خان مولائے کریم مرحومین کی مغفرت فرمائے، آمین۔ میرا نٹ کھٹ دوست ملک رحمت کہاں جنتر منتر ہے کستوری لگا کے؟ سرگودھا والے عمر فاروقی ہاشمی اور میانوالی والے محسن خان کو سلامِ دوستانہ۔ شائقین کے دلوں کی دھڑکن طاہر جاوید مغل کی انگارے کی ابتدائی قسط نے آنکھیں موسم برسات کی طرح چھلکا دیں، دیارِ غیر سے پاکستان واپسی کے مہمان شاہ زیب کے شریف تن پر بدمعاشی کا چولا زبردستی پہنایا گیا۔ مغل اعظم کے نام کا ڈنکا چہار سو بج اٹھا ہے۔ پیارے طاہر جی نے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کے لیے شاہکار، سماج دشمن عناصر کے خلاف شہزی کی جولانیاں عروج پر، بھٹی صاحب کی گرفت کہانی پر مضبوط۔ سرورق کا پہلا رنگ بھرم بہن بھائی کے منہ بولے رشتے بھی پاکیزہ اور معتبر ہوتے ہیں۔ بدبخت سلیم آستین کا سانپ نکلا۔ مریم کے خان کا دوسرا رنگ گزارے لائق رہا۔''

عروج ناز کی سیالکوٹ کینٹ سے تیز رفتاری'' طویل غیر حاضری کے بعد پھر سے رونقِ محفل ہیں۔ اس بار جاسوسی معمول سے کچھ لیٹ یعنی 8 جولائی کو موصول ہوا۔ ذاکر صاحب کے کرشماتی ہاتھوں سے بنا ٹائٹل مجموعی طور پر بہتر تھا۔ سب سے پہلے پہنچے محفلِ یاراں میں جہاں محمد قاسم رحمان براجمان تھے۔ ابتدا کی آوارہ گرد سے جہاں شہزی اور راول خیر بھرپور ایکشن میں نظر آئے۔ مار دھاڑ، ایکشن اور تھرل سے بھرپور قسط مزہ دے گئی۔ انگارے، تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔ پہلی قسط سے ہی سیاپے شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے شاہ زیب کے ساتھ۔ کاشف زبیر کی پرچھائیں اس بار کچھ خاص رنگ نہ جما سکی۔ جبار تو تیر کی دلدل، دولت اور پیار کی ہوس میں جائز اور ناجائز کا فرق نہ رکھنے والوں کی داستان عبرت انگیز تھی۔ جمال دستی کی بے ضمیر بھی خوب رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ بھرم کسی پر بھی اندھا اعتماد ہمیشہ لے ڈوبتا ہے۔ دوسرا رنگ مریم کے خان کی ٹکراؤ کچھ ادھوری سی محسوس ہوئی۔ رقصِ اجل ملک دشمن عناصر کے ظلم و بربریت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ خمیازہ بھی لاجواب تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

رحیم یار خان سے فلک شیر ملک کی تنقید و توصیف'' میں عرصہ 30 برس سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں مگر کچھ عرصے سے اس رسالے کا معیار کچھ ڈاؤن ہو رہا ہے کیونکہ کچھ کہانیاں کاپی ہو رہی ہیں اور کچھ کہانیاں بہت چھوٹی اور مختصر ہوتی ہیں۔ سکندر علیم کی تلاش، بابر نعیم کی دیدہ دلیر، ایس انور کی قطرۂ خون اور پھر کوئی خاص سبق بھی نہیں ہوتا۔ سرورق پر لڑکی کی ناک بہت پسند آئی۔ عینکوں والے یوں لگ رہے تھے جیسے سابقہ صدر یحییٰ خان ہوں۔ مدیرِ اعلیٰ نے میرے جذبات کی عکاسی کر دی۔ آپ کے جذبے کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ انگارے کی پہلی قسط ہی بھا گئی۔ طاہر جاوید مغل صاحب نے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ کئی لوگ بلاوجہ پولیس مقابلوں میں مار کر دیے گئے۔ اگر یہ محکمہ درست ہو جائے تو جرم گھٹ جائیں مگر اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ کاشف زبیر کی پرچھائیں پڑھی۔ وہ بھی انہی حالات کی نشاندہی کر رہی ہے۔ خوب صورت انداز میں بتایا گیا ہے کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ تنویر ریاض کی سراغ بہت اچھی تحریر تھی۔ پیسے کی ہوس، لالچ انسان کو ایسا ظالم بنا رہا ہے کہ وہ اپنوں کا بھی خون کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ تمام لکھنے والوں کو اور خصوصاً ادارہ کے لوگوں کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے اس ملک و قوم کی حفاظت کرے۔ یہاں بھی خوش حالی آئے۔ زندہ قوموں کی طرح ہم بھی سر اٹھا کر چل سکیں۔ زرد چہروں پر بھی مسکراہٹیں آ جائیں۔ میں ایک پُراسرار کہانی'' ہوا کے دوش پر'' لکھ رہا ہوں اگر اجازت ہو تو بھیج دوں۔'' (مکمل کرنے کے بعد بھیج دیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

راجہ عارف محمود، تحصیل بھمبر۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور۔ سید اکبر شاہ، مانسہرہ۔ ابن شمشاد، کراچی۔ ہارٹ کیچر، علی پور جتوئی۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ آصف محمود، گوجرانوالہ۔ ملک سعید، چکوال۔ قاسم رحمان، ہری پور۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ ادریس احمد خان، کراچی۔ محمد مرتضیٰ احتشام، جھنگ۔ نعیم الحسن شاہ، اسلام آباد۔

سنگِ گراں

پروین زبیر

ان دغاباز ساعتوں کی کہانی... جب انسانی رشتوں نے اپنا اعتبار کھودیا...

اپنی برتری اور شان و شوکت کو قائم رکھنے کے لیے طاقتور لوگ ہمیشہ اپنی پسند کے اُصول اور ضابطے وضع کرتے ہیں... اپنے مفادات کی خاطر غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنا ان کی فطرتِ خاص بن جاتی ہے... وہ صرف اور صرف اپنے مالی مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں... مگر اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کبھی کسی ٹھوس پتھریلی زمین پر اُترنا ان کی قسمت میں نہیں ہوتا... ناہموار اور دشوار گزار زمین پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھنا ہی ان کے قدموں کا مقدر بن جاتا ہے... خواب دیکھنے والے ایک ایسے ہی ثابت قدم نوجوان کی بے لوث کوششوں اور امنگوں کی کہانی... قدم در قدم اس کے راستے میں رکاوٹیں حائل ہوتی رہیں... مگر اس کا عزم... یقین اور نیت کسی مقام پر متزلزل نہیں ہوا... اس کا سفر کامیابی کی جستجو میں رواں دواں رہا... اس کے کارواں کے تمام مہرے اس کی جنبشِ نظر کے مطابق حرکت کررہے تھے مگر اچانک ایک روز ایسا ہوا...

روشن خیال لوگوں کے تاریک جذبوں کی ترجمان پراثر تحریر...

فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ تیزی سے گھومتی ہوئی سیڑھیاں اترتا ہوا بیسمنٹ میں بنے فلورل ہال کی طرف جارہا تھا۔ جہاں آج سے 'جیمز اینڈ جویلز' کے نام سے بہت قیمتی پتھروں کی نمائش شروع ہونے والی تھی۔

اس نمائش میں رکھے جانے والے بہت اعلیٰ درجے کے وہ قیمتی ہیرے جواہرات تھے جو کچھ شوقین لوگوں کا ذاتی کلیکشن تھے۔ کچھ جواہرات کو ان کے مالکان نیلامی کے ذریعے فروخت کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔

آنے والوں میں سے کئی ایک رائل فیملیز کی آمد بھی متوقع تھی۔ ان کے علاوہ بعض غیرملکی اور ملکی مہمانوں کی آمد بھی یقینی تھی جو ان قیمتی جواہرات کو خریدنے کی سکت رکھتے ہوں اور نیلامی میں اونچی بولی لگا سکتے ہوں۔ 'جیمز اینڈ جویلز' نام کی یہ نمائش اس طرح مشتہر کی گئی تھی کہ نہ صرف امریکا، کینیڈا بلکہ دنیا کے کئی ممالک سے لوگوں نے اس نمائش کو دیکھنے کے شوق کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ انتظامات میں اس

بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

سلطان خان ایک پاکستانی تھا اور پچھلے تین چار سال سے اس بڑے ہوٹل ''ہالیڈے اِن'' میں ایونٹ منیجر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔

اس کی سرخ و سفید رنگت اور طویل قامتی سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس کا تعلق پاکستان کے شمالی علاقوں سے ہے۔

بے شمار تعریفی خطوط و اسناد اس کی بے مثال صلاحیتوں کی قدردانی کا ثبوت تھے۔ ہوٹل منیجمنٹ نے بھی اسے اس سلسلے میں فری ہینڈ دے رکھا تھا کہ وہ جیسے چاہے کسی بھی تقریب کا انتظام وانصرام کرے۔

نیویارک کے ہالیڈے اِن میں جب نمائش کی بات سامنے آئی تو یہ سلطان کی ہی رائے تھی کہ اسے بیسمنٹ میں واقع 'فلورل ہال' میں منعقد کیا جائے۔ تاکہ سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات کرنے میں آسانی رہے۔ انتظامیہ نے اس کی بات مان لی اور ہال تقریباً دس دن پہلے سلطان اور اس کی ٹیم کے حوالے کردیا گیا اور اس نے آٹھ دنوں میں تمام انتظامات مکمل کرلیے۔

کلر تھیم بالکل وہائٹ رکھی گئی تھی تاکہ اس بے داغ ماحول میں چھوٹے سے چھوٹا جواہر بھی نمایاں نظر آئے۔ مناسب جگہوں پر رکھے جانے والے چھوٹے چھوٹے اسٹال جن کی ٹیبل کا مرکزی حصہ آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا اور اس پر گہری سرخ سلک کی سلوٹوں والے کور تھے...... جن کے نیچے چھوٹے بڑے اسٹینڈ اس خوب صورتی سے چھپائے گئے تھے کہ وہ سرخ ریشم کی سلوٹوں کا حصہ بن گئے تھے۔ ان گھومنے والے چھوٹے چھوٹے اسٹینڈز پر شفاف شیشے کے گنبد نما کور تھے جن میں مختلف اینگلز سے چھوٹی مگر تیز لائٹس لگی ہوئی تھیں۔

''یس چارلی! از ایوری تھنگ او کے؟'' اس نے ہال میں داخل ہوتے ہی اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

''ہاں، سب کچھ ہوچکا ہے۔ لسٹ تمہارے پاس ہے۔ کون سا جوئیل کہاں رکھنا ہے، لسٹ دیکھ کر بتاؤ تاکہ میں ان کے کارڈز وہاں رکھ دوں۔''

چارلی نے ہاتھ میں تھامے کارڈز پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ جہاں ہر جوئیل کے فوٹوگراف کے ساتھ اس کا مخصوص کوڈ اور اس کے مالک کا نام لکھا تھا۔

''ہاں لسٹ یہ ہے۔ تم کارڈز رکھو۔ میں ذرا سیکیورٹی دیکھ لوں۔'' سلطان لسٹ تھما کر آگے بڑھ گیا۔

یہاں اس نے ٹرپل ٹریک سیکیورٹی رکھوائی تھی۔ مہمانوں کے داخلے کے لیے ایک مختصر عارضی کوریڈور بنایا گیا تھا جس میں تین دھاتی دروازے تھے اور ان دروازوں میں لگے ڈیوائسز کی مدد سے...... ہر گزرنے والے شخص کے جسم پر کیا کیا ہے، اندر سیکیورٹی چیک روم میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا اور یہ کسی بھی طرح ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے لباس میں چھپا کر کوئی آتشیں یا غیر آتشیں ہتھیار اندر لے جانے میں کامیاب ہوسکے یا اندر سے کوئی قیمتی پتھر چرا کر چھپا کر باہر لے جاسکے۔

سلطان نے سارے انتظامات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور کرنل ٹام کی طرف دیکھ کر سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اسے داد دی۔ ٹام ایک ریٹائرڈ فوجی تھا اور اپنی ایک پرائیویٹ سیکیورٹی فرم چلا رہا تھا۔ جہاں کہیں بھی خاص سیکیورٹی فراہم کرنے کی ضرورت پیش آتی، ٹام کی کمپنی اپنی بہترین خدمات پیش کرتی تھی۔ اس حوالے سے اس کا نام خاصا معروف تھا اور کئی مرتبہ مل کر کام کرنے کے مواقع ملنے کی وجہ سے سلطان کے اس کے ساتھ کچھ خاص اور ذاتی مراسم بن گئے تھے۔

''گڈ جاب بوائے!'' سلطان نے مسکرا کر کہا تو ٹام نے حسب عادت اپنا مخصوص گونج دار قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے ساتھ اس کی توند بھی بے قرار ہوکر ہلنے لگی۔ جس کے سبب سلطان کی مسکراہٹ ایک مدھم ہنسی میں تبدیل ہوئی اور وہ باہر نکلتا چلا گیا۔

بیسمنٹ سے نکل کر وہ لابی میں جانے کے بجائے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا جہاں سے پارکنگ میں ایگزٹ تھی۔ کیونکہ ابھی ابھی اسے فون پر اطلاع ملی تھی کہ وہ آرمرڈ وین آچکی ہے جس میں نمائش میں رکھے جانے والے جواہرات آنا تھے۔ چنانچہ اس نے مخصوص گیراج نما حصے کا رخ کیا۔ جہاں صرف وی آئی پیز کی گاڑیاں کھڑی کی جاتی تھیں۔ گیراج کا بڑا سا گیٹ بند تھا۔ اس نے گارڈ کو اشارہ کیا تو اس نے جیب سے ریموٹ نکال کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ریموٹ کنٹرولڈ گیٹ بے آواز اوپر اٹھتا چلا گیا۔

سامنے ہی چاروں طرف سے فولادی چادروں سے بند وین کھڑی تھی، موٹے بلٹ پروف شیشے کے اس پار ہیلمٹ پہنے ڈرائیور نظر آیا تو سلطان نے اشارے سے اسے گاڑی آگے لانے کو کہا۔ جیسے ہی گاڑی آگے آکر کھلے حصے میں رکی، اس کا پچھلا دروازہ کھلا اور چار گارڈز نیچے اترے۔ وہ اپنی مخصوص یونیفارم میں پوری طرح مسلح

تھے۔ ان کے پیچھے دو افراد اور بھی اترے جن میں سے ایک ان کا سپروائزر اور دوسرا غالباً انشورنس ایجنٹ تھا۔

''ہائے، آئی ایم جیکسن۔ تمہاری امانتیں یہاں تک پہنچانا میرا کام تھا، وہ میں نے پہنچا دی ہیں۔ یہ ان کی رسید ہے، اس پر سائن کر کے مجھے واپس کر دو اور مجھے بتاؤ کہ مجھے لنچ کے لیے کہاں جانا ہے۔ سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔''

یونیفارم میں ملبوس سپروائزر نے چند کاغذات سلطان کو پکڑائے اور لابی کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے شخص کو سلطان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کی پریشان سی شکل پر پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔

''ہائے! آئی ایم ویزلے...... جم ویزلے...... میں اس انشورنس کمپنی کا نمائندہ ہوں جہاں ان جواہرات کا انشورنس ہے جو آج اس نمائش میں لائے گئے ہیں۔ ایک ایک جواہر کا کروڑوں ڈالر کا انشورنس ہے۔ اس لیے میں ساتھ ہی آ گیا ہوں تا کہ دیکھ سکوں کہ آپ لوگوں نے ان کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا ہے۔ مجھے اپنی کمپنی کو رپورٹ پیش کرنی ہے۔''

جم ویزلے نے کچھ ہکلا ہکلا کر اپنی بات پوری کی۔ شاید یہ ہکلاہٹ اس کی پریشانی کا اظہار تھی۔

''شیور مسٹر ویزلے۔ آپ اچھی طرح جائزہ لیجیے۔ میں آپ کو فلورل ہال میں بھجوا دیتا ہوں۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کے ساتھ ایک گارڈ کو اسے ساتھ لے جانے کا اشارہ بھی کر دیا۔

وین کا مضبوط والٹ ایک کوڈ اور دو بڑی مخصوص چابیوں سے کھولا گیا اور اس میں ترتیب سے رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے مگر بھاری دھاتی ڈبے وہاں سے نکال کر فلورل ہال میں پہنچا دیے گئے۔ سپروائزر لنچ کر کے آ گیا تھا اور اب رپورٹ سلطان کو دے رہا تھا۔

''یہ کل آٹھ بکس ہیں۔ ہر بکس کے اوپر جواہرات کی تعداد اور ان کے مالک کا نام واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر باکس ایک مخصوص کوڈ اور چابی کی مدد سے کھلے گا جو میرے پاس ہیں۔''

سپروائزر نے کاندھے پر رکھا ہوا چھوٹا سا بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور اس میں سے چھوٹا لیپ ٹاپ نکالا۔ دوسرے خانے سے چمڑے کا ایک کی چین بیگ نکال کر کھولا۔ جس میں ترتیب سے چابیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

''یہ رہا ان کا کوڈ...... اور یہ رہی چابی۔'' سپروائزر نے کوڈ اور چابی کی مدد سے بکس کھولا اور سلطان کے حوالے کر دیا۔ اس میں رکھے ہوئے جواہرات سلطان نے نکالے اور اپنے پاس موجود اس لسٹ میں چیک کیا جس میں اس کی تفصیل کے علاوہ فوٹوگراف بھی تھے۔ پھر انہیں اس ٹیم کے حوالے کیا جو انہیں اپنی مخصوص جگہوں پر رکھنے کی ذمے دار تھی۔ انہوں نے جواہرات اپنی مخصوص جگہوں پر رکھنا شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹے چلا یہاں تک کہ تمام جواہرات اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر رکھ دیے گئے۔ سپروائزر ان سب کی رسید پر سائن لے کر اور سلطان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

تمام چیزیں ترتیب سے رکھی جا چکی تھیں اور اب ان ٹرن ٹیبلز پر شیشے کے شفاف کورز بھی ڈھک دیے گئے تھے کہ اچانک ہال میں جلنے والی چکاچوند روشنیاں مدھم ہوئیں اور شفاف شیشے کے گنبد نما کورز میں لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی لائٹیں تیز روشنی سے جل اٹھیں۔

''واؤ...... کیا خوب صورت منظر ہے۔ ہیرے جواہرات کیسے جگمگا رہے ہیں۔ میں تو ان کے جادو کا اسیر ہو گیا ہوں...... سلطان! تم نے آج لوگوں کو پاگل کر دینے کا منظر تخلیق کر دیا ہے۔'' سیکیورٹی چیف کرنل ٹام واقعی جواہرات کے حسن سے ٹرانس میں آیا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیا پتھر اس قدر حسین بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں تو ان میں سے بعض کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پا رہا ہوں۔ کیوں دوستو! کیا تم میں سے بھی کسی کی ایسی ہی کیفیت ہے یا میں ہی حواس باختہ ہو گیا ہوں؟''

سلطان کے ساتھی چارلی نے اپنے ساتھیوں سے سوال کیا تو ان سب نے بھی محسوس کیا کہ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی کیفیت ان کی بھی ہے۔ وہ سب ایسے ہی تبصروں میں مصروف تھے کہ سلطان کی آواز گونجی۔

''او کے ساتھیو! ہم سب نے تو دیکھ لیے یہ جواہرات...... اب بس دو گھنٹوں کے بعد اس نمائش کی ابتدا ہونے والی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو اپنی اپنی ذمے داریاں سنبھال لینا چاہیے۔ کچھ ہی دیر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ میں اوپر جا رہا ہوں۔ ہم سب کا آپس میں فون پر رابطہ رہے گا۔ کسی کو کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے مطلع کرے۔ او کے گائیز! بی الرٹ۔''

یہ کہتا ہوا وہ گول گھومتی سنگ مرمر کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔

لابی میں حسبِ معمول چند لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے گپ

تھے۔ان کے پیچھے دو افراد اور بھی اترے جن میں سے ایک ان کا سپروائزر اور دوسرا غالباً انشورنس ایجنٹ تھا۔

''ہائے، آئی ایم جیکسن۔تمہاری امانتیں یہاں تک پہنچانا میرا کام تھا' وہ میں نے پہنچا دی ہیں۔یہ ان کی رسید ہے،اس پر سائن کر کے مجھے واپس کر دو اور مجھے بتاؤ کہ مجھے لنچ کے لیے کہاں جانا ہے۔سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔''

یونیفارم میں ملبوس سپروائزر نے چند کاغذات سلطان کو پکڑائے اور لابی کی طرف بڑھ گیا۔دوسرے شخص کو سلطان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کی پریشان سی شکل پر پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔

''ہائے! آئی ایم ویزلے...... جم ویزلے...... میں اس انشورنس کمپنی کا نمائندہ ہوں جہاں ان جواہرات کا انشورنس ہے جو آج اس نمائش میں لائے گئے ہیں۔ایک ایک جواہر کا کروڑوں ڈالر کا انشورنس ہے۔اس لیے میں ساتھ ہی آ گیا ہوں تاکہ دیکھ سکوں کہ آپ لوگوں نے ان کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا ہے۔مجھے اپنی کمپنی کو رپورٹ پیش کرنی ہے۔''

جم ویزلے نے کچھ ہکلا ہکلا کر اپنی بات پوری کی۔شاید یہ ہکلاہٹ اس کی پریشانی کا اظہار تھی۔

''شیور مسٹر ویزلے۔آپ اچھی طرح جائزہ لیجیے۔میں آپ کو فلورل ہال میں بھجوا دیتا ہوں۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کے ساتھ ایک گارڈ کو اسے ساتھ لے جانے کا اشارہ بھی کر دیا۔

وین کا مضبوط والٹ ایک کوڈ اور دو بڑی مخصوص چابیوں سے کھولا گیا اور اس میں ترتیب سے رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے مگر بھاری دھاتی ڈبے وہاں سے نکال کر فلورل ہال میں پہنچا دیے گئے۔سپروائزر لنچ کر کے آ گیا تھا اور اب رپورٹ سلطان کو دے رہا تھا۔

''یہ کل آٹھ بکس ہیں۔ہر بکس کے اوپر جواہرات کی تعداد اور ان کے مالک کا نام واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ان میں سے ہر باکس ایک مخصوص کوڈ اور چابی کی مدد سے کھلے گا جو میرے پاس ہیں۔''

سپروائزر نے کاندھے پر رکھا ہوا چھوٹا سا بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور اس میں سے چھوٹا لیپ ٹاپ نکالا۔

دوسرے خانے سے چمڑے کا ایک کی چین بیگ نکال کر کھولا۔جس میں ترتیب سے چابیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

''یہ رہا ان کا کوڈ...... اور یہ رہی چابی۔'' سپروائزر نے کوڈ اور چابی کی مدد سے بکس کھولا اور سلطان کے حوالے کر دیا۔اس میں رکھے ہوئے جواہرات سلطان نے نکالے اور اپنے پاس موجود اس لسٹ میں چیک کیا جس میں اس کی تفصیل کے علاوہ فوٹوگراف بھی تھے۔پھر انہیں اس ٹیم کے حوالے کیا جو انہیں اپنی مخصوص جگہوں پر رکھنے کی ذمے دار تھی۔انہوں نے جواہرات اپنی مخصوص جگہوں پر رکھنا شروع کر دیے۔یہ سلسلہ کئی گھنٹے چلا یہاں تک کہ تمام جواہرات اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر رکھ دیے گئے۔سپروائزر ان سب کی رسید پر سائن لے کر اور سلطان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

تمام چیزیں ترتیب سے رکھی جا چکی تھیں اور اب ان ٹرن ٹیبلز پر شیشے کے شفاف کورز بھی ڈھک دیے گئے تھے کہ اچانک ہال میں جلنے والی چکاچوند روشنیاں مدھم ہوئیں اور شفاف شیشے کے گنبد نما کورز میں لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی لائٹیں تیز روشنی سے جل اٹھیں۔

''واؤ...... کیا خوب صورت منظر ہے۔ہیرے جواہرات کیسے جگمگا رہے ہیں۔میں تو ان کے جادو کا اسیر ہو گیا ہوں...... سلطان! تم نے آج لوگوں کو پاگل کر دینے کا منظر تخلیق کر دیا ہے۔'' سیکیورٹی چیف کرنل ٹام واقعی جواہرات کے حسن سے ٹرانس میں آیا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیا پتھر اس قدر حسین بھی ہو سکتے ہیں۔مجھے یقین نہیں آتا۔میں تو ان میں سے بعض کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پا رہا ہوں۔کیوں دوستو! کیا تم میں سے بھی کسی کی ایسی ہی کیفیت ہے یا میں ہی حواس باختہ ہو گیا ہوں؟''

سلطان کے ساتھی چارلی نے اپنے ساتھیوں سے سوال کیا تو ان سب نے بھی محسوس کیا کہ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی کیفیت ان کی بھی ہے۔وہ سب ایسے ہی تبصروں میں مصروف تھے کہ سلطان کی آواز گونجی۔

''او کے ساتھیو! ہم سب نے تو دیکھ لیے یہ جواہرات...... اب بس دو گھنٹوں کے بعد اس نمائش کی ابتدا ہونے والی ہے۔لہٰذا ہم سب کو اپنی اپنی ذمے داریاں سنبھال لینا چاہیے۔کچھ ہی دیر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔میں اوپر جا رہا ہوں۔ہم سب کا آپس میں فون پر رابطہ رہے گا۔کسی کو کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے مطلع کرے۔ او کے گائیز ابی الرٹ۔''

یہ کہتا ہوا وہ گول گھومتی سنگ مرمر کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔

لابی میں حسب معمول چند لوگ ادھر ادھر بیٹھے گپ

شپ کر رہے تھے یا اخبار میگزینز پڑھ رہے تھے۔ اس نے لابی کے ایک دور افتادہ گوشے میں..... پریس اور میڈیا کے نمائندوں کو بٹھانے کا انتظام کیا تھا جبکہ خاص مہمانوں کے لیے اسی سے متصل لاؤنج میں آرام دہ مخملی صوفے لگوائے تھے۔

ابھی وہ انتظامات کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا کہ نظر سامنے اٹھ گئی۔

''او مائی گاڈ! سب سے پہلے اسے ہی نازل ہونا تھا۔'' وہ زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے اپنی جانب تیزی سے بڑھنے والی اس لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا جو سرخ شرٹ کے ساتھ سیاہ کوٹ پہنے گلے میں مفلر اور کاندھے پر ایک بڑا سا بیگ لٹکائے چلی آرہی تھی۔

''ہائے ہینڈسم! تمہارے مہمانوں میں سب سے پہلے آنے والی غالباً میں ہی ہوں۔'' اس نے شرارتی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ہیلو مس صبا غزل! کبھی تو کسی تقریب سے غیر حاضر بھی ہو جایا کرو۔ ہر جگہ اپنا یہ بستہ اٹھا کر پہنچ جاتی ہو۔'' سلطان نے اس کے بڑے سے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آہستہ سے ہنسی۔

''بستہ؟ ٹھیک کہا مگر میری جان! یہ بلّو کا بستہ نہیں، میرا نہایت قیمتی بیگ ہے۔ اس کے بغیر میرا وجود ادھورا ہے اسی لیے اسے دل سے لگائے پھرتی ہوں۔'' اس نے ڈائیلاگ بولنے کی کوشش کی۔

''کاش یہ ڈائیلاگ تم کسی زندہ، سانس لیتے وجود کے لیے بولتیں۔ تو وہ زندگی بھر کے لیے تمہارا اسیر ہو جاتا۔ مگر واہ، کیا قسمت پائی ہے اس نے..... قابلِ رشک ہے۔'' سلطان نے مسکرا کر کہا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

''قابلِ رشک ہے، قابلِ حسد تو نہیں ہے کہیں؟''

''خیر، میری ایسی قسمت کہاں، بہرحال پاکستانی قونصلیٹ میں..... یو این او ڈیسک کی میڈیا منیجر کے پاس یہ چیزیں تو لازمی ہیں نا۔ جو اس قابلِ رشک بیگ میں ہیں۔ مثلاً! میرا کیمرا، میری لیپ ٹاپ نوٹ بک وغیرہ وغیرہ۔ اور کیونکہ ان کے بغیر میرا کام چلتا نہیں اس لیے میں اور میرا بستہ..... آج بھی یہاں موجود ہیں۔ بائی دا وے کب ہے تمہاری اس نمائش کی اوپننگ؟'' اس نے نان اسٹاپ بولتے ہوئے آخر میں سوال کر ڈالا۔

''ٹھیک تین بجے۔ اور بائے دا وے نمائش میری نہیں..... جیمز اینڈ جویلز کی ہے۔'' سلطان نے تصحیح کی تو وہ ہنسی۔

''اچھا..... ویسے ایک بات بتاؤں..... جہاں یہ جیمز اینڈ جویلز کی نمائش ہو رہی ہے نا تم وہاں کمرے ہو کر بھولے سے بھی مسکرامت دینا۔''

''کیوں..... کیوں بھئی؟ میرے مسکرانے پر پابندی کیوں لگائی جارہی ہے؟''

''اس لیے کہ اِدھر تم مسکرائے۔ اُدھر خود کار سیکیورٹی الرٹ ہو جائے گی۔ الارم بجنے لگیں گے۔ اچھی خاصی پینک پھیل جائے گی۔''

''میں..... میں کچھ سمجھا نہیں۔'' سلطان نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ابھی سیکیورٹی والے دوڑ پڑیں گے کہ چیک کرو بھئی، یہ ہمارے ایونٹ منیجر مسٹر سلطان نے کہیں اصلی اور خاص جواہرات چوری کر کے اپنے منہ میں تو نہیں چھپا لیے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''اوہ، اگر یہ میرے دانتوں کی تعریف ہے جس کی مجھے تم سے قطعی توقع نہیں ہے تو بے حد شکریہ۔ لیکن اگر یہ کسی رعایت کے حصول کے لیے مکھن پالش ہے تو میں پہلے ہی معذرت خواہ ہوں۔'' سلطان نے برابر کی چوٹ کی۔

''ارے توبہ توبہ! یہ کیا چھوٹی بات کر دی تم نے۔ دوست ہونے کے ناتے..... چھوٹی موٹی رعایت کے لیے مجھے تم سے کچھ کہنا تھوڑی پڑے گا۔ وہ تو تم خود ہی دے دو گے۔ مکھن پالش کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''پہلے مکھن پالش..... اور اب یہ دوستی کی دہائی..... کام کیا ہے؟'' سلطان بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتائے دیتی ہوں۔ مجھے ان میں سے کچھ خاص خاص جواہرات کی نزدیک سے تصویریں لینی ہیں۔ نمائش شروع ہو گئی تو رش بڑھ جائے گا اور مجھے قریب سے اطمینان سے تصویریں کھینچنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس لیے اگر ابھی نمائش شروع ہونے سے پہلے......'' اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سلطان بول پڑا۔

''ناٹ پوسیبل۔''

''پلیز، پلیز، پلیز۔'' اس نے بڑی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے درخواست کی تو سلطان نے سر ہلاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کاش! کبھی کسی نے سچے دل سے سراہا ہوتا۔

اپنی ایسی قسمت کہاں...... تف ہے...... تف ہے اپنے آپ پر۔''

سلطان نے افسوس میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا فلورل ہال کی طرف چل دیا۔

''نہ نہ...... افسوس کرنے کی بات نہیں ہے۔ اچھی امید رکھنا چاہیے...... تم دیکھنا! ایک دن آئے گا جب دنیا تمہاری سچی تعریف کرے گی۔ غم نہ کرو۔'' وہ جلدی جلدی اس کی معیت میں قدم بڑھاتے ہوئے شرارت آمیز سنجیدگی سے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ہی اسے کرنل ٹام مل گیا۔ جو اسے ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ آتا دیکھ کر وہیں رک گیا تھا اور لڑکی کی نظر بچا کر اس نے سلطان کو آنکھ بھی ماری۔

''موٹو! یہ لڑکی فوٹو گرافر ہے۔ کچھ جویلو کی تصویریں بنانا چاہتی ہے۔ اب یہ تمہارے حوالے ہے۔'' سلطان نے اس کے آنکھ مارنے کا بدلہ اسے موٹو کہہ کر لے لیا تھا۔

''صبیی! یہ کرنل ٹام...... یہاں کے سیکیورٹی چیف...... تمہارے کام میں تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے اوپر جانا ہے۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ او کے......'' سلطان نے بات ختم کر کے سیڑھیوں پر دوڑ لگائی اور ٹام صبیی کی طرف متوجہ ہوا۔

''لیکن مس! آپ کو سیکیورٹی چیک سے گزرنا پڑے گا۔ مائنڈ مت کیجیے گا۔ ویسے تو خوب صورت لڑکیوں کو سات خون معاف ہوتے ہیں لیکن کیا کروں، یہ میری پیشہ ورانہ ذمے داریاں ہیں۔ اس لیے مجبور ہو گیا ہوں۔'' ٹام نے جھکتے ہوئے خاکساری سے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... میں مائنڈ نہیں کروں گی۔ آپ چیک کر سکتے ہیں۔'' اس نے اپنا بیگ اس کی طرف بڑھا دیا جسے ٹام نے احتیاط سے تھام لیا۔

معزز مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی جنہیں سلطان نے مکمل وی آئی پی پروٹوکول کے ساتھ نی الحال خوب صورتی سے آراستہ لاؤنج میں بٹھا دیا تھا۔ تین بجنے میں تھوڑا وقت تھا اس لیے مہمان ایک دوسرے سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔

آخرکار مہمانِ خصوصی...... یعنی جیمز اینڈ جویلو کارپوریشن کے مقامی صدر کی آمد ہوئی۔ جنہوں نے باقاعدہ نمائش کا افتتاح کیا اور مہمان ذوق و شوق سے ان جگمگاتے ہوئے بے مثال جواہرات کو دیکھتے رہے۔ اس دوران سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ویسے تو نمائش میں رکھا ہوا ہر نمونہ...... شاہکار ہے۔ لیکن پھر بھی نیلم سے تراشا ہوا بدھا اور زمرد سے تراشی گئی جل پری...... بہت ہی کمال کی چیزیں ہیں۔

''مسٹر آرتھر ایشلے! آپ کے یہ دونوں شاہکار بہت ہی کمال کے ہیں۔ کیا آپ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتانا پسند کریں گے۔'' کسی مہمان نے فرمائش کی تو مسٹر آرتھر ایشلے آ کر اس ٹرن ٹیبل کے پاس کھڑے ہو گئے جہاں یہ دونوں جواہرات رکھے ہوئے تھے۔

''ویل! آپ لوگوں کے سوال کے جواب میں...... مجھے کئی سال پیچھے جانا پڑے گا۔ اور آپ کو بتانا پڑے گا کہ ان پتھروں کے حصول کے لیے میں نے خود انتہائی دشوار گزار پہاڑوں میں پاپیادہ سفر کیے۔ موسم کی سختیاں اور نامہربان راستوں کے مشکل حالات سے لڑ کر میں نے ان پتھروں کو حاصل کیا تھا۔ پھر ان کو خام حالت سے اس شکل میں لانے تک کے مرحلوں کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے مجھے دنیا کے مختلف ملکوں میں بھٹکنا پڑا۔ تب کہیں جا کر یہ شاہکار تخلیق ہوئے ہیں۔'' وہ دبلا پتلا دراز قد شخص جس کی نیلی آنکھوں میں سرد مہری اور بے حسی کے علاوہ ایک ایسا تاثر تھا جیسے وہ اپنے سامنے ساری دنیا کو تحقیر آمیز سمجھتا ہو۔

سلطان کو نہ جانے کیوں یہ آنکھیں کچھ شناسا سی محسوس ہوئیں۔ وہ اس کے چشمے کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی ان آنکھوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا جو اس کے ذہن پر ثبت تھیں۔

''اس بندے کو پہلے میں نے کب اور کہاں دیکھا ہے؟ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا۔'' وہ گہری سوچوں میں گم یادداشت کھنگالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مہمانوں کی تالیوں کے شور نے اسے یادوں کے گنبد سے نکال لیا۔

اس نے دیکھا کہ تمام لوگ تحسین آمیز انداز میں اسے دیکھ کر داد دے رہے ہیں۔ اس سے مختلف سوالات کر رہے ہیں۔ وہ انہیں جوابات دے رہا ہے۔ ہوٹل کا فوٹوگرافر کھٹاکھٹ تصویریں لے رہا ہے اور صبیی ہر اینگل سے مووی بنانے میں سرگرداں ہے۔ وہ اس ماحول سے ایک لمحے کے لیے غائب ہو کر واپس تو آ گیا تھا لیکن اس کے ذہن میں اب بھی اس لمحے کا سرا پکڑنے کی جستجو جاری تھی۔ وہ اسی طرح الجھا ہوا سا شام چھ بجے تک مصروف رہا۔

کیونکہ نمائش کا وقت تین سے چھ بجے تک کا تھا۔
چھ بجے تک وہ تمام مہمانوں کو رخصت کر کے لابی میں آیا اور تھکان زدہ انداز میں کاؤچ پر کچھ ڈھیر سا ہو گیا۔ ایک لمبے کو آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا تو بہت بہتر محسوس ہوا۔
''ہیلو ہینڈسم! بہت تھک گئے ہو کیا؟'' اسے اپنے کان کے پاس ایک مترنم سی سرگوشی محسوس ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔
''ہاں، شاید۔'' وہ مسکرا دیا۔
''اوہ...... کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟'' صبی نے مخلصانہ لہجے میں پوچھا۔
''ہم م م م...... صبی! تم نے آج کافی تصویریں اور مووِیز بنائی ہیں۔ کیا ان میں سے کچھ...... میں دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''کیوں نہیں...... ضرور دیکھ سکتے ہو...... کیا ابھی؟'' اس نے پوچھا۔
''اگر تمہیں زحمت نہ ہو۔''
''اونہیں بھئی...... کوئی زحمت نہیں۔'' اس نے بیگ ٹیبل پر رکھا۔
''نہیں...... وہاں بیٹھتے ہیں۔'' سلطان نے لاؤنج کے دور افتادہ گوشے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں وہاں جا بیٹھے۔ صبی نے اپنا کیمرا لیپ ٹاپ سے اٹیچ کیا اور اپنی اسٹل فوٹوگرافی کے کمال اسے دکھانے لگی۔ وہ ایک پروفیشنل فوٹوگرافر تھی اور اس نے ہر جوئیل کی بڑی خوب صورت فوٹوگرافی کی ہوئی تھی۔
''بہت خوب صورت۔'' سلطان نے سراہا۔
''کون؟ میں؟'' صبی نے شرارت سے پوچھا۔
''تم بھی...... اور تمہارا یہ کام بھی۔'' سلطان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''آہ...... کہ خوشی سے مر نہ جاتے...... اگر اعتبار ہوتا۔''
''ڈرامانہیں، مووِیز دکھاؤ۔'' سلطان نے اسے ٹوکا۔
''اچھا۔ کوئی خاص مووی دیکھنی ہے یا سب دیکھنا ہیں۔''
''مسٹر آرتھر ایشلے کو دیکھنا اور سننا ہے۔''
''کوئی خاص بات؟''
''ہم م م م...... شاید خاص ہو یا شاید نہ ہو۔''
''پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔'' صبی نے تھوڑی دیر میں وہ مووی اسٹارٹ کر دی جس میں آرتھر ایشلے زین نبیل کے نزدیک کھڑا اپنے جوئیلری کلیکشن کے بارے میں بتا رہا تھا اور لوگوں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔
سلطان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ صبی نے اسے کئی اینگلز سے شوٹ کیا تھا جگہ جگہ اس کے چہرے کے کلوز اپ تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے سلطان کے چہرے پر سنگین سی سنجیدگی تھی۔
''یہاں اسے روکو ذرا۔'' سلطان نے ایک ایسی جگہ مووی کو رکوایا تھا جہاں اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسے بغور دیکھتا رہا پھر بڑبڑایا۔
''وہی...... بالکل وہی...... وہی ہے یہ ڈاکو لٹیرا۔''
اس کی بڑبڑاہٹ میں تلخی تھی۔ صبی نے چونک کر اسے دیکھا۔
''کون ڈاکو؟ کون لٹیرا؟ کس کو کہہ رہے ہو؟ اس میں تو صرف ایشلے ہے۔'' صبی نے اسکرین پر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''میں بھی اسی ایشلے کی بات کر رہا ہوں۔'' اس کے اندر کی تلخی غصے کی صورت جھلک رہی تھی۔
''کیا لوٹا ہے اس نے؟''
''یہ جو اس کے پاس قیمتی اور نادر روزگار جواہرات کا خزانہ ہے، یہ سب اس نے لوٹا ہے۔ دھوکے اور فریب سے۔ چند ٹکے خرچ کر کے یہ لاکھوں کروڑوں ڈالرز کی دولت لوٹ کر لے آیا ہے۔'' سلطان نے غصے سے کہا۔
''کہاں سے لایا ہے؟'' صبی حیران اور پریشان اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔
''میرے علاقے سے۔''
''اوہ! تمہارا علاقہ کیا...... بلکہ پورا پاکستان اور انڈیا ایک زمانے میں برٹش رولنگ میں تھا۔ فاتح مفتوح کی ہر چیز پر قابض ہو جاتے ہیں، ایشلے بھی برٹش ہے۔ اس کے باپ دادا وہاں سے لے آئے ہوں گے یہ جواہرات۔ اس پر تمہیں اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟'' صبی اس کے غصے پر حیران تھی۔
''نو وور...... باپ دادا نہیں...... یہ خود۔'' شاید غصے میں وہ کچھ زور سے چلایا تھا باقی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو صبی نے اسے تسلی دی۔
''کول مین کول! کیا ہو گیا ہے؟ ریلیکس۔''
''اوہ...... آئی ایم سوری...... میں شاید زیادہ تھک گیا

ہوں۔ اِف یو ڈونٹ مائنڈ...... میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے۔''صبیی نے سر ہلایا تو وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔

صبیی پُرخیال انداز میں اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ خود بھی واپسی کے لیے روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اس نے نیم وا نظروں سے اپنی بکریوں کو چرتے دیکھا اور مطمئن ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی انگلیاں رباب پر تھرکنے لگیں۔ آہستہ آہستہ لے تیز ہوتی رہی اور وہ بے خود سا ہو کر اپنے ہی چھیڑے ہوئے سُروں پر مدہوش سا ہوا تو ہونٹوں سے نغمہ بھی پھوٹ کر آبشار کی طرح بہنے لگا۔

وہ جذبات سے بھیگے سُروں میں لفظ گنگناتا رہا۔ گاتا رہا...... مست و مدہوش...... رباب سے سُر اور اس کے ہونٹوں سے نغمے پھوٹتے رہے۔ نہ جانے کب تک یہ سلسلہ چلتا رہا کہ اچانک ساز و آواز کا طلسم ٹوٹ گیا۔ کسی نے آہستہ سے اس کا کاندھا ہلایا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔

وہ کوئی گورا تھا۔ نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا...... جو اپنی پشت پر سیاحوں والا بڑا سا تھیلا لادے اور ہاتھ میں کیمرا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دریا خان کے لیے ایسے سیاحوں کی آمد کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کا علاقہ تھا ہی اس قدر خوب صورت کہ دنیا کے کونے کونے سے سیاح وہاں گھومنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ وہ گورا بھی ان میں سے ایک تھا۔

''کیا بات ہے صاب؟''دریا خان نے نرم سے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''توم سے بات کرنا مانگتا؟''اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

''بولو صاب۔''

''دو بات...... ایک، توم گاتا بہت اچھا ہے۔ دوسرا، میں ان پہاڑوں میں آگے جانا چاہتا ہوں۔ گھومنا چاہتا ہوں۔ دور تک...... لیکن کھونا نہیں چاہتا۔ اس لیے کیا توم میرے کو اس پہاڑی وادی کا سیر کرائے گا؟''گورے نے غور سے دریا خان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہ پہاڑ سارے ایک جیسے ہیں۔ جیسے یہ سامنے نظر آرہے ہیں، ایسے ہی دور تک بھی ہوں گے۔ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔''

''یہ میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں ان پہاڑوں اور وادیوں کو دور تک دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا آدمی میرے ساتھ ہو جو اس علاقے کو اچھی طرح جانتا ہو۔'' گورے نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''پر میں تو علاقے کے لوگوں کی بکریاں چراتا ہوں۔ اگر میں اُدھر چلا گیا تو میرا روزگار ختم ہو جائے گا۔ میرے بچے بھوک سے بے حال ہو جائیں گے۔''

''اس کی فکر نہ کرو...... میں تم کو پیسے دوں گا۔ آدھے پہلے...... آدھے واپس آنے کے بعد...... تمہارے بچوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''پر صاب......!''دریا خان کچھ ہچکچا رہا تھا۔

''دیکھو...... میں تم کو ہزار روپے ابھی دوں گا۔ جانے سے پہلے...... گھر میں دے دینا......''

''ہزار روپے......؟''دریا خان کے لہجے میں حیرتیں تھیں جس کا مطلب گورے نے کچھ اور لیا۔

''اوکے...... میں تمہیں دو ہزار روپے دیتا ہوں۔''دو ہزار کا سن کر دریا خان کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ اس نے ہزار کا نام سنا تھا کبھی ہزار...... اور وہ بھی دو ہزار روپے ایک ساتھ دیکھے نہیں تھے۔

دریا خان نے جلدی جلدی بکریوں کو جمع کیا اور اپنے گدھے کی رسی تھام کر گھر کی جانب چل پڑا۔ گورے کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا تو وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ ایک کچا مٹی سے بنا ہوا کمرا تھا جو گھر کے بیرونی حصے میں بنا ہوا تھا۔ چھپر کی چھت اور فرش پر ایک بوسیدہ سا پرانا قالین پڑا ہوا تھا۔

''صاب! ابھی شام ہو رہی ہے۔ تم اِدھر کمرے میں آرام کرو۔ ہم صبح صبح نکلیں گے اور پہاڑوں میں دور تک جائیں گے پھر شام کو واپس آجائیں گے۔''

''نہیں دریا خان! ہم شام کو واپس نہیں آئیں گے بلکہ میں ان پہاڑوں میں بہت دور تک جانا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہمیں کئی دن لگ جائیں۔''

''کئی دن؟ صاحب! دور اِن ویران پہاڑوں اور وادیوں میں ایسا کیا ہے جو آپ اتنی دور دراز کا سفر کرو گے۔ اور تم کو معلوم ہے کہ پہاڑوں میں سفر اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اونچے نیچے...... پتھریلے اور مشکل راستے...... انسان کی ہمت کو توڑ دیتے ہیں۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں پہاڑوں میں گھومنے کا عادی ہوں۔ یہ میرا شوق ہے۔'' تم یہ پیسے رکھ لو......

یہ دو ہزار تمہارے ہیں...... اور یہ ہزار روپے اور ہیں، اس سے تم راستے کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان خرید لینا۔''

''صاب! ادھر پہاڑوں اور وادیوں میں شکار ملتا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی ہو سکتا ہے ہمیں ضرورت ہو۔ اس لیے ضرورت کی چیزیں ساتھ ہی لے چلتے ہیں۔'' گورے کی بات سن کر اس نے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر میں دریا خان کا دس سالہ بیٹا ایک تھال میں کھانا لے آیا۔ ایک بڑے کٹورے میں گوشت کا سالن...... موٹی موٹی مکئی کی روٹیاں اور پیاز رکھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کھانا کھاتے رہے اور آئندہ سفر کا پروگرام بناتے رہے۔ پھر تازہ حقہ بھی آ گیا۔ وہ دونوں باری باری اس کے کش لگاتے رہے۔

''اچھا صاب! اب تم آرام سے ادھر سو جاؤ...... صبح ملاقات ہوگی۔'' دریا خان اٹھ کر چلا گیا اور دروازہ بھیڑ گیا۔

صبح دم ان کا سفر شروع ہو گیا۔ سرمئی دھند میں چھپے پہاڑوں کے پیچھے سے روشنی نمودار ہو چکی تھی اور سورج طلوع ہوا ہی چاہتا تھا۔ خودرو سبزے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو وادی میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول کا فسوں متاثر کن تھا۔

وہ ایک مبہم سی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ گورا حسبِ سابق اپنے بیگ پیک کے ساتھ اور دریا خان کندھے پر بندوق اور اس پر گرم چادر ڈالے اپنے گدھے کے ساتھ تھا جس پر اس نے ضرورت کا سامان بار کیا ہوا تھا۔ گورا جگہ جگہ رک کر تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اس نے دریا خان اور اس کے گدھے کی بھی کئی تصویریں لی تھیں۔ کیمرا پولورائیڈ تھا اس لیے فوراً ہی رزلٹ سامنے آ گیا تھا۔ پھر وہ دونوں گدھے کے مختلف پوز دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے۔ گورے نے ایک تصویر دریا خان کو بھی دی جس میں وہ تینوں موجود تھے اور اس نے شکریہ کہہ کر وہ تصویر سنبھال کر جیب میں رکھ لی۔

صبح سے دوپہر...... اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ وہ پہاڑوں میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ گورے نے کہیں کہیں رک کر راستے میں پڑے پتھر اٹھائے۔ ان کا بغور معائنہ کیا پھر پھینک دیے۔ صرف دو چار اس نے اپنی بے شمار جیبوں والی پینٹ کی ایک جیب میں ڈال لیے تھے۔

''صاب! پہاڑوں میں رات بہت جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی شام ہو چکی ہے۔ ہمیں رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کر لینا چاہیے۔ ورنہ اندھیرا ہو گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' دریا خان نے تیزی سے جھکتے سورج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، آؤ اس پہاڑ پر تھوڑا اوپر جا کر کوئی غار دیکھتے ہیں۔ کھلے میں سردی بھی ہوگی اور ہو سکتا ہے جانور بھی تنگ کریں۔''

وہ دونوں تھوڑی بلندی پر ایک چھوٹا سا غار تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ غار کے آگے چٹان کا ایک حصہ آگے کی طرف چھجے کی طرح نکلا ہوا تھا۔ انہوں نے قریبی جھاڑی کی شاخیں توڑ کر غار کی جھاڑ دلگائی۔ صفائی کی اور سامان اندر رکھ دیا۔ پھر اِدھر اُدھر سے لکڑیاں جمع کر کے آگے نکلے ہوئے چھجے پر آگ جلائی۔ دریا خان کے گدھے کو بھی اسی چھجے پر جگہ ملی۔ دریا خان نے اس کی رسی ایک پتھر سے باندھ دی تھی۔ کھانے اور چائے تمباکو سے فارغ ہو کر گورے نے اپنا سلیپنگ بیگ نکال کر غار میں پھیلایا۔

''دیکھو خان! ہم لوگ باری باری سوئیں گے۔ ابھی میں سو رہا ہوں۔ تم بارہ بجے مجھے جگا دینا...... پھر تم سو جانا ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

''وہ صاب! تھوڑی دیر ہم اپنا رباب بجا لے...... تھوڑی دیر بعد بند کر دوں گا۔'' گورا آہستگی سے ہنسا۔

''ضرور...... تمہارا جب تک جی چاہے رباب بجاؤ...... میرے پاس اس کا علاج ہے۔ یہ دیکھو یہ ربڑ کے ٹکڑے ہیں نا...... میں انہیں کانوں میں لگا کر آرام سے سو جاؤں گا۔ کوئی آواز مجھے پریشان نہیں کرے گی۔ تم شوق سے رباب بجاؤ......'' وہ ہنستے ہوئے کانوں میں ائر پیڈ لگا کر اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

☆☆☆

نمائش کا دوسرا دن تھا۔ آج کیونکہ ہر خاص و عام کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج رش زیادہ تھا۔ آج بھی کل کی طرح خاص خاص نوادر کے مالکان نے اپنے اپنے جویلز کے بارے میں مہمانوں سے بات کی۔ ان میں آرتھر ایشلے بھی تھا۔ اس کے تقریباً پندرہ جویلز میں سے وہ دو بے مثال تھے اور لوگوں کی توجہ کا خاص مرکز بھی تھے جن میں ایک نیلم میں بدھا اور زمرد میں جل پری کو کمالِ مہارت سے تراشا گیا تھا۔

مختلف مالکان اپنے بعض نوادر کو نیلامی کے لیے پیش

کرنے کا اعلان کر رہے تھے اور لوگ بے چینی سے منتظر تھے کہ شاید مسٹر ایشلے بھی اپنے ان خاص نوادرات کو نیلامی کے لیے پیش کریں۔

''میں فی الحال ان دونوں کو نیلامی کے لیے پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہاں باقی جویلو پیش کرتا جاتا ہوں۔ وہ بھی نہایت شاندار ہیں اور مجھے امید ہے کہ شوقین حضرات انہیں اچھی قیمت میں خرید کر...... اپنے قیمتی کلیکشن میں شاندار اضافہ کریں گے۔'' ایشلے جن لوگوں سے بات کر رہا تھا، وہ مختلف خریداروں کے ایجنٹ تھے۔

''مسٹر ایشلے! اس دفعہ نہیں...... تو کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اگلی مرتبہ آپ انہیں بھی نیلامی میں رکھیں گے؟'' ایک رائل فیملی کے ایجنٹ نے پوچھا۔

''ہو بھی سکتا ہے...... اور نہیں بھی...... دراصل ابھی میں نے اس بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے۔''

''تو سوچیے گا ضرور...... ہم اس وقت کا انتظار کریں گے۔ بہت بے چینی سے...... اور ہمیں امید ہے کہ آپ کو ان کی قیمت توقع سے کہیں زیادہ ہی ملے گی۔'' ایک معروف ٹینس چیمپئن کے ایجنٹ نے کہا تو ایشلے کے ہونٹوں پر آنے والی مدھم مسکراہٹ نے بتا دیا کہ وہ اپنے جویلو کے اس طرح بھاؤ بڑھنے پر خوش ہے۔ ورنہ اس کے پتھریلے سے چہرے پر مسکراہٹ شاذ و نادر ہی نمودار ہوتی تھی۔ اس کی سرد مہر نیلی آنکھیں اور پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں کی ساخت بتاتی تھی کہ وہ ایک بے حس، سرد مہر اور ظالم ہونے کی حد تک سخت مزاج انسان ہے۔

سلطان زیادہ وقت ہال میں ہی موجود تھا اور صبی نے محسوس کیا کہ اس کی توجہ کا مرکز ایشلے ہی تھا۔

''میں نے محسوس کیا کہ تم زیادہ وقت ایشلے کو ہی دیکھتے رہے...... اس کی ہر بات اور ہر حرکت پر تمہاری نظر تھی اور...... تمہاری نظروں میں اس کے لیے کچھ نفرت اور کچھ معاندانہ سی کیفیت تھی...... کیا بات ہے؟''

نمائش کا وقت ختم ہو چکا تھا اور وہ دونوں تھک کر لابی کے اس دور افتادہ گوشے میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ کافی اور کیک کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور سلطان کافی کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ پر نظریں جمائے سوچ و فکر میں غلطاں تھا۔ صبی کی بات سن کر اس نے سر اٹھایا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ اچانک مسکرایا۔

''کوئی بات نہیں مس صبا غزل! میں تو آج سارا وقت یہی سوچتا رہا کہ آپ کا نام کس قدر خوب صورت ہے...... صبا بھی اور غزل بھی۔ یعنی لے بھی ہے...... اور نغمہ بھی...... واہ...... میں تو یہ نام رکھنے والے کے ذوق کا قائل ہو گیا واہ...... واہ......'' سلطان نے اسے طرح دینے کی کوشش کی۔

''یہ نام میری دادی نے رکھا تھا۔ واہ واہ کر کے مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو اور نہ ہی جھوٹ بول کر تم اپنی جان چھڑا سکتے ہو۔ اس لیے میرے سوال کا سیدھا جواب دو۔'' صبی نے کچھ غصے سے اسے پھٹکارنے کی کوشش کی۔

''تمہارے اس سوال کا جواب اتنا سیدھا بھی نہیں ہے کہ میں تمہیں چند فقروں میں بتا سکوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس شخص کی کمینگی کی جڑیں میرے بچپن میں کہیں پیوست ہیں۔ آج کے ملینیئر ایشلے...... اور ایک بدحال لاطینیت ڈاکو ایشلے کے درمیان سالہا سال کا طویل عرصہ پھیلا ہوا ہے۔'' سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے صبی کی طرف دیکھا تو وہ الجھی ہوئی کیفیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں سب کچھ سننا چاہتی ہوں۔''

''لمبی کہانی ہے...... وقت لگے گا۔''

''میرے پاس بہت وقت ہے۔ میں آخری لفظ سننے تک یہاں اطمینان سے بیٹھی ہوں...... کہو۔'' صبی نے اپنا بیگ اور کیمرا ٹیبل پر رکھا اور خود اطمینان سے کرسی پر پھیل کر بیٹھ گئی۔

''او کے! میں کوشش کرتا ہوں کہ مناسب اور مختصر الفاظ میں تمہیں سب کچھ بتا سکوں لیکن میری ایک درخواست ہے کہ میری اس داستان کو کہانی بنا کر عام کرنے کی کوشش نہ کرنا...... پلیز۔'' سلطان نے سنجیدگی سے کہا تو صبی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جیسا کہ تم جانتی ہو کہ میرا تعلق پاکستان کے شمالی علاقوں سے ہے۔ ان علاقوں میں قدرت کی عطا کردہ بے انتہا خوب صورتی ہے لیکن انسانوں کی دی ہوئی بے انتہا غربت اور جہالت بھی ہے۔ میں ایک غریب چرواہے کا بیٹا ہوں جس گھر میں ہوش سنبھالا، وہ ایک چھوٹے سے دیہات کا مختصر اور کچا سا گھر تھا۔ ماں بیمار رہتی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی دھول مٹی سے اٹی گلیوں میں کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔

گھر میں کھانے کو ہی پورا نہیں ہوتا تھا تو دوا اور تعلیم کہاں سے ہوتی۔ میں بڑا تھا اور اپنے گھر اور حالات کو دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ پڑوس والے رحمان چاچا نے شہر سے آنے والے اپنے ایک رشتے دار کو

اپنا باہر والا کمرا کرائے پر دیا۔ انور خان ایک پڑھا لکھا اور نیک طینت آدمی تھا۔

ایک دن اماں نے میٹھے چاول بنائے تھے۔ میں رحمان چاچا کے گھر دینے گیا تو وہ سب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے وہ چاول انور خان کو دیے تو اس نے مجھے پاس بٹھالیا۔

رحمان چاچا تو اپنے بھائی کے گھر دوسرے گاؤں گئے ہیں۔ دو چار دن میں آجائیں گے۔ تم یہ چاول واپس لے جاؤ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں، واپس تو نہیں لے جاؤں گا...... چاچا نہیں ہیں تو کیا ہوا...... تم کھاؤ۔'' میں نے تھال اس کے سامنے رکھ دی۔

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مجھے بہت اچھا لگا۔

''نہیں، واپس لے جاؤں گا تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ لے آیا ہوں تو اب تم کو کھانا ہی پڑیں گے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''ٹھیک ہے...... میں کھاتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم بھی میرے ساتھ کھاؤ گے۔''

یوں ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہوا اور اس نے ہی مجھے یہ احساس دلایا کہ انسان کے لیے تعلیم کتنی اہم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا اور ایک وقت آیا کہ باقاعدہ شہر لے جاکر مجھے امتحان بھی دلوایا۔ میرا باپ بھی حسبِ توفیق میری مدد اور حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو خود پڑھنا سکھایا۔ یوں زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی۔''

''تو...... ان سب میں ایشلے کہاں ہے بھئی؟ جو تمہاری زندگی کا ولن ہے۔''صیبی کو اس کہانی میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔

''ہمارا علاقہ قراقرم رینج کی ذیلی شاخ پر کہیں آباد ہے۔ قدرتی مناظر اور پہاڑوں کی روایتی خوب صورتی سے آراستہ وادیاں انتہائی پُرکشش ہیں اس لیے وہاں سیاحوں کا آنا جانا رہتا ہے۔

ایک شام بابا بکریاں چرا کر واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی مہمان بھی تھا۔ وہ باہر مہمان خانے میں تھا جب میں کھانا لے کر وہاں گیا تو وہ غیر ملکی مہمان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔

اس کی باتوں سے میرا بابا پریشان ہو رہا تھا لیکن وہ گورا زبردستی پیچھے پڑا ہوا تھا۔ مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ اس وقت میں کھانے کا تھال لے کر اندر داخل ہوا۔

''یہ تو اچھا خاصا بڑا ہے۔ آرام سے کچھ دن بکریاں چرا لے گا۔'' میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا تو میں نے بھی غور سے اس کی نیلی، سرد مہر آنکھوں کو دیکھا۔ ان میں جو کمینگی اور مکاری کا اضافی تاثر تھا، اس نے میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا کی۔

''صاب! یہ پڑھتا ہے۔ چرواہی کرے گا تو پڑھے گا کس وقت...... اس کا تعلیم میں نقصان ہوگا۔'' بابا نے پھر کوشش کی۔

''ارے چند دنوں میں یہ کتنا لکھ پڑھ لے گا۔ تھوڑے دنوں میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ بس تم تیاری کرو۔ میں گاؤں سے کسی اور کو بھی لے سکتا تھا لیکن جس سے بھی بات کی، اس نے تمہارا ہی نام لیا کہ تم سے زیادہ ان پہاڑوں کو کوئی اور نہیں جانتا اس لیے تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔ پیسے اگر کم لگ رہے ہیں تو اور بڑھا دیتا ہوں...... بولو۔'' میں کم سنی کے باوجود سمجھ گیا کہ وہ اپنے کسی بڑے فائدے کے لیے...... بابا کو جانے پر مجبور کر رہا ہے۔

پھر بابا کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

''ٹھیک ہے صاب! پھر پیسے نہ بڑھاؤ...... گھر میں ایک نہیں، تین مہینے کا راشن ڈلوادو۔ تاکہ بچوں کو بھوکا نہ رہنا پڑے۔''

بابا کے بجھے ہوئے شکست خوردہ لہجے نے مجھے اور مشتعل کر دیا۔ میں نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک جھلسا دینے والی مسکراہٹ سرسرا رہی تھی۔ میں پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے شدت سے خواہش ہوئی کہ اس گورے کو دھکے مار کر گھر سے نکال دوں۔ اور گھر کیا...... اپنے علاقے سے ہی نکال باہر کروں۔ میں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ بابا باہر آئے گا تو میں اسے منع کردوں گا کہ وہ اس کے ساتھ پہاڑوں میں نہ جائے۔

''ماں!'' میں نے ماں کے بری طرح کھانسنے کی آواز سنی تو اندر دوڑا۔ وہ باورچی خانے میں تھی اور اسے بری طرح کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ وہ دوپٹا منہ پر رکھے کھانس کھانس کر دہری ہوئی جارہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ اور پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ بے حال ہو رہی تھی۔

چھوٹی بہن پانی کا کٹورا ہاتھ میں لیے اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی اور دونوں چھوٹے بھائی روہانسے

سے ماں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اور بہن نے بڑی مشکل سے ماں کو پانی پلایا اور سہارا دے کر پلنگ تک پہنچایا تاکہ وہ آرام سے لیٹ سکے۔ وہ نڈھال سی ہوگئی۔

''ماں! مجھے تھوڑے پیسے دو۔ میں حکیم سے تمہارے لیے دوا لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا تو ماں نے خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس وقت اپنی کم مائیگی کا احساس مجھے تڑپا گیا۔ میں نے ایک نظر خاموش لیٹی ماں پر ڈالی پھر چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھا جو کتابیں سامنے رکھے چٹائی پر اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی ضروریات، ان سب کی خوشیاں پیسوں سے وابستہ تھیں۔ ماں کی صحت یابی اور ہم بہن بھائیوں کا مستقبل پیسوں کا ہی مرہونِ منت تھا اور اس وقت پیسا صرف اس گورے کے پاس تھا جو بابا کو پہاڑوں میں لے جانا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بابا باہر آیا تو میں شدید خواہش کے باوجود اسے یہ نہیں کہہ سکا کہ ''بابا! پہاڑوں میں مت جاؤ اور اس گورے کو دھکے مار کر اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ اپنے علاقے سے بھی نکال باہر کرو۔''

سلطان کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کل کیونکہ جویلری کی نیلامی کا دن تھا اس لیے سیٹ اپ میں کچھ تبدیلیاں کرنی تھیں۔ سلطان کا اسی وقت وہاں پہنچنا لازمی تھا۔

''سوری مائی ڈیئر! میرا بلاوا ہے۔ فلور ہال میں کافی دیر تک مصروفیت رہے گی۔ باقی کہانی پھر کسی دن...... اوکے۔'' سلطان نے صبیحہ سے معذرت کی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

''دریا خان! اٹھو، صبح ہو گیا ہے۔ آگے چلنا ہے اٹھو۔'' گورے نے سوئے ہوئے دریا خان کو اٹھایا۔ وہ دونوں رات باری باری سوتے رہے تھے۔ آگ ابھی تک جل رہی تھی اور اس نے برتن میں چائے بنالی تھی۔ ان دونوں نے گھر سے لائی ہوئی میٹھی روٹی اور چائے کا ناشتا کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

''صاب! کچھ بتاؤ تو سہی، تم کون سے پہاڑ دیکھنا چاہتے ہو، شاید میں جانتا ہوں تو تمہیں سیدھا اُدھر ہی لے جاؤں۔''

دریا خان تمام دن اس کے ساتھ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد تھک گیا تھا۔ سورج جھک رہا تھا اور وہ رات گزارنے کے لیے پھر سے ایک نئی پناہ گاہ کے لیے بھٹک رہے تھے۔

گورے نے اس کی بات پر ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''دیکھو خان! لوگوں کو طرح طرح کے شوق ہوتے ہیں۔ کسی کو سکے جمع کرنے کا۔ کسی کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا کسی کو پرانے نوادرات جمع کرنے کا۔ اسی طرح مجھے پتھر جمع کرنے کا شوق ہے۔ اچھے، خوب صورت، رنگ دار پتھر...... اور تمہیں پتا ہے پتھر تو پہاڑوں میں ہی ملتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا میں سارے راستے پتھر اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا ہوں۔ سب عام سے ہی تھے۔ وہ خوب صورت، رنگ دار پتھر مجھے ابھی تک نہیں نظر آئے جن کا ذکر سن کر میں یہاں تک آیا ہوں۔'' گورے نے تفصیل سے بتایا۔

''کس رنگ کے پتھروں کی تلاش ہے تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بھئی، سنا ہے تمہارے علاقے میں نیلے اور سبز رنگ کے بڑے خوب صورت پتھر پائے جاتے ہیں۔ میں انہی کی تلاش میں ہوں لیکن ابھی تک تو نظر آئے نہیں۔'' گورے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھے اچکائے۔

''صاب! تمہیں پہلے بتانا تھا نا...... جدھر یہ نیلم اور زمرد ملتا ہے۔ وہ جگہ بہت دور ہے اور علاقہ بھی خطرناک ہے۔ اُدھر جانے کا راستہ بہت زیادہ چڑھائی اور بہت زیادہ اترائی کی وجہ سے خطرناک ہے پھر اُدھر بھیڑیے اور سانپ بھی ہیں۔ ان سے بچ جائیں تو اُدھر ایف سی والے...'' گورے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''یہ سب میں جانتا ہوں۔ اچھی چیزیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ ان کے لیے مشکلات تو اٹھانا پڑتی ہیں۔''

''تم نے مجھے یہ بات شروع میں نہیں بتائی ورنہ میں تمہارے ساتھ نہیں آتا۔ اتنا مشکل اور دشوار سفر...... اور جگہ جگہ جان کا خطرہ...... اگر کسی وجہ سے میں مارا گیا تو میرے بچوں کو کون پالے گا۔ دو ہزار روپے اور تھوڑا سا راشن...... اس میں میرے بچوں کی زندگی نہیں گزر سکتی صاب! میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' دریا خان نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔

''دیکھو خان! بات ہو چکی ہے۔ تم نے جو مانگا، وہ میں نے تمہیں دیا اس لیے اب تم اس بات کے پابند ہو کہ جہاں تک میں کہوں تم مجھے لے کر چلو۔''

''صاب! بات صرف پہاڑوں میں جانے کی ہوئی تھی۔ صرف گھومنے کے لیے۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم

غیر قانونی طریقے پر نیلم اور زمرد لینے کے لیے جانا چاہتے ہو...... اگر تم مجھے بتاتے تو میں کبھی ادھر آنے کی ہامی نہ بھرتا۔'' دریا خان نے اس کی بدنیتی کو اس کے سامنے کھول دیا۔

''اب تو آگئے ہو نا...... اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ واپسی کا مت سوچو...... اتنی دور آکر خالی ہاتھ واپس جانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن میں سوچ سکتا ہوں۔ تم چاہو تو آگے بڑھتے رہو...... کبھی نہ کبھی ان پہاڑوں تک پہنچ ہی جاؤ گے جہاں سے تمہیں وہ قیمتی پتھر مل جائیں لیکن میں تمہارے لیے اپنی جان نہیں گنوا سکتا۔''

''میں اپنے ساتھ ساتھ...... تمہاری حفاظت بھی کروں گا، تم کیوں ڈرتے ہو؟'' گورے نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا تو دریا خان چڑ سا گیا۔

''تم اپنی حفاظت کرلو یہی بہت ہے۔ میں مسلمان ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ میری حفاظت کرنے والا اللہ ہے اور نہ ہی میں ڈرپوک یا بزدل ہوں۔ تمہارا تو مجھے پتا نہیں صاب کہ آگے پیچھے کوئی ہے یا نہیں رونے والا لیکن میں مر گیا تو میرے پیچھے میرا خاندان تباہ و برباد ہوجائے گا۔ میں واپس جارہا ہوں۔'' اس نے گدھے کو رسی کھینچ کر موڑا اور مخالف سمت جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ ایک دھماکا ہوا اور گولی اس کے پیروں کے پاس کنکریاں اُڑاتی ہوئی نکل گئی۔

''رک جاؤ دریا خان! ورنہ دوسری گولی تمہیں اوپر پہنچا دے گی۔'' گورے کی حرکت اور لہجے نے ٹھنڈے مزاج والے دریا خان کو بھی مشتعل کردیا۔ اس نے غصے میں اپنے کندھے سے بندوق اتاری اور پلٹ کر گورے کا نشانہ لیا۔

''بزدل! ہم کو گولی سے ڈراتا ہے۔ ہمارے پاس بھی تیرے حصے کی گولی ہے۔'' اس نے گھوڑا چڑھایا تو گورا زور زور سے ہنسنے لگا۔

''میرے حصے کی گولی میرے پاس ہی ہے...... یہ دیکھو۔'' گورے نے ہتھیلی پر رکھ کر بندوق کی گولیاں اسے دکھائیں۔

''او خانہ خراب، تم نے ہماری بندوق کی گولیاں چوری کرلی ہیں۔'' دریا خان جزبز ہوگیا۔

''ہاں، ایسے ہی موقع سے بچنے کے لیے...... گولیاں میں نے چوری کرلی ہیں۔ واپس جاکر تمہیں لوٹا دوں گا اس لیے ضد نہ کرو۔ آگے چلو میرے ساتھ۔ میں اتنی دور سے اس لیے یہاں نہیں آیا ہوں کہ خالی ہاتھ واپس چلا جاؤں...... مجھے ہر صورت وہ پتھر حاصل کرنے ہیں۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا تو دریا خان ضبط کے باوجود اشتعالی کیفیت میں آگیا۔

''تم پتھروں کی خاطر ایک انسان کی جان لینا چاہتے ہو...... لعنت ہو تم پر...... تم کب تک میری نگرانی کروگے۔ تمہیں سوتا چھوڑ کر میں کسی وقت بھی خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ بھٹکتے رہنا ساری زندگی ان پہاڑوں میں، عمر گزر جائے گی باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا۔'' اس نے انتہائی غصے سے کہا۔

''ایسی کوئی کوشش کرنا بھی نہیں۔ میں نے یہ انتظام کرلیا ہے کہ تم اگر بھاگو گے تو تمہارے سو گز دور جاتے ہی میرے پاس گھنٹی بج جائے گی اور سو گز کے فاصلے سے تمہیں گولی ماردینا...... کون سا مشکل کام ہے اور ہاں تمہارے گدھے کے ساتھ بھی یہی انتظام کردیا ہے۔'' گورے نے اطمینان سے بتایا۔

''او خدائی خوار، مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہو۔'' دریا خان نے بے یقینی سے کہا۔

''آزما کر دیکھ لو، جاؤ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تم جاؤ، سو گز کے فاصلے کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' گورے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو دریا خان گدھے کی رسی پکڑ کر واپسی کے لیے چل پڑا۔ وہ زیرِ لب گورے کو بھلا برا کہتا جارہا تھا۔

''ہم کو پاگل سمجھتا ہے۔ اس کی بے وقوفی کی بات سنو، بولتا ہے گھنٹی بج جائے گی۔ جن قابو کیا ہوا ہے کیا جو اس کے کان میں گھنٹی بجا دے گا ہونہہ۔'' وہ بڑھتی ہوئی شام میں تیزی سے واپسی کے لیے پلٹ رہا تھا۔ کافی دور نکل آیا تھا کہ ایک دھماکا ہوا۔ پھر اس کے پیروں کے پاس سے کنکریاں اُڑیں اور وہ سکتے کی کیفیت میں آگیا۔ اسی وقت گورے کی آواز پہاڑوں میں گونجی۔

''واپس آجاؤ دریا خان! آگے بڑھے تو اگلی گولی تمہارے گدھے کو ماردوں گا...... پھر بھی نہ رکے تو اگلی باری تمہاری ہوگی۔ واپس آجاؤ۔''

دریا خان نے پلٹ کر دیکھا تو دور وہ گورا ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ ہاتھ میں عجیب سی ساخت کی بندوق پکڑے ہوئے ٹیلے پر کھڑا وہ اسے کسی بدروح، کسی شیطان جیسا نظر آیا۔ مایوسی کی ایک لہر اس نے اپنے رگ و پے میں اترتی محسوس کی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے د

مرے مرے قدموں سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ موجودہ صورتِ حال میں وہ نہ چاہنے کے باوجود اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے گورے سے کہا۔

''اوئے خانہ خراب! یہ کیا جادوگری کیا ہے تم نے۔ کیسے گھنٹی بج جاتا ہے؟''

''یہ جادوگری نہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا سائنسی کمال ہے۔ یہ میں نے لگایا تو اس لیے تھا کہ لمبے سفر میں ہم پہاڑوں میں بھٹک کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو میں تمہیں اور تمہارے گدھے کو ڈھونڈ سکوں۔ کیونکہ راستے بتانے والے تم ہو، تو گدھے پر ضرورت کا سارا سامان لدا ہوا ہے۔ اس لیے میں دونوں کو ساتھ لے کر اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ امید ہے بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب خاموشی سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' گورے نے اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہا تو دریا خان بے بس ہو گیا۔ اس نے کندھے سے چادر اور خالی بندوق اتار کر نیچے ڈالی اور قریب بہتے چھوٹے سے جھرنے کی طرف بڑھ گیا۔ گدھا بھی چارا اور پانی دیکھ کر اس کی طرف آگیا۔ وہ بڑی دیر تک چہرے پر پانی کے چھپاکے مار مار کے مایوسی کی اس گرد کو دھونے کی کوشش کرتا رہا جو اس کے وجود پر چھا گئی تھی پھر وہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

آج نمائش کا آخری دن تھا اور آج ہی عام نمائش کا وقت ختم ہونے کے بعد جواہرات کی نیلامی کا سیشن چلنے والا تھا۔ لہٰذا زیادہ تر ان لوگوں کا مجمع تھا جو اس نیلامی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جواہرات کے شوقین تمام وی آئی پیز کے لیے اعلیٰ نشستوں کا انتظام تھا اور ان کے ایجنٹ اِدھر اُدھر چکراتے پھر رہے تھے۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ سب سے زیادہ دلچسپی کس جوئیل میں لی جا رہی ہے اور ان کی قیمتیں کہاں سے شروع ہونے والی ہیں۔ ہال کی مشرقی دیوار پر ایک بڑی اسکرین لگی ہوئی تھی اور اس کے دائیں جانب ایک میز پر لیپ ٹاپ، کچھ ڈی وی ڈیز اور کچھ دوسری متعلقہ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہاں دو افراد ان کے ساتھ کچھ مصروف تھے۔

بائیں جانب روسٹرم اور اس پر مائیک لگا ہوا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ اور شوخ رنگوں کی ٹائی لگائے ہوئے ایک شخص وہاں نیلامی کا پروگرام شروع کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آج جو شخصیت سب سے پہلے نیلامی کے لیے اپنے جوئیلز پیش کر رہی ہے، وہ ہے مسز ہوبرٹ ونسلیٹ کی۔ آئیے مسز ونسلیٹ۔''

مسز ونسلیٹ نے اپنے کلیکشن میں سے جو چند نمونے نیلامی کے لیے پیش کیے اس میں 51 قیراط سے لے کر 129 قیراط تک کے چار عمدہ نمونے تھے ان میں نمایاں مارننگ اسٹار تھا۔ شیمپین کلر کا یہ خوب صورت ہیرا خوب صورتی میں لاجواب تھا۔ مسز ونسلیٹ نے جو نمونے نیلامی کے لیے پیش کیے تھے، ان کی تصاویر اسکرین پر دکھائی جا رہی تھیں۔ پورے ہال میں ایک مدھم سی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ ایجنٹس اپنے اپنے مالکوں کی طرف سے بولیاں لگا رہے تھے اور بولی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ سلسلہ بڑی دیر تک چلتا رہا۔ سب کو بڑی بے چینی سے مسٹر آرتھر ایشلے کا انتظار تھا کہ وہ کب ڈائس پر آتے ہیں اور اپنے جوئیلز کو نیلامی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ پچھلے تین دنوں سے 'بدھا' اور 'مرمیڈ' کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کو ان سے کچھ ایسی محبت سی ہو گئی تھی کہ وہ ان کے نیلامی میں آنے کے وقت کے لیے بہت بے قرار تھے۔

آخر کار مسٹر ایشلے آئے اور انہوں نے یہ اعلان کر کے لوگوں کو کسی حد تک مایوس کر دیا کہ ابھی 'بدھا' اور 'مرمیڈ' کے چھوٹے بہن بھائیوں کو آپ سب کے سامنے پیش کر رہا ہوں لیکن یہ وعدہ ہے کہ مناسب وقت آنے پر وہ دونوں شاہکار بھی یقیناً آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کروں گا۔

لوگوں نے بے دلی سے اب دوسرے جوئیلز کی بولیاں لگائیں اور ان پانچ میں سے صرف ایک دل کی شکل کا نیلم ہی فروخت ہو سکا۔ وہ بھی اس لیے کہ ٹائی ٹینک فلم کے حوالے سے وہ ایک رومانویت کی علامت سمجھا جا رہا تھا۔ فلم کی ہیروئن، شاہی خاندان کی ایک شہزادی نے یہ نیلم کا دل کی شکل کا لاکٹ پہنا تھا جو ایک غریب لڑکے کی محبت میں جان سے گزر گئی تھی۔

لوگوں کے پُرزور اصرار پر نمائش اور نیلامی کے لیے ایک دن اور بڑھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ ابھی سلطان کو فرصت نہیں ہوئی تھی۔ نمائش کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی اس کو فرصت کے لمحات کم ہی مل پا رہے تھے۔ کیونکہ بعض مہمان اور جواہرات کے مالکان جو باہر سے آئے تھے ان کی کچھ تعداد خود اسی ہوٹل کے رائل سوئٹس اور کمروں میں رہائش پذیر تھی۔ انہیں خاص پروٹوکول دینا اور خاص خدمات فراہم کرنا بھی سلطان کی ذمے داریوں میں سے ایک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ڈیوٹی آورز ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی

سلسلے میں مصروف رہتا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے استفسار ہوا۔

''منیجر بِدروم سروس سر!''

''کم اِن۔'' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایک لمحے کو رک کر ویٹر کو اندر آنے کا موقع دیا جو ایک ٹرالی میں ناؤنوش کے لوازمات سجائے اس کے ساتھ آیا تھا۔

''مسٹر ایشلے! اِٹس سم تھنگ اسپیشل فار یو سر۔'' اس نے ٹرالی پر رکھی ہوئی ایک خاص الخاص شیمپین کی بڑی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ایشلے کی سرد مہر اور منجمد آنکھوں میں خوشی کا بڑا واضح تاثر آیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ شراب کا شوقین تھا۔

''ویل مسٹر سلطان! تمہیں میرے شوق کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہے شاید۔ اچھی شراب میری کمزوری ہے اور تم جو چیز لے کر آئے ہو وہ تو بہت ہی کم کم ملتی ہے۔ کہو اپنے ویٹر سے...... ایک اچھا سا گلاس بنا کر دے مجھے...... اس کو سامنے دیکھ کر صبر کرنا ذرا مشکل لگ رہا ہے۔''

''سر! میں آپ کو خود اپنے ہاتھ سے بنا کر دوں گا۔''

سلطان نے ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا اور ٹرالی اپنی جانب گھسیٹ کر اس کے لیے جام تیار کرنے لگا۔

''یار! اِدھر آکر میرے پاس بیٹھو اور پینے میں بھی میرا ساتھ دو...... تو مزہ دوبالا ہو جائے گا۔'' ایشلے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سلطان کو بھی پینے کی دعوت دی۔ سلطان نے اگرچہ کبھی شراب کو چکھا تک نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے مذہب کی رُو سے اس کے حرام ہونے کے حکم کو جانتا تھا لیکن اس معاشرے میں شراب کی دعوت کو ٹھکرانا بدتہذیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا اس لیے اس نے بھی مسکراتے ہوئے ہامی بھری۔

''شیور...... مائی آنر سر۔'' پھر اس نے دو پیگ تیار کیے۔ خوب صورت آئس بکس سے آئس کیوبز نکال کر ڈالے...... ایک بڑے سلیقے سے ایشلے کو پیش کیا اور دوسرا خود ہاتھ میں اٹھالیا۔ ایشلے نے ارغوانی شراب سے بھرے ہوئے جام کو ہاتھ میں اوپر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ کرسٹل کے جگمگاتے گلاس میں سے جھلکتا سرخ رنگ اور اس میں تیرتے ہوئے دل کی شکل کے آئس کیوبز۔

''واہ...... واہ...... کیا خوب چیز لائے ہو مسٹر سلطان! آئی لو اِٹ۔'' اس نے کہتے ہوئے بے صبری سے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ کچھ دیر اس کے ذائقے کو محسوس کیا۔ تعریفی انداز میں سر ہلایا اور سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر سلطان کو تحسین پیش کی اور تھوڑی ہی دیر میں گلاس خالی کر دیا۔ جیسے ہی اس نے گلاس نیچے رکھا، سلطان نے مستعدی سے اسے دوبارہ بھر دیا۔ آئس کیوبز ڈال کر دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

یہ سلسلہ چلتا رہا اور سلطان اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ تین چار جام پینے کے بعد ایشلے پر اس کا نشہ طاری ہونے لگا۔ سلطان اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے شراب کو دوآتشہ...... بلکہ سہ آتشہ بنا کر ایک خاص مقصد کے تحت ایشلے کو پلایا تھا۔

''ہے مسٹر سلطان! تم کیوں نہیں پی رہے ہو؟ تمہارا گلاس ابھی تک بھرا ہوا ہے؟'' ایشلے نے لہراتے ہوئے انگلی سے سلطان کے گلاس کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک جوں کا توں بھرا ہوا تھا۔

''اوہ...... یس...... مسٹر ایشلے! دراصل میری ساری توجہ آپ کی خدمت کی طرف تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بہت خاص شراب سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ آپ لیجیے...... میں بھی لیتا ہوں۔'' سلطان نے اسے نیا بھرا ہوا گلاس پیش کیا اور اپنا گلاس بھی ہاتھ میں اٹھالیا۔ پھر ایشلے کی نظر بچا کر اس کی تھوڑی سی مقدار ساتھ رکھے ہوئے گملے میں انڈیلی اور ایشلے کو دکھانے کے لیے اسے منہ سے لگا کر بغیر گھونٹ لیے واپس رکھ دیا۔

پھر اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی اور اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ ایشلے اب پوری ترنگ میں آگیا تھا اور بے خودی میں کچھ گنگنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلطان نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے بات چھیڑی۔

''سر! نمائش میں آنے والے تمام مہمانوں کو آپ کے جویلو بہت ہی زیادہ پسند آئے۔ خاص طور پر 'بدھا' اور 'مرمیڈ' نے تو جیسے پورا میلہ ہی لوٹ لیا ہے۔ ان کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔''

''ہا، ہا، ہا......'' ایشلے زور سے خمار آلود ہنسی ہنسا۔

''ان کا کوئی جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ مجھے آرام سے نہیں مل گئے تھے۔ سالوں کی خواری کے بعد یہ شاہکار میں نے خود تخلیق کیے ہیں۔''

''ریئلی سر! ان بلیویبل...... یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے اور پھر اتنا بے داغ اور قیمتی پتھر حاصل کرنا پھر اس میں ڈیزائن تخلیق کرنا...... یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ آپ

نے یہ سب کیسے کیا؟'' سلطان نے تجسس آمیز جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایشلے نے ہمیشہ مشکل ترین کام ہی کیے ہیں۔ آسان کام اسے بھاتے ہی نہیں ہیں۔ جانتے ہو ان پتھروں کو حاصل کرنے کے لیے میں نے پہاڑوں میں پیدل سفر کیے ہیں۔ پندرہ پندرہ دن...... مہینے مہینے...... میں پیدل چل چل کر ان پتھروں کو تلاش کرتا رہا اور پیدل اس لیے چلنا پڑا کہ اونچے اونچے پہاڑی سلسلوں میں نہ تو کوئی سڑک ہوتی ہے کہ آدمی جیپ پر چلا جائے۔ نہ ہی کوئی ہموار راستہ ہوتا ہے کہ گھوڑے پر سفر کر سکے۔ اس لیے ان اونچے نیچے دشوار گزار راستوں پر پیدل سفر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔'' ایشلے نے جذباتی انداز میں کہا۔

''اوہ! آپ بہت باہمت ہیں سر! غالباً یہ پتھر آپ نے میکسیکو کے پہاڑوں سے حاصل کیے ہوں گے۔ زیادہ تر جویلز وہیں سے حاصل کیے گئے ہیں۔'' سلطان نے اس کو باتوں میں گھیرا۔

''اوہ نو...... نو...... نو سلطان! میکسیکو کے پہاڑوں میں کیا رکھا ہے۔ وہاں سے اس معیار کا کوئی پتھر اب نہیں ملتا...... یہ تو میں نے پاکستان سے حاصل کیے تھے۔'' نشے نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور اس کی آواز بہک رہی تھی۔

''جانتے ہو...... پاکستان میں جو قراقرم رینج کے پہاڑ ہیں نا...... ان میں یہ قیمتی پتھر...... عام پتھروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی اُدھر جاتا ہی نہیں اور اگر کوئی جائے...... تو اسے کوئی پوچھتا نہیں۔ بس ہمت کر وان دشوار گزار راستوں پر جانے کی اور جتنے مرضی سمیٹ کر لے آؤ۔ بس لڑنا پڑتا ہے تو سخت موسم سے...... جنگلی جانوروں اور سانپوں سے...... اور وہاں منڈلانے والے چوروں اور ڈاکوؤں سے...... اور...... کوئی مشکل نہیں۔'' وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا پھر جام ہونٹوں سے لگا لیا۔

''اوہ، آپ وہاں اکیلے گئے تھے سر!'' سلطان نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''ہم م م...... اکیلا ہی سمجھو...... میں وہاں کے ایک مقامی آدمی کو بطور گائیڈ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اور اس کا گدھا۔ دونوں میرے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔ وہ مجھے راستہ بتاتا تھا اور اس کا گدھا میرا سامان اٹھاتا تھا۔ ہم لوگ کوئی چھ سات دن سفر کر کے ان پہاڑوں میں پہنچے تھے۔ جہاں سے میں نے یہ پتھر حاصل کیے تھے۔ پھر اتنا ہی وقت ہمیں واپسی میں لگا۔ مگر دیکھو! سالوں پہلے کی وہ مشکلات اٹھانے کا صلہ کتنا خوب صورت ملا ہے مجھے...... آج میں ملینز آف ڈالرز کے ان نوادرات کا مالک ہوں۔'' ایشلے نے طمانیت کے احساس میں ڈوب کر کہا۔

''یو آر رائٹ سر! آپ نے بہت مشکلیں اٹھا کر یہ دولت حاصل کی ہے۔ میں آپ کی ہمت کا قائل ہو گیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ ساتھ وہ گدھے والا بھی امیر ہو گیا ہوگا۔ وہ بھی تو وہاں سے قیمتی پتھر اٹھا کر لایا ہو گا؟'' سلطان نے تھوڑا ہنس کر پوچھا۔

''اوہ نو! کیا بات کر رہے ہو؟ وہ لوگ جو وہاں دولت کے ان پہاڑوں کے دامن میں بیٹھے ہیں، بہت بڑے ڈفر ہیں۔ اس گدھے والے کو دولت سمیٹنے سے زیادہ اپنے گھر...... اپنے بچوں کی فکر تھی۔ میں نے اسے جو تھوڑے سے پیسے دیے...... وہ اسی میں خوش تھا۔ یہاں تک کہ واپس پہنچنے پر میں جو پتھر سمیٹ کر لایا تھا' ان میں جو زرا کم کوالٹی کے تھے' وہ میں نے اس کو دے دیے تھے کہ وہ ان کو پردیس کروا کے بیچ دے گا تو کچھ پیسے اسے بھی مل جائیں گے اور میرے پاس ویسے بھی وزن کافی زیادہ ہو رہا تھا۔ سفر کے دوران مشکل ہوتی تھی۔'' پر جانتے ہو، اس بے وقوف نے کیا کیا؟ اس نے وہ پتھر اٹھا کر اپنے بچوں کو کھیلنے کے لیے دے دیے۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''اچھا! لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اسے دولت نہیں چاہیے تھی؟'' سلطان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہم م م م، ایسا تو نہیں تھا شاید...... کیونکہ وہ غریب آدمی تھا۔ پیسا تو اسے چاہیے تھا لیکن اس کی آئیڈیالوجی بڑی عجیب و غریب تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے یہ پتھر وہاں سے چوری کیے ہیں۔ اس کے اور اس کے بچوں کے لیے چوری کا مال حلال نہیں تھا۔ اس لیے یہ قیمتی پتھر اس کے لیے بیکار تھے...... صرف معمولی پتھر۔'' ایشلے نے تبصرہ کیا۔

''بہت ہی ناسمجھ انسان تھا۔'' سلطان نے آہستگی سے کہتے ہوئے ایشلے کا گلاس پھر بھر دیا۔

''ہم م م، ناسمجھ تو تھا لیکن تھا بہت اچھا انسان۔ بہت ہی باذوق...... کوئی بہت عجیب سا ساز بجاتا تھا اور گاتا بھی بہت اچھا تھا۔ اکثر خاموشی اور تنہائی میں اس کا وہ ساز اور نغمہ پہاڑوں میں گونجتا تو واقعی میرے جیسے آدمی کا دل بھی جھوم جاتا تھا۔ میرے جیسا آدمی...... مطلب میوزک کو

بالکل نہ سمجھنے والا۔'' ایشلے مسکرایا۔

''کوئی خاص نغمہ گاتا تھا وہ...... یا کچھ بھی گاتا رہتا تھا؟'' سلطان نے تجسس سے پوچھا۔

''کئی گیت گاتا تھا لیکن جب زیادہ موڈ میں ہوتا اور اپنی دنیا میں کھو جاتا تو ایک ہی گیت...... بڑا ڈوب کر گاتا تھا۔ مجھے اس کے زیادہ الفاظ تو یاد نہیں ہیں لیکن اس میں ایک لفظ جو وہ بار بار کہتا تھا...... وہ مجھے آج بھی یاد ہے...... وہ کچھ اس طرح کا تھا۔

ی راکسم...... می راکسم...... باقی مجھے یاد نہیں رہا۔''

''اوہ! آپ کو اس کا نام یاد ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ادھر سارے لوگ 'کھان' ہوتے ہیں۔ وہ بھی کوئی 'کھان' تھا۔'' ایشلے نے بے پروائی سے کہا۔

''وہاں سے آپ نے خام شکل میں وہ پتھر لیے پھر اس کی کٹنگ اور پالشنگ وغیرہ کہاں ہوئی؟'' سلطان نے سوال کیا۔

''انڈیا میں...... حالانکہ میں بیلجیم اور اٹلی بھی گیا۔ فرانس بھی دیکھا۔ لیکن وہاں کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا اور بہت مہنگا بھی۔ پھر کسی نے انڈیا کا بتایا اور وہاں میری پسند کے مطابق...... نہایت کم پیسوں میں یہ شاندار کام ہو گیا۔ اب میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میرے یہ بے مثال...... نہایت قیمتی جوئیلو...... میرے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ 'ایشیلو بدھا' اور 'ایشیلو مرمیڈ' ہے نا فخر کی بات؟'' ایشلے نے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''واقعی...... آپ نے شہرت اور دولت دونوں چیزیں حاصل کر لیں۔ چوری کر کے...... اب آپ کا نام بھی نوابوں، شہزادوں اور کروڑپتی...... ارب پتی لوگوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ جو کئی نسلوں سے پیسا اور دولت جمع کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں۔ واہ مسٹر ایشلے! آپ تھوڑی زیادہ محنت کے ساتھ چوری کر کے ایک ہی جست میں ان کے برابر آ گئے، واہ، واہ۔'' سلطان کے طنزیہ لہجے کو تو وہ اپنے نشے کی وجہ سے سمجھ نہ سکا لیکن اس کی تحسین کو حقیقت سمجھ کر خوش ہوا۔

''اوہ...... بدمعاش!'' اس نے انگلی اٹھا کر جھومتے ہوئے کہا اور صوفے پر لڑھک گیا۔

سلطان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جن نظروں سے ایشلے کو دیکھا، ان میں کتنی نفرت تھی اگر وہ ہوش میں ہوتا تو دیکھ کر حیران ضرور ہوتا۔ سلطان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا جس پر پچھلے چالیس منٹ کی ویڈیو ریکارڈ ہوئی تھی۔ اسے آف کر کے واپس جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

رات گہری اور اندھیری تھی۔ سامنے جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کا انعکاس بس تھوڑی دور تک روشنی دے رہا تھا اور اس کے پیچھے گہرے گھپ اندھیرے کی چادر تھی جس نے ہر چیز کو اپنی سیاہی میں چھپا رکھا تھا۔

آج وہ دن بھر جن راستوں پر سفر کرتے رہے، وہ انتہائی دشوار گزار تھے۔ اونچے نیچے ٹیلے اور ہر طرف پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے کنکر پتھر...... کئی جگہ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب آگے جانا ناممکن ہے۔ راستہ ہی نہیں ہے۔ کوئی بڑا پتھر...... کوئی چھوٹی سی چٹان راستہ روکے کھڑی تھی لیکن یہاں دریا خان نے آفرین پیش کی گورے کو کہ جس نے کبھی ایک چھوٹی کدال نما اوزار کی مدد سے اور کبھی بارود کی اسٹک سے آگے بڑھنے کا راستہ بنا ہی لیا۔ ایک چھوٹا سا دھماکا اس پتھر یا چٹان کو اس حد تک توڑ دیتا تھا کہ ان کے نکلنے کا راستہ بن جاتا تھا۔

ایشلی خان! آفرین ہے تم پر...... راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹا کر آگے بڑھنے کی راہ بنا لیتے ہو، تمہاری پیٹھ پر جو تھیلا ہے' وہ جادو کا پٹارا ہے۔ اس میں سے ہر کام کی چیز نکل آتی ہے۔'' دریا خان نے کہا۔

''ہم م م، میں پہاڑوں میں سفر کرتا رہتا ہوں۔ معلوم ہے کہ یہاں مجھے سفر کے دوران کن کن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اس لیے میں ساتھ لے کر آیا تھا۔'' گورے نے بے پروائی سے کہا۔

تمام دن کے اس صبر آزما سفر کے بعد وہ تینوں بری طرح تھک چکے تھے اور سفر میں فاصلہ بھی بہت کم طے ہوا تھا لیکن تھکن نے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ سر شام ہی محفوظ ٹھکانا تلاش کر کے ڈھیر ہو گئے۔ دریا خان نے آگ جلانے کے لیے لکڑیاں بھی بمشکل جمع کیں۔ آگ جلانا بے حد ضروری تھا۔ کیونکہ ایک تو رات میں سردی میں اضافہ ہو گیا تھا، دوسرے وہ خطرناک علاقہ شروع ہو گیا تھا جہاں بھیڑیوں اور سانپوں کے علاوہ چھوٹے تیندوے بھی پائے جاتے تھے۔ جو بھوک سے بے تاب ہو کر کسی بھی جاندار پر حملہ کر سکتے تھے۔ ان سے بچنے کا واحد طریقہ آگ ہی تھی۔ کیونکہ وہ آگ کے نزدیک نہیں آتے تھے۔

اس وقت جاگنے کی باری دریا خان کی تھی۔ گورا اپنے سلیپنگ بیگ میں گھسا بے خبر سو رہا تھا۔ وہ رباب پر نئے نغمے بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسمانی تھکن نے اس پر نیند اور اضمحلال سا طاری کر رکھا تھا اسی وجہ سے وہ اس دل پسند مشغلے میں یکسوئی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

اسی دوران ایک لمحے کو اس نے رباب بند کیا تو اپنے قریب ہی ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے کہیں سے کچھ کنکریاں پتھر پر گری ہیں۔ یقیناً آس پاس کوئی ہے جس کی حرکت کے سبب یہ آواز پیدا ہوائی ہے۔ اس نے رباب ایک طرف رکھا اور آگ میں کچھ لکڑیاں اور ڈال دیں تاکہ مدھم ہو جانے والی آگ...... تیز ہو کر جلنے لگے پھر آگ کے پار غور سے گھپ اندھیرے میں نظریں جما کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد اسے کچھ نظر آیا تو وہ کچھ خوف زدہ ہو کر بڑبڑایا کیونکہ اندھیرے میں اسے کچھ چمکتی سی چیزیں نظر آئی تھیں۔

''او میرے خدایا! یہ تو بھیڑیوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ بہت قریب آ گئے ہیں خانہ خراب...... اندھیرے میں کم از کم چار آنکھیں چمکتی نظر آ رہی ہیں۔ ابھی کیا کروں میں؟'' غیر اختیاری طور پر اس کا ہاتھ اپنی بندوق پر لپک کر گیا۔ اسے ہاتھ میں اٹھا کر گھوڑا چڑھانے لگا تو اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔

''اوئے...... یہ بندوق تو بیکار ہے۔ اس خانہ خراب نے ہماری ساری گولیاں چرا کر اپنے ہاتھ میں رکھ لی ہیں۔ ابھی کیا کرے؟''

''ایشلی خان! اوئے گورا خان! اٹھو، بھیڑیوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ خطرہ ہے...... بہت بڑا خطرہ۔''

دریا خان زور زور سے چلا رہا تھا تاکہ غار میں سویا ہوا گورا جاگ جائے۔ وہ خود غار کے دہانے پر بیٹھا جلتی ہوئی لکڑیوں کو پھیلا رہا تھا۔ تاکہ ذرا سی بھی جگہ پا کر بھیڑیے اندر نہ آ جائیں۔ ورنہ ان دونوں کی خیر نہیں۔ ایک لمحہ نہیں لگے گا انہیں تکا بوٹی کرنے میں۔

''اوئے مُردے کا بچہ! اٹھو......'' دوسری آہٹ پا کر وہ زور سے چلایا۔ کیونکہ آواز نزدیک سے آئی تھی اور اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ بھوکے بھیڑیوں کا گروہ ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ اسے چلاتے ہوئے یاد آیا کہ گورے کے کانوں میں تو ایئر پیڈ لگے ہوئے ہیں وہ کیسے سنے گا۔

''اوئے بیڑا غرق۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ گورے کو ہلائے۔ اسے بیدار کر کے خطرے سے آگاہ کرے مگر اسی وقت اوپر سے ایک جسیم بھیڑیے نے پُرشور آواز کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں ایک لمحہ پہلے دریا خان بیٹھا تھا۔ اس نے بھی خوف زدہ ہو کر ایک جست بھری اور سوئے ہوئے گورے کی پشت کی جانب پہنچ گیا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ وہ غار بھیانک آوازوں سے گونج اٹھا۔

گورے نے بیدار ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے اپنی وہ خوف ناک گن نکال کر فائر کیا اور اپنی جانب چھلانگ لگاتے ہوئے بھیڑیے کی پیشانی پر گولی ماردی۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ بھیڑیے کی خوف ناک غراہٹیں بلند ہوئیں اور وہ جو چھلانگ لگانے کے لیے فضا میں بلند ہو چکا تھا، گولی کھاتے ہی دھپ سے وہیں گر پڑا۔ اس کے نکوستے ہوئے نکیلے اور ہیبت ناک دانت ویسے ہی کھلے رہ گئے۔

اسی لمحے دوسرا بھیڑیا جو شاید اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس نے بھی ٹھیک اسی جگہ چھلانگ لگائی تھی لیکن فائر کے دھماکے کی آواز سن کر بدحواسی میں واپس پلٹ پڑا تھا۔ اگرچہ گورے نے اس پر بھی فائر کیا لیکن اس سے پہلے ہی وہ باہر چھلانگ لگا چکا تھا۔

''بچ گئے...... خدائے خیر، شکر ہے۔'' دریا خان نے دہشت سے رکا ہوا سانس کھینچا۔

''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' گورے نے تھوڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کتنے آواز دیے تم کو...... لیکن تم تو مردہ بنے سو رہے تھے۔ ابھی تم کو جھنجوڑنے کے لیے میں اِدھر آیا تھا کہ بھیڑیے نے چھلانگ لگا دی۔ پناہ بخدا!! اتنا بڑا بھیڑیا تو ہم نے بھی زندگی میں پہلی بار ہی دیکھا ہے۔ اگر ہم کو اٹھنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو تم سوتے رہ جاتے اور یہ خانہ خراب ہم کو ہضم کرنے کے بعد تمہارے کو بھی کھا جاتے۔'' دریا خان نے اسے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ! یہ تمہارے رباب کی وجہ سے میں کان بند کر کے سوتا ہوں۔ آج سے تم رباب نہیں بجاؤ گے اور میں کان کھلے رکھوں گا تاکہ کوئی خطرہ ہو تو مقابلہ تو کر سکوں۔'' گورے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اس کی وجہ میرا رباب نہیں بلکہ تمہاری کمینگی ہے۔ اگر تم نے میری بندوق کی گولیاں غائب نہ کی ہوتیں تو میں بھیڑیوں کے رحم و کرم پر نہ ہوتا۔ پہلی آہٹ سنتے ہی فائر کرتا، سب بھاگ جاتے۔'' دریا خان نے اسے شرمندہ

کرنے کی کوشش کی۔

''گولیاں تمہارے پاس ہوتیں..... تو تم پہلے ہی بھاگ جاتے۔ مجھے مار کے۔ یہاں تک آنے کی نوبت ہی کہاں آتی۔ خیر چھوڑو، چلو اس بھیڑیے کی لاش کو باہر پھینکیں..... یہاں پڑا رہے گا تو ہم سو نہیں سکیں گے۔'' گورے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی اندھیرا ہے، باہر پتا نہیں اس جیسے کتنے اور ہوں گے۔ روشنی ہونے دو پھر پھینک دیں گے۔ اب تم بیٹھ کر چوکیداری کرو کیونکہ بندوق تمہارے پاس ہے، میں سوتا ہوں۔'' یہ کہہ کر دریا خان اس کے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

''لیکن..... ابھی تو..... بہت رات باقی.....'' گورے نے ہڑبڑا کر کچھ کہنا چاہا۔

''شب بخیر۔'' دریا خان نے ہاتھ ہلایا اور سر بھی اندر گھسا لیا کیونکہ سردی بڑھ گئی تھی۔

اس وقت دریا خان کا گدھا جو شاید بھیڑیوں سے اور اس ہنگامے سے دہشت زدہ ہو کر ایک کونے میں سکڑ گیا تھا اب خطرہ ٹل جانے کے احساسِ طمانیت کا اظہار اپنی اونچی اونچی ڈھینچوں کی آوازوں سے کرنے لگا۔ دریا خان نے منہ باہر نکال کر اسے ڈانٹا۔

''چپ کر خنزیر کا بچہ۔'' اس نے جھنجلا کر اپنا بھاری جوتا اسے پھینک کر مارا تو وہ بے چارہ خاموش ہو کر کونے میں دبک گیا۔ گورا ان دونوں کو دیکھ کر مسکرایا اور آگ کے الاؤ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

''ماں نے صبح صبح اٹھ کر بابا کو راستے کے لیے میٹھی روٹیاں..... اچار اور پراٹھے بنا کر دے دیے۔ بابا رحمان چاچا کی دکان سے کافی ساری چائے کی پتی، خشک دودھ، چینی اور نمک وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ اسی سامان میں کچھ درد دور کرنے والی گولیاں اور زخم پر لگانے والا مرہم اور پٹیاں بھی تھیں۔ بابا نے یہ سارا سامان اور پانی کی دو چار بڑی بوتلیں بھی گدھے پر لاد دیں..... پھر مجھے قریب بلایا۔

''دیکھو سلطان خان! ہم ابھی کئی دن کے لیے پہاڑوں میں جا رہے ہیں۔ واپسی میں پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں۔ ہمارے پیچھے ساری ذمے داری تمہاری ہے۔ رحمان بھائی آج کسی وقت آٹے کی بوری اور تین مہینے کا راشن کا سامان گھر بھجوا دے گا۔ تم خیال رکھنا اور بکریاں بھی تم کو چرانے کے لیے جانا ہے۔''

بابا نے ہم بہن بھائیوں کو پاس بلا کر پیار کیا اور گدھے کو ہانکتا ہوا چلا گیا۔ گورا بھی اپنی بہت ساری جیبوں والی پینٹ پہنے اور پیٹھ پر اپنا بڑا سا میلا سا تھیلا اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بابا کے کندھے پر اس کا رباب بھی تھا۔

مجھے پتا تھا کہ وہ اپنے رباب کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ نہ صرف رباب بہت اچھا بجاتا تھا بلکہ گاتا بھی بہت اچھا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ہمیں کھانا نہیں ملتا۔ کچھ ہوتا ہی نہیں تھا جو ماں پکاتی..... ہم بہن بھائی بھوک سے پریشان ہوتے۔ ماں خاموش ہوتی اور دکھ سہتی تھی۔ ایسے میں بابا کے رباب کی آواز آتی۔ وہ صحن میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا رباب بجاتا۔ پھر اس کے گانے کی آواز بھی اس میں شامل ہو جاتی۔

ہم بہن بھائی ایک ایک کر کے اس کے نزدیک جا کر بیٹھ جاتے اور سنتے رہتے۔ ہمیں اس کا گایا ہوا وہ فارسی نغمہ بہت پسند تھا جو وہ بڑا ڈوب کر گایا کرتا تھا۔ دل سے آواز نکلتی تھی اس کی..... اس کے بول مجھے آج بھی یاد ہیں۔''

سلطان نے بولتے بولتے خلا میں نظریں جمائیں۔ پھر آنکھیں بند کر کے پرانی یاد میں دور تک چلا گیا۔

''مجھے بھی سناؤ نا..... کیا گاتے تھے تمہارے بابا.....'' صبی نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے کچھ بھولی بسری یادوں کو مجتمع کر کے گویا ہوا۔

نمی دانم کہ آخر چوں، دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوق، کہ پیشِ یار می رقصم
بیا جاناں تماشا کن، کہ در انبوہ جاں بازاں
بصد سامانِ رسوائی، سرِ بازار می رقصم..... سرِ بازار می رقصم.....

''واہ..... واہ..... کیا خوب صورت شاعری ہے۔ انتہائے عشق کی داستان..... اس سے بہتر انداز میں ہو ہی نہیں سکتی..... کمال ہے۔'' صبی نے پُرجوش انداز میں داد دی تو سلطان اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''یہ کلام فارسی میں ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ہاں تو؟ میں بھی جانتی ہوں یہ فارسی کلام ہے۔ لیکن تم شاید نہیں جانتے کہ میرے ڈیڈی کی پوسٹنگ کئی سالوں تک ایران کے پاکستانی سفارت خانے میں رہی ہے۔ میں نے ابتدائی اسکولنگ وہیں سے کی ہے۔ اسکول اگرچہ انٹرنیشنل تھا لیکن تھا تو تہران میں..... تو وہاں فارسی بھی

پڑھائی جاتی تھی۔ لازمی کورس کے طور پر...... اسی لیے میرے لیے فارسی سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے مسٹر کہاں؟'' صبیحہ نے پڑھ کر وضاحت کی تو سلطان مسکرایا۔

''اگر مسکرا چکے ہو، تو آگے چلو...... میں سننے کی منتظر ہوں۔'' صبیحہ نے اسے یاد دلایا کہ وہ کچھ پرانی باتیں سنا رہا تھا۔

''ہاں آں......'' سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پھر سے اپنے خیالات کو مرتکز کیا۔

بابا کے جانے کے بعد ساری ذمے داریاں مجھ پر پڑ گئیں۔ روزانہ بکریاں چرانے لے جانا...... اپنی پڑھائی پوری کرنا کیونکہ امتحان نزدیک آرہے تھے۔ ماں کی دوائی کا...... چھوٹے بہن بھائیوں کی پڑھائی کا خیال رکھنا، سب کچھ کرنے کی کوشش میں اب تھکنے لگا تھا میں...... بابا کو گئے پندرہ بیس دن ہوگئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اب وہ جلدی سے واپس آجائے اور اپنے حصے کی ذمے داریاں سنبھال لے۔ تاکہ میں امتحان کی تیاری پر پوری توجہ دے سکوں۔ ویسے بھی بابا...... اتنے بہت دنوں کے لیے کبھی گیا نہیں تھا اس لیے ہمیں پریشانی بھی ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں وہ گورا بابا کو لے کر کہاں چلا گیا تھا۔ رحمان چاچا سے میں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو یہ بات سن کر اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور بولا۔

''لے بھئی سلطان! تیرے بابا کو تو لے گیا وہ گورا اپنے ملک...... وہاں اس نے کرادی ہوگی اس کی شادی کسی پیسے والی گوری میم سے...... خوب صورت تو وہ ہے ہی...... اور پھر فنکار بھی...... وہ بیٹھ کے رباب بجاتا ہوگا اور وہ گوری میم اس پر پیسے نچھاور کرتی رہتی ہوگی۔ مزے کرتے ہوں گے وہ دونوں۔''

''نہیں چاچا! میرا بابا ایسا نہیں ہے۔ وہ ہم لوگوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جاسکتا۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''ارے کیوں بچے کو وسوسوں میں ڈال رہے ہو۔ وہ پہلے ہی پریشان ہے اور پریشان ہو جائے گا۔ نا بیٹا! تیرا باپ واقعی ایسا نہیں ہے۔ پہاڑوں میں گورے کے ساتھ آگے نکل گیا ہوگا۔ آجائے گا۔ اپنی ماں گل مینا کے سامنے ایسی بات نہ کرنا۔ وہ ہول جائے گی۔'' چاچی نے رحمان چاچا کو جھاڑا اور مجھے تسلی دی۔

اس کے دو چار دن بعد بابا آگیا۔ گورا بھی ساتھ تھا۔ گورا مہمان خانے میں رک گیا تھا۔ بابا اندر آیا تو سارے بچے اس سے لپٹ گئے۔ اس نے سب کو پیار کیا۔ ماں سے ملا اور اس کے ہاتھ میں کچھ پیسے دیے۔

''یہ لے گل مینا! یہ میری بڑی محنت کی کمائی ہے۔'' وہ تھکن زدہ لہجے میں بول رہا تھا اور میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بابا کافی کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رنگ بھی بہت سنولا گیا تھا۔ اس کی انگلیوں اور پیروں میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا زخم لگے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی بہت میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ پچھلے پچیس دن اس نے بہت مشقتوں میں گزارے ہیں۔

''سلطان! آجا...... ذرا کنویں سے پانی نکال کے مجھ پر ڈالنا...... میں نہالوں۔'' میں کنویں سے بالٹیاں کھینچ کھینچ کر اس پر ڈالتا رہا اور وہ نہاتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اتنے دنوں میں کبھی ٹھیک سے نہا بھی نہیں پایا تھا اور اب وہ اتنے دنوں کا سارا میل کچیل اتار دینا چاہتا ہے۔ پھر بہن کے ہاتھ ماں نے اس کا دھلا ہوا جوڑا بھجوایا تو اس نے کپڑے بدل لیے۔ بال ٹھیک کرتا ہوا وہ مہمان خانے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں کھانا لے کر وہاں پہنچا تو عجیب منظر تھا۔ چادر پر رنگ برنگے خوب صورت اور چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ بعض پتھروں سے نیلے اور سبز رنگ جھلک رہے تھے۔ گورا اور بابا ان پتھروں کو دیکھ اور پرکھ رہے تھے اور چن چن کر نسبتاً بڑے اور صاف پتھر گورا اپنے پاس موجود چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ میں بھی کھانے کا تھال ایک طرف رکھ کر یہ سب دیکھنے لگا۔

''دیکھ سلطان! ہم بہت دور ان پہاڑوں میں گئے تھے۔ جہاں اس طرح کے پتھر ملتے ہیں۔ نیلے اور سبز...... یہ سب اس گورا خان نے وہاں سے کھود کھود کر نکالے ہیں۔'' بابا نے میری تجسس بھری نظروں کو دیکھتے ہوئے مجھے بتایا۔

میں گورے کو دیکھ رہا تھا جس کا چمڑے کا تھیلا بھر چکا تھا، اس نے اس کا منہ بند کر کے ایک طرف رکھا۔ پھر رہ جانے والے پتھروں میں سے آخری مرتبہ ہاتھ گھما کر کچھ اور پتھر نکالے۔ ان میں سے چند اپنی پینٹ کی بہت ساری جیبوں میں رکھ لیے۔

''ویل خان! یہ جو پتھر رہ گئے ہیں۔ یہ بھی اچھی خاصی قیمت کے ہوسکتے ہیں اگر تم ان کو کٹنگ اور پالش کر والو...... مجھے جو لینا تھے لے لیے...... اب یہ سب تمہارے

ہیں۔'' گورے نے سخاوت دکھانے کی کوشش کی۔

''چھوڑ دو اس کو...... ابھی کھانا کھاؤ...... ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' بابا نے وہ چادر سمیٹ دی جس پر چند چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کھانے کا تھال ان کے سامنے رکھ دیا۔ پھر چائے پی کر گورا جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی شام ہونے کو ہے...... شہر دور ہے...... تم صبح نکلو...... رات اِدھر آرام کرو۔'' بابا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں...... اب مجھے جانا ہے۔ رات تک پہنچ جاؤں گا شہر...... وہاں سے صبح صبح نکل جاؤں گا۔ دیکھو خان! ان قیمتی پتھروں کو اس طرح مت پھینکو...... سنبھال کر رکھو...... شہر جا کر انہیں صاف کروا کر بیچ دینا۔ بہت اچھے پیسے مل جائیں گے۔ کیونکہ یہ پتھر کوالٹی میں بہت اعلیٰ ہیں۔ پیسے تمہارے بچوں کے کام آئیں گے۔'' گورے نے چادر میں لپٹے پتھر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''سلطان! اِدھر آ۔'' بابا نے مجھے بلایا۔

''یہ لے...... اندر لے جا...... تو اور تیرے بھائی بہن ان سے کھیل لینا۔'' بابا نے وہ مجھے پکڑا دیے۔

''یہ کیا کر رہے ہو بے وقوف آدمی! اتنے قیمتی پتھر تم نے بچوں کو کھیلنے کے لیے دے دیے۔ وہ ضائع ہو جائیں گے۔ کچھ نہیں ملے گا تمہیں ان کے بدلے۔'' گورا چلایا۔

''مجھے ان سے کچھ چاہیے بھی نہیں صاب! میں رزق حلال پر یقین رکھتا ہوں۔ بے شک ان پتھروں کے لیے تم نے جو مشکل سفر کیا، وہ ساری مشکلیں میں نے بھی اٹھائی ہیں لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ پتھر تم نے چوری کیے ہیں اور چوری کا مال...... میرے اور میرے بچوں کے لیے حلال نہیں ہے اس لیے یہ میرے لیے بیکار ہیں۔'' بابا نے بڑے تحمل سے کہا۔

''چوری کا مال؟ یہ چوری کا مال کہاں سے ہو گیا۔ زمین میں...... پہاڑوں میں پڑے تھے یہ پتھر...... اگر ہم نے وہاں سے اٹھا لیے تو چوری کیسے ہو گئی۔ یہ کسی کی ملکیت تو نہیں تھے۔'' گورا حیرت سے آنکھیں پھیلائے سوال کر رہا تھا۔

''صاب! یہ میرے وطن کی ملکیت ہیں۔ میرے وطن کے لوگوں کی۔ ہم لوگوں کی ملکیت ہیں۔ تمہارا تو کوئی حق ہی نہیں بنتا ان پر...... پھر بھی تم نے اِدھر سے بغیر کسی کی اجازت کے یہ پتھر نکالے...... یہ چوری تو ہوئی نا...... اور اس چوری میں مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ شامل رکھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں کبھی یہ کام نہ کرنے دیتا۔ ابھی بھی میں کسی سرکاری افسر کو تمہارے بارے میں بتا دوں تو تم یہ لے کر جا نہیں سکتے۔ لیکن خیر! تم بدقسمتی سے میرے مہمان بھی رہ چکے ہو اس لیے جا سکتے ہو۔'' بابا کہہ رہا تھا اور میں بڑے غور سے اس کی بات سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ میری نظریں گورے کے چہرے پر تھیں۔ مجھے اس کی نیلی اور سرد آنکھوں میں کمینگی کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔

''اوہو...... حب الوطنی کا بخار ہو رہا ہے۔ خیر، میں تمہیں بتا دوں کہ تم کسی سے بھی شکایت کرو، مجھے روک نہیں سکو گے کیونکہ یہاں ہر کوئی بکنے کے لیے تیار رہتا ہے، دو چار لاکھ نہیں...... دو چار ہزار ہی میرے راستے میں آنے والے کو پھسلانے کے لیے کافی ہیں۔ میں کل دن میں کسی بھی وقت تمہارا ملک چھوڑ دوں گا۔ جب تک کا وقت ہے تم چاہو تو اتنے وقت میں مجھے گرفتار کروانے کی کوشش کر سکتے ہو۔'' اس نے استہزا سے کہا۔

''میں ایسی کوئی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ تم جاؤ...... اور یہ پتھر صدقہ سمجھ کر لے جاؤ۔ چند پتھروں کے نکل جانے سے...... اس خزانے میں کوئی کمی نہیں آ جائے گی جو قدرت نے ہمیں عطا کیا ہے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ آئندہ کبھی اس نیت سے اِدھر مت آنا۔ کیونکہ اب میں سب کو بتا دوں گا کہ کسی گورے کو...... کوئی پہاڑوں میں لے کر نہ جائے۔ یہ چوری کرنے آتے ہیں۔'' بابا کی کھری کھری باتیں سن کر مجھے جتنی خوشی ہو رہی تھی، اتنی ہی نفرت اور غصہ مجھے گورے کی شکل دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا۔

پھر جس قدر بدطینت اور کمینے انداز میں وہ ہلکے سے ہنسا تھا میرا جی چاہا کہ انہی پتھروں میں سے ایک مار کر اس کا سر پھوڑ دوں۔

''چلو، ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے پہاڑوں تک جانے اور پتھر حاصل کرنے میں میرا جتنا ساتھ دیا ہے، اس میں تمہاری بہت زیادہ محنت ہوئی ہے اور تمہارا معاوضہ اس کے مقابلے میں کچھ کم ہے۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکالے۔

''یہ میرے پاس بچی ہوئی پاکستانی کرنسی ہے۔ ویسے بھی اب مجھے زیادہ کرنسی کی ضرورت نہیں ہے اس لیے یہ تمہاری ہے۔'' اس نے کچھ نوٹ بابا کو پکڑائے ''اور یہ تمہارے لیے۔'' اس نے سو روپے کا ایک نوٹ میری جیب

میں ڈالا اور خباثت سے ہنسا۔

''نہیں چاہیے۔'' میں نے غصے سے چلّا کر جیب سے وہ نوٹ نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ گورا زور سے ہنسا اور ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

بابا نے جھک کر وہ نوٹ بھی اٹھا لیا پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ساتھ لے کر گھر میں آ گیا۔ اندر آ کر میں نے وہ سارے پتھر ایک کونے میں پھینک دیے جن سے بہت عرصے تک میرے چھوٹے بہن بھائی کھیلتے رہے۔

یہ وہ وقت تھا جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تھی اور میں اپنے لوگوں اور اپنے گھر کے علاوہ آس پاس کے ماحول اور جانے انجانے لوگوں کو جاننے اور پرکھنے لگا تھا۔ ان کے انداز و اطوار سے میں ان کی باطنی شخصیت کو کسی حد تک سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس لیے کچھ وقت پہلے کا گزرا ہوا وہ لمحہ مجھے سمجھا گیا کہ دور دیس سے آنے والا وہ اجنبی...... بد باطن اور خباثت کا پتلا ہونے کے باوجود کتنا طاقتور تھا اور میرا بابا نیک طینت، سچا اور سادہ ہونے کے باوجود کتنا کمزور تھا۔ میرا بابا درست ہونے کے باوجود ناکام رہا اور وہ گورا غلط ہونے کے باوجود کامیابی حاصل کر کے چلا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی وہ نیلی، سرد مہر اور بدباطنی کو ظاہر کرتی آنکھیں میرے ذہن و دل پر نقش ہو گئیں اور سالہا سال کے بعد بھی میں نے اس شخص کو اس کی آنکھوں سے پہچان لیا...... وہ یقیناً ایشلے تھا۔

''اچھا آ آ آ......'' صبیی حیرت سے چلائی۔

''تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ ایشلے وہی ہے۔ جو برسوں پہلے تمہارے علاقے میں گیا اور یہ سارے قیمتی جوئیلو وہاں سے غیر قانونی طور پر چوری کر کے لایا ہے۔''

''ہم م م...... بالکل یقین ہے۔ یہ سو فیصد وہی شخص ہے۔'' سلطان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... پھر...... اب تم کیا کرو گے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا؟ لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گا۔ کم از کم دنیا کو پتا تو چلے کہ یہ اس وقت کا کروڑ پتی، باعزت اور معروف شخص...... دراصل ایک چور...... اور قانون کی نظر میں مجرم ہے۔ اس نے اپنی عزت دار زندگی کے لیے جو محل تعمیر کیا ہے، اس کی بنیاد چوری کے پیسے سے رکھی گئی ہے۔ میں دنیا کو اس کا اصل چہرہ دکھانا چاہتا ہوں۔'' سلطان نے جذباتی انداز میں کہا۔

''ریلیکس، ریلیکس خان صاحب! میں آپ کی بات آنکھیں بند کر کے مان سکتی ہوں کیونکہ میں آپ کی باتیں...... کانوں سے نہیں، دل سے سنتی ہوں لیکن دنیا میں سب میری طرح کے لوگ نہیں ہیں۔ وہ آپ کی بات کو جھٹلا کر...... خود آپ کو ہی کٹہرے میں کھڑا کر دیں گے کہ آپ ایک باعزت آدمی کو جھوٹے الزامات لگا کر...... اس کی نیک نامی کو داغ دار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر شاید اسے بلیک میل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت ہے، مسٹر خان؟'' صبیی نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

''ثبوت؟ ثبوت تو میرے پاس نہیں اور کم از کم اس وقت تو بالکل نہیں ہے لیکن وہاں میرے ملک میں میرا بابا موجود ہے۔ وہ اس کو ابھی بھی بہت آسانی سے پہچان لے گا۔ وہ گواہی دے گا۔ تب بھی کوئی نہیں مانے گا کیا؟'' سلطان نے پوچھا۔

''میں نہیں سمجھتی...... کہ ایک بوڑھے آدمی کی یادداشت کے سہارے...... ایک طاقتور اور معاشرے میں باعزت مقام رکھنے والے شخص کا کچھ بگاڑا جا سکتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ فرض کرو ایسا ہو گیا۔ تمہارے بابا نے یہاں آ کر ایشلے کو دیکھ کر پہچان بھی لیا اور بتا بھی دیا کہ ایشلے نے یہ جوئیلز تمہارے علاقے سے چوری سے حاصل کیے ہیں۔ تب کیا ہو گا؟ میرا مطلب ہے تمہارے مقاصد کیا ہوں گے؟ تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟''

صبیی نے کچھ الجھتے ہوئے سوالات کیے...... تو سلطان نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو خود بھی سوال بنا ہوا تھا۔

''اگر تمہارے گھر سے کوئی چور تمہاری کچھ قیمتی چیزیں چوری کر کے بھاگ جائے۔ تم اسے پکڑنے اور اپنی قیمتی چیزیں واپس لینے پر قادر نہ ہو...... تو کیا تمہیں ان کے اس طرح چھن جانے پر افسوس نہیں ہو گا؟''

''یقیناً ہو گا۔''

''اور تمہیں سالوں بعد اگر وہ شخص مل جائے...... تو تم کیا کرو گی؟''

''یقیناً میں اسے گردن سے پکڑ کر اپنی چیزیں واپس لینے کی کوشش کروں گی۔'' صبیی نے روانی سے جواب دیا پھر اپنے ہی جواب پر کچھ ٹھٹک سی گئی۔

سلطان مسکرا دیا۔

''یہی تو میں بھی کرنا چاہ رہا ہوں...... میرے ملک کی

جو قیمتی چیزیں ایک چور سالوں پہلے چرا کر لے گیا تھا، آج میرے سامنے ہے...... میں کیوں نا اسے پکڑوں...... اور کیوں نا اپنی قیمتی چیزیں بھی اس سے واپس لوں؟'' سلطان نے اپنے خیال کی وضاحت کی۔

''لیکن...... یہ اتنا آسان تو نہیں ہے سلطان! آج تم اس پر یہ الزام لگاؤ اور وہ جواب میں یہ کہے کہ تم نے محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما گھڑا ہے اور یہ کہ تم نے اپنی اس بے سروپا الزام لگانے والی حرکت سے اس کی گڈول کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے لہٰذا کیوں نہ تمہیں ہرجانے کا نوٹس بھجوایا جائے...... کئی ملین ڈالرز کا...... ورنہ مسٹر کھان کو جیل کی ہوا کھلوائی جائے...... پھر تم کیا کرو گے؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آواز اٹھاؤں...... اور لوگوں کو ایشلے جیسے لوگوں کی حقیقت سے ضرور آگاہ کروں کہ یہ اپنے آپ کو مہذب اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل کہنے والے لوگ...... دراصل اندر سے چور، ڈاکو اور لٹیرے ہیں جو گھٹیا اخلاقی قدروں کے مالک اور مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگ ہیں۔ آج نمائش میں یہ جو جواہرات کی دکان سجائے بیٹھا ہے۔ ان میں سے کچھ بھی اس کا اپنا نہیں ہے۔ یہ سب ریاست پاکستان کی ملکیت ہیں اور اسے واپس ملنا چاہیے۔'' سلطان نے جوش سے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے...... لیکن...... لیکن اگر تم تھوڑا ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بات پر غور کرو گے...... تو تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ کسی بھی بات کو صحیح یا سچ ثابت کرنے کے لیے...... ٹھوس ثبوت درکار ہوتے ہیں۔ تم یہ کام اس طرح بھی کر سکتے ہو کہ اپنے سفارت خانے سے رجوع کرو اور انہیں اس کے لیے تیار کرو کہ وہ تمہیں مکمل سپورٹ کریں۔''

''ہاہ ہ ہ...... سفارت کار؟ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی کہ ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ ایسے معاملات کو ہینڈل کرے۔ کیونکہ وہاں ایسی کوئی سوچ ہی نہیں ہے۔'' سلطان نے بدمزگی سے کہا۔

''ہاں، عمومی طور پر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن پھر بھی میں پاپا سے تو مشورہ کر سکتی ہوں۔ وہ پریس اتاشی ہیں اور سفیر صاحب کے کافی قریب بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ نہ کریں لیکن کم از کم گائیڈ ہی کر دیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے...... ٹھیک ہے نا؟ پھر ہم اٹارنی سے بھی بات کر سکتے ہیں تاکہ کم از کم ایک مناسب سی لائن آف ایکشن کا انتخاب تو کر سکیں۔ چلے گا؟'' صبیحہ نے جواب طلب انداز میں دیکھا تو سلطان کے ہونٹوں پر ایک بھرپور سی مسکراہٹ دیکھ کر چونک گئی۔

''کیا ہوا؟ اچانک یہ گرج چمک کے طوفانی جلوے کے بعد...... نرم نرم مسکراہٹ کی رم جھم پھوار...... ایک لمحے میں دنیا بدل کیسے گئی کھان صاحب؟''

''کیونکہ تمہاری باتیں سنتے سنتے اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس پاگل پن میں اکیلا نہیں ہوں میں...... میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' وہ ہلکے سے ہنسی۔

''ٹھیک ہے پھر ملتے ہیں۔ میں پاپا سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں...... اوکے...... بائے۔'' وہ چہرے کے بدلتے رنگوں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تو سلطان... طمانیت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''وہ دیکھو صاب! وہ جو پہاڑ نظر آرہے ہیں نا...... انہی میں ملتے ہیں وہ نیلم...... نیلا پتھر۔'' دریا خان نے انگلی سے دور اشارہ کرتے ہوئے کہا تو گورا چلتے چلتے یکلخت تھم گیا۔

''واؤ...... کیا حُسن ہے ان پہاڑوں میں...... اپنے اندر اتنی خوب صورتی چھپائے ہوئے ہیں۔ تب ہی باہر سے بھی اس قدر حسین نظر آرہے ہیں...... لیکن تم نے کہا ان میں صرف نیلا پتھر ملتا ہے...... سبز پتھر پھر کہاں ملے گا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''وہ پہاڑ دوسرے راستے پر ہیں۔ ایک پورا دن اور سفر کرنا ہوگا۔ تب ہم اُدھر پہنچ سکتے ہیں۔ وہ سنگ مرمر کی چٹانوں میں ملتا ہے...... ادھر بہت لوگ سنگ مرمر نکالتے ہیں۔ پتا نہیں وہ تمہیں ادھر سے پتھر نکالنے دیتے ہیں یا نہیں۔'' دریا خان نے بتایا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو، مجھے حالات اور لوگوں سے نمٹنا آتا ہے۔ فی الحال تو ہم نیلا پتھر نکالتے ہیں۔''

گورے نے بے پروائی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اگلے دو گھنٹوں میں وہ ان پہاڑوں کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔ گورا ان پہاڑوں میں جگہ جگہ جھلکتے نیلے رنگ کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں کئی جگہ ایسے آثار تھے جیسے ان کی آمد سے پہلے بھی کچھ لوگ وہاں آئے تھے اور کچھ وقت گزار کر گئے ہیں کیونکہ کئی جگہ بجھی ہوئی آگ کی راکھ اور کوئلے

نظر آئے۔ کچھ خالی تھیلیاں اور لفافے جیسے کھانے کی کچھ چیزیں وہاں لائی اور کھائی گئی ہوں۔ پہاڑوں میں جگہ جگہ کھدائی کے آثار بھی نمایاں تھے۔

گورے نے کافی گھومنے پھرنے اور اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ایک جگہ کا انتخاب کیا اور اپنا بڑا تھیلا اتار کر وہاں ڈال دیا۔ یہ ایک بڑی سی غار نما جگہ تھی۔ جہاں پہلے بھی کھدائی کی گئی ہوگی کیونکہ کافی پتھر وہاں ٹوٹ کر بکھرے ہوئے تھے اور اس نے ان پتھروں کا جائزہ لیتے ہوئے ہی وہاں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

دریا خان بری طرح تھک چکا تھا۔ اس نے گدھے کو ایک طرف باندھا۔ سامان اتار کر ایک طرف ڈالا اور اس سے ٹک کر نیم دراز ہوگیا۔

''دیکھو کھان! ادھر بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ادھر جنگلی جانوروں کے ساتھ ساتھ پتھر چور بھی آسکتے ہیں۔ جو سامان اور کھانے پینے کی چیزیں ہتھیانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس لیے چوکنا رہنا ہے۔'' گورے نے دریا خان کو تنبیہ کرنے کی کوشش کی تو وہ آنکھیں کھولے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔

''میرے ہوشیار اور چوکنا رہنے سے کیا ہوگا۔ اگر کسی جانور یا انسان نے حملہ کیا بھی تو میں خالی ہاتھ اس کا کیا بگاڑ لوں گا۔ اس لیے ہوشیار اور چوکنا رہنے کا کام بھی تم کو ہی کرنا پڑے گا۔ مجھے آرام کرنا ہے کیونکہ میں تھک گیا ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر تم پتھر توڑ کر نکالو...... میں چوکیداری کرتا ہوں۔'' گورے نے کہا۔

''مجھے پتھر توڑنا نہیں آتا اور ویسے بھی میرا تم سے ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ میں پتھر بھی تمہیں توڑ کر دوں گا۔ صرف راستہ بتانا اور ان پہاڑوں تک لانا میری ذمے داری تھی۔ وہ میں پوری کر چکا ہوں۔''

''او مائی گاڈ! اچھا بابا! میں کرلوں گا۔ تم کھانا تو نکالو۔ آگ جلاؤ۔ گرم کرو...... بہت بھوک لگی ہے۔'' گورے نے کہا۔

''کھانا؟ اب کوئی کھانے کی چیز نہیں رہی۔ صرف تھوڑے سے چنے رہ گئے ہیں وہ بھی ابھی کھالیے تو پتا نہیں واپسی کے سفر میں ہم بھوک کے ہاتھوں مارے جائیں۔ بہتر ہے پہلے کوئی شکار کرلو...... تاکہ پیٹ بھر کے کھاسکیں۔'' اس کی بات سن کر گورا کچھ جھنجلا گیا۔

''سب کچھ میں ہی کروں اور تم نواب بن کر آرام کرتے رہو گے؟''

''نہیں تم شکار کر کے لاؤ...... پکاؤں گا میں۔ ابھی آس پاس لکڑیاں جمع کر رہا ہوں تاکہ آگ جل سکے۔ شام ہونے والی ہے۔ پہاڑوں میں رات بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ شکار نہیں ملے گا پھر...... جلدی جاؤ...... یہ پتھر توڑنے کا کام بعد میں کرنا۔''

دریا خان کی بات سن کر گورے نے جھنجلا کر ہاتھوں میں پکڑے پتھر زور سے پھینکے جن کا وہ بغور جائزہ لے رہا تھا اور پاؤں پٹختا ہوا اپنے سامان کی طرف گیا۔ اس میں سے ایک بڑی نال والی بندوق نکال کر...... جیب میں رکھا ہوا میگزین ڈال کر اس میں فٹ کیا اور دریا خان کو دزدیدہ نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں دریا خان بھی اٹھا اور غار کے آس پاس سے ہی خشک ٹہنیاں اور لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ رات بھر آگ جلانے کا بندوبست ضروری تھا۔ سردی اور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے آگ جلانا ہی پڑتی تھی۔

آگ پوری طرح جل چکی تھی اور اب لپٹوں کے ساتھ ساتھ چنگاریاں بھی چیخ چیخ کر پھیل رہی تھیں۔ پہاڑوں پر شام تیزی سے اتر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا۔ وہ ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے باہر تیزی سے سرمئی ہوتے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ باہر کا سرمئی اجالا اور چٹختی ہوئی لکڑیوں سے جلتی ہوئی آگ دیکھ کر اسے اپنا گھر یاد آرہا تھا۔

گورا جو شکار کی تلاش میں تھوڑا دور نکل گیا تھا بمشکل تین خرگوش شکار کرنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ وہ ان کی ٹانگیں باندھ کر ایک ڈنڈے پر لٹکائے تیزی سے واپس آرہا تھا۔ کیونکہ شام تیزی سے رات کی طرف جھک رہی تھی اور وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا اور اس غار کے نزدیک پہنچ ہی رہا تھا کہ کسی درندے کے غرانے کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ درندے کی غراہٹ میں ایک للکار سی تھی۔ جیسے وہ کسی پر حملہ کر رہا ہو۔ گورے نے جلدی سے اپنی خطرناک گن لوڈ کی اور تیزی سے آگے بڑھا۔ ایک چھوٹی پہاڑی کے موڑ سے مڑا تو ایک عجیب منظر اس کے سامنے تھا جو ملگجی روشنی میں بھی صاف نظر آرہا تھا۔

وہ ایک چھوٹے سائز کا تیندوا تھا جو دریا خان پر حملہ آور ہوا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں میں جلی ہوئی لکڑیاں اٹھائے تیندوے پر وار کر رہا تھا اور اپنے آپ کو اس کے

حملوں سے بچانے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا اور تیندوا ابھی اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

تیندوے نے پھر آگے بڑھ کر حملہ کیا اور دریا خان نے جلتی ہوئی لکڑی اس کے منہ پر دے ماری۔ وہ چیختے ہوئے پیچھے ہٹا اور دوبارہ سنبھل کر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ دریا خان نے بھی چلتے ہوئے الاؤ سے ایک زیادہ تیزی سے جلنے والی لکڑی کھینچ لی تھی اور اسے لے کر تیندوے کی طرف بڑھا۔

وہ ڈر کر تھوڑا پیچھے ہوا اور اسی وقت دھائیں کے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ تیندوا چیخ کر زور سے اچھلا اور نیچے کہیں گر پڑا۔ دریا خان نے پلٹ کر دیکھا تھوڑی دور گورا کھڑا تھا اور فائر اسی نے کیا تھا۔ وہ لکڑیاں واپس الاؤ میں پھینک کر غصے سے اسے گھورنے لگا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔

''وہ مر گیا......تم ٹھیک ہو؟'' اس نے دریا خان کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، تو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ ورنہ تم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے مروانے میں۔'' وہ غصے سے چلاتے ہوئے بولا۔

''آئی ایم سوری۔'' گورے نے بے پروائی سے کہا۔

''اس خبیث نے اچانک جست لگا کر حملہ کیا اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو اس کا پہلا پنجہ پڑتے ہی اس کے بس میں چلا جاتا۔ وہ خانہ خراب کا بچہ مجھے گھسیٹ کر اپنے کسی ٹھکانے پر لے جاتا اور جب تک تم یہاں پہنچتے، وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر میری دعوت اڑا چکا ہوتا اور تم یہاں پہنچ کر مجھے ڈھونڈتے ......تھک کر یہ یقین کر لیتے کہ دریا خان بھاگ گیا اور اس کے بعد اپنے پتھر توڑنے میں مصروف ہو جاتے۔'' دریا خان کا غصہ عروج پر تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا، شکار کرنا ہوگا تو دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔'' گورے نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

''ہاں لیکن میری بندوق کی گولیاں نہیں دو گے؟'' اس نے انتہائی غصے سے کہا۔

''مجھے واپس بھی جانا ہے اور واپسی کا راستہ بھی تمہیں ہی معلوم ہے۔'' گورے نے کہا اور چاقو نکال کر خرگوشوں کا تیا پانچا کرنے لگا۔

''اوئے خدائی خوار! بیڑا غرق تمہارا......تم نے ہم کو

کتنا مجبور کردیا ہے، ہماری بندوق کی گولیاں چھین کر......تم نے ہم کو کیچوے کا بچہ بنادیا ہے۔ ہتھیار نہیں ہونے کی وجہ سے بار بار ہماری جان خطرے میں پڑ رہی ہے۔ وہ تو اوپر والے نے زندگی لکھی ہے تو ہر بار بچ جاتا ہوں۔ نہیں تو تم نے تو اب تک ہمارا چہلم کروا دیا ہوتا، خانہ خراب۔'' وہ انتہائی مشتعل تھا اور پتھر سے لگا بیٹھا مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

گورا خود ہی خرگوشوں کو کاٹ کر اور صاف کر کے آگ پر بھون رہا تھا۔

''اچھا، اب بول چکے ہو تو جاؤ...... اور جاکر سامان سے نمک لے کر آؤ...... بھوک نہیں لگی ہے کیا؟''

تھوڑی ہی دیر میں وہ کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تھے۔

''آج تم پہلے سو جاؤ۔ میں تھوڑے پتھر توڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند آئے گی تو میں تمہیں جگا دوں گا۔'' گورے نے کہا تو اس نے بھی کوئی تکلف نہیں کیا۔ فوراً ہی جاکر اس کے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ گورا پتھر توڑنے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دریا خان نے بیگ سے منہ نکالا۔

''تم اتنا ٹھک ٹھک...... اتنا شور کرو گے تو میں کس طرح سوؤں گا۔ پتھر بے شک نکالو...... لیکن شور تو نہ کرو۔''

''یہ لو...... یہ کان میں لگالو۔ تمہارے رباب کی آواز سے بچنے کے لیے میں یہ اپنے کانوں میں لگاتا تھا۔ آج تم لگا لو اور سو جاؤ۔'' گورے نے اپنے ایئر پیڈ اسے دیے اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

نمائش کا آج آخری دن تھا۔ نیلامی بھی ختم ہو چکی تھی۔ بہت سے معزز مہمان جو ہالیڈے اِن میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے، انہوں نے کل ناشتے کے بعد چیک آؤٹ کرنا تھا۔ چنانچہ ان تمام مہمانان کی تفریحِ طبع کے لیے ہوٹل کی انتظامیہ کی جانب سے اس رات ایک خصوصی محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک نسبتاً کم معروف لیکن بہترین گانے والے سیاہ فام کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ شوقین سنگرز تھے۔ سیاہ فام گلوکار کے مدھر مدھر نغموں کے بعد دو ٹین ایجرز آئے جنہوں نے دھوم مچاتی بیٹ پر ایسے گانے گائے جنہوں نے لوگوں کو تھرکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایک لڑکی نے اپنی دلکش آواز میں چند ایک گانے سنائے۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آج کی شام کا ایک خاص تحفہ...... خاص لوگوں کے لیے...... خاص لوگوں کی طرف سے۔'' ساؤنڈ سسٹم پر اس عجیب و غریب اناؤنسمنٹ کے بعد جو آواز ابھری...... وہ ایک نیا آہنگ لیے ہوئے تھی۔ کسی نئی اور مختلف آواز والا وہ ساز وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً تمام سامعین کے لیے نیا تھا۔ سوائے ایک کے۔

اس ایک شخص کے لیے...... نہ تو وہ ساز نیا تھا اور نہ ہی اس پر بجنے والی دھن نئی تھی۔ وہ آج سے بہت پہلے اس ساز اور اس پر بجائی جانے والی دھن سے آشنا ہو گیا تھا۔ اس نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا جس کے حریری پردے آہستہ آہستہ سمٹ رہے تھے اور صبیی نے مووی بناتے ہوئے خاموشی اور آہستگی سے کیمرے کا رخ اس کی جانب پھیر دیا اور لینس کو اس کے چہرے پر فوکس کیا جہاں پہلے چونکنے اور حیران ہونے کے بڑے واضح تاثرات نمودار ہوئے تھے اور اب کچھ الجھنے کے سے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے کیونکہ پردہ ہٹتے ہی جب پرفارمر پر نظر پڑی تو وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے جو ایونٹ منیجر اس کے آس پاس موجود رہتا تھا، اس کی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ اس وقت وہ سر جھکائے اس اجنبی ساز کو بجا رہا تھا جسے وہ رباب کے نام سے جانتا تھا۔ سرخ و سپید چہرہ، لمبے بھورے بال اور سیاہ آنکھوں والا وہ نوجوان محویت سے رباب بجا رہا تھا۔ پھر اس نے رباب کے سُروں کے ساتھ اپنی آواز کو ہم آہنگ کیا۔ ایک بڑا ہی خوب صورت نغمہ ہال کے ساؤنڈ سسٹم پر پھیلتا چلا گیا۔

نمی دانم کہ آخر چوں، دمِ دیداری رقصم
مگر نازم باایں ذوق، کہ پیشِ یاری رقصم
بیا جاناں تماشا کن، کہ در انبوہ جاں بازاں
بصد سیامانِ رسوائی، سرِ بازاری رقصم...... سرِ بازاری رقصم...... می رقصم...... می رقصم۔

''او مائی گاڈ! یہ تو وہی ہے۔ میں نے پہلے کیوں نہیں پہچانا اسے...... وہی بالکل وہی ہے۔''

آرتھر ایشلے ہیجانی کیفیت میں زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی اس کیفیت کو بھی صبیی کے کیمرے نے بڑی خاموشی سے اپنے اندر چھپالیا۔

سلطان نے جو سُر چھیڑے تھے اور جس خوب صورت اور دل کو چھو لینے والے انداز میں نغمہ گایا تھا، اس کی خوب صورتی نے لوگوں کو اپنے طلسم میں قید کر لیا تھا۔ وہ سب اس مدھر نغمگی میں اس طرح بے خود تھے کہ نغمہ ختم ہوجانے کے باوجود اس کا سحر طاری تھا اور انہوں نے تالیاں تک نہیں

بجائی تھیں۔

سلطان جب اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ناظرین کے سامنے تھوڑا سا خم ہوا تو اچانک انہیں خیال آیا اور ہال بھرپور تالیوں سے گونج اٹھا۔

سلطان نے دیکھا کہ آرتھر ایشلے تیزی سے اس کی طرف لپک رہا تھا۔

''ہے سلطان کھان! میں نے تم کو پہچان لیا۔ اچھی طرح پہچان لیا ہے۔'' اس نے ہیجانی انداز میں کہا تو سلطان نے بھی جواب میں وہی کہا۔

''میں نے بھی تمہیں بہت اچھی طرح پہچان گیا تھا مسٹر آرتھر ایشلے! تمہیں بھی اور تمہارے ان نادر روزگار جویلز کو بھی اور مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد آ گیا تھا کہ تم یہ قیمتی جویلز کہاں سے اور کیسے لائے ہو؟'' سلطان نے سرسراتے سے لہجے میں جواب دیا تو ایشلے کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنی نیلی سرد آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''یہی...... کہ یہ سارے جویلز...... چوری کے ہیں۔ انہیں میرے ملک سے چوری کر کے لایا گیا ہے۔'' سلطان نے آہستگی سے کہا تو ایشلے چراغ پا ہو گیا۔

''وہاٹ ربش؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی اور تمہارے پورے پھٹیچر ملک میں اس پائے کا کوئی ایک بھی جویل کہیں نہیں ہے...... تو میں کہاں سے چوری کروں گا؟'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''یہ کسی میوزیم سے نہیں چرائے گئے ہیں بلکہ انہیں پہاڑوں سے چوری کیا گیا ہے۔ اپنی خام شکل میں۔'' سلطان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس......؟ تم مجھ پر بلاوجہ الزام تراشی نہیں کر سکتے مسٹر کھان۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ تم پر الزام تراشی نہیں کر رہا ہوں اور ثبوت......؟ اگر ڈھونڈیں گے...... تو ثبوت بھی مل جائیں گے۔'' سلطان بولا۔

''میں تمہیں کورٹ میں سُو کر دوں گا اس لیے اس قسم کی بات ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔'' ایشلے نے دھمکی دی۔

''مسٹر ایشلے! جب کوئی جویل نیلامی میں رکھا جاتا ہے اور وہ فروخت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی پوری ہسٹری بھی دینی پڑتی ہے کہ وہ کہاں سے ملا تھا، کہاں اس کی تراش خراش ہوئی، کتنی بار بکا ہے اور تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ اس لیے تم بھی اپنے جویلز کی ہسٹری لکھ کر رکھ لو اور اس میں یہ ضرور لکھ لینا کہ انہیں تم نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟'' سلطان کے لہجے میں ایک چیلنج تھا۔

''اس کی فکر میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ان کی ہسٹری موجود ہے اور جب بھی انہیں فروخت کروں گا...... مکمل ہسٹری تیار کر کے ہی فروخت کروں گا۔'' ایشلے نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''ویسے تو مجھے نہ کوئی فکر ہے نہ پریشانی...... لیکن تم جب بھی انہیں فروخت کرنا چاہو گے...... غلط ہسٹری کے ساتھ...... تو اس میں تصحیح ضرور کروں گا۔ چاہے یہ موقع بھی آئے۔ ابھی یا کچھ عرصے کے بعد۔'' سلطان نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ مزید برافروختہ ہو گیا۔

''گو ٹو ہیل۔'' ایشلے نے اباؤٹ ٹرن لیا اور ہال سے باہر نکل گیا۔ ویسے بھی محفل ختم ہو چکی تھی اور بیشتر مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ سو وہ بھی اپنے رباب کو سنبھالتا ہوا باہر آ گیا۔

''سلطان خان! تم اتنا اچھا رباب بجاتے ہو اور اتنا ہی اچھا گاتے ہو کہ جادو چھا جاتا ہے۔ یہ تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟''

عظمت ایک پاکستانی تھا اور اس ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ ان کی مشترکہ پاکستانیت دونوں کو قریب لے آئی تھی۔ اس نے ہال میں سلطان کی پرفارمنس دیکھی تھی اور بہت متاثر ہو کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ سب میں نے اپنے بابا سے سیکھا تھا۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور رباب اسے پکڑا دیا۔

''اسے میرے کمرے میں رکھ آؤ گے پلیز...... میں ذرا مصروف ہوں۔'' اس نے عظمت کو رباب تھمایا اور خود آگے بڑھ گیا۔

اب اس کی نظریں صبیی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ ہال سے باہر نکل کر لابی میں آیا تو ایک جگہ وہ نظر آ گئی۔ کسی وی آئی پی سے انٹرویو لے رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ لابی کے ایک گوشے میں پہنچ کر بیٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی آ گئی۔

''ہائے ہینڈسم! آج تو تم نے کمال کر دیا۔ کیا گایا

ہے...... اور کیا بچایا ہے...... پورا میلہ ہی لوٹ لیا۔ باقی گانے والے بے چارے تو بس شرمندہ ہی ہو گئے۔'' اس نے آتے ہی حسبِ عادت بولنا شروع کردیا۔

''اف، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تمہارے منہ سے اپنی تعریف...... اور وہ بھی بغیر کسی کام کے...... دیکھو یہ نہ کہنا کہ ابھی، اسی وقت تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں اس لیے صاف انکار کردوں گا۔ چاہے تم کتنی بھی تعریف کرو۔'' سلطان نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''کیوں مجھے بدنام کرتے ہو؟ میں تمہاری تعریف رشوت کے طور پر تھوڑی کرتی ہوں۔ کوئی قابلِ تعریف کام کرتے ہو، تو کرنا پڑتی ہے۔'' صبیی نے چیونگم چباتے ہوئے کہا تو سلطان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ...... تم نے اسٹلے والا معاملہ کسی سے ڈسکس کیا؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ہم م م...... پاپا سے بات کی تھی مختصراً...... وہ معاملے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کل رات تمہارے ساتھ ان کی ایک میٹنگ ارینج کردی ہے۔ ڈنر پر...... ٹھیک سات بجے پہنچ جاؤ گے؟'' صبیی نے پوچھا تو سلطان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

''سر! میں اچھی طرح جانتا ہوں...... اس نے وہ تمام قیمتی جویلز...... پاکستان سے ہی چوری کیے ہیں۔ خود میرے بابا کو وہ زبردستی ان پہاڑوں میں لے گیا تھا۔ جہاں نیلم اور زمرد ملتے ہیں اور وہاں سے ڈھیروں جواہرات اٹھا کر لایا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ پتھر......'' سلطان نے زور دے کر اپنی بات کہی۔

نیویارک میں واقع پاکستان قونصلیٹ آفس میں وہ پاکستانی سفیر برائے امریکا کے سامنے بیٹھا اپنی بات سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

سفیر صاحب گہرے نیلے برانڈیڈ سوٹ میں ملبوس...... مہاگنی کی قیمتی آفس ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھے تھے۔ ٹیبل پر پاکستان اور امریکا کے جھنڈے لگے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر قائداعظم کا بڑے سائز کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ وہ ایک بے تاثر چہرے کے ساتھ اس کی بات سن رہے تھے۔

ان کے پریس اتاشی نے اس شخص کی سفارش کی تھی کہ اس کی بات سن لی جائے اور وہ خود بھی وہاں موجود تھے۔

''تم جانتے ہو، تم جس شخص کے بارے میں بات کررہے ہو، یہاں کی سوسائٹی میں اس کا کیا مقام ہے؟ تم اس شخص پر کیچڑ اچھالنا چاہ رہے ہو۔ وہ جب پلٹ کر وار کرے گا تو تم سہہ پاؤ گے کیا؟'' انہوں نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس وقت ایک دولت مند اور طاقت ور شخص ہے لیکن جس دولت نے اسے یہ طاقت دی ہے' وہ آئی کہاں سے ہے؟ اس بارے میں جاننے میں کیا قانون کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ میں اپنے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں...... کہ میں ایک کمزور آدمی ہوں اور اس کی طاقت کا مقابلہ تنِ تنہا نہیں کرسکتا۔ جب ہی تو آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ آپ ریاست پاکستان کے نمائندے ہیں۔ آپ ریاست کو فریق بنا کر اس پر چوری کا مقدمہ کریں اور اس سے وہ تمام جواہرات واپس لیں جو اس نے پاکستان سے چوری کیے تھے۔'' سلطان نے جذباتی انداز میں کہا۔

''دیکھیے مسٹر سلطان یہ سب جذباتی باتیں ہیں جو کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ قانون، انصاف، حق حقوق...... یہ سب پوری دنیا میں ایک ہی معیار رکھتے ہیں۔ سب کچھ طاقتور کو ملتا ہے۔ کمزور صرف سزا بھگتتا ہے۔'' سفیر نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''ایسا پاکستان میں عام ہے لیکن یہاں قانون اتنا کمزور نہیں ہے کہ اسے پیسے اور طاقت سے خرید کر جیب میں ڈال لیا جائے۔ اگر حقائق واضح ہوں تو قصوروار کو سزا ضرور ملتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو یقیناً آپ کی نظر سے بھی ضرور گزری ہوں گی۔''

سفیر صاحب نے انتہائی خشونت بھری نظروں سے دوسری جانب بیٹھے ہوئے اپنے پریس اتاشی کو گھورا۔

''کیا آپ نے مسٹر سلطان کو بتایا نہیں کہ یہ دو افراد کے اختلاف کا شاخسانہ نہیں بلکہ دو ریاستوں کی قانونی جنگ بن جائے گی اور پاکستان جیسی چیونٹی کو...... امریکا جیسے ہاتھی سے لڑانا...... کتنی بڑی عقل مندی ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ انہیں نہیں لیکن آپ کو تو ہوسکتا ہے۔ پھر یہ سب کیا ہے؟''

''جی سر! میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی۔ یہ بضد تھے کہ اس سلسلے میں آپ سے بات ضرور کریں گے۔''

''سر! یہ ایک بے بنیاد بات نہیں ہے۔ قانون ایک

چور کو تحفظ نہیں دے سکتا..... اور پھر جنگ قانونی ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ یا تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا، کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر..... یا پھر زیادہ سے زیادہ مجھے نام نہاد عزت دار شخص کی گڈول خراب کرنے پر سزا ہو جائے گی۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' سلطان نے انہیں قائل کرنے کی پھر کوشش کی۔

پاکستانی سفیر اسے گھورتے رہے پھر شاید انہیں اس کی آنکھوں میں استقامت اور ہمت و حوصلے کی ایسی جھلکیاں نظر آئیں کہ وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

''کیا آپ کو اس طرح کے مقدمے کی قانونی حیثیت کے بارے میں کچھ علم ہے؟ کہ یہ ممکن ہے یا نہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں نے اپنے ایک دوست سے اس بارے میں بات کی تھی۔ وہ پاکستان لائرز فورم کا ممبر ہے اور ایک بہت اچھا لائر ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ بالکل ممکن ہے۔ بلکہ اگر ایسا کوئی مقدمہ دائر کیا گیا تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہوگا اور یہاں بسنے والا ہر پاکستانی اس میں اپنا حصہ ضرور ڈالے گا۔ کوئی قدم بڑھائے تو سہی..... بہت سے لوگ مل جائیں گے ساتھ دینے والے۔'' سلطان نے جذباتی لہجے میں زور دے کر کہا۔

''اوکے مسٹر سلطان! میں اس سلسلے میں پاکستان میں اپنے پرائم منسٹر اور پریذیڈنٹ سے بات کروں گا اور پھر آپ کو بتاسکوں گا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ آیا ریاستِ پاکستان کو فریق بنانا ممکن ہو سکے گا یا نہیں۔''

سفیر نے اس کی جانب مصافحے کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو سلطان نے بھی سمجھ لیا کہ یہ ملاقات کا اختتام ہے۔ چنانچہ اس نے بھی کھڑے ہو کر سفیر سے ہاتھ ملایا۔ دوسری جانب موجود پریس اتاشی، اتارنی اور سیکریٹری کی جانب جھک کر ان سے رخصت ہوا اور مضبوط قدم رکھتا ہوا آفس سے نکل گیا۔

''یہ کیا حماقت کا شاہکار پکڑ لائے تھے تم..... کس قسم کی باتیں کر رہا تھا یہ..... ایسے لوگوں کو منہ لگانا..... کم از کم آپ سے تو یہ توقع نہیں تھی مجھے۔'' اس کے باہر نکلتے ہی سفیر صاحب اپنے پریس اتاشی پر برس پڑے اور سلطان کے حوالے سے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔

''جانے دیں سر! وہ ایک جذباتی سا بندہ ہے۔ اس طرح کی باتیں اس کی کلاس کے بہت سے لوگ سوچتے ہیں اور بہت کچھ کر گزرنے کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ اس کی ہم خیال ایک خاصی بڑی لابی بھی اس کے ساتھ ہے۔ جس نے مجھ پر کچھ ایسا دباؤ ڈالا کہ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کی آپ کے ساتھ ایک میٹنگ ضرور کروا دوں۔ آپ نے خاصے اچھے طریقے سے اسے ہینڈل کر لیا ہے۔ اب وہ انتظار کرتا ہی رہے گا۔'' پریس اتاشی نے بدمزگی سے جواب دیا۔

''ہم م م م..... اب اگر وہ رابطہ کرے تو آپ خود ہی اسے ٹال دیجیے گا۔ میرے پاس لانے کی زحمت مت کیجیے گا۔'' سفیر صاحب نے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اٹھ کر اپنے آفس کی طرف بڑھ گئے۔ لابی سے گزرتے ہوئے انہوں نے دائیں جانب یو این ڈیسک کی طرف نظر ڈالی تو وہاں کمپیوٹر پر جھکی ہوئی صبیی نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ لیکن ان کے پاس بتانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں تو وہ کیا کرتے۔ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی ڈیڈ! سلطان کی بات غلط تو نہیں ہے۔ اگر وہ ایک چور سے پاکستان کی دولت واپس لینا چاہتا ہے تو اس میں غلط کیا ہے؟'' دونوں باپ بیٹی ڈنر کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے صبیی نے صبح کی کارروائی سنتے ہوئے کہا تو اس کے لہجے سے جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

''اصولی طور پر تو غلط نہیں ہے لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں ہے..... تم سمجھ سکتی ہو۔'' انور بیگ صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

صبیی نے ان کے لب و لہجے سے اندازہ کر لیا کہ ڈیڈ کتنی ہی کوشش کریں شاید اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر پائیں گے کیونکہ اوپر والے اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے۔ وہ کچھ مایوس سی ہو کر رہ گئی۔ وہ سلطان کو اس سلسلے میں اچھی خبر دینا چاہتی تھی لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ فی الوقت شاید یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔

کھانے کے بعد دونوں باپ بیٹی اپنے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ صبیی نے بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ آن کیا۔ ایف/بی پر کچھ دیکھتی رہی۔ شاید کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے فرینڈز کی لسٹ کو رول کرتے ہوئے آخر کار ایک نام کو تلاش کر ہی لیا۔

''یس یہی ہے اس کا ای میل ایڈریس۔'' اس نے ایڈریس تلاش کیا اور ایک مختصر میل اپنے مطلوبہ شخص کو بھیج دی۔ تھوڑی ہی دیر میں نہ صرف میل کا جواب موصول ہوا بلکہ وہ خود بھی آن لائن آ گیا۔

''ہائے صبا! آج اتنے دنوں بعد تمہیں میری یاد کیسے آگئی؟ بہرحال مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیسی ہو؟ کیا حال چال ہیں؟''

''سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک...... مزے میں زندگی گزر رہی ہے، تم سناؤ...... تم نے لاء کی ڈگری تو لے لی تھی۔ اب کیا پریکٹس کررہے ہو؟ یا کوئی اور مصروفیت ہے آج کل؟'' صبی نے پوچھا۔

''لاء پڑھا ہے۔ تو اسے استعمال بھی کروں گا نا...... میں خود پریکٹس کرتا ہوں۔ میرا شعبہ تارکینِ وطن سے متعلق معاملات کی قانونی پیروی کرنا ہے پھر کچھ وقت اپنی این جی او کو بھی دیتا ہوں۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری این جی او کیا کرتی ہے؟''

''دراصل ہم یہاں رہنے والے کچھ پاکستانی لائرز نے ایک ہم خیال گروپ بنا رکھا ہے اور ہم ان پاکستانیوں کی قانونی مدد کرتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے بعض مشکلات کا شکار ہوجاتے ہیں اور انہیں قانونی مدد درکار ہوتی ہے۔''

''او مائی گاڈ! کس قدر زبردست کام کررہے ہو تم لوگ...... عبداللہ! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں...... فوری طور پر...... کیا تم مجھے کچھ وقت دے سکو گے؟''

''ہاں آں...... لیکن صبا! تم جیسی توپ چیز کو ہم جیسے معمولی لائرز سے کیا کام پڑگیا ہے بھئی؟''

''میں کہاں کی توپ چیز ہوں بھئی؟ یہ تم کس قسم کا خطاب دے رہے ہو مجھے؟ بہرحال مجھے وقت بتاؤ اور اپنے آفس کا پتا بھی...... تاکہ میں وہاں پہنچ سکوں۔''

''اوہوہو...... بڑی جلدی ہے مجھ سے ملنے کی؟ کیا میں کسی اچھی سی خوش فہمی میں مبتلا ہوجاؤں؟'' اس نے مزاحاً کہا۔

''ضرور ہوجاؤ...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے کہتے ہیں کہ خوش فہم انسان...... دنیا کا خوش ترین انسان ہوتا ہے لہٰذا تم بھی خوش رہو اور جلد سے جلد اپنا فون نمبر، آفس ایڈریس اور ملنے کا ٹائم مجھے سینڈ کردو...... تھینکس...... ملتے ہیں بریک کے بعد۔''

صبی نے لیپ ٹاپ بند کیا اور لیٹ کر کمبل سر تک کھینچ لیا۔

اگلی صبح اس نے اپنے آفس سے ہی سلطان کو فون کیا۔

''ہیلو ہینڈسم! کیسے ہو؟ تم آج شام چار بجے میرے ساتھ کہیں چل رہے ہو۔ مجھے تمہیں کسی سے ملانا ہے اس لیے کم از کم ایک گھنٹے کا بریک لے لینا۔'' اس نے حسبِ عادت جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

''کیا دوبارہ سفیر صاحب سے ملوانا چاہ رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں بتادوں کہ بیکار ہی ہوگا۔ کیونکہ ان سے ایک بار مل کر ہی میں نے اندازہ کرلیا کہ ان میں پاکستانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور ہمارے جیسی سوچ ان کے لیے پاگل پن کے سوا کچھ اور نہیں۔'' سلطان نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''کیا انہوں نے تم سے ایسا کہا؟'' صبی نے سوال کیا۔

''جس طرح نفسِ مضمون میں بہت سی باتیں بین السطور بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سادہ گفتگو میں بھی بہت معانی پوشیدہ ہوتے ہیں جو تھوڑی سی توجہ سے بہ آسانی سمجھے جاسکتے ہیں اور ان سے جو گفتگو ہوئی، میں نے اس سے بہ آسانی سمجھ لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔'' سلطان نے اپنا تجزیہ اسے بتایا۔

''ہم م م م...... تو پھر تم کیا اپنے دعوے سے دستبردار ہوجاؤ گے؟ یا دوسرے الفاظ میں تم نے اٹھانے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے ہیں؟'' صبی نے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں ہتھیار پھینک کر خاموش ہوکر بیٹھ جاؤں گا۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں دراصل وقتی طور پر پیچھے ہٹ گیا ہوں کیونکہ طاقتور دشمن سے کس طرح نمٹا جائے اس کی اسٹریٹجی طے کرنا پڑے گی اور پاکستانی سفارت خانے سے مایوس ہوجانے کے بعد میرے پاس اور کیا آپشنز ہوسکتے ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑا سوچنا ہوگا اور میں آج کل یہی کام کررہا ہوں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''گڈ! میں اسی سلسلے میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہ رہی ہوں۔ ابھی اس کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے ملاقات پر ہی بات ہوگی۔ پونے چار بجے میں تمہیں پک کرلوں گی...... تم مجھے باہر ہی ملنا، اوکے۔''

ٹھیک چار بجے وہ دونوں بروکلین میں واقع پاکستان لائرز فورم کے معمولی سے آفس میں بیٹھے تھے۔ چند میزیں تھیں جن پر چار پانچ ینگ لائرز بیٹھے کام بھی کررہے تھے اور فائلوں میں لپٹے ہوئے کچھ کیسز کو ڈسکس بھی کررہے تھے۔ وہیں ایک ٹیبل پر عبداللہ بھی موجود تھا۔

''اوہو، بڑے بڑے مہمان آئے ہیں بھئی۔''

عبداللہ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور سلام دعا کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔

''صہبا! تم ویسی کی ویسی ہی ہو...... جیسا میں نے تمہیں تین چار سال پہلے آخری مرتبہ دیکھا تھا، نوچینج۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''اوہ...... مجھے افسوس ہے کہ تمہاری توقعات کے برعکس...... میں اب تک ویسی کی ویسی ہوں۔ حالانکہ تین چار سالوں کے طویل عرصے میں تو مجھے بڈھی پھونس ہو جانا چاہیے تھا۔ سفید بال، چہرے پر جھریاں اور کمر جھکی ہوئی، وغیرہ وغیرہ۔'' صبی نے ٹھیک ٹھاک جواب پکڑایا تو وہ زور سے ہنسا۔

''باتیں بھی ویسی کی ویسی ہیں...... نوچینج...... خیر، یہ بتاؤ کہ کیوں ملنا چاہ رہی تھیں تم؟ کوئی قانونی قسم کا کام پڑ گیا ہے کیا؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ یہ مسٹر سلطان ہیں۔ ہالینڈ سے اِن کے ایونٹ مینجر اور میرے بہت اچھے دوست۔ معاملہ ان کا ہے اور اس بارے میں ساری بات یہ کریں گے اور میں صرف یہ چاہوں گی کہ اگر قانونی طور پر یہ ممکن ہو سکے جو یہ چاہتے ہیں تو تم اور تمہاری این جی او ان کی بھرپور مدد کرے...... پاکستانی ہونے کے ناتے یہ تم لوگوں کے لیے بھی ایک ٹیسٹ کیس ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اب تم ان کی سنو۔'' صبی نے سلطان کی طرف اشارہ کیا۔

''جی مسٹر سلطان! جو بھی کہنا ہے بے جھجک کہیے۔ یہاں سب پاکستانی بیٹھے ہیں اور ہمارا تو کام ہی یہی ہے کہ ہم پاکستانیوں کو قانونی امداد فراہم کریں۔ وہ بھی مفت...... اس لیے ہماری نیتوں پر شک کرنا، زیادتی ہوگی...... فرمائیے۔'' عبداللہ نے سلطان کو حوصلہ دیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہوں گے کہ پچھلے دنوں ہالینڈ اِن میں 'جیمز اینڈ جویلز' نام کی ایک نمائش چل رہی تھی......'' سلطان نے اپنی بات پوری تفصیل سے سنانا شروع کی اور اس کی باتیں صرف عبداللہ نے نہیں سنیں بلکہ وہاں باقی جو چار پانچ قانون داں تھے وہ بھی پوری توجہ سے سن اور سمجھ رہے تھے۔

اسی دوران ایک لڑکا ان سب کے لیے چائے رکھ گیا۔ خالص پاکستانی اسٹائل کی دودھ پتی۔ جس میں سے الائچی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سلطان آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ وہ سب خاموشی اور مکمل توجہ سے اسے سنتے رہے۔ صبی نے کھڑکی کے بلائنڈ سے باہر دیکھا۔ برف گرنا شروع ہو گئی تھی۔ ہلکے ہلکے روئی کے گالوں جیسی برف فضا میں اُڑتی پھر رہی تھی۔

''تو اب آپ کیا چاہتے ہیں سلطان صاحب؟'' اس کی بات ختم ہوتے دیکھ کر عبداللہ نے سوال کیا۔

''پہلی بات تو میں یہ چاہتا ہوں کہ سلطان کے ساتھ یہ 'صاحب' کا لاحقہ نہ لگایا جائے...... اور دوسری بات جو میں چاہتا ہوں وہ یہ کہ پاکستان کی دولت...... پاکستان کو واپس ملنا چاہیے اور اسے چوری کرنے والے کو سزا۔'' سلطان نے کہا تو بعض چہروں پر زیرِلب مسکراہٹ سی پھیلی اور پھر وہ سنجیدہ ہو گئے۔

''او کے سلطان! آپ کی بات میں دم ہے۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناتے میں اصولی طور پر آپ سے بالکل صد فیصد متفق ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے یہاں کے قانون میں اتنی گنجائش ہے کہ آپ کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک سرسری خیال ہے۔ اس بارے میں یہاں کے قوانین کو کھنگالنا ہو گا اور یہ دیکھنا ہو گا کہ اگر ہم اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو ہماری کامیابی کا امکان کتنے فیصد ہو گا۔ ہم لوگ دراصل زیادہ تر امیگریشن والے کیسز میں الجھے رہتے ہیں اس لیے ان قوانین میں تو ہم رواں ہیں۔ لیکن یہ ذرا نیا ہے ہمارے لیے...... اس لیے اس پر تھوڑا ہوم ورک کرنا ہو گا۔ آپ ہمیں تھوڑا وقت دیجیے...... پھر میں آپ سے خود رابطہ کروں گا۔''

اور پھر سب خوش گوار ماحول میں ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

واپسی میں ہلکی پھلکی برف کے گرنے سے موسم خوب صورت لگ رہا تھا لیکن ٹھنڈک بھی مزاج پوچھ رہی تھی۔ سلطان کو واپس ہوٹل ڈراپ کر کے وہ واپس ہونے لگی تو سلطان نے اسے کافی کی آفر کر ڈالی۔

''اتنی سردی ہو گئی ہے...... آجاؤ، میں تمہیں زبردست سی کافی پلواتا ہوں اور ہماری معرکتہ الآرا پیسٹریاں یقیناً زبردست مزہ دیں گی...... یو نو! موسم کا تقاضا ہے...... آجاؤ، آجاؤ۔'' سلطان نے اسے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر اصرار کیا تو وہ بھی ٹھنڈی سانس بھر کے اتر آئی۔

''مجھے اچھی طرح اندازہ ہو رہا ہے کہ بہت جلد مجھے آفس سے ایک شوکاز نوٹس ملنے والا ہے کہ کیوں نا آپ کے

گا ہے پتا ہے اس طرح آفس سے غائب ہونے کی وجہ سے آپ کو یہاں سے مستقل طور پر غائب کردیا جائے۔ لہٰذا اب آپ گھر بیٹھیں...... اور ہمیں معاف فرمائیں۔'' صبی نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً تمہارے باپ کا راج ہے۔ کس کی مجال ہے کہ تمہیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت کرے۔ تمہارے لیے تو وہاں پر سات خون معاف ہیں اور تم ایسے شو کرتی ہو جیسے بڑی سخت نوکری کررہی ہو، رہنے دو۔'' سلطان نے اس کی کوشش پر پانی پھیر دیا۔

''تم باز نہیں آؤ گے...... مجھے طعنے دیے بغیر تو شاید تمہارا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ اُف مائی گاڈ! میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟''

اس نے ڈراما بولنے کی کوشش کی تو سلطان نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ اس نے غصے میں اسے گھونسا دکھایا تو سلطان ہنس پڑا۔

''پبلک پلیس پر بے عزتی کرو گی کیا؟ چلو۔''

''ویسے تمہارا کیا خیال ہے صبی! کیا عبداللہ اس سلسلے میں کچھ کرسکے گا؟'' وہ دونوں لابی میں ایک کافی ٹیبل پر آکر بیٹھے تھے۔

''جہاں تک میں عبداللہ کو جانتی ہوں۔ وہ بھی تم سے کچھ کم سرپھرا نہیں ہے۔ اگر اس کے دماغ پر بھی یہ سودا سوار ہوگیا تو تم دیکھنا...... کہ وہ کسی نقصان کی پروا کیے بغیر اپنی ساری جان لگادے گا۔'' صبی نے گرما گرم بھاپ اڑاتا کافی کا کپ اٹھایا اور اپنے سرد ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ویٹر پیسٹریاں بھی سرو کر کے گیا ہے...... یہ بھی کھاؤ۔'' سلطان نے پیسٹریاں اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھنا کہ وہ اس وقت ہمارے کیس پر ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈسکس کرنے میں مصروف ہوگا اور شاید کل ہی تمہیں فون کرے۔ اس لیے تم بھی اپنی تیاری رکھنا پتا چلا کہ اس نے مکمل تیاری کے ساتھ گرین سگنل دیا تو سلطان صاحب کو سر کھجانے کی فرصت نہیں مل رہی ہے۔ مدعی سست گواہ چست والی بات ہوجائے گی۔'' وہ پیسٹری سے انصاف کرتے ہوئے بولتی گئی۔

''نہیں، اس کام کے لیے تو میں سارے کام چھوڑ سکتا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہی ہو کہ عبداللہ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ کم از کم کچھ تو میرا حوصلہ بڑھے گا۔'' سلطان نے امید ظاہر کی۔

تین چار دن بعد ہی سلطان کو عبداللہ کا فون موصول ہوا۔

''سلطان! جس دن تم سے بات ہوئی تھی، اسی دن سے ہم یہاں کے قوانین کی کتابیں کھنگالنا شروع ہوگئے تھے...... اور اپنے مطلوبہ کیس کے سلسلے میں بھی ہمیں کافی حد تک معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ کافی غور خوض کے بعد ہم لوگوں نے...... یعنی میں نے اور میرے ساتھیوں نے...... ایک لائن آف ایکشن کا انتخاب کیا ہے۔ تم تھوڑا وقت نکال کر یہاں چکر لگاؤ...... ہم اس بارے میں ڈسکس کریں گے۔''

''تھینکس عبداللہ! تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے اس حوصلہ افزا رد عمل سے میری ہمت و حوصلہ کس قدر مضبوط ہوا ہے۔ میں پہلی فرصت میں تمہارے پاس آتا ہوں۔'' سلطان نے خوش ہوکر کہا۔

اگلے دن ہی اس نے تین گھنٹے کا آف لیا اور بروکلین میں واقع عبداللہ کی این جی او کے آفس پہنچ گیا۔ ان سب نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔

''ہاں بھئی، کیا تیاری ہے؟'' اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

''بھئی تیاری تو ابھی کوئی شروع نہیں کی ہے۔ فی الحال تو ہم چھ سات لوگوں نے مل کر قانون کی کتابوں کو کھنگالا ہے اور ان دفعات کا جائزہ لیا ہے جن کے تحت یہ مقدمہ دائر کیا جاسکتا ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ یہاں کے قانون میں تمہارے کیس سے متعلق کافی گنجائش ہے۔'' عبداللہ نے بتایا تو سلطان خوش ہوگیا۔

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب کرنا کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''کرنا یہ ہے کہ ملینز آف ڈالرز کا معاملہ ہے۔ اس کا مدعی کوئی ہمارے تمہارے جیسا عام آدمی ہوگا تو بات بننا مشکل ہوگی۔ کیونکہ سامنے جو شخص ہے وہ نہ صرف بہت زیادہ دولت مند...... بلکہ کافی اثر و رسوخ کا بھی مالک ہے اور جبکہ جواہرات جن کی ملکیت کا دعویٰ کیا جائے گا وہ ہم میں سے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہے ہیں بلکہ خود ہمارا مؤقف بھی یہی ہوگا کہ یہ ریاست پاکستان کی ملکیت ہیں اور انہیں ریاست پاکستان کو واپس دلوایا جائے...... لہٰذا اگر ہم مقدمہ دائر کرتے ہیں تو مدعی ریاستِ پاکستان کو بنانا ہوگا۔'' عبداللہ نے صراحت سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے...... ریاستِ پاکستان کو مدعی بنالو...... اس میں کیا مشکل ہے؟'' سلطان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مشکل کوئی نہیں...... بات صرف فریق بنانے کی نہیں ہے۔ فریق ایسا کہ جس کے مؤقف کا دفاع کرنے والا ایک طاقتور، پُراثر حیثیت رکھنے والا ہو...... نہ کہ ہمارے اور تمہارے جیسا کوئی عام سا آدمی۔''

''ایسا کون ہوسکتا ہے؟'' سلطان نے سوال کیا۔

''ہاں، یہ ہے نا ملین ڈالر کا سوال...... دیکھو بھئی سلطان محمد خان کے بجائے اگر پاکستانی ایمبیسیڈر کی طرف سے یہ دعویٰ دائر کیا جائے تو بات بنتی ہے...... کیونکہ ہمارے سفیر...... یہاں ریاستِ پاکستان کے نمائندے...... اور اس کے مفادات کے تحفظ کے ضامن ہیں، یہ ان کی ڈیوٹی ہے کہ وہ پاکستان کے مفادات کے لیے کام کریں اور اس مقدمے کو ان کے توسط سے دائر کیا جائے...... تو نتائج حوصلہ افزا آنے کے چانسز بڑھ جائیں گے۔'' عبداللہ نے کہا تو سلطان نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''وہ نہیں مانیں گے۔''

''کیوں نہیں مانیں گے...... تم ان کے سامنے اپنا مؤقف رکھو...... انہیں تفصیلات بتاؤ...... انہیں آمادہ کرو اس بات پر...... بلکہ ایسا کرو کہ صہبا کو بھی ساتھ لے جا۔ وہ بھی تو وہیں ہوتی ہے پھر اس کے فادر...... پریس اتاشی ہیں وہاں...... ہوسکتا ہے کہ تم لوگ مل کر اپنے سفیر صاحب کو اس بات کے لیے راضی کر ہی لو۔''

''گیا تھا میں ان کے پاس...... اول تو ان سے ملاقات کا موقع ہی صہبا کی وجہ سے ملا۔ پھر میں نے ان کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی...... لیکن مجھے اندازہ یہ ہوا کہ انہوں نے میری بات کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا۔'' اس نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں...... ایک بار ٹال دیا نا...... تو دوبارہ جاؤ...... اور انہیں یہ بتاؤ کہ تم نے بہت سے لائرز سے یہ کیس ڈسکس کیا ہے اور کیونکہ انہوں نے بتایا ہے کہ یہاں کے قانون میں اس کی کافی زیادہ گنجائش موجود ہے۔ اس لیے تم چاہتے ہو کہ وہ صرف مدعی بننے کے لیے راضی ہوجائیں۔ باقی سب کام تو ہم کو ہی کرنے ہیں جس حد تک وہ ہیلپ کرسکتے ہوں کردیں...... ورنہ یہ لڑائی ہم خود لڑیں گے انہیں زیادہ زحمت نہیں دیں گے۔'' عبداللہ نے اس کی ہمت بندھائی پھر اس کی مایوس شکل دیکھ کر مسکرایا۔

''دیکھ یار! ایک بات اچھی طرح گرہ میں باندھ لے...... یہ جو کچھ کرنے کا تو نے ارادہ کیا ہے نا...... یہ کوئی پھولوں بھرا راستہ نہیں ہے۔ اس راستے میں بے شمار ہرڈلز آئیں گی۔ ایک کے بعد ایک رکاوٹ...... اگر تجھ میں ان رکاوٹوں کو کامیابی سے عبور کرنے کا حوصلہ ہے تو سفر کی ابتدا کر...... ورنہ ابھی سوچ لے۔ اگر ایک مرتبہ ابتدا کردی تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ اس لیے اچھی طرح سوچ لے۔'' عبداللہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ یہ بہت مشکلات میں ڈالنے والا کام ہے لیکن میں بھی کم ہمت نہیں ہوں۔ میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میں پاکستان کو اس کا حق دلانا چاہتا ہوں۔ چاہے مجھے اس کے لیے کتنی بھی پریشانیاں اور مشکلات جھیلنی پڑیں۔'' سلطان نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''سوچ لے، سب سے پہلے تو تیری جاب ختم ہوجائے گی۔ تیرے پاس اس کا کوئی متبادل ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم پیچھے پاکستان میں تیری فیملی پریشان ہوگی، مالی مسائل پیدا ہوجائیں گے اور تو مجبور ہوجائے گا۔'' عبداللہ نے اسے ڈرایا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں کا شہری ہوں۔ سالہا سال ہوگئے مجھے یہاں ڈالر کماتے...... پاکستان کافی پیسے بھیجے میں نے...... اس سے بابا نے وہاں ایک بڑا اسٹور کھول لیا ہے جو بہت اچھا چل رہا ہے۔ بہن پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن گئی ہے اور دونوں چھوٹے بھائی اپنی انجینئرنگ کرچکے۔ ایک کو واپڈا میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے دوسرا بابا کے ساتھ اسٹور پر ان کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ اب وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں بھی میری جاب ایسی ہے کہ قیام وطعام ہوٹل کی ذمے داری ہے تو کچھ زیادہ اخراجات ہی نہیں ہیں۔ اچھی خاصی سیونگز ہیں میری...... جو میں نے ایک دو جگہ انویسٹ بھی کررکھی ہیں۔ اس لیے اگر جاب ختم بھی ہوجاتی ہے تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' سلطان مطمئن تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے یار! کیونکہ یہاں رہنے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ بس تو پھر بسم اللہ کر...... اپنی پہلی ہرڈل پار کر...... اپنے سفیر صاحب کو راضی کرجا کر......'' عبداللہ نے خوش ہوکر کہا۔

''یہی سب سے مشکل کام ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ انہیں کس طرح راضی کروں۔ وہ تو بالکل ہی ہوپ لیس کیس ہیں۔'' سلطان پریشانی سے بولا۔

''دیکھ یار! تو ایک بار پھر اپنی طرف سے پوری کوشش کرلے...... ورنہ پھر کوئی اور راستہ دیکھتے ہیں۔ اگر ہم نے طے کرلیا ہے کہ آگے بڑھنا ہے...... تو کوئی ساتھ دے یا نہ دے...... ہم آگے بڑھتے ہی رہیں گے۔ اب لوگ اس کو پاگل پن کہیں یا جنون...... کرنا ہے تو کرنا ہے...... تو بس ایک بات کو ذہن میں رکھنا...... کہ ہم سب...... ہر حال میں تیرے ساتھ ہیں۔ اوکے! تو اپنی کوشش کرلے پھر مجھے بتانا...... کہ وہ راضی ہوئے یا نہیں۔ ہمارا ہوم ورک جاری ہے اور جاری رہے گا۔ پوری تیاری تک...... ٹھیک ہے۔'' عبداللہ نے مضبوط لہجے میں کہا تو سلطان سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سلام دعا کرکے رخصت ہوگیا۔

اگلے کئی دن وہ سفیر سے ملنے کی کوششیں کرتا رہا لیکن انہوں نے ٹائم ہی نہیں دیا۔ اس نے صبیی سے مل کر شکوہ کیا۔

''صبیی! یہ ہمارے ملک کے سفیر ہیں یا کوئی بادشاہ سلامت...... میں کئی دن سے ان سے ملاقات کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ مختلف بہانوں سے مجھے ٹال دیتے ہیں، آخر مسئلہ کیا ہے؟'' اس کے انداز میں جھنجلاہٹ سی تھی۔ صبیی کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی۔

''تمہارے خیال میں کیا مسئلہ ہوسکتا ہے؟'' اس نے جواب میں بھی سوال کردیا۔

''شاید وہ میرے پاگل پن میں شامل ہونا نہیں چاہتے۔''

''مجھے افسوس ہے مگر تمہاری بات درست ہے۔ یہ اور ان کے جیسے سارے لوگ مصلحتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی ان کا لائف اسٹائل بن گیا ہے کہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرو، ملک اور قوم جائے بھاڑ میں۔ عزت، دولت اور اسٹیٹس...... صرف اپنے اور اپنی اولادوں کے لیے...... باقی سب ربش۔'' صبیی بھی شاید توقع ٹوٹنے پر برگشتہ تھی۔

''اوہو...... بھئی ان سے ہم کوئی مالی تعاون تھوڑی چاہتے ہیں۔ ہمیں تو صرف ان کا نام چاہیے...... مدعی کی حیثیت سے...... اس میں ان کا نقصان کیا ہے؟''

''نقصان، اگر فرض کرو ہم یہ مقدمہ ہار جاتے ہیں تو انہیں نہ صرف سبکی برداشت کرنا ہوگی بلکہ ہوسکتا ہے پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے ان کی سفارت ہی ختم کردی جائے یہاں سے...... یہ نقصان ہوگا۔'' صبیی نے سمجھایا۔

''بھئی وہ سفارت کار ہیں۔ یہاں سے ہٹیں گے تو کسی اور ملک میں لگا دیے جائیں گے، گھر تو نہیں بٹھا دیے جائیں گے۔''

''چھوڑو سلطان، ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اپنے طور پر کرنا ہے۔ ہم پوری طاقت سے لڑیں گے۔ انجام کی پروا کیے بغیر۔ ہم مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر...... پوری جان لڑائیں گے۔ کیونکہ ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

صبیی کے لہجے میں مضبوط ارادوں کی جھلک تھی جو سلطان کو بہت اچھی لگی اور اس کا ذہنی تناؤ یک دم کافی ہلکا ہوگیا۔ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''بالکل ٹھیک...... چلو، پھر چلتے ہیں عبداللہ کے پاس۔''

وہ سب بڑی دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے اور آخرکار یہ طے کرکے اٹھے کہ مقدمہ سلطان کی مدعیت میں دائر کیا جائے گا۔ عبداللہ اور اس کے تمام ساتھی اس کے قانونی مددگار ہوں گے۔ صبیی میڈیا سنبھالے گی۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا...... دونوں جگہ اس مقدمے کو ایک مقدمے کی ہی طرح لڑے گی اور وہ سب مل کر ایک ایسی ٹیم بنالیں گے جو اس سے متعلق ثبوت وشواہد جمع کرے گی۔

''سرپھروں کی کمی نہیں ہے یہاں...... ہزاروں میل دور ہیں وطن سے لیکن ذرا سی مشکل آن پڑے وطن کو...... جنونیوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اپنے اپنے محاذ پر۔ تم دیکھنا! ہمیں بھی اس سفر میں بہت سے ساتھی مل جائیں گے۔ بس مایوس ہوکر ہتھیار مت ڈال دینا۔ لڑتے رہنا...... آخری وقت تک...... سب کچھ ملے یا نہ ملے...... لیکن بہت کچھ پھر بھی ضرور ملے گا۔ اپنے ملک کی شناخت...... اپنے پاکستانی ہونے کی پہچان...... اور کم از کم ایسے لوگوں کو ایک تنبیہ کہ اگر آج تم ہمارے ملک سے چوری کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے ہو تو کبھی نہ کبھی...... کہیں نہ کہیں...... کوئی نہ کوئی سرپھرا...... تمہیں پکڑ لے گا۔ اس لیے مشتری ہوشیار باش۔'' وہ سب ہنستے مسکراتے، مضبوط ارادوں کے ساتھ اگلے مرحلوں کی تیاری میں جت گئے۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بجے تھے۔ رٹگر یونیورسٹی نیوجرسی میں طلبہ کا ہجوم نظر آیا۔ کچھ کلاسز ختم ہوئی تھیں۔ کچھ شروع ہونے والی تھیں اور اس تبدیلی کے وقفے میں وہ سب اِدھر اُدھر

گھومتے نظر آرہے تھے۔ یونیورسٹی کی طویل و عریض لائبریری میں بھی طلبہ کی قابلِ ذکر تعداد موجود تھی اور لائبریری کا کمپیوٹر کارنر تقریباً فل تھا۔

اشعر کو اچانک پیغام موصول ہوا۔

''نیوز چیک کرا شعر...... بڑی انٹرسٹنگ نیوز چل رہی ہیں۔'' اس نے جلدی سے نیوز چینل کھولا تو واقعی ایک زبردست نیوز تقریباً ہر چینل پر چل رہی تھی۔

''مشہور کروڑپتی مسٹر آرتھر ایشلے پر چوری کا الزام...... جواہرات چوری کر کے لائے اور انہیں نمائش میں بھی رکھا۔ ایک پاکستانی کا الزام۔''

''مسٹر آرتھر ایشلے...... دی گریٹ تھیف۔''

''مسٹر ایشلے کی دولت مندی چوری کی مرہونِ منت ہے۔''

''مسٹر آرتھر ایشلے کا قیمتی کلیکشن سارے کا سارا چوری کے جواہرات پر مشتمل ہے اور یہ سب پاکستان سے چوری کیے گئے ہیں۔''

اشعر ہر چینل پر نیوز چیک کررہا تھا جہاں یہ ہاٹ کیک کی طرح چل رہی تھیں۔

''کیا یہ بات صحیح ہے؟'' اب یہ سوال ہر کمپیوٹر پر گردش کررہا تھا۔

''پتا نہیں...... لیکن اتنے قیمتی جویلز پاکستان جیسے غریب ملک کے پاس آئے کہاں سے...... جہاں سے ایشلے نے انہیں چوری کیا؟'' اشعر کے اسکرین پر دوسرا سوال ابھرا۔ وہ سب کانفرنس پر آگئے تھے۔ یہ سب دوست پاکستان سے آنے والے خاندانوں کے بچے تھے جو پیدا تو نہیں ہوئے تھے لیکن والدین کے توسط سے پاکستان سے روابط رکھتے تھے۔

''کیس کس نے کیا ہے؟ کیا گورنمنٹ آف پاکستان نے؟''

''نہیں، گورنمنٹ نے تو نہیں کیا۔ یہ تو کوئی عام پاکستانی شہری ہے۔''

''انٹرسٹنگ...... ایک عام آدمی کے پاس اتنے وسائل ہیں کیا...... جو اس کیس کو فیصلہ ہونے تک لڑ سکے؟ آفٹر آل ایشلے کروڑپتی ہے۔''

''نیوز کو تفصیل سے دیکھ۔ یہاں کے دو بڑے بزنس پیلز نے اخراجات کی ذمے داری اٹھانے کا اعلان کیا ہے، وہ بھی پاکستانی ہیں۔''

''اور کیس لڑے گا لائرز کا پورا ایک پینل...... جس میں تقریباً دس قانون داں ہیں...... بغیر کی معاوضے کے۔''

''ویس گڈ یار! ہم سب بھی تو پاکستانی ماں باپ کی اولادیں ہیں۔ ہمارے اندر بھی تو پاکستان کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ میں تو ابھی اس بارے میں ایک پیج بناتا ہوں۔ اس پر ہم اس پاکستانی کو مورل سپورٹ دینے کی کوشش کریں گے۔ جس نے یہ بہادری دکھائی ہے۔''

''ٹوئیٹر اور بلاگز پر بھی ہونا چاہیے یہ سب کچھ۔''

''ٹھیک ہے، ہم سب اس بارے میں سب کچھ کریں گے...... گو آن گائیز۔''

یہ سب کچھ صرف رنگر یونیورسٹی میں نہیں ہورہا تھا بلکہ ہر اس جگہ ہورہا تھا جہاں پاکستانی موجود تھے اور ان سب کے خیال میں یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس میں ان سب کو اپنا حصہ ڈالنا ضروری تھا۔ بے شمار نوجوانوں نے اپنے نام اس کمیٹی میں شامل کرنے کے لیے ارسال کردیے تھے۔ جس کے ذمے ''فیکٹ فائنڈنگز'' کا کام لگایا جارہا تھا۔

یہ کیس اس قدر دلچسپ تھا کہ صرف پاکستانی ہی نہیں دوسرے لوگ بھی اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ آرتھر ایشلے کے بحیثیت چور سامنے آنے پر ہر شخص اپنے ملک کے اس کروڑپتی کی شخصیت کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اب ہر جگہ اس کی ذات لوگوں کا موضوعِ گفتگو بنی ہوئی تھی۔ ہر شخص اس کے بارے میں اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ اپنی اپنی معلومات شیئر کررہا تھا۔ غرض یہ کہ اخبار، میگزینز اور نیٹ پر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اس کیس کے حوالے سے۔

''ہاہاہا...... ایک ایسا غریب ملک جہاں کی ستر فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہو، وہ اس قدر قیمتی جویلز کی ملکیت کی دعویدار بنے؟ کیا بات ہے؟ ارے یہ ایک لطیفہ ہے بھئی...... ہنسو...... ہاہاہاہا......''

''جس ملک میں اتنے قیمتی جواہرات...... پتھروں کی طرح بکھرے پڑے ہوں...... وہاں غربت کا راگ الاپنا...... سوائے دھوکے کے اور کچھ نہیں ہے۔ امداد دینے والے ممالک کو ہوشیار ہوجانا چاہیے۔''

یہ اور ایسے ہی ہزاروں میسیجز نیٹ پر ہر طرف گردش کررہے تھے۔ لوگ اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے۔

☆☆☆

کورٹ میں اس عجیب و غریب کیس کی شنوائی جاری تھی۔ جج، جیوری ارکان، وکلا اور بے شمار سننے والوں کے ساتھ آج مدعی اور ملزم بھی موجود تھے۔ آرتھر ایشلے کا دفاع کرنے کے لیے شہر کے ایک معروف وکیل...... اپنی ٹیم کے

ساتھ موجود تھے تو دوسری جانب مدعی کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بھی وکلا کا ایک پورا پینل موجود تھا۔

جج نے ایک طائرانہ سی نگاہ پورے کورٹ روم میں ڈالی پھر وکلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروسیڈ کا لفظ کہا۔ مدعی کی طرف سے ایک معروف وکیل سلمان احمد کھڑے ہوئے اور قانونی زبان میں اپنے مؤکل کے دعوے کو عدالت کے سامنے دہرایا۔ پھر بات وہاں سے شروع کی جہاں پچھلی پیشی پر ختم ہوئی تھی۔

”می لارڈ! میں ملزم آرتھر ایشلے سے کچھ سوالات کرنے کی اجازت چاہوں گا۔“ سلمان احمد نے جج کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

”مسٹر ایشلے! پچھلے دنوں آپ نے ’جیمز اینڈ جویلز‘ نامی نمائش میں اپنے بعض نہایت شاندار اور قیمتی جواہرات رکھے تھے۔ اور لوگوں سے بڑی داد و تحسین وصول کی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس صرف یہی جواہرات ہیں یا ان کے علاوہ اور بھی ہیں؟“

”اور بھی ہیں..... لیکن سب سے زیادہ شاندار اور قیمتی وہی ہیں جو نمائش میں رکھے گئے تھے۔“ ایشلے نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”گڈ..... مسٹر ایشلے! نمائش میں رکھے جانے والے تمام قیمتی جواہر آپ نے کہیں سے خریدے ہیں؟ یا کسی اور ذریعے سے حاصل کیے ہیں؟“ سلمان احمد کے اس سوال پر ایشلے نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اس طرح کی قیمتی چیزیں خرید کر ہی حاصل کی جا سکتی ہیں..... اور تو کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔“

”نہیں..... ضروری نہیں ہے۔ کسی کو دھوکا دے کر..... زبردستی کر کے یا پھر چوری کر کے بھی حاصل کر لی جاتی ہیں اس طرح کی قیمتی چیزیں۔“ سلمان احمد نے کہا۔

”ہو سکتا ہے..... لیکن میں نے ایسا کوئی حربہ استعمال نہیں کیا۔ میرے سارے جویلز خریدے ہوئے ہیں۔“ ایشلے نے اسی طرح روکھے انداز میں کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے مسٹر ایشلے! میں اور جواہرات کی بات تو نہیں کروں گا۔ فی الوقت آپ کے صرف ان دو جویلز کے متعلق آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں..... جو ’ایشلیز بدھا‘ اور ’ایشلیز مرمیڈ‘ کے نام سے نمائش میں رکھے گئے تھے۔ یہ آپ نے کب اور کہاں سے خریدے تھے؟“ سلمان احمد نے کٹہرے میں کھڑے ایشلے سے پوچھا۔

”میں نے ان جویلز کی ہسٹری بھی ساتھ رکھی تھی۔ وہ منگوا کر دیکھ لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔“ ایشلے نے بدمزاجی سے کہا تو سلمان احمد نے پلٹ کر اپنے مددگار وکلا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ نے ایک فائل ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ سلمان احمد نے اس میں لگے کاغذات دیکھتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔

”جی ہاں، آپ نے ان جویلز کی ہسٹری میں لکھا ہے کہ بائیس برس قبل آپ نے ان جواہرات کو حاصل کرنے کے لیے..... دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سفر کیا اور بے پناہ صعوبتیں اٹھانے کے بعد آپ انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ وہ کون سے پہاڑ تھے جہاں آپ نے یہ صعوبتوں بھرا سفر کیا اور وہ کہاں واقع ہیں؟“ سلمان احمد نے سوال کیا تو ایشلے ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر تھوڑا سنبھل کر گویا ہوا۔

”پہاڑوں میں سفر میں نے جواہرات کے لیے نہیں کیا تھا۔ یہ تو میرا شوق ہے کہ میں دشوار گزار پہاڑی سلسلوں میں گھومتا رہتا ہوں اور اس سلسلے میں امریکا، یورپ اور ایشیا و افریقہ کے بے شمار پہاڑی سلسلوں کو دیکھتا آ رہا ہوں..... وہاں کی خاص خاص چیزیں، موسم، ماحول، پہاڑوں کی بناوٹ اور وہاں کے لوگوں کی بود و باش کے بارے میں اتھارٹی ہوں میں اور جلد ہی اس سلسلے میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں۔ اس طرح گھومنے پھرنے کے دوران اگر وہاں سے متعلق کوئی خاص چیز مجھے نظر آتی تھی تو میں لے آتا تھا..... اور آپ جانتے ہی ہیں کہ پہاڑوں میں پتھروں کے علاوہ اور خاص کیا ہوگا تو میرے پاس بہت سی اقسام کے بے شمار پتھر جمع ہو گئے۔ ان میں سے دو یہ بھی ہیں جن کا آپ نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔“ ایشلے نے صراحت سے اپنی بات کہی۔

”آپ نے بالکل درست فرمایا ہے مسٹر ایشلے کہ پہاڑوں میں پتھروں کے علاوہ اور خاص کیا ہوگا؟ لیکن میرا سوال اب بھی یہی ہے کہ آپ نے اپنے ’بدھا‘ اور ’مرمیڈ‘ کے لیے وہ خاص پتھر..... یعنی نیلم اور زمرد کہاں سے حاصل کیا تھا؟“ سلمان احمد نے اسے گھیر لیا تھا۔

”بائیس برس قبل کی بات ہے۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں ہے۔ شاید میکسیکو کے پہاڑوں سے..... یا شاید افریقہ کے کسی پہاڑی سلسلے سے..... یا ہو سکتا ہے یورپ..... یا پھر ایشیا..... میں ٹھیک نہیں بتا سکتا۔“

ایشلے نے اٹک اٹک کر سوچ سوچ کر جواب دیا۔

''ہاں ظاہر ہے...... بیس بائیس سال پرانی بات یاد رکھنا...... کافی مشکل بات ہے لیکن آپ جن کی عمر پہاڑوں میں گھومتے پھرتے گزری ہے...... آپ ان سے متعلق تقریباً تمام چیزوں پر اتھارٹی ہیں۔ یقیناً اس بات سے تو واقف ہوں گے کہ کسی خاص قسم کے پتھر کن پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں اور وہ پہاڑ کن علاقوں میں واقع ہیں؟'' سلمان احمد نے پوچھا۔

''کسی حد تک...... کیونکہ ضروری نہیں کہ ایک قسم کے پتھر...... کسی ایک ہی علاقے میں ملتے ہوں۔ یہ ایک سے زیادہ جگہوں پر بھی ملتے ہیں اس لیے کسی پتھر کے بارے میں وثوق سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ یہ فلاں علاقے سے حاصل کیا گیا ہے۔'' ایشلے نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... مسٹر ایشلے! کیا آپ کبھی پاکستان گئے ہیں؟''

''جی ہاں، دو تین بار جا چکا ہوں۔''

''یقیناً پہاڑی علاقوں میں بھی گھومے ہوں گے۔ کن پہاڑی علاقوں میں جانا ہوا آپ کا؟''

''وہاں زیادہ بڑا اور مشہور پہاڑی سلسلہ قراقرم رینج ہے۔ وہیں جانا ہوا تھا۔''

''جیولوجی کے ماہرین کہتے ہیں کہ انہی پہاڑوں میں سب سے زیادہ سیفائر اور ایمرلڈ ملتا ہے اور وہ بھی بہت اعلیٰ کوالٹی کا...... کیا آپ جانتے ہیں؟''

''کسی حد تک...... کیونکہ میں جیولوجی کا ماہر نہیں ہوں۔''

''آپ جب قراقرم کے پہاڑی سلسلے میں گئے تو کیا آپ نے وہاں سے کچھ پتھر حاصل کیے تھے؟''

''مجھے یاد نہیں ہے۔''

''یاد کرنے کی کوشش کیجیے مسٹر ایشلے! اگر آپ کے جوئیلری کی صحیح ہسٹری ان کے ساتھ نہ ہوئی...... تو شاید اپنی شایانِ شان قیمت پر وہ فروخت نہ ہوسکیں...... آپ کو نقصان ہوجائے گا۔''

''مجھے یہاں بلا کر...... میرے قیمتی وقت...... اور میری نیک نامی کو جس طرح نقصان پہنچایا گیا ہے، اس سے بڑا نقصان تو نہیں ہوگا نادہ......'' اس مرحلے پر ایشلے کے وکیل نے مداخلت کی۔

''می لارڈ! میرے مؤکل ایک نہایت معروف انسان ہیں۔ بغیر کسی ثبوت کے ایک بے بنیاد الزام لگا کر...... انہیں اس طرح عدالت میں بار بار بلوانا...... ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ اگر مسٹر پراسیکیوٹر اپنے دعوے کے ثبوت پیش کرسکتے ہوں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ کیس کو خارج کیا جائے۔''

''ثبوت ہیں می لارڈ! ثبوت ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت تو خود مدعی ہے...... جس نے اپنی آنکھوں سے انہیں پہاڑوں میں جاتے ہوئے...... اور وہاں سے پتھر لاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' سلمان احمد نے کہا۔

''کیا آپ چشم دید گواہ ہیں مسٹر سلطان؟'' جج نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے سلطان سے پوچھا۔

''یس می لارڈ! میں انہیں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ میرے باپ کو زبردستی اپنے ساتھ ان پہاڑوں کی طرف لے گئے تھے جن میں یہ قیمتی پتھر آج بھی ملتے ہیں۔ جب یہ واپس آئے تھے تو ان کا چمڑے کا تھیلا...... اور ان کی پینٹ میں لگی ہوئی بے شمار جیبیں ان قیمتی پتھروں سے بھری ہوئی تھیں...... جو انہوں نے وہاں سے حاصل کیے تھے۔ ان میں وہ بڑے سائز کے نیلم اور زمرد بھی تھے جن سے ان کا یہ بدھا اور مرمیڈ تخلیق ہوا ہے۔'' سلطان نے ایشلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے بیس بائیس سال پہلے...... مسٹر سلطان ایک بچے ہوں گے۔ چھوٹے اور ناسمجھ بچے...... ایک سنجیدہ مسئلے پر ایک بچے کی گواہی...... اس کورٹ کے معیار سے میل نہیں کھاتی۔ ہوسکتا ہے وہاں کوئی اور گورا پہنچا ہو...... اور مسٹر سلطان مجھے سمجھ رہے ہیں۔ یہ کوئی مستند گواہی نہیں کہلائی جاسکتی۔''

''میں اس وقت اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا می لارڈ! دس گیارہ برس کا خاصا سمجھدار لڑکا تھا۔ اس وقت کے مسٹر ایشلے اور آج کے ایشلے میں کچھ اتنا زیادہ فرق نہیں ہوا ہے کہ مجھے پہچاننے میں کوئی مشکل ہو۔ میں جانتا ہوں...... یہ وہی ہیں۔'' سلطان نے زور دے کر کہا۔

''یہ کوئی فلم نہیں چل رہی می لارڈ! کہ بچپن کی یادوں کو بنیاد بنا کر...... کسی عزت دار شخص کو سوسائٹی میں تماشا بنانے کی کوشش کی جائے۔ میں اپنے فاضل دوست سے درخواست کروں گا کہ اگر کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو پیش کریں...... ورنہ مقدمہ واپس لیں۔'' ایشلے کے وکیل نے تیز لہجے میں کہا۔

''می لارڈ! میں اپنے مؤکل کی چشم دید گواہی کے علاوہ...... ایک اور ثبوت آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا

ہوں۔'' سلمان احمد نے عبداللہ سے ایک لفافہ لیا اور جج کی خدمت میں پیش کیا۔ جج نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک تصویر برآمد ہوئی۔ امتدادِ زمانہ کے باعث اس کے رنگ کچھ پھیکے سے پڑ گئے تھے۔ تاہم تصویر صاف پہچانی جا رہی تھی۔ ایک گورا اور ایک ایشیائی آدمی پہاڑوں کے پس منظر میں کھڑے تھے۔ درمیان میں ایک گدھا نظر آ رہا تھا جس پر کچھ سامان بار کیا ہوا تھا۔ پولورائیڈ کیمرے سے کھینچی گئی یہ تصویر پرانی ضرور تھی لیکن اس میں موجود افراد کے چہرے بہ آسانی پہچانے جا رہے تھے۔

جج نے تصویر کا بغور جائزہ لیا۔ پھر چشمے کے اوپر سے آرتھر ایشلے کو دیکھا اور پھر تصویر اپنے اردلی کے ذریعے جیوری کے ارکان کی طرف بھجوا دی۔

سلمان احمد نے اپنی فائل کا جائزہ لیتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔

''می لارڈ! میں نے آپ کی خدمت میں جو ثبوت پیش کیا ہے...... شاید وہ میرے مؤکل کے دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ تصویر میں موجود مسٹر ایشلے بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ اور آپ کی اور معزز جیوری ارکان کی معلومات کے لیے عرض کر دوں کہ تصویر میں موجود دوسرا آدمی...... دریا خان ہے۔ میرے مدعی کا باپ...... وہ شخص...... جس کو مسٹر آرتھر ایشلے اپنے ساتھ پہاڑوں میں لے کر گئے تھے، گھومنے پھرنے کا کہہ کر...... لیکن پھر یہ زبردستی اسے ان پہاڑوں کی طرف لے گئے جو انتہائی دشوار گزار راستوں پر تھے۔ جہاں قدم قدم پر جان کا خوف تھا۔ لیکن مسٹر ایشلے گن پوائنٹ پر اسے وہاں لے جانے پر مجبور کرتے رہے۔ آخرکار وہ وہاں پہنچے اور قیمتی پتھر وہاں سے لے کر ہی آئے۔'' سلمان احمد نے ثبوت پیش کر کے مقدمے کا رخ تبدیل کر دیا۔ اور آرتھر ایشلے جو اپنے آپ کو اس مقدمے میں ملزم ٹھہرائے جانے پر بہت ہی چراغ پا تھا، اب دفاعی پوزیشن پر آ گیا۔

''می لارڈ! ایک تصویر کے ذریعے میرے مؤکل کو مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر ایشلے کا تو زندگی بھر یہ شوق رہا ہے کہ وہ پہاڑوں، وادیوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ تصویر بھی ایسے ہی کسی بھی موقع کی ہو سکتی ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ قیمتی پتھر بھی انہوں نے وہاں سے چوری کیے ہیں؟''

ایشلے کا وکیل اس کی مدد کو آیا اور ثبوت کو ناکافی قرار دے کر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔

سلمان احمد نے گھور کر اسے دیکھا اور مڑ کر اپنے پینل میں بیٹھے ہوئے وکلا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عبداللہ نے ایک اور لفافہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے انہوں نے جج کی خدمت میں پیش کیا۔ جج نے چشمہ ناک پر ٹکا کر دوسری تصویر کو بھی بہ غور دیکھا اور اسے بھی جیوری ارکان کو بھجوا دیا۔

''می لارڈ! اس تصویر میں آپ کو مسٹر آرتھر ایشلے نظر آ رہے ہوں گے۔ جن کے ہاتھ میں تین بڑے سائز کے پتھر نظر آ رہے ہیں اور اس تصویر میں پتھروں کا نیلا اور سبز رنگ بھی نمایاں طور پر نظر آ رہا ہوگا۔ یہی وہ بدھا اور مرمیڈ ہیں۔ خام حالت میں۔''

''مسٹر ایشلے! کیا آپ اب بھی انکار کریں گے کہ یہ پتھر آپ نے وہاں سے نہیں لیے تھے۔ جواب دیجیے مسٹر ایشلے! کیا میرے مؤکل کا دعویٰ غلط ہے؟ کیا یہ پتھر آپ نے پاکستان کے پہاڑوں سے حاصل نہیں کیے...... کہیے مسٹر ایشلے! جواب دیجیے۔''

سلمان احمد نے دبنگ لہجے میں ایشلے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب طلب کیا۔ وہ خاموش ہو کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ گھر گیا ہے اور اب جائے فرار نہیں رہی۔

''او کے! مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں نے یہ پتھر وہیں سے حاصل کیے تھے...... لیکن......'' اس نے مختصر سا بیان دیا۔ اب کیس کی نوعیت بدل چکی تھی۔ لہٰذا اگلی کارروائی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی گئی۔

☆☆☆

''او مائی گاڈ! سلطان تم نے تو کمال کر دیا۔ پتھر سے چشمہ نکال لیا۔ آج کے سارے نیوز پیپرز...... سارے ٹی وی چینلز پر ایک ہی چیز نمایاں چل رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسٹر ایشلے نے جواہرات چوری کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔'' صبیحی چہک رہی تھی۔

''ہاں، اور ہر جگہ یہ خبر اتنی ہاٹ بنانے میں تمہاری محنت تسلیم کرنا پڑے گی۔ تم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' سلطان مسکرایا۔

''اور انٹرنیٹ پر دیکھا ہے۔ کیسا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ کیا فیس بک، کیا ٹوئٹر اور بلاگ...... ہر جگہ لوگوں نے اس کو ہاٹ فیورٹ بنا لیا ہے۔ بعض نے تو اس کیس سے متعلق الگ الگ پیجز بنا ڈالے ہیں۔ کئی فورم بن گئے ہیں۔ جہاں یہ کیس ہر وقت، ہر لمحہ ڈسکس ہو رہا ہے اور پتا ہے لوگوں نے تمہاری تصویر کو پروفائل پکچر بنا ڈالا ہے۔ ہیرو بن گئے ہو

بھئی...... ہیرو!'' صبی زور سے ہنسی۔
''جواب میں ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔
ہم کو تمہارے عشق نے کیا کیا بنا دیا
جب کچھ نہ بن سکے، تو ہیرو بنا دیا
''مائی ڈیئر صہبا غزل! یہ آپ کے حسنِ کرشمہ ساز کا کمال ہے۔ چاہیں تو ہیرو بنا دیں چاہیں تو زیرو۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اُف! کس قدر اعلیٰ شعری ذوق ہے...... ماشاء اللہ...... موگامبو خوش ہوا۔'' صبی نے ہنس کر کہا۔
''اچھا چھوڑو یہ سب...... چار بجے ہمیں پاکستان قونصلیٹ جانا ہے۔ ایک صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' صبی نے اطلاع دی۔
''کون صاحب! اور کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ وہ بھی مجھ خاکسار سے...... جو اُن کے کسی کام کا نہیں۔'' سلطان کے لہجے میں کچھ برہمی اتر آئی۔
''یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ کون صاحب ہیں؟ اور کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ لیکن پاپا نے بتایا تھا کہ وہ سفیر صاحب کی طرف سے...... تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''
''جب میں سفیر صاحب سے مدد کی درخواست کرنے گیا تھا تو انہوں نے مجھے ٹرخا دیا تھا۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ میں انہیں یاد آ گیا ہوں؟'' اس نے تلخی سے کہا۔
''ایزی...... ایزی...... ایزی مین! اب انہوں نے یاد کر لیا ہے تو اس کو پوزیٹو لو...... ملنے اور بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ اچھی بات ہی سامنے آ جائے۔''
''اچھی بات؟ ہاہ...... مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ یہ لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں نا...... ان کے پاس میرے جیسے عام آدمی کے لیے...... کوئی اچھی بات ہو ہی نہیں سکتی۔''
''او کے او کے...... شاید ایسا ہی ہو لیکن آج تم چار بجے میرے ساتھ قونصلیٹ آفس چل رہے ہو...... نو آرگیومنٹ......'' صبی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور بات ختم ہو گئی۔
آج عدالتی کارروائی کے بعد وہ دونوں کورٹ سے نکلے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے اپنے وکیل سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا اور اگلی پیشی کی کیا تیاریاں کرنا ہیں، اس کے بارے میں گفتگو کی۔ سلمان احمد سمیت وہ سب بہت خوش تھے...... آج انہوں نے اچھی کامیابی حاصل کی تھی۔
''ان سے رخصت ہو کر وہ ہوٹل آئے اور اب لابی میں ہلکا پھلکا لنچ کر رہے تھے۔
''بائی دا وے...... یہ تصویری ثبوت کہاں سے ملے؟ جنہوں نے مقدمے کا رخ ہی بدل دیا؟'' صبی نے ڈرنک کا گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔
''تمہارے لہجے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہیں یہ ثبوت جھوٹے لگ رہے ہیں؟'' سلطان نے کھاتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... ایسا تو نہیں ہے۔ دراصل آج کل فوٹو شاپ پر بنائی ہوئی تصویریں اتنی اچھی ہوتی ہیں کہ بالکل اصلی لگتی ہیں۔ اس لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ عبداللہ اینڈ کمپنی نے یہ ثبوت گھڑ تو نہیں لیے۔'' صبی نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔
''اگر ایسا ہوتا...... تو ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایسی فیک تصویروں کو پہچاننا ایک لمحے کا کام رہ گیا ہے اور یقیناً ان تصویروں کو بھی چیک کیا جائے گا۔ جانتی ہو رزلٹ کیا آئے گا؟'' سلطان نے سوال کیا تو صبی نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''رزلٹ یہی آئے گا کہ تصویریں بالکل اصلی ہیں۔ بھئی جس زمانے کی یہ بات ہے اس زمانے میں پولورائیڈ کیمرا نیا نیا عام ہوا تھا۔ ایشلے کے پاس بھی تھا اور یہ تصویریں اسی کے کیمرے سے کھینچی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ کچھ تصویریں میں نے بھی لی تھیں۔ ایشلے نے سیٹ کر کے کیمرا مجھے تھما دیا تھا۔ میں نے فوکس کر کے اس کا بٹن دبا دیا۔ میرے شوق کی تکمیل میں وہ اس طرح پھنس جائے گا...... یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔''
''اوہ، تو تم نے ان تصویروں کو اب تک محفوظ رکھا ہوا تھا؟''
''میں نے نہیں...... اماں نے اور بابا نے...... ہمارے گھر میں ٹین کا ایک بڑا سا بکس ہے جس میں اماں بستروں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی چیزیں بھی ڈال دیتی ہے جو اس کے خیال میں پھینکنے کی نہیں ہوتیں۔ اسی پرانے سامان میں...... ایک لفافے کے اندر یہ تصویریں بھی پڑی تھیں۔ میں نے جب یہاں اپنے ارادوں کے بارے میں بابا کو فون پر بتایا...... تو انہوں نے ڈھونڈ کر بعض ایسی چیزیں مجھے یہاں بھجوا دیں جو اس مقدمے میں کام آ سکتی ہیں...... ان میں یہ تصویریں بھی تھیں۔'' سلطان نے صراحت سے بتایا۔

"یعنی تصویروں کے علاوہ...... اور چیزیں بھی ہیں؟" صبی نے سرہلاتے ہوئے مبہم سا سوال کیا تو سلطان نے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔

"اوکے......ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ چلو ہم نکلتے ہیں۔ چار بجے میٹنگ ہے تمہاری۔" صبی نے کہا اور اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"صبی! مجھے کچھ بتاؤ تو سہی...... آخر کون ہے؟ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہا ہے؟" سلطان نے بے دلی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے اگر کچھ بھی معلوم ہوتا...... تو میں تمہیں ضرور بتاتی...... کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ یہ زبردستی کی میٹنگ کیوں رکھی جارہی ہے...... اور اس میٹنگ میں گفتگو کا ایجنڈا کیا ہوسکتا ہے؟" صبی نے سوال کیا۔

"بالکل...... بہت اچھی طرح اندازہ ہے مجھے...... دراصل آج مقدمے نے کارروائی کے دوران جس طرح رخ تبدیل کیا ہے، اس سے آنے والی ہواؤں کا اندازہ ہو گیا ہے ان لوگوں کو...... تو یقیناً وہ پیشگی مبارک باد اور شاباش ہاتھوں میں لیے بیٹھے ہیں۔ تاکہ میں جیسے ہی ان کے پاس پہنچوں، وہ مجھ پر لاد دیں۔ اور یہ اعزاز بھی سمیٹ لیں کہ پاکستانی سفارت خانہ کس طرح اپنے ہم وطنوں کے ہم قدم اور ساتھ ساتھ ہے۔ وہ بات آف دی ریکارڈ ہے کہ جب میں ان کے پاس گیا تھا مدد حاصل کرنے تو انہوں نے کس طرح مجھے ٹرخا دیا تھا...... وغیرہ وغیرہ......" سلطان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو، سن لینے میں کیا حرج ہے۔ اچھا ایک کام کرو......" صبی نے اپنا ایک خصوصی موبائل فون سیٹ کر کے اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ وائس ریکارڈنگ پر سیٹ ہے۔ ہوسکتا ہے تمہاری میٹنگ میں مجھے شرکت کی اجازت نہ ملے۔ تو پلیز کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اسے آن کر لینا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ ایسی کیا خاص بات ہے جو تمہیں اس قدر زبردستی بلوایا جارہا ہے۔ یہ تقریباً نوے منٹ کی ریکارڈنگ کرسکتا ہے...... کرلوگے نا؟"

صبی نے کہا تو سلطان نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے اسے اپنی فرنٹ پاکٹ میں رکھ لیا۔

قونصلیٹ آفس کے اس چھوٹے سے کمرے میں جس آدمی سے اس کی ملاقات ہوئی، اس کی شکل دیکھ کر نہ جانے کیوں چیل کی تشبیہ ذہن میں گونجی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی تیز طرار سی آنکھوں نے سلطان کے ذہن پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔

"ہیلو! میرا نام منظر جمیل ہے اور میں یہاں سفیر صاحب کا سیکریٹری فار پبلک ریلیشن ہوں۔ سفیر صاحب کی ہی خواہش پر میں نے آپ سے ملنے کی درخواست بھیجی تھی۔ تھینکس فار کمنگ...... تشریف رکھیے۔" سلطان اس سے ہاتھ ملا کر ٹیبل کے دوسری جانب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ویل، پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ آپ اس وقت خبروں میں جس طرح ہاٹ کیک بنے ہوئے ہیں اور جس خلوص سے آپ پاکستان کا مقدمہ لڑ رہے ہیں، وہ نہ صرف یہاں بلکہ پاکستان میں بھی بے حد تحسین آمیز ہے۔ سفیر صاحب بھی اس مقدمے کے شروع ہونے سے لے کر آج تک کی تمام اپ ڈیٹس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ بہت خوش ہیں اور آپ کی ہمت اور ثابت قدمی کو سراہتے ہیں۔" اس نے ایک لمحے کو رک کر سلطان کے چہرے پر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ "سفیر صاحب نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کو اگر کسی بھی قسم کی مدد درکار ہو تو سفارت خانہ آپ کو سہولیات فراہم کرسکتا ہے۔ جو آپ چاہیں۔"

سلطان کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی جسے اس نے بڑے جتن کر کے دبایا۔

"میں سفارت خانے سے مدد مانگنے آیا تھا۔ سفیر صاحب سے خود حاضر ہو کر درخواست کی کہ وہ مجھے صرف اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دیں۔ تاکہ میں ریاستِ پاکستان کو مدعی بنا کر یہ دعویٰ دائر کرسکوں...... مگر......" وہ تلخ سے لہجے میں بات کر کے خاموش ہو گیا۔

"آپ کو منع تو نہیں کیا تھا انہوں نے...... صرف وقت لیا تھا کیونکہ اس قسم کے معاملات اوپر والوں کی مرضی اور باضابطہ اجازت کے بغیر تو نہیں ہوسکتے نا...... اور آپ جانتے ہیں' ضابطے کی کارروائیوں میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ آپ نے انتظار کرنے کے بجائے...... خود ہی اسٹینڈ لے لیا۔" منظر جمیل نے نمائشی مسکراہٹ سے کہا۔

"اوہ...... مائی مسٹیک...... یو آر رائٹ مسٹر منظر جمیل...... آخر' آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک' تو مجھے کم از کم اپنی عمر تک تو انتظار کرنا چاہیے تھا...... جو میں نے نہیں کیا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ آگے کہیے۔" سلطان کوشش کے باوجود اپنی خفگی کو چھپا نہ سکا۔

"آپ شاید ناراض ہو گئے اس بات پر...... غصہ

تھوکیے...... اور مجھے بتایئے کہ سفارت خانے سے آپ کس قسم کی مدد چاہتے ہیں؟'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''بہت شکریہ...... میں ناراض نہیں ہوں اور آپ جب اس قدر اصرار کر رہے ہیں تو میں عرض کردوں کہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اخراجات بہترین قانون دانوں کی خدمات کے سلسلے میں ہو رہے ہیں۔ سفارت خانہ اگر ان اخراجات کی ذمے داری قبول کرلے...... تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

''جہاں تک میری معلومات ہیں...... تو وہ یہ ہیں کہ آپ کا کیس لڑنے والے لائرز کسی این جی او کے توسط سے آپ کو ساری خدمات بلا معاوضہ پیش کر رہے ہیں۔''

''سب نہیں...... صرف چند۔'' سلطان نے مختصر جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ جو مشہور و معروف قانون داں کیس لڑ رہے ہیں اور جن کی اپنی ایک بہترین لاء فرم ہے انہیں آپ معاوضہ ادا کر رہے ہیں؟''

اس کے جواب میں سلطان خاموشی سے منظر جمیل کو گھورتا رہا۔

''مسٹر سلطان! سلمان احمد جیسے مشہور و معروف اور کامیاب قانون داں کا معاوضہ...... تھوڑا بہت نہیں ہے بلکہ اچھا خاصا بھاری بھرکم معاوضہ لیتے ہیں وہ...... آپ اگر انہیں ادائیگی کر رہے ہیں تو یہ معلومات تو حاصل کرنا پڑیں گی کہ آپ کے پاس اتنی بڑی رقم آئی کہاں سے...... کیونکہ میری معلومات کے مطابق تو آپ ایک فور اسٹار ہوٹل میں ایونٹ منیجر کی معمولی سی ملازمت کرتے ہیں اور اس سے ملنے والی تنخواہ سے تو ایسے اخراجات نہیں کیے جاسکتے۔''

منظر جمیل کی آنکھوں اور چہرے پر ایک سی کمینگی جھلک رہی تھی جسے دیکھ کر سلطان اور برافروختہ ہوگیا۔

''تو ٹھیک ہے آپ اس سلسلے میں مجھے نوٹس بھجوا دیجیے گا۔ جہاں ایک مقدمہ لڑ رہا ہوں وہاں دوسرا بھی لڑلوں گا۔'' سلطان بھنّا کر اٹھنے لگا تھا کہ منظر جمیل نے ایک دم ہاتھ ہلا کر اسے روکا۔

''اوہ...... نو نو مسٹر سلطان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ بیٹھیں...... بیٹھیں...... بیٹھیں...... پلیز!'' وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر بادلِ ناخواستہ بیٹھ گیا۔

''دیکھیے مسٹر سلطان! یہ صرف جواہرات پر حق کا مقدمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا سیاسی پس منظر بھی ہے۔ دو ملکوں کے درمیان تعلقات کے لیے بھی ایک امتحان ہے یہ...... کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آرحم ایملے کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آنے والے الیکشن میں وہ کانگریس کا انتخاب بھی لڑ رہا ہے۔ اور ایسے وقت میں اس کی شہرت کو اس مقدمے کی وجہ سے پہنچنے والے نقصان نے...... گویا سوئے ہوئے سانپ کو جگا دیا ہے۔ اگر اس نے پوری قوت سے اپنا دفاع کیا اور آپ پر جوابی کارروائی کا حملہ کیا تو آپ بڑی مشکل میں آجائیں گے۔'' منظر جمیل نے مخصوص ذہنیت کا اظہار کیا۔

''مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کا بہت بہت شکریہ...... میں گھر جا کر اس کے بارے میں ضرور سوچوں گا کہ میں ڈروں...... یا نہ ڈروں۔'' سلطان کے لہجے میں کاٹ تھی۔

''اوہ نو مسٹر سلطان! میرا مقصد آپ کو خوف زدہ کرنا نہیں بلکہ آپ کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرنا ہے تاکہ آپ کے عمل کے جواب میں جو ردِعمل سامنے آئے، اس سے بچنے کے لیے آپ پیشگی کوئی معقول انتظام کرسکیں۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اگر اس مقدمے کا نوٹس حکومتی سطح پر لیا گیا تو آپ اور آپ کے ساتھی...... دو ہاتھیوں کی لڑائی میں چیونٹیوں کی طرح پس جائیں گے۔ دنیا کی ایک سپر طاقت کے سامنے...... ہماری حکومت بھی آپ کا ساتھ نہیں دے پائے گی اس لیے میں آپ کو ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ ہم سے رابطے میں آجائیں۔ حکومتی سطح پر اعلانیہ آپ کا ساتھ دینا تو ہماری خارجہ پالیسی سے میل نہیں کھاتا۔ یہ ہماری سیاسی مجبوری ہے۔ لیکن بحیثیت پاکستانی...... سفیر صاحب ذاتی طور پر آپ کی مدد کے خواہاں ہیں لیکن کسی کے علم میں لائے بغیر......'' منظر جمیل کی بات کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ سلطان کچھ سمجھا...... کچھ نہیں سمجھ پایا۔

''سفیر صاحب ذاتی طور پر میری مدد کے خواہاں ہیں کس قسم کی مدد؟'' اس نے سوال کیا۔

''جیسا کہ ابھی آپ نے کہا کہ مقدمے کے اخراجات کافی زیادہ ہیں تو اس سلسلے میں آپ کی مدد ہوسکتی ہے اگر آپ چاہیں تو سفیر صاحب اپنی ذاتی حیثیت میں یہ تمام ادائیگیاں کرسکتے ہیں۔'' منظر جمیل نے غور سے سلطان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ذاتی حیثیت میں...... کیوں؟ بطور سفیر پاکستان وہ ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟'' سلطان نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے کہ یہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ وہ اتھارٹیز جو ہماری فارن پالیسی کے بارے میں فیصلے کرتی ہیں، انہوں نے اس مقدمے کے بارے میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے سفیر صاحب ذاتی حیثیت میں آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ آپ پاکستانی ہیں اور وہ بھی...... اس لیے کہ وہ آپ کے جذبات اور احساسات کی قدر کرتے ہوئے آؤٹ آف دے جا کر بھی آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔''

''اگر سچ مچ ایسا ہی ہے تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''زیادہ کچھ نہیں...... اس سلسلے میں آپ کو ایک چھوٹا سا ایگری منٹ سائن کرنا ہوگا۔ اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہوگی۔ محض دو دوستوں کے درمیان یہ ایک جینٹل مین معاہدہ ہوگا۔'' منظر جمیل نے مسکراتے ہوئے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگایا تو نہ جانے کیوں سلطان کو اس کے چہرے پر جو تاثرات نظر آئے...... وہ کچھ ایسے تھے کہ جیسے اس نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو اور سلطان کو چوکنا کر دیا۔ اسے کسی حد تک اندازہ ہو گیا کہ سب کچھ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا یہ سامنے بیٹھا شخص ظاہر کر رہا ہے۔

''ایگری منٹ؟ اس ایگری منٹ میں کیا لکھا ہوگا مسٹر منظر جمیل؟''

''ڈیٹس ملین ڈالر کوئسچن...... دیکھیے مسٹر سلطان! آپ کو اتنے دنوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مقدمے کے اخراجات کے لیے رقم...... مٹھی بھر نہیں...... بلکہ جھولی بھر درکار ہوتی ہے اور فیصلہ ہونے تک کتنی ہیرنگز ہوں...... کتنے دن لگ جائیں...... کچھ معلوم نہیں...... لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ لاکھوں ڈالرز کا معاملہ ہے۔ تو جو شخص لاکھوں ڈالرز آپ پر خرچ کرنے کو تیار ہو...... اسے آپ سے کوئی نہ کوئی توقع تو ہونا ہی چاہیے نا؟''

''میں وہی توقع جاننا چاہتا ہوں۔''

''ففٹی ففٹی......'' منظر نے پُراسرار سے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' سلطان نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مسٹر سلطان! آپ جانتے ہیں...... دنیا گیو اینڈ ٹیک پر چلتی ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو...... یہی زندگی کا اصول ہے اس لیے مقدمے کے تمام اخراجات اگر سفیر صاحب اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں اور فیصلہ آپ کے حق میں ہو جاتا ہے تو جو بھی جو بیلو آپ کو ملتے ہیں ان کا ففٹی ففٹی......''

منظر نے بتایا اور سلطان سمجھ گیا کہ آخرکار بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

''وہاٹ؟ ففٹی ففٹی؟ لیکن فرض کریں کہ فیصلہ ہمارے خلاف ہو جائے...... تو پھر؟'' سلطان نے تپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''پھر بھی ففٹی ففٹی......'' منظر کے ہونٹوں پر بے ہودہ سی مسکراہٹ تھی۔

''وہ کس طرح ففٹی ففٹی؟''

''سمپل...... جو بھی اخراجات ہوں گے...... ان کا بھی ففٹی ففٹی۔''

''وہاٹ ربش؟ جو پیسے خرچ ہو چکے ہوں گے، ان کا ففٹی پرسنٹ میں کہاں سے ادا کروں گا؟'' سلطان نے جھنجلا کر کہا۔

''یہ ایک سمجھداری کا سوال ہے۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ پہلے جو بھی اخراجات ہو رہے ہوں...... ان کا ففٹی پرسنٹ کا چیک آپ ہم سے لے لیں۔ ہر پیشی پر جتنے بھی اخراجات ہوں گے، ان کا ففٹی پرسنٹ کا چیک آپ کو یہاں سے مل جائے گا۔ فیصلہ اگر آپ کے حق میں ہو جاتا ہے تو باقی کے ففٹی پرسنٹ ہم آپ کو ادا کر دیں گے۔ یعنی اس مقدمے پر ہونے والے مکمل اخراجات۔''

''اور اگر فیصلہ ہمارے خلاف ہوتا ہے...... پھر؟'' سلطان نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''پھر وہ جو ففٹی پرسنٹ ہم نے دیا ہوگا، وہ بھی آپ کو لوٹانا ہوگا۔'' اس نے بے مہر لہجے میں جواب دیا۔

''واہ...... کیا ڈیل ہے؟ میری ماں اس طرح کے لین دین کو لال سوداگری کہا کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟ بہرحال جس نے بھی یہ پلان بنایا ہے میں اس کی سمجھداری کی داد ضرور دوں گا کہ اس نے بغیر کسی رسک کے...... فائدے میں ففٹی پرسنٹ اور نقصان میں کوئی نقصان نہیں کا یہ فامولا ترتیب دیا ہے...... ویل ڈن مسٹر منظر جمیل، آپ کی اس کرم نوازی کا بے حد شکریہ...... پہلے میں سمجھا تھا کہ شاید قومی غیرت ...... اور حمیت کا ہلکا سا اٹیک ہوا ہے۔ لیکن یہاں تو قومی نہیں...... بلکہ شخصی بے غیرتی اور بے حمیتی نے حملہ کر کے ذہن و دل مفلوج کر دیے ہیں۔ اجازت چاہوں گا۔'' سلطان جھٹکے سے اٹھا۔

''مسٹر سلطان! شاید آپ جانتے نہیں کہ اس طرح کے مقدمات بعض اوقات سالہا سال چلتے رہتے ہیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ انڈیا نے بین الاقوامی عدالت میں

کوہ نور ہیرے کی ملکیت کا دعویٰ کر رکھا ہے جو برطانیہ نے لوٹ کھسوٹ میں حاصل کیا تھا۔ وہ مقدمہ آج تک چل رہا ہے۔ انڈیا آج تک پیشیاں بھگتا رہا ہے اور ادھر برطانیہ کی ملکہ آج تک کوہ نور ہیرا جڑے تاج کو پہن رہی ہیں۔ کیا اس کے اخراجات کا اندازہ ہے آپ کو...... اور وہ بھی لاحاصل؟'' منظر جمیل کو شاید سلطان کے تھوڑے سخت الفاظ نے غصہ دلا دیا تھا۔

''یہ بات سمجھنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے کام وہی کرتے ہیں جن میں جنون ہوتا ہے۔ مفلوج ذہن و دل رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ سب خرافات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے لیے ایک مخلصانہ مشورہ ہے' ان خرافات سے بچتے رہیں۔ زندگی آسان رہے گی۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''میں آپ کے مشورے کو یاد رکھوں گا لیکن ایک بات میں بھی آپ کو بتا دوں۔ آپ کو ایک نہ ایک دن یہاں آنا ہی پڑے گا۔ ہمارے پاس۔'' منظر نے تلخی سے کہا۔

''کیا میں اسے کوئی دھمکی سمجھوں؟'' سلطان چراغ پا ہو رہا تھا۔

''آپ ایک سمجھ دار آدمی ہیں۔'' منظر نے ہونٹوں کو پھیلا کر ایک پیشہ ورانہ قسم کی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تو سلطان بھنا کر اباؤٹ ٹرن ہوا اور مارچ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں طرف کے وکیل اپنے اپنے پینل کے ساتھ دھواں دار طریقوں سے اپنے اپنے دلائل آزما رہے تھے۔ اکیوزڈ باکس میں ایک طرف سلطان اور دوسری جانب ایشلے موجود تھا۔ جج اور جیوری ارکان بڑے غور سے دونوں طرف کے دلائل سن رہے تھے۔

ایشلے کا وکیل جوشِ جذبات میں بھرپور طریقے سے اپنے موکل کا دفاع کر رہا تھا۔

''می لارڈ! چوبیس پچیس برس پرانی دو تین تصویروں کو مستند ثبوت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کہنگی مناسب انداز میں ان لوگوں کے چہروں کو اجاگر کرنے میں ناکام ہے جو اس تصویر میں موجود ہیں۔ اس لنگڑے لولے ثبوت کی بنیاد پر...... ایک معزز انسان کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

''کیا آپ ان تصاویر کے علاوہ اور ثبوت پیش کر سکتے ہیں مسٹر سلمان احمد؟'' جج نے سلمان احمد کو مخاطب کیا تو سلمان احمد مڑ کر اپنے پینل کے وکلا کی طرف گئے۔ ان سے کچھ دھیمے لہجے میں کوئی بات کی اور پھر ایک سی ڈی لے کر جج کے پاس آئے۔

''می لارڈ! تصویریں پرانی ہونے کے سبب ناقابلِ اعتبار قرار پا رہی ہیں لیکن یہ ثبوت حال ہی کا ہے۔ شاید معزز ارکانِ جیوری کے لیے یہ ایک مستند ثبوت قرار پائے۔'' سلمان احمد نے ایک سی ڈی جج کے سامنے لے جا کر رکھی تو فوراً ایک شخص اسے اٹھا کر اپنی کمپیوٹر ٹیبل پر لے گیا۔ سلاٹ میں ڈال کر چلائی تو اسکرین پر ایشلے کا چہرہ نمودار ہوا اور اسی لمحے اس کی آواز بھی گونجی۔

''او نو نو...... مسٹر سلطان! میکسیکو کے پہاڑوں میں کیا رکھا ہے۔ وہاں سے اب اس معیار کا کوئی پتھر نہیں ملتا۔ یہ تو میں نے پاکستان سے حاصل کیے تھے۔'' ایشلے کی آواز میں اس اعتراف نے یک دم ایک کھلبلی سی مچا دی۔

پھر ایشلے کی آواز دوبارہ گونجی تو ماحول میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ ایشلے بول رہا تھا اور سب لوگ سن رہے تھے۔

''میں وہاں کے ایک مقامی آدمی کو بطور گائیڈ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اور اس کا گدھا...... دونوں میرے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔ وہ مجھے راستہ بتاتا تھا اور اس کا گدھا میرا سامان اٹھاتا تھا۔ ہم لوگ کوئی چھ سات دن پیدل سفر کر کے ان پہاڑوں میں پہنچے تھے۔ جہاں سے میں نے یہ پتھر حاصل کیے تھے...... مگر دیکھو! سالوں پہلے کی وہ مشکلات اٹھانے کا صلہ...... کتنا خوب صورت ملا ہے مجھے...... آج میں ملینز آف ڈالرز کے ان نوادرات کا مالک ہوں......'' ایشلے کی آواز گونجتی رہی اور عدالت میں موجود سب لوگ سنتے رہے۔ یہ ایشلے کا اعترافِ جرم تھا جو مکمل صوتی اور تصویری صورت میں موجود تھا۔ اب اس میں کوئی ابہام نہیں رہا تھا کہ ایشلے نے یہ پتھر پاکستان سے حاصل کیے تھے۔

کٹہرے میں کھڑے ایشلے کے چہرے پر بھی پہلی مرتبہ کچھ فکرمندی کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنے وکیل کو قریب بلایا اور آہستہ آہستہ اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ پھر وہ دوسری ٹیبل پر موجود اپنے مددگار وکلا کی طرف گیا اور ان سے بھی آہستہ آہستہ کچھ ڈسکس کرتا رہا۔ انہوں نے قانون کی کتابوں سے دفعات کھنگالیں اور ان کے حوالے تیار کر کے وکیل کو دیے۔

''مسٹر پراسیکیوٹر! آپ کو کچھ کہنا ہے؟'' جج نے ایشلے کے وکیل کو مخاطب کیا۔

''یس می لارڈ! ابھی جو ڈراما عدالت میں پیش کیا گیا۔ میرے فاضل دوست یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ دھانسو ڈراما...... دراصل ایک ایسا ہتھیار ہوگا جو میرے موکل کے لیے آخری چوٹ ثابت ہوگا۔ اور وہ ان کا یہ وار سہہ نہیں پائے گا۔ دھڑام سے گرسے گا اور یہ لوگ فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔

''مگر مجھے افسوس ہے می لارڈ کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ آپ سب لوگوں نے ویڈیو دیکھی بھی ہے اور مسٹر ایشلے کی گفتگو بھی سنی ہے۔ ویڈیو میں آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ مسٹر ایشلے ڈرنک کر رہے ہیں اور آواز سنتے ہوئے آپ سب کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کافی نشے میں تھے۔ قانون کی دفعہ فلاں فلاں کے تحت (اس نے مختلف دفعات کے نمبر بول کر بتایا) ایک ایسا شخص جو نشے میں ہو...... اس کا بیان درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ویڈیو میں مسٹر ایشلے نے جو کچھ کہا۔ کیونکہ وہ نشے کی کیفیت میں کہا گیا اس لیے وہ بیان مستند تسلیم نہیں کیا سکتا۔''

ایشلے کے وکیل نے اس کے اعترافی بیان کو بھی مسترد کر دیا تو سلمان احمد پھر میدان میں آئے۔

''می لارڈ! آپ نے اور معزز جیوری ارکان نے اگر بغور دیکھا اور سنا تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جس وقت مسٹر ایشلے نے اعتراف کیا' وہ اس وقت تک اتنے زیادہ یا نشے میں مبتلا نہیں ہوئے تھے' جہاں نشے کے سبب ذہنی صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں اور انسان مکمل طور پر بہک جاتا ہے۔ وہ صرف ہلکا سا سُرور ہے جس میں وہ یہ اعتراف کر رہے ہیں اور محض معمولی سرور کو نشے میں ہکنے سے تعبیر کرنا...... کچھ اتنا زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''می لارڈ! نشہ تو نشہ ہوتا ہے۔ اِتنا یا اُتنا نہیں۔ قانونی دفعات میں نشے کی مقدار یا کیٹیگری کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ نشے کی کیفیت میں دیا گیا کوئی بھی بیان مستند نہیں ہو سکتا۔ سو وہ نہیں ہے۔''

ایشلے کے وکیل اور سلمان احمد میں یہ بحث بہت دیر تک چلتی رہی۔ آخرکار جج نے سلمان احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر پراسیکیوٹر! کیا آپ کوئی اور مستند ثبوت یا چشم دید گواہ پیش کر سکتے ہیں؟''

''یس می لارڈ! میں پوری کوشش کروں گا۔'' سلمان احمد نے مختصر جواب دیا اور عدالت اگلی پیشی تک برخاست ہو گئی۔

☆☆☆

بروکلین نیویارک کا کافی پرانا علاقہ ہے اور کافی تعداد میں پاکستانی بھی وہاں آباد ہیں۔ اسی کی ایک ذیلی سڑک پر عبداللہ کی این جی او کے آفس میں وہ سب جمع تھے اور آج کے مقدمے کی پیش رفت پر گفتگو کر رہے تھے۔

''اتنا واضح ثبوت بھی جج نے مسترد کر دیا۔ خود اس نے اپنے منہ سے اعتراف کیا ہے۔ پھر بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی۔ کمال ہے۔'' بھینی جھنجلا کر بولی۔

''تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ یہ اس کی بقا کا سوال ہے۔ وہ پوری قوت سے اپنا دفاع کرے گا۔ اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کے لیے وہ ہر جدوجہد کرے گا۔ اپنے آپ کو اس الزام سے بچانے کی کوشش میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' عبداللہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ بھی تو دیکھو یارو! اگر فیصلہ اس کے حق میں نہ ہوا تو وہ تو ڈبل ٹربل میں آ جائے گا۔ اس کی قیمتی دولت جو جواہرات کی شکل میں ہے، وہ جائے گی اور اس اُچکے لفنگے نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد اپنے آپ کو شرفا کی صف میں شامل کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس پر بھی پانی پھر جائے گا۔ یعنی دولت بھی گئی اور عزتِ سادات بھی گئی۔'' عبداللہ کے ساتھی نے ہنس کر کہا تو وہ سب بھی مسکرا دیے۔

''سلطان! دیکھو یار میری سلمان احمد صاحب سے بات ہوئی تھی اس مسئلے پر...... انہوں نے جو مشورہ دیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تمہارے والد یہاں کورٹ میں پیش ہوں اور گواہی دیں کہ ایشلے ہی وہ شخص ہے جو انہیں زبردستی پہاڑوں میں لے گیا تھا اور وہ نیلم اور زمرد اس نے وہیں سے حاصل کیے تھے جن سے یہ شاہکار ''بدھا'' اور ''مرمیڈ'' تخلیق ہوئے تو اسے جھٹلانا ناممکن ہو جائے گا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارے والد یہاں آ سکیں اور عدالت کو سچ بتا سکیں؟'' عبداللہ نے سلطان سے پوچھا۔

''بابا کبھی اپنے علاقے سے باہر نہیں نکلے...... پتا نہیں وہ یہاں آ سکیں گے یا نہیں۔'' سلطان نے فکرمندی سے کہا۔

''ارے یار! ان سے فون پر بات کر اور ساری تفصیل بتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آنے پر راضی ہو جائیں گے۔ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔''

''او کے، میں پوری کوشش کروں گا۔ آج ہی فون پر بات کرتا ہوں اُن سے۔ اگر راضی ہو گئے تو بھائی سے کہوں گا کہ ان کا ارجنٹ پاسپورٹ اور ویزے کا بندوبست کر دے۔'' سلطان نے کہا۔

''اس پروسیس میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا...... میں سلمان صاحب سے کہوں گا کہ وہ پیشی کے لیے کوئی لمبی تاریخ لے لیں۔'' عبداللہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ آخری حربہ ہے تو بھائی جیسے بھی ہو، ہاتھ پاؤں جوڑ کر...... خوشامد کر کے...... یا اپنی کوئی شدید بیماری یا اچانک ایکسیڈنٹ کا بتا کر انہیں ہر صورت راضی کرلو۔ اگر وہ آگئے تو ان کی گواہی...... اس ایشلے کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے...... اس لیے......'' شہریار نے سلطان کے لیے لائن آف ایکشن ترتیب دی۔

''کرلوں گا یار، سب کچھ کر کے انہیں راضی کرلوں گا۔ میرے بابا ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان سے اپنی بات کس طرح منوانی ہے۔'' سلطان نے سرہلا کر کہا۔

''اچھا آ آ آ...... یعنی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ انہیں بلیک میل کرنے کے کیا کیا گر ہیں...... گڈ۔'' صبیی نے ہنستے ہوئے کہا تو ماحول کا بوجھل پن کچھ کم ہوا۔

''عمر! یار اپنی وہ ٹھیٹ پاکستانی...... الائچی والی دودھ پتی تو بنا...... ابلتی، کھولتی بنانا...... سردی بہت ہے یار۔'' عبداللہ نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے لڑکے سے کہا۔

''مزیدار، گرما گرم چائے پی کر سلطان اور صبیی باہر نکل آئے۔ آج برف باری تو نہیں ہو رہی تھی لیکن آسمان سے ریت کی طرح جمی ہوئی برفیلی قلمیں گر رہی تھیں۔

''اوہ...... فریزنگ رین...... مائی گاڈ! سردی بہت ہے بھاگو۔'' صبیی کو سرد ہوا کا برفیلا تھپیڑا پڑا تو وہ دوڑی اور کار تک پہنچتے پہنچتے سردی نے اچھا خاصا مزاج پوچھ لیا۔

''سلطان! ہیٹر فل آن کر دو...... آج تو شدید ٹھنڈ ہے۔ گاڑی بھی فریز بنی ہوئی ہے۔'' وہ دونوں ہیٹر آن ہوتے ہی اپنے ہاتھ اس کی گرم ہوا کے سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔ کیونکہ ڈرائیونگ کے لیے ہاتھوں کا نارمل طریقے پر کام کرنا بے حد ضروری تھا۔

''اب تمہیں کہاں جانا ہے؟'' سلطان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے صبیی سے پوچھا۔

''ابھی تو ٹائم ہے اس لیے آفس ہی جاؤں گی۔ گاڑی اگر تمہارے ہوٹل پر نہ چھوڑی ہوتی تو یہیں سے نکل جاتی۔''

''تم نے اپنے اس خبیث کی باتیں سنی تھیں۔ کیا کہہ رہا تھا وہ۔'' سلطان نے پوچھا۔

''ہاں، جیسے ہی تم نے فون واپس کیا۔ میں نے پہلی فرصت میں یہ کام کیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر پوری ریکارڈنگ سنی۔''

''پھر؟ تمہارے کیا خیالات ہیں اس کی آفر کے بارے میں؟'' سلطان نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میرے خیالات؟ سلطان! اس نے ایک ڈیل آفر کی ہے، اسے ماننا یا نہ ماننا تو تمہارے اختیار میں ہے۔'' صبیی نے عام سے لہجے میں کہا۔

سلطان نے گردن موڑ کر کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یعنی تمہارے خیال میں...... وہ آفر اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں سوچا جائے کہ اسے مانا جائے...... یا نہ مانا جائے؟''

''سلطان! میں جانتی ہوں کہ اپنے وطن کے بارے میں سوچتے ہوئے تم خاصے جذباتی ہو جاتے ہو۔ اس مقدمے کے بارے میں بھی تم بہت جذباتی ہو۔ اس لیے تمہاری نظر ان مسائل پر نہیں جا رہی ہے جن کا سامنا ہمیں آنے والے وقتوں میں کرنا پڑے گا۔ میرا مطلب ہے مقدمے کے اخراجات...... عبداللہ کی این جی او محدود وسائل رکھتی ہے۔ سلمان احمد کی لاء فرم اس کے بی ہاف پر ہمارا کیس لڑ رہی ہے۔ بے شک وہ اپنی مروجہ فیس سے کم ہی لے رہے ہیں لیکن پھر بھی اچھا خاصا حساب کتاب بن رہا ہے۔ کیس جیت جانے کی صورت میں اگر وہ تمام جویلرز تمہیں مل جاتے ہیں تو ظاہر ہے انہی میں سے کوئی ایک دو بیچ کر تمہیں یہ حساب کتاب چکتا کرنا پڑے گا۔ اور اگر ہم یہ کیس ہار جاتے ہیں تو میں نہیں جانتی کہ عبداللہ یہ سب کچھ کس طرح نمٹائے گا۔'' صبیی کا یہ سارا تجزیہ سنتے ہوئے سلطان نے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے گاڑی سائڈ میں روک دی، سر پکڑ کر کچھ دیر آنکھیں بند کیں پھر ایک لمبا سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔

''صبیی! میں نے واقعتاً اس بارے میں اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کیس عبداللہ کی این جی او اور سلمان احمد کی لاء فرم مل کر صرف اپنے وطن کے لیے...... بغیر کوئی معاوضہ لیے لڑ رہی ہیں۔ سفارت خانے کے اس خبیث کو تو میں نے صرف آزمانے کے لیے اخراجات کی بات کی تھی تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ تو......'' سلطان نے پریشان اور افسردہ

لہجے میں کہا۔

''سلطان! آزردہ مت ہو۔ حقائق سے آنکھیں چرانے سے..... وہ غائب نہیں ہو جاتے۔ ہمیں کبھی نہ کبھی ان کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم ان حقائق کو اپنے سامنے رکھیں۔ تاکہ ان سے بروقت نمٹنے کی مناسب کارروائی کر سکیں۔ بے خبری میں ٹھوکر کھا کر گرنے سے چوٹ زیادہ لگتی ہے۔'' صبیی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''واپس چلتے ہیں۔ عبداللہ سے مجھے دوٹوک بات کرنی ہے کہ اگر سلمان احمد یہ کیس بغیر کسی معاوضے کے لڑ سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے فارغ کر دو۔ کیونکہ اگر ہم یہ کیس جیت بھی جاتے ہیں اور وہ تمام جویلز مجھے مل بھی جاتے ہیں تو میں تو اسے پاکستان کی امانت سمجھ کر..... حکومت پاکستان کو دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز بیچنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جیتنے کی صورت میں بھی اگر اسے کوئی معاوضہ مل سکتا ہے تو صرف اتنا جتنا میرے پاس میری بچت کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس سے زیادہ ادائیگی میرے لیے ممکن نہیں ہے اور یہ صورتِ حال دونوں صورتوں میں ہے۔ خواہ ہم یہ کیس جیتیں یا ہاریں۔'' سلطان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تو صبیی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''تم پھر جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔ ہم یہ کام بھی کر سکتے ہیں لیکن تھوڑا وقت ہمیں صرف کرنا پڑے گا۔ اس کا ہر پہلو سے جائزہ لینے میں۔ اب جبکہ سارا ہاتھی نکل گیا ہے صرف دم رہ گئی ہے تو تم اس مرحلے پر یہ جیتا ہوا کیس..... ایک لالی پوپ کی طرح ان کے ہاتھ میں تھما دینا چاہتے ہو۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' سلطان نے اپنی کنپٹیاں مسلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، کیس جس طرح چل رہا ہے اسے چلنے دو۔ بابا کو بلالو۔ ان کی گواہی سے ہو سکتا ہے اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہی ہو جائے۔ کیس جیتنے کے بعد سب کچھ تمہاری مرضی پر ہوگا کہ تم کس کو کیا دینا چاہتے ہو۔ دیتے ہو یا نہیں۔ انہیں اس بات پر قائل بھی کر سکتے ہو کہ یہ سب تم نے صرف اور صرف اپنے وطن کی خاطر کیا ہے۔ آخر ان سب پر بھی تو وطن کا قرض اتارنا..... فرض ہے۔ تو وہ یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے کیس سلطان خان کے لیے نہیں..... بلکہ پاکستان کے لیے لڑا ہے۔ اب اتنی شرم اور لحاظ تو ہوگا ان میں کہ وہ اپنے وطن کی خدمت کے اخراجات سے دستبردار ہو جائیں۔''

سلطان اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ صبیی کی بات ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور آخر میں ایک بھرپور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سج گئی۔

''جانتی ہو، میں اس وقت اپنے آپ کو ایک ایسے لنگڑے کی طرح محسوس کر رہا ہوں جس کے ہاتھ میں صبیی نام کی ایک بیساکھی ہے اور اس بیساکھی کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا۔'' وہ ہنسا۔

''اوہ..... تو مجھے آج سے اپنا نام بدل کر صہبا غزل کے بجائے بیساکھی رکھ لینا چاہیے۔'' وہ بھی ہنسی۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ہلکی آواز میں بجنے والے الارم سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ سلطان نے آنکھیں کھول کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ 'ابھی وہاں شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ فون کرنے کا صحیح وقت یہی ہے۔'' پھر اس نے فون پر نمبر پنچ کیے۔

''ہاں، ذیشان؟ سلطان بول رہا ہوں۔ کیا حال ہیں؟'' اس نے بھائی کی آواز سن کر حال پوچھا۔

''بس بھائی! شام ہو رہی ہے۔ آج گھر میں بڑی رونق لگی ہوئی ہے۔ پلوشہ بھی آئی ہوئی ہے۔ اماں نے زبردست دعوت کا انتظام کیا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا بنا رہی ہے۔ میں، بھائی اور میرا دوست ہم لوگ دم پخت بنا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا۔ سب ہیں بھائی! بس آپ کی کمی ہے۔ سب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔'' ذیشان نے بتایا۔

''میں بھی تم سب کو بہت یاد کرتا ہوں۔ بہت مس کرتا ہوں سب کو۔ چلو، اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ جلد ملیں گے۔ اور سناؤ، کیا پروگرام ہے؟''

''بس بھائی! میں اور بابا صبح صبح نکلیں گے تو دوپہر تک پشاور پہنچ جائیں گے وہاں سے رات آٹھ بجے فلائٹ ہے تو انشاء اللہ روانگی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے پتا کر لیا ہے۔ یہاں صبح گیارہ بجے تمہاری فلائٹ پہنچ جائے گی۔ میں تم لوگوں کو ائیرپورٹ پر ہی مل جاؤں گا۔''

تھوڑی دیر اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر

سلسلہ منقطع کر کے وہ بستر سے نکل آیا۔ صبح ہو رہی تھی۔ فجر کا وقت تھا۔ چنانچہ وہ نماز کی تیاری کرنے لگا۔

پورا دن اس نے اس سرخوشی کو محسوس کیا جو ایک طویل عرصے کے بعد اپنے باپ اور بھائی سے ملاقات کی مظہر تھی۔ صبی اور عبداللہ سے فون پر بات ہوئی تھی اور اس نے انہیں بتا دیا تھا کہ بابا کل پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ بابا سے ملنے آنے کو بھی کہا۔

آج اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس بات کو اس کے ساتھ کام کرنے والے سب ہی لوگوں نے محسوس کیا۔

''کیا بات ہے سلطان بھائی! آج بڑے خوش نظر آرہے ہو؟'' عظمت نے پوچھا جو اسی ہوٹل میں ویٹر تھا لیکن ہم وطن ہونے کے ناتے دوستی بھی تھی۔

''ہم م م م...... آج میرے بابا اور بھائی آرہے ہیں۔'' سلطان نے بتایا۔

''اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ان کی خدمت میں کروں گا۔ سلطان بھائی میری ڈیوٹی ادھر ہی لکھوا دینا جدھر وہ ٹھہریں گے۔'' عظمت نے کہا تو سلطان نے ہنستے ہوئے سر ہلایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

رات دس بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو وہ روز کی طرح تھکن محسوس کرنے کے بجائے اپنے آپ کو چاق چوبند ہی محسوس کر رہا تھا۔ رات بستر پر لیٹتے ہوئے وہ صبح کے بارے میں سوچنے لگا۔

''اتنے عرصے کے بعد بابا سے اور بھائی سے مل کر کیسا لگے گا؟'' وہ مسکرایا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ گہری نیند میں تھا جب اسے محسوس ہوا جیسے دور کہیں کوئی موسیقی بج رہی ہے اور وہ سمجھنے کی کوشش میں نیند کے بے پناہ دباؤ سے باہر آ گیا۔

ٹیبل پر رکھے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور اس کا اسکرین روشن ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی صبح کے چھ بج رہے تھے۔ اسکرین پر پاکستان کا نمبر دیکھتے ہی اس کا دل دھڑکا۔

''خدا خیر کرے۔'' وہ بڑبڑایا اور جلدی سے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو، السلام علیکم...... کون ہے؟''

''آپ سلطان خان بات کر رہے ہیں؟ آپ کے بھائی آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ بات کیجیے۔'' کسی اجنبی آواز نے کہا تو سلطان پریشان ہو گیا۔

''بھائی!'' اگلے ہی لمحے وہ فون پر ذیشان کی بھرائی ہوئی آواز سن کر حواس باختہ سا ہو گیا۔

''ذیشان! کیا ہو گیا ہے؟ تم لوگوں کو تو آج گیارہ بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ تم ابھی تک وہاں کیا کر رہے ہو؟ بابا تو ٹھیک ہیں ناں؟'' اس نے گھبرا گھبرا کر سوال کیے۔

''بس بھائی! بابا ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم لوگ گاؤں سے ویگن میں پشاور آرہے تھے تو کچھ مسلح لوگوں نے ویگن کو روکا۔ سب مسافروں کو نیچے اتار کر تلاشی لینے لگے۔ سب کے پاس جو کچھ نقدی یا موبائل فون تھے وہ لے لیے۔ میرے اور بابا کے پاس بھی جتنا پیسا گھڑیاں اور میرا فون تھا وہ ان لوگوں نے لے لیا۔ ہم دونوں کے پاسپورٹ بھی چھین لیے۔ بابا نے پاسپورٹوں کے لیے ان کی بڑی منتیں کیں کہ یہ تم لوگوں کے کسی کام کے نہیں ہیں۔ ہمیں واپس دے دو۔ مگر وہ نہیں مانے۔ بابا نے زیادہ اصرار کیا تو ان ظالموں نے گولی چلا دی۔ جو بابا کے بازو پر لگی۔ وہ تو شکر ہے کہ ہڈی بچ گئی۔ ابھی اسپتال سے پٹی وغیرہ کروا کے فارغ ہوا ہوں۔ اب مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں۔ واپس گاؤں چلے جائیں ہم لوگ...... کہ اِدھر پشاور میں رک کر دوسرے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کروں۔'' ذیشان کے لہجے میں بے حد پریشانی تھی۔ اور اس کی بات سن کر ایک لمحے کو ہی سلطان کا دماغ بھی بھک سے اڑ گیا تھا۔ پھر اس نے بمشکل اپنے اوپر قابو پایا۔

''ذیشان! پہلے تو یہ بتاؤ کہ بابا کی حالت کیسی ہے؟''

''گولی نے صرف اوپر کی کھال اور تھوڑا بہت گوشت زخمی کیا تھا۔ وہ کوئی اتنی بڑی تکلیف نہیں تھی۔ اب مرہم پٹی کے بعد بابا بالکل ٹھیک ہیں۔ بس تھوڑے افسردہ ہیں کہ پاسپورٹ ضائع ہو جانے کی وجہ سے ہم آج روانہ نہیں ہو سکے۔'' ذیشان نے بتایا۔

''دیکھو، بابا کو تسلی دو اور ان کے دوست محمود شاہ کے گھر لے جاؤ۔ وہ وہاں آرام کریں اور تم ارجنٹ پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرو، فوراً...... تم جانتے ہو بابا کا جلد از جلد یہاں آنا کتنا ضروری ہے؟'' سلطان نے پُرسکون لہجے میں بھائی کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے بھائی، میں کوشش کرتا ہوں۔''

''دیکھو، پریشان مت ہونا۔ میں فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔ روزانہ فون کر کے تمہاری اور بابا کی خیریت اور پاسپورٹ کی اپ ڈیٹس لیتا رہوں گا۔ جلدی پاسپورٹ

حاصل کرنے کے لیے جو بھی ممکن ہو کرلو۔ ٹھیک ہے۔ بابا کو میرا اسلام کہنا۔''

سلطان فون بند کر کے بڑی دیر تک فکرمندی سے کسی نادیدہ نقطے کو گھورتا رہا پھر اٹھ گیا۔

☆☆☆

ایک بجے کے قریب صبیی اور عبداللہ کے فون آگے پیچھے آئے۔ سوال ایک ہی تھا۔

''سلطان! بابا آ گئے کیا؟''

''نہیں، بعض وجوہات کی بنا پر وہ ابھی نہیں آپائیں گے۔ کچھ وقت لگے گا۔'' اس نے دونوں کو ایک سا جواب دیا۔

دو بجے لنچ بریک میں جب وہ لابی میں پہنچا تو صبیی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ خلافِ توقع اس نے چہک کر ہیلو ہینڈسم کہنے کے بجائے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' اس کے مختصر سے سوال سے وہ سمجھ گیا کہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

''ان کے پاسپورٹ کا کچھ مسئلہ تھا اس لیے نہیں آسکے۔ کچھ دن کے بعد آئیں گے۔''

''کیا مسئلہ تھا؟'' صبیی نے اسے سنجیدگی سے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ اس کے انداز پر حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

''میں بتاؤں؟ گاؤں سے شہر آتے ہوئے کچھ ڈاکوؤں نے لوٹ مار کی اور پیسے، موبائل اور گھڑیوں کے ساتھ ساتھ ان کے پاسپورٹ بھی چھین لیے۔'' صبیی نے گویا انکشاف کیا۔

''ہاں، تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب؟'' سلطان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے اپنے ذرائع سے یہ اطلاع ملی ہے۔ میں صرف تصدیق کرنا چاہتی تھی۔'' صبیی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں آں آں...... میں تصدیق کر رہا ہوں نا...... یہ بات درست ہے لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ یہ جاننا چاہتا ہوں میں؟'' اس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''اگر میں یہ کہوں...... کہ اس دور دراز علاقے میں ہونے والی...... ڈکیتی کی وہ واردات یہاں سفارت خانے میں پلان کی گئی تو کیا تمہیں یقین آجائے گا؟'' صبیی نے پُراسرار سے لہجے میں کہا تو سلطان حیرت سے چیخ اٹھا۔

''توووو...... یہ کیسے ممکن ہے؟ یہاں کوئی ایسا کیوں کرے گا؟'' اس نے جذباتی انداز میں سوال کیا تو صبیی خاموشی سے اس کی ہیجانی کیفیت کا جائزہ لیتی رہی پھر آہستہ سے گویا ہوئی۔

''تمہارے بابا کے یہاں آنے کے اغراض و مقاصد اور کچھ عرصے پہلے آفر ہونے والی ڈیل کے تانے بانے جوڑنے کی کوشش کرو...... بات سمجھ میں آجائے گی۔''

''او مائی گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ لوگ اس حد تک بھی جاسکتے ہیں۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''معاملہ ملینز آف ڈالرز کا ہو...... تو کوئی کہیں تک بھی جاسکتا ہے۔ مائی ڈیئر! ہوسکتا ہے کہ یہ حرکت کر کے تمہیں یہ پیغام دیا گیا ہو کہ تم اگر ہماری بات نہیں مانو گے تو پھر تمہارے راستے میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے...... نہ کھیڈاں گے...... نہ کھیڈن دیاں گے۔'' صبیی نے بات سمجھانے کی کوشش کی تو سلطان بے بسی کے عالم میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''یعنی اگر میں ان کی ففٹی ففٹی والی ڈیل کو مان لیتا ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ وہ یہ کیس مجھے جیتنے نہیں دیں گے؟''

''مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو اور وہ واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہو۔'' سلطان کے اندر امید ٹوٹی نہیں تھی۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ محض میری غلط فہمی ہی ہو۔ میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ آگے جو حالات و واقعات سامنے آئیں گے تو ہم دونوں کو ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ بلکہ میں دعا کروں گی کہ میرا خیال ہی غلط ہو اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک بالکل ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ تم چاہتے ہو۔'' صبیی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھے تسلی...... بلکہ جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کر رہی ہو یا محض بہلانے کی کوشش ہے کہ...... مجھے صحیح صحیح بتاؤ صبیی کہ سچ کیا ہے؟'' سلطان کے لہجے میں تھوڑی اشتعالی سی کیفیت تھی۔

''سلطان! جو کچھ میرے علم میں آیا، وہ بس اتنا ہی آدھا ادھورا ہے۔ زیادہ تفصیلات کا مجھے بھی علم نہیں۔ جسٹ ویٹ اینڈ واچ...... امید ہے جلد ہی سچ سامنے آجائے گا۔'' صبیی نے بات ختم کر دی۔

اور پھر جلد ہی سچ سامنے بھی آ گیا۔ فون پر ذیشان سے بات کی تو اس نے بتایا کہ پاسپورٹ کاغذ کی نایابی اور

پرنٹنگ مشین کی خرابی کے سبب نئے پاسپورٹ بننا ممکن نہیں ہے۔ اوران دونوں چیزوں سے متعلق مسائل حل کرنے میں کتنا وقت لگے گا، یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ بھائی! ابھی تو پاسپورٹ کا مسئلہ ہی حل نہیں ہو رہا ہے۔ ویزے کی باری آنے اور ویزا لگنے میں کتنا وقت لگے گا، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی کوشش جاری رکھو...... وہاں پاسپورٹ آفس میں ایجنٹ گھومتے رہتے ہیں۔ کچھ پیسے دے کر کسی سے بات کرو...... شاید کام ہو جائے۔''

''میں نے کوشش کی تھی بھائی! ایک نے پانچ ہزار کے عوض کام کروانے کا کہا تھا مگر وہ غائب ہو گیا۔ دوسروں نے یہی کہا کہ کام ہی بند ہے تو کوئی کیسے کروائے گا۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں بھائی! میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بہتر ہو ہی جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنا اور بابا کا خیال رکھنا۔ او کے اللہ حافظ۔'' سلطان فون بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

چار پانچ دن کے بعد پھر زیشان سے بات ہوئی تو نہ جانے کیوں اس کی امیدوں کے دیے ٹمٹمار ہے تھے اور وہ نمبر ملاتے ہوئے دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے کہ اس دفعہ اسے اچھی خبر ملے تا کہ اسے تمام اندیشوں اور وسوسوں سے نجات مل جائے۔ زیشان جواب میں یہی کہے کہ بھائی سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہم لوگ آ رہے ہیں مگر جب بات ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ نہ تو اس کی دعا قبول ہوئی ہے اور نہ ہی بداندیشوں سے نجات ممکن ہو سکی۔

''بھائی! بڑی عجیب بات ہے۔ کئی دن تو وہ لوگ یہی کہتے رہے کہ کاغذ نہیں ہے۔ پرنٹنگ مشین خراب ہے اب مسئلہ حل ہو گیا ہے تو دوسروں کے پاسپورٹ تو بن رہے ہیں لیکن ہمارے پتا نہیں کیوں اٹکے ہوئے ہیں۔ میرے بار بار پوچھنے پر پہلے تو وہ ٹالتے رہے پھر کہنے لگے کہ آپ کے پاسپورٹ جن لوگوں نے چھینے ہیں وہ ان کا غلط استعمال نہ کریں، ابھی اسی سلسلے میں تحقیقات ہو رہی ہیں۔ آپ کو ابھی انتظار کرنا پڑے گا۔ کتنا انتظار...... یہ نہیں معلوم۔''

''کسی ایجنٹ کے ذریعے بھی ممکن نہیں ہوا؟'' سلطان نے یاس انگیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بھائی! انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ اب میں بابا کو لے کر گاؤں جا رہا ہوں۔ پلوشہ کے شوہر امتیاز کو کہہ کر جا رہا ہوں کہ وہ پتا کرتا رہے۔''

زیشان نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا تو اس نے مایوسی میں سر بیڈ کے سرہانے دے مارا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ صبیح کی بات میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہے۔

''یعنی اس طرح وہ مجھے زبردستی مجبور کریں گے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ جیسے جیسے وہ سوچتا جا رہا تھا، اس کا اشتعال بڑھ رہا تھا۔ کیا کرے، کیا نہ کرے...... عجب بے بسی کی سی کیفیت تھی۔ وہ اسی طرح سوچوں کے بھنور میں گھرا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے چونکایا۔

''اتنی رات کو کس کا فون آ گیا؟'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے فون اٹھایا اور کال ریسیو کی۔

''میں منظر جمیل بات کر رہا ہوں۔ پاکستان ایمبیسی سے...... آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے سوچا آپ سے معلوم کرلوں کہ میں نے کسی کے بی ہاف پر آپ کو جس ڈیل کی آفر کی تھی، اس بارے میں آپ نے کچھ تو سوچا ہو گا۔ شاید آپ کوئی پوزیٹو اسٹیپ لینا چاہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ پھر کیا خیال ہے آپ کا؟'' منظر جمیل کی آواز اور اس کا لب ولہجہ اس کے اشتعال کو اور بڑھا گیا۔ جسے اس نے بڑی مشکل سے قابو کیا کہ یہی مصلحت کا تقاضا تھا۔

''آپ کی ڈیل کے بارے میں سوچنا تو اب بیکار ہی ہے۔ مقدمے کی تمام اپ ڈیٹس آپ کو مل ہی جاتی ہوں گی۔ اس کے فیصلے کا انحصار اب صرف میرے بابا کی گواہی پر ہے اور ان کے ساتھ وہاں کچھ ایسا ہو گیا کہ ان کا آنا محال ہے اس لیے اگر ان کی گواہی نہیں ہو گی تو فیصلہ ہمارے حق میں تو نہیں ہو سکتا...... اور یقینی طور پر ہم یہ مقدمہ ہار جائیں گے۔ آپ کی آفر اگر میں نے قبول کر لی تو دہرے نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا اور میری مالی حیثیت اس قابل نہیں کہ اخراجات کی اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کر سکوں۔ اس لیے اس سلسلے میں کچھ سوچنا ہی بیکار ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''آپ کے بابا کو کیا مسئلہ درپیش ہے۔ آپ بتائیں! شاید ہم اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد کر سکیں؟'' اس کے اس اندازِ تغافل پر سلطان کو اپنی کنپٹیوں میں کچھ کھولتا ہوا سا محسوس ہوا لیکن پھر اس نے ضبط کا دامن تھامے رکھا۔

''آپ کو معلوم تو ہو گا کہ ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' وہ اپنے لہجے کی چبھن پر قابو نہیں رکھ پایا۔

''ہاں ہمارے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے دوست سے یہ تو معلوم ہوا تھا کہ شاید ان کے پاسپورٹ کا کچھ مسئلہ ہے۔'' منظر جمیل نے بتایا۔

''آپ کے دوست نے بالکل صحیح بتایا ہے۔ پہلے ان کا پاسپورٹ ضائع کروا دیا گیا اور اب نیا بنا کر دیا نہیں جارہا۔''

''یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے سلطان صاحب! آپ اگر کہیں تو میں اپنے ریسورسز استعمال کر کے نہ صرف پاسپورٹ بلکہ ویزے کا بھی جلد سے جلد انتظام کروا سکتا ہوں۔''

''اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں آپ کی آفر کردہ ڈیل قبول کرلوں؟'' سلطان نے تلخ لہجے میں کہا تو منظر جمیل ہلکے سے ہنسا۔

''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے سلطان صاحب! دنیا کے تمام معاملات کچھ دو اور کچھ لو پر ہی چلتے ہیں۔ یہ کوئی نرالی انوکھی بات نہیں ہے۔ آج ہم اسی امید پر آپ کے کام آنے کی کوشش کریں گے نا...... کہ کل آپ بھی ہمارے کام آئیں گے۔'' اس نے لفظوں کا کھیل کھیلا۔

''مجھے کچھ وقت دیجیے...... سوچنے کے لیے...... کل اسی وقت فون کیجیے، میں اس وقت تک کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں گا۔'' سلطان نے فون بند کر دیا۔ اس کا غصہ آہستہ آہستہ بے بسی میں تبدیل ہوا تو آنکھوں میں نمی سی آگئی۔

اگلے دن اس نے صبیی کو یہ سب بتایا۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتایا تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا اور ہو رہا ہے، وہ سب یہیں پلان کیا گیا ہے اور دیکھ لو...... میری بات سچ تھی نا۔''

''لیکن اب میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟'' سلطان کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔

''اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہو؟ تم اپنے مقصد پر نظر رکھو۔ تمہارا مقصد یہی ہے نا...... کہ تم یہ مقدمہ جیتو اور جب تمہیں وہ سب جویلو مل جائیں تو...... اسے پاکستان کا نیشنل ہیریٹیج ڈکلیئر کر کے حکومت پاکستان کے حوالے کر دو۔'' صبیی نے کہا۔

''ہاں، چاہتا تو یہی ہوں لیکن کس طرح ہوگا یہ...... میں نہیں جانتا۔'' وہ افسردہ تھا۔

''سمپل...... ان کی آفر قبول کرلو۔'' صبیی نے اطمینان سے کہا تو وہ چڑ سا گیا۔

''اگر وہ قیمتی ورثہ...... ان جیسے بدنیتوں کے ہی حوالے کرنا ہے تو کیا ضرورت ہے مجھے اتنا بکھیڑا پھیلا کر انہی سے چھیننے کی۔ اسی کے پاس رہنے دیتا ہوں۔''

''اوہ و و...... بھئی مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مقدمہ جیتنے کے لیے ان کی مدد لے لو...... بعد میں ہم میڈیا کے توسط سے اسے حکومت پاکستان کے حوالے کرنے کی بات اس طرح پھیلائیں گے کہ یہ بات پوری دنیا کے سامنے آجائے گی۔ پھر انہیں ہمت نہیں ہوگی کہ ان پر ڈاکا ڈال سکیں۔ انہیں پاکستان کے حوالے کرنا ہی پڑے گا اور یہی تمہارا مقصد بھی ہے۔'' صبیی نے اسے روشن رخ دکھایا۔

''شاید تمہارا کہنا درست ہو لیکن دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ فرض کرو سب کچھ کرنے کے باوجود...... فیصلہ ہمارے حق میں نہیں ہوتا تو میں ففٹی پرسنٹ اخراجات کہاں سے ادا کروں گا۔ تم جانتی ہو میری مالی حیثیت ایسی نہیں ہے۔''

''اس کے لیے ہمارے پاس دو آپشنز ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم سلمان احمد سے ملیں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ بغیر معاوضہ لیے یہ مقدمہ لڑے کیونکہ ایک پاکستانی ہونے کے ناتے اتنا تو اس کا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے وطن کے لیے اتنا تو کر سکے۔ حالانکہ مجھے اس کی امید کم ہے۔ لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔

''دوسرا آپشن یہ ہے کہ اس منظر جمیل سے بات کرو اور اس سے کہو کہ مقدمے کے تمام اخراجات وہی برداشت کرے کیونکہ ان جویلو کا ففٹی پرسنٹ بھی کئی ملین ڈالرز کے برابر ہوگا۔ اخراجات تو شاید اس کا ٹین پرسنٹ بھی نہیں ہوں گے۔ دونوں آپشنز میں سے جو بہتر لگے تم اس پر بات کرو۔'' صبیی نے اسے نئی راہیں سجھائیں۔

''ہم م م م...... پہلی صورت میں سلمان احمد بغیر معاوضہ کام کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ تمام جویلو پاکستان کو مل جائیں گے لیکن اگر وہ نہیں مانتا تو مجبوراً پھر منظر جمیل سے بات کرنا پڑے گی نہ چاہتے ہوئے بھی۔'' سلطان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

پھر یہی ہوا۔ وہ سلمان احمد سے ملا تو اس نے کہا۔

''میں نے پاکستانی ہونے کے ناتے پہلے ہی اپنا حق ادا کیا ہے۔ جو معاوضہ میں عموماً وصول کرتا ہوں اس مقدمے میں اس سے نصف پر کام کر رہا ہوں پھر میں تنہا نہیں ہوں۔ پوری ایک لا فرم ہے میری...... جس میں اس وقت تقریباً دس وکلا ہیں۔ ان کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات مجھے پابندی سے ادا کرنا ہوتے ہیں۔ تو میاں! گھوڑا گھاس سے اگر اتنی دوستی کرلے گا تو کھائے گا کہاں سے؟''

پھر مجبوراً سلطان کو منظر جمیل سے بات کرنا پڑی۔

''دیکھیے مسٹر سلطان! اگرچہ یہ ہماری خدمات کا درست صلہ نہیں ہے کیونکہ ہم آپ کے راستے کے سارے کانٹے ہٹا رہے ہیں اور اخراجات کی مکمل ادائیگی کرنے کے بعد یہ ہمارے لیے ایک مہنگا نسخہ ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم آپ کی مجبوریاں دیکھتے ہوئے ایک اچھے مقصد کے لیے آپ کی اتنی مدد کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔''

پھر یہی ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں سلطان کو خبر مل گئی کہ بابا اور بھائی کو پاسپورٹ بھی مل گئے ان پر ویزا بھی لگ گیا اور اگلے چند دنوں میں وہ نیویارک پہنچ رہے ہیں۔

سلمان احمد نے کورٹ میں پیشی کی قریبی تاریخ لے لی تھی۔ اور آخرکار اپنے وقت پر مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سلمان احمد نے اس دن اپنی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے۔

''می لارڈ! دوسری جنگِ عظیم کے بعد فاتح ممالک نے جس طرح مفتوحہ علاقوں میں لوٹ مار کی اس میں مفتوحہ ممالک اپنے بے شمار قومی ثقافتی ورثوں سے بھی محروم کردیے گئے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے ذریعے یہ قانون بنایا گیا کہ ایسی کوئی بھی صورتِ حال ہو، کسی ملک کے قومی ثقافتی ورثوں کی لوٹ مار نہیں کی جائے گی۔ اسی سلسلے میں کئی مقدمات بین الاقوامی عدالت میں زیرِ سماعت ہیں۔ جن میں ایک مشہور کیس کوہ نور ہیرے کا بھی ہے۔ جس کی ملکیت کے دعوے کا کیس انڈیا نے دائر کر رکھا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ ہیرا ان کے علاقے گولکنڈہ کی کانوں سے نکلا تھا۔

''لیکن پاکستان کے ایک وزیراعظم نے بھی اس کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہوا ہے کہ یہ ہیرا کیونکہ پاکستان کے علاقے لاہور سے لے جایا گیا ہے اس لیے اس کی ملکیت پاکستان کو ملنا چاہیے۔

''تو می لارڈ اس قانون کے تحت آرتھر ایشلے کے پاس موجود جویلو پاکستان کا نیشنل ہیریٹیج ہیں اس لیے انہیں پاکستان کو ملنا ہی چاہئیں۔''

کارروائی چلتی رہی۔ سلمان احمد، عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے ثبوت و شواہد کے ساتھ ساتھ اپنے موقف کو مضبوطی سے آگے بڑھاتے رہے۔ سلطان کے والد کا بیان بھی سنا گیا۔ انہوں نے آرتھر کو پہچان کر اس کے کرتوت بیان کیے اور آخرکار فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔

کمرائے عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین میں اور لوگوں کے ساتھ ساتھ منظر جمیل بھی خاموشی سے پچھلی سیٹوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

آخرکار فیصلے کا اعلان ہوا۔ سلطان مقدمہ جیت چکا تھا۔ جج نے آرتھر ایشلے کو وہ تمام جویلو جو اس نے پاکستان سے حاصل کیے تھے، واپس کرنے کا حکم دیا۔ کچھ اور جزئیات بھی فیصلے میں شامل تھیں۔

فیصلہ سنتے ہی کمرائے عدالت میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ سب سلطان کو مبارک باد دے رہے تھے اور وہ خود سلمان احمد کا بڑا مشکور تھا کہ ان کی قابلیت اور محنت کے سبب وہ اس قابل ہوسکا کہ پاکستان کو اس کا حق دلا سکے۔ بے حد خوش تھے وہ سب...... صبیی نے بھی زوردار مبارک باد دی اور عبداللہ تو آکر اس سے پُرجوش طریقے سے لپٹ گیا۔ سلطان پر بھی ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری تھی۔ بہت دنوں کے بعد اس کے دل و ذہن کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا۔

وہ اس بات کی خوشی کو..دل سے محسوس کر رہا تھا کہ اللہ نے اسے اس قابل بنایا کہ وہ اپنے وطن کی کوئی خدمت کرسکے۔

اگلے چند دنوں میں معاملات تیزی سے سمٹنے لگے۔ ذیشان کے امتحان سر پر تھے اس لیے بابا نے جلد واپسی کا پروگرام بنالیا۔ سلطان نے ان دونوں کو خوب نیویارک کی سیر کروائی۔ کئی لوگوں نے انہیں دعوتوں پر بھی مدعو کیا۔ صبیی نے بھی ایک اچھے پاکستانی ریسٹورنٹ میں ان کی دعوت کی پھر انہوں نے رختِ سفر باندھا۔

''ابا! دو دن بعد تو جواہرات کی کسٹڈی مل جائے گی اور سفیر صاحب جو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، ان کے آتے ہی باقاعدہ تقریب میں...... یہ سارے جواہرات میں حکومت پاکستان کے حوالے کروں گا۔ آپ تھوڑے دن اور رک جاتے۔'' سلطان نے اصرار کیا مگر بابا نہیں مانے۔ چنانچہ اگلے دن کی فلائٹ سے ہی پاکستان کے لیے روانگی ہوگئی۔

اگلے دن سلطان کو جویلو کی کسٹڈی مل گئی۔

''اب میں انہیں کہاں رکھوں؟ بینک میں یا پھر اپنے ہوٹل کی ہی تجوری میں رکھوادوں؟'' سلطان نے اپنی مشکل بیان کی۔

''بھئی تمہیں ان کو لے کر تو پاکستان ایمبیسی میں ہی جانا پڑے گا۔ کیونکہ حوالگی کی تقریب تو وہیں ہوگی اس لیے بہتر نہیں ہوگا کہ انہیں وہیں حفاظت سے رکھوادیا جائے۔''

''کیا یہ محفوظ ہوں گے وہاں؟''

''کیوں نہیں...... ایمبیسی میں اپنے سیف ڈپازٹ لاکرز بھی ہیں۔ انہیں پاکستان پہنچانے سے پہلے وہیں تو رکھا جائے گا۔ تم کہاں بینک کا لاکر لینے کے لیے کہہ رہے ہو۔ پیسے بھی خرچ کرنا پڑیں گے پھر انہیں لانا لے جانا بھی مسئلہ ہو گا۔ ہوٹل میں یہ اتنے محفوظ نہیں ہیں اس لیے میرے خیال میں ایمبیسی ہی زیادہ بہتر ہے۔ باقی آگے تمہاری مرضی۔'' صبیی نے کاندھے اچکاتے ہوئے بال اس کے کورٹ میں پھینک دی۔

سلطان کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلا کر صبیی کے فیصلے پر صاد کر دیا۔ اگلے دن سفارت خانے کی گاڑی میں وہ تمام جویلز لے کر نکلا تو اس کی درخواست پر سلمان احمد بھی اس کے ساتھ ہولیے۔ صبیی تو تھی ہی ساتھ۔ ان لوگوں کی موجودگی ہونا سلطان کے خیال میں اس لیے ضروری تھی کہ کم از کم وہ دو لوگ تو گواہ ہوں گے کہ اس نے وہ قیمتی جویلز سفارت خانے میں رکھوائے ہیں۔

''سفیر صاحب کب تک آئیں گے؟'' اس نے منظر جمیل سے پوچھا۔

''پرسوں شام تک آجائیں گے۔ تو انشاء اللہ اگلے دن ہی میں تقریب کا انتظام کروالوں گا جس میں تم باقاعدہ طور پر یہ تمام جویلز حکومت پاکستان کے حوالے کر دینا۔'' منظر جمیل نے مسکراتے ہوئے اسے پروگرام بتایا تو وہ مطمئن ہو کر سر ہلاتا ہوا لوٹ گیا۔

☆☆☆

بڑا شاندار آفس تھا وہ۔ گہری سبز کلر اسکیم کے ساتھ اس کے پردے، کارپٹ اور طویل و عریض مہاگنی کی آفس ٹیبل کے نیچے بچھا ہوا سبز اونی گرد پوش...... سب کچھ سبز تھا۔ ٹیبل کے پیچھے شاندار اونچی پشت گاہ والی ریوالونگ چیئر اور اس کے پیچھے دیوار پر قائداعظم کا نہایت شاندار پورٹریٹ ایک قیمتی سنہری فریم میں آویزاں تھا۔

وہ سب کونے میں پڑے آرام دہ صوفوں پر براجمان تھے۔ ان کے مقابل دیوار پر لگے ایل سی ڈی اسکرین پر نیوز چینل پر خبریں چل رہی تھیں۔

مقامی خبروں میں ابھی ابھی ایک خبر بریک ہوئی تھی۔

''کل شام ہائی وے چوبیس پر ایک کار کو ٹریلر نے ٹکر ماری۔ کار بے قابو ہو کر اچھلی اور جنگلا توڑتی ہوئی نیچے پانی میں گر پڑی۔ ٹریلر کے بریک سسٹم میں اچانک خرابی کے سبب ڈرائیور اسے روک نہیں پایا۔ تاہم ایک کار سے ٹکرانے کے بعد اس نے کوشش کر کے ایمرجنسی بریک کے ذریعے ٹریلر کو روک لیا۔ وہ خود بھی زخمی ہوا ہے۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ اس کار میں صرف ایک ہی آدمی تھا۔ پولیس کی امدادی کارروائیاں جاری ہیں اور گہرے پانی سے کار کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''چلو بھئی! خس کم جہاں پاک...... یہاں تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ وہاں پاکستان کی کیا خبریں ہیں انور بیگ صاحب؟'' منظر جمیل نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، پریس اتاشی ہیں آپ...... آپ سے زیادہ خبردار کون ہوگا' بتائیے۔'' سفیر نے سگار کا کش لیتے ہوئے انور بیگ کی طرف دیکھا۔

''وہاں بھی معاملات بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ دونوں جیپ میں اپنے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سڑک کے کنارے نصب کسی پوشیدہ بم کے اچانک پھٹنے سے جیپ کے پرخچے اڑ گئے اور اس میں موجود تمام مسافر اور ڈرائیور راہی ملک عدم ہوئے اور اپنے پیچھے کچھ بکھرے ہوئے اعضا، خون کے لوتھڑے اور بے نام کہانیاں چھوڑ گئے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر کہ یہاں کیا کیا ہوا' دنیا سے گزر گئے۔ اب وہاں کسی کو نہیں معلوم کہ 'بدھا' اور 'مرمیڈ' نام کی کیا چیزیں ہیں اور کہاں پائی جاتی ہیں۔'' انور بیگ کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر تھا۔

''یہ بات اس وقت کہی جا سکتی ہے جب اس بات کا یقین ہو کہ یہاں سے اس بارے میں کوئی خبر پاکستان نہ پہنچ سکی ہو۔ ورنہ اگر کسی کو بھی معلوم ہوا تو اس میں مزید حصے دار بڑھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے یہ ساری ایکسرسائز بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اور میں کم از کم یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔'' سلمان احمد نے صوفے میں مزید دھنستے ہوئے کہا۔

''یو آر رائٹ سر! یو نو، میں نے کتنی مشکلات اٹھا کر ان تینوں کو اوپر پہنچوانے کا بندوبست کیا ہے۔ ٹائمنگ اتنی شارٹ تھیں کہ مجھے دانتوں پسینا آ گیا تھا، سب کچھ بروقت ارینج کرنے میں۔ تو اب اس مرحلے پر کسی قسم کی مشکل کھڑی نہیں ہونا چاہیے۔'' منظر جمیل نے اپنا کارنامہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''صبیی! بیٹا انہیں بتاؤ کہ اس سلسلے میں تم نے کیا کیا تھا؟'' انور بیگ نے خاموش بیٹھی ہوئی صبیی کو مخاطب کیا تو اس نے سنجیدگی سے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

''ہاں، میں نے اس سلسلے میں ساری خبروں پر فلٹر لگا دیا

تھا۔ اس لیے اس کے لیک آؤٹ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔''

''میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ اپنے پریس اتاشی انور بیگ صاحب اور مس صبا غزل! ماشاء اللہ باپ بیٹی ہیں۔ ایک ہی گھر کے لوگ...... مل جل کر ہی کام بھی کرتے ہیں۔ تو پھر ان کا دو الگ الگ حصے دار ہونا...... کچھ غیر مناسب نہیں ہے؟'' سلمان احمد نے ایک نکتہ اٹھایا تو صبی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ڈیڈ اپنا کام الگ کرتے ہیں اور میں اپنا کام الگ کرتی ہوں۔ اس ساری ایکسر سائز میں...... اہم ترین کام میں نے ہی انجام دیا ہے۔ یعنی سلطان کو اپنے ٹریک پر چلائے رکھنے کا۔ ورنہ وہ اس دوران کئی بار پٹری سے اترا۔ یہ میں ہی تھی جو اسے کونیس کر کے پھر اپنے راستے پر لے آتی تھی۔ ورنہ آپ سب کو پتا ہے وہ نہایت ضدی اور اپنی بات پر اڑ جانے میں کس قدر مضبوط ہے۔ اگر وہ ہمارے بنائے ہوئے پلان سے ہٹ جاتا اور کوئی اور راستہ پکڑ لیتا تو ہمارے ہاتھ کچھ آنے والا نہیں تھا۔ پھر چاہے اسے عبداللہ اینڈ کمپنی سے ملوانا ہو اور ان کے بعد آپ سے ملوانا...... یہ بھی پلان میں تھا تو میں نے ہی کروایا۔ آپ لوگوں سے ڈیل کروانا بھی میری ہی کوشش تھی اور سب سے بڑی کاوش کہ جویلو کا یوں ٹافیوں کی طرح آپ لوگوں کے ہاتھ آجانا...... کیا میرا ہی کارنامہ نہیں ہے؟ حالانکہ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ لوگوں نے بالا ہی بالا پلان کروا کے...... اسے مروا ڈالا...... وہ بے چارہ ایکسیڈنٹ میں گاڑی سمیت گہرے پانیوں سے ہوتا ہوا موت کی کھائیوں میں اتر گیا۔ کیا قصور تھا اس کا۔ اسے ہم دھوکے میں رکھ سکتے تھے کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ اس نے کون سا جا کر صدر سے یا وزیراعظم سے پوچھنا تھا۔ ظلم کیا ہے آپ لوگوں نے۔'' صبی آزردہ تھی اس بھولے بھالے، نیک اور پُرجوش نوجوان کے لیے جس نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''اوہو...... بھئی کہیں تم اس سے محبت تو نہیں کرنے لگی تھیں؟ جو اس قدر دل دکھ رہا ہے تمہارا...... اس کے لیے۔'' منظر جمیل نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

''کیا اس سے تمہارے لیے...... بلکہ تم سب کے لیے کوئی فرق پڑتا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں ملامت اور لہجہ زخمی تھا۔

''چھوڑو...... دل چھوٹا نہ کرو صبی! جب اس مالِ غنیمت میں سے تمہیں اپنا حصہ ملے گا تو تمہارا سارا دکھ اور افسوس بالکل غائب ہو جائے گا۔'' سفیر صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ساری رکاوٹیں تو دور ہو گئیں۔ بس اب ایک مسئلہ رہ گیا ہے۔ اس سارے سلسلے کو شروع سے آخر تک جاننے والا عبداللہ اور اس کے ساتھی...... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیں۔'' سلمان احمد نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تو مروا دیں عبداللہ کو بھی...... اور اس کے سارے ساتھیوں کو بھی...... بلکہ اور لوگ بھی تلاش کریں۔ شاید کوئی اور بھی جانتا ہو۔ سب کو ایک ساتھ ہی اوپر پہنچوا دیں۔'' صبی نے تلخ لہجے میں کہا تو سب اسے غور سے دیکھنے لگے۔

''ایزی صبی! ایزی...... کچھ حاصل کرنے کے لیے...... کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انور بیگ نے اسے ٹوکا۔

''کرتے ہیں کچھ...... اس بارے میں بھی کچھ کرتے ہیں۔ منظر! کچھ پلان کرو بھئی۔'' سفیر صاحب نے کہا تو منظر نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

سفارت خانے میں ایک چھوٹی سی تقریب تھی جس میں چند ہی لوگ مدعو تھے۔ عبداللہ اور اس کے پانچ ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔ اس سادہ سی تقریب میں مرحوم سلطان خان کے لیے فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت بھی کی گئی اور ایک دو لوگوں نے مختصراً اس کے اخلاق و کردار پر اچھے الفاظ میں تبصرہ بھی کیا۔ اس کو یاد کر کے ماحول کافی افسردہ ہو گیا تھا۔

اور اسی افسردہ ماحول میں قانون داں سلمان احمد نے ان قیمتی جویلو کا بکس سفیر صاحب کو پیش کیا جنہوں نے نہایت ذمے داری سے ان تمام قیمتی جویلو کو جو ریاست کی امانت تھے حکومت کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ اگلے دن ہی اپنے ملک روانہ ہو رہے تھے تاکہ جلد سے جلد وہ اس امانت کو اس کی درست جگہ پہنچا سکیں۔

''کاش اس موقع پر مرحوم سلطان خان بھی ہوتے تو ...... بے حد خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔'' سفیر صاحب نے کہا تو سب نے بلند آواز میں 'آمین' کہا اور تقریب ختم ہو گئی۔

چالباز

سیرینا راض

دور ہو یا نزدیک محبت کبھی ختم نہیں ہوتی... ہجر و فراق سے دوچار ایک ایسے ہی شخص کا امتحان... وہ اپنی محبت کو ہم سفر نہ بنا سکا تھا... مگر اسے کسی مشکل میں دیکھنا اسے کسی طور قبول نہ تھا... بیتے دنوں کی یادوں کے سہارے روز و شب گزارنے والے سراغرساں کا کارنامہ...

وفا گزیدوں کی زندگی میں جفاؤں کے بیج بونے والوں کا المیہ

ٹریبر کا قصبہ، ریاست فلوریڈا کے شہر ٹامپا کے جنوب مشرق میں واقع ہے جہاں حد نگاہ تک ٹماٹروں کے کھیت نظر آتے ہیں۔ پرائیویٹ سراغ رساں ولی کو، علی الصباح میامی سے روانہ ہوا اور چار گھنٹے کا سفر طے کر کے اس قصبے تک پہنچ گیا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے ٹماٹروں کے پودے قطار در قطار سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا اور فصل تیار تھی۔ چار فٹ اونچے پودوں کی ڈالیاں سبز ٹماٹروں کے

بوجھ سے جھکی جارہی تھیں اور ان کھیتوں میں بہت سے مرد اور عورتیں ٹماٹر چننے کا کام کر رہے تھے۔ انہوں نے تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سفید ہیٹ پہن رکھے تھے۔

ایک مقام پر پہنچ کر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے مکانات کی قطار تھی۔ اس نے گاڑی روکی اور ایک تین منزلہ سفید مکان کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا جہاں اس کی دوست مونیکا کیمپ بیرونی سیڑھیوں پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"ولی۔" اسے دیکھتے ہی مونیکا نے زوردار نعرہ لگایا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ دونوں ہی ہوانا کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے جوان ہوئے تھے پھر مونیکا پڑھنے کے لیے یونیورسٹی آف فلوریڈا چلی گئی اور لوٹ کر واپس نہیں آئی۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک دوست کو گھر والوں سے ملانے کے لیے لائی۔ فریڈ کیمپ نامی یہ شخص ایک کسان کا بیٹا تھا اور اگیرو بزنس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ دوسری بار مونیکا آئی تو اس کی انگلی میں ایک بڑی سی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے فخریہ انداز میں ولی کو وہ انگوٹھی دکھائی تو اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی مونیکا تعلیم سے فارغ ہوگی، وہ اسے شادی کے لیے پروپوز کر دے گا لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تاخیر ہو گئی۔ اس نے بجھے دل کے ساتھ مونیکا کو مبارک باد دی اور اس کی شادی میں بھی شریک ہوا۔ البتہ گزشتہ بیس برسوں میں وہ جب بھی اپنے گھر والوں سے ملنے آیا، اس نے مونیکا سے ملنے میں احتیاط سے کام لیا۔ اسی لیے گزشتہ روز جب مونیکا نے اسے فون کیا تو اس کا حیران ہونا ایک فطری سی بات تھی۔

"میں ایک مشکل میں گرفتار ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ولی سے کہا۔

"تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ بات فون پر نہیں بتا سکتی۔ کیا تم میرے پاس آسکتے ہو۔ ہم تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیں گے۔"

"ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔" ولی نے کہا۔ "میں کل صبح آرہا ہوں۔"

وہ اسے لیونگ روم میں لے گئی جہاں قدیم طرز کا فرنیچر رکھا ہوا تھا اور دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ عقب میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی جہاں سے فارم کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد فریڈ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ولی سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک دبلا پتلا چوڑے کندھوں والا شخص تھا جس کا چہرہ مسلسل دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ ولی جانتا تھا کہ وہ ایک خشک مزاج شخص ہے۔ اس لیے اس سے کسی گرم جوشی کی توقع رکھنا فضول تھا۔

فریڈ نے اسے کرسی پیش کی اور مونیکا خود صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پیالی میں بغیر چینی کی آئس ٹی انڈیلی اور ولی کو کپ تھماتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ ہماری بیٹی کی وجہ سے ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ اس کی عمر اکیس سال ہے اور وہ ایک ایسے شخص سے محبت کرنے لگی ہے جو ہمارے پاس کام کرتا ہے۔ ان دونوں نے تین ماہ قبل منگنی بھی کر لی ہے اور آئندہ موسم خزاں میں شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

ولی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ خوش قسمت شخص کون ہے؟"

"اس کا نام فرنانڈو اورٹز ہے۔ وہ میکسیکو کا رہنے والا ہے لیکن سات سال قبل فارم ورکر کی حیثیت سے ہجرت کر کے امریکا آ گیا اور تب سے ہی ہمارے پاس کام کر رہا ہے۔ محنتی شخص ہے۔ اس نے انگریزی بھی سیکھ لی ہے اور اب کمپنی کا حساب کتاب وہی رکھتا ہے۔"

ولی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طور پر کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔"

مونیکا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے مقامی کالج میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی کلاسیں لینا شروع کر دی ہیں۔ اس کا ارادہ اس مضمون میں ڈگری حاصل کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت نرم مزاج اور پُرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟" ولی نے پوچھا۔

"بظاہر وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔"

فریڈ اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، اچانک بول پڑا۔ "اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس عورت کے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور صرف یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے سوزان سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ فراڈیا ہے۔"

ولی نے فریڈ سے نظریں ہٹا کر مونیکا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ عورت کون ہے؟"

"ایک ہفتہ قبل وہ عورت یہاں آئی تھی۔" مونیکا نے کہا۔ "اس کا نام ماریا والڈیز ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ

حال ہی میں اپنے شوہر فرنانڈو کی تلاش میں یہاں آئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھ سال کی بچی ٹریسا بھی ہے جسے وہ فرنانڈو کی بیٹی بتاتی ہے۔''

فریڈ نے ولی کو غضب ناک طریقے سے دیکھا اور بولا۔''وہ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا اور ہماری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خوش قسمت ہے کہ میں نے اس کا گلا نہیں دبایا۔''

مونیکا نے فریڈ کا بازو پکڑا اور اسے ٹھنڈا کرنے لگی۔

ولی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔''ان لوگوں کے یہاں آنے کے بعد کیا ہوا؟''

مونیکا اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔''ہم نے فرنانڈو کو بلا کر ان کا آمنا سامنا کروادیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے ماریا کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی شادی ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی بچہ ہے۔''

ولی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔''تم اس عورت کو نہیں جانتیں اور تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا جبکہ فرنانڈو تمہارا قابلِ بھروسا ملازم ہے۔''

فریڈ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔''اس نے ثبوت پیش کیے تھے۔'' پھر وہ سامنے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز تک گیا۔ دراز کھول کر اس میں سے دو کاغذ نکالے اور ولی کو پکڑا دیے۔

''اس کے پاس اصل کاغذات ہیں۔ میں نے ان کی کاپیاں کروالی ہیں۔'' فریڈ نے کہا۔

دونوں کاغذات پر میکسیکو کے شہر ویراکروز کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ان میں ایک میرج سرٹیفکیٹ تھا جس کے مطابق فرنانڈو اورٹز کی شادی ماریا والڈیز سے پندرہ مئی دو ہزار سات کو ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرا کاغذ ٹریسا کا پیدائش سرٹیفکیٹ تھا جو ان دونوں کی اولاد تھی۔ میامی پولیس میں کافی عرصے کام کرنے کے دوران ولی کی نظروں سے ایسے بے شمار کاغذات گزرے تھے اور دیکھنے میں یہ دونوں کاغذ بھی قانونی لگ رہے تھے۔

''جب اس عورت نے یہ کاغذات دکھائے تو فرنانڈو نے کیا کہا؟''

فریڈ ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا، وہ کہنے لگا۔ ''فرنانڈو نے یہ اعتراف تو کر لیا کہ وہ ویراکروز کا رہنے والا ہے لیکن اس کا اصرار ہے کہ یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے اور یہ کاغذات جعلی ہیں۔ اسی اثنا میں ہماری بیٹی بھی آ گئی۔ اس نے ہماری باتیں سن لیں اور اسی کی طرف داری کرنے لگی۔''

اچانک ہی ولی نے اپنے عقب میں ایک آواز سنی۔ ''میں اب بھی اس کا ساتھ دوں گی۔ فرنانڈو اس عورت کا شوہر اور اس بچی کا باپ نہیں ہے۔''

ولی نے مڑ کر سوزان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے چھ سات سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہی پیاری اور خوب صورت لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کے لمبے بال، باپ جیسی سبز آنکھیں اور ماں جیسی خوب صورت اور چمکدار جلد دیکھنے والوں پر جادو کر دیتی تھی۔ ولی کو یہ سمجھنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ ایک نوجوان میکسیکن یا کوئی بھی شخص اس سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہے۔

فریڈ غصے سے بولا۔''ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس میٹنگ میں مداخلت مت کرنا۔''

''تاکہ تم اس شخص کو فرنانڈو کے خلاف بھر سکو۔ میں ہر حال میں اس سے شادی کروں گی اور مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم کیا کہتے ہو۔''

''اگر وہ پہلے سے شادی شدہ ہے تو تمہاری شادی غیر قانونی ہوگی۔'' ولی نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

سوزان طوفان کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔ مونیکا اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ولی کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی سابقہ محبوبہ کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف فریڈ کے چہرے پر چٹان جیسی سختی تھی۔ اس نے ولی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح ہماری بیٹی پر یہ ثابت کر دو کہ یہ شخص اسے دھوکا دے رہا ہے۔''

مونیکا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''ہم صرف یہی نہیں چاہتے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ سچ سامنے لایا جائے، چاہے وہ کچھ بھی ہو۔''

ولی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فریڈ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا اور ولی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ان دونوں میاں بیوی کے بیچ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

اس کے جانے کے بعد ولی نے مونیکا سے پوچھا۔

''میں فرنانڈو سے کہاں مل سکتا ہوں؟''

اس نے سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ یہاں سے نصف میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے سفید گھر میں رہتا ہے جو ہماری ملکیت ہے۔ فریڈ تو اسے گھر اور ملازمت سے نکالنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو فرنانڈو یہ قصبہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور سوزان بھی اس کا ساتھ دے گی۔ اس طرح ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے دور ہو جائیں گے۔''

''اور اس عورت سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''وہ ایک ٹریلر پارک میں ٹھہری ہوئی ہے جہاں بہت سے مقامی مزدور رہتے ہیں۔ فرنانڈو کے مکان سے ایک میل آگے جانے کے بعد تمہیں دائیں ہاتھ پر ایک کچی سڑک ملے گی۔ یہ ٹریلر پارک وہیں پر ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔''

ولی واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تو مونیکا نے اس کے عقب میں آتے ہوئے کہا۔ ''برائے مہربانی اس مسئلے کو حل کرنے میں میری مدد کرو۔ اس سے پہلے کہ میرا خاندان بکھر جائے۔''

ولی نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا اور اسے یقین دلایا کہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے، اس کے لیے ضرور کرے گا۔ وہ اپنی کار میں سوار ہو کر مونیکا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ بڑے مکانات کا سلسلہ ختم ہوا تو اس کی نظر ایک سفید کاٹیج پر گئی جس کا تذکرہ مونیکا نے کیا تھا۔ اس کے دروازے پر ایک پرانی سفید پک اپ کھڑی تھی۔ ولی گاڑی سے اتر کر کاٹیج کے بیرونی دروازے پر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو اس کی نظر ایک نوجوان شخص پر گئی جو ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ولی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہی فرنانڈو اورٹز ہو سکتا ہے۔ پہلے تو اس نے ولی کی آمد کا نوٹس نہیں لیا لیکن جب ولی نے دوسری بار دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو وہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جیسا کہ مونیکا نے بتایا تھا کہ وہ پچیس چھبیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی اور چہرہ صاف و بے داغ تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور وہ گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ شاید گزشتہ دنوں جو واقعات پیش آئے تھے، ان کی وجہ سے وہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ولی کے دوبارہ دستک دینے پر اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی جانب لپکا تاہم ولی کو دیکھ کر اچانک ہی رک گیا۔ شاید اسے کسی اور کے آنے کی توقع تھی۔

''تم کون ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟'' فرنانڈو نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم ہی فرنانڈو اورٹز ہو؟''

''ہاں۔''

''میرا نام ولی کوئستا ہے اور میں مسٹر و مسز کیمپ کا دوست ہوں۔''

یہ سن کر فرنانڈو کا منہ لٹک گیا اور اس کی بھوری آنکھیں سکڑ گئیں۔ ولی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہسپانوی زبان میں بولا۔ ''میری بات غور سے سنو۔ میری تم سے کوئی مخالفت نہیں ہے۔ میں صرف سچ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اسی سلسلے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔''

فرنانڈو تھوڑا سا ہچکچایا پھر اس نے جالی والا دروازہ کھول کر ولی کو اندر آنے دیا۔ یہ چھوٹا سا ایک منزلہ مکان اندر سے صاف ستھرا اور مکمل آراستہ تھا۔ ایک کونے میں میز پر بہت سے رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ فرنانڈو نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اگر تم سچ جاننا چاہتے ہو تو میں تمہیں حقیقت بتائے دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے ماریا والڈیز کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اور تمہاری اس سے شادی بھی نہیں ہوئی؟''

''جب میں کبھی اس سے ملا ہی نہیں تو شادی کیسے ہوتی؟''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ بچی ٹریسا بھی تمہاری نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ عورت یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہے۔ اسے تم پر یہ الزامات لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس عورت کے پاس ایسی باتیں کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے؟''

''ہاں، کیونکہ اس عورت سے میرا کبھی واسطہ نہیں رہا اور نہ ہی میں نے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ بھی ویراکروز کی رہنے والی ہے جہاں سے تمہارا تعلق ہے؟''

''وہ یہی کہتی ہے لیکن میں نے اسے وہاں بھی کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک بڑا شہر ہے اور وہاں ہزاروں لوگ

رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں سب کو نہیں جانتا اور یہ عورت بھی ان میں شامل ہے۔''

یہ کہہ کر وہ کرسی سے کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ غصے میں ہے اور اس صورتِ حال سے نکلنا چاہتا ہے۔ ولی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''تم ایک نوجوان شخص ہو۔ ممکن ہے کہ ماضی میں تم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو لیکن اس کا ازالہ ممکن ہے۔ اگر تم سچ بتا دو۔ سوزان تم سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''میں تمہیں سچ ہی بتا رہا ہوں۔'' وہ چلاتے ہوئے بولا۔ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف گیا۔ اسے کھولا اور پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ولی نے اس کا اشارہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب اس کا رخ ٹریلر پارک کی جانب تھا۔ وہ مونیکا کے بتائے ہوئے محل وقوع کے مطابق سڑک پر ایک میل تک گیا اور اسے مطلوبہ جگہ مل گئی۔ وہاں سے ایک تنگ اور کچی سڑک اس ٹریلر پارک تک جا رہی تھی جہاں تقریباً دو درجن ٹریلر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان خالی جگہ پر جھاڑیاں اُگ آئی تھیں اور جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا۔ کئی ٹریلروں کے باہر رسی پر بچوں کے دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے اور کہیں کہیں پرانی زنگ آلود کاریں بھی کھڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ عادی کام چور اس روز کام پر نہیں گئے تھے کیونکہ کچھ ٹریلروں کے باہر سیڑھیوں پر کام کے دوران پہننے والے جوتے اور ٹماٹر جمع کرنے والی بالٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

ولی نے کار ایک جگہ روکی اور وہاں کھیلتے ہوئے بچوں سے پوچھا۔ ''کیا تم ماریا والڈیز نامی کسی عورت کو جانتے ہو جو چند روز قبل اپنی بچی ٹریسا کے ساتھ یہاں رہنے آئی ہے؟''

سب بچوں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور ایک خوب صورت لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''یہی وہ لڑکی ہے۔'' ان میں سے سب سے بڑے لڑکے نے کہا۔

وہ لڑکی اتنی توجہ ملنے پر شرما گئی۔ ولی نے اس سے ہسپانوی زبان میں پوچھا۔ ''کیا تم مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو گی؟''

لڑکی کچھ ہچکچائی تو ولی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ میں امیگریشن آفیسر نہیں ہوں۔''

وہ لڑکی ایک عقبی ٹریلر کی جانب مڑ گئی۔ ولی بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ ایک عورت ٹریلر کی سیڑھیوں پر بیٹھی ولی کو اپنی جانب آتا دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی اس کے پاس جا کر رک گئی۔ اس عورت نے نیلی پتلون اور زرد رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت گہری سانولی اور بال سیاہ تھے۔ اس نے گہری سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ اس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہوگی لیکن چہرے کے تاثرات سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگ رہی تھی۔ اس نے ترچھی نظروں سے ولی کو دیکھا جن سے واضح طور پر اجنبیت جھلک رہی تھی۔ ولی نے غور کیا کہ لڑکی کی شکل فرنانڈو کے بجائے اس عورت سے مل رہی تھی گو کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا اور ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے اس سوال کا جواب معلوم کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں وقت لگتا اور تب تک سوزان پریشان رہتی۔

''معاف کرنا، کیا تم ہی ماریا والڈیز ہو؟'' ولی نے ہسپانوی زبان میں پوچھا۔

اس عورت نے اثبات میں سر ہلایا تو ولی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں مسٹر اور مسز کیمپ کا دوست ہوں اور یہاں اس لیے آیا ہوں کہ فرنانڈو وارٹز کے ساتھ تمہارے رشتے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس سے تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟''

ماریا کو ولی سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی اٹھ کر ٹریلر میں چلی جائے گی اور اندر سے دروازہ بند کر لے گی لیکن وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

''میں اس سے ویرا کروز میں ملی تھی۔ ہم دونوں کے خاندان وہیں مقیم ہیں۔''

''تمہاری اس سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے کون سے سال؟''

''مجھے یاد نہیں۔'' اس عورت نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''یاد کرنے کی کوشش کرو۔ سات سال، آٹھ سال، تمہاری عمر اس وقت کیا تھی؟''

''میں شاید پندرہ یا سولہ سال کی تھی۔''

''پہلی بار تم نے ایک دوسرے کو کہاں دیکھا؟''

اس عورت نے غصے سے دیکھا لیکن خاموش رہی۔ ولی نے اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مت کہنا کہ تمہیں یاد نہیں۔ عورتوں کو ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ وہ پہلی بار اپنے محبوب سے کہاں ملی تھیں۔ ویرا کروز میں بہت سی

جگہیں ہیں۔ بندرگاہ کے قریب، کسی ہوٹل میں، یا کوئی کلب وغیرہ۔''

ماریا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ویراکروز کے بارے میں اتنا جانتا ہے جبکہ اس کا تعلق میامی سے تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ولی ایک مرتبہ کسی کیس کے سلسلے میں ویراکروز جا چکا ہے اور اس نے ان جگہوں کے نام صرف اسے متاثر کرنے کے لیے بولے تھے تاہم وہ اب بھی خاموش رہی۔

''یا تمہاری ملاقات ویلارٹا کے ساحل پر ہوئی ہو؟'' ولی نے پوچھا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ زیادہ تر جوڑے وہیں ملتے ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔ ولی نے ٹریلر کی سیڑھی پر ایک پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کے کسی دوست کا نام بتا سکتی ہو جسے تم دونوں ویراکروز سے جانتے ہو۔ شاید اس طرح کچھ آسانی ہو جائے۔''

''مارٹن۔'' اس نے کہا۔ ''مارٹن مینڈوزا۔''

ولی کو یقین نہیں تھا کہ وہ فرنانڈو سے ویراکروز میں مل چکی ہے۔ کیونکہ وہاں ویلارٹا کا ساحل نہیں تھا۔

''اب یہ شخص کہاں ہے؟'' ولی نے پوچھا۔ ''کیا یہ اب بھی میکسیکو میں رہتا ہے؟''

اس عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ اس وقت یہ کہاں ہے۔''

ولی جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے انٹرویو ختم ہو گیا ہے۔ اس نے ماریا کا شکریہ ادا کیا۔ بچی کے سر پر پیار سے تھپکی دی اور کار کی طرف واپس چل دیا۔ وہ اس کے پڑوسیوں سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے لیے اسے انتظار کرنا پڑتا کیونکہ زیادہ تر لوگ اس وقت کام پر گئے ہوئے تھے۔

وہ ٹریلر پارک سے روانہ ہو گیا۔ دو سو گز دور جانے کے بعد اس نے کار روکی اور فریڈ کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف فریڈ نے ہی کال وصول کی۔ ''میں ولی بول رہا ہوں۔ تم سے ایک سوال پوچھنا ہے۔''

''ہاں، بولو۔'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''کیا تم نے کبھی اس علاقے میں مارٹن مینڈوزا نامی شخص کا نام سنا ہے؟''

فریڈ غراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، وہ میرے پاس کام کر چکا ہے۔''

ولی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔

''واقعی، یہ کب کی بات ہے؟''

''میں نے اسے دو سال پہلے نکال دیا تھا۔ اس نے میرے پاس تین سال تک اسسٹنٹ فورمین کی حیثیت سے کام کیا۔''

''تم نے اسے کیوں نکال دیا؟''

''کیونکہ وہ اپنا کام ٹھیک طرح سے نہیں کر رہا تھا۔ اسے کھیتوں میں جا کر مزدوروں کی نگرانی کرنا ہوتی تھی لیکن وہ سارا وقت ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر گزار دیتا تھا۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ اب وہ کہاں ہے؟''

''وہ اب بھی یہیں ہے۔ مجھے تو یہی بتایا گیا ہے لیکن وہ فورمین نہیں محض ٹماٹر چننے والا مزدور ہے اور وہ ٹریلر پارک ہی میں کہیں رہتا ہے۔''

''یہ وہی جگہ ہے جہاں ماریا والڈیز ٹھہری ہوئی ہے؟''

''ہاں، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

ولی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''کیا مینڈوزا کی ملازمت سے برطرفی کا تعلق کسی بھی طرح فرنانڈو اورٹز سے ہو سکتا ہے۔''

''نہیں، اس معاملے سے فرنانڈو کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے مینڈوزا کو ملازمت سے برطرف کیا تھا۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ مینڈوزا اور فرنانڈو کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں تھا؟''

''نہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں، ان کے بیچ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن میں تمہاری فرنانڈو سے بات کروا سکتا ہوں۔ وہ اس وقت دفتر میں ہی ہے۔ میں تو اسے بھی اب تک نکال چکا ہوتا لیکن مونیکا نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔''

چند لمحوں بعد اسے فون پر فرنانڈو کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ ''میں ولی کوئستا بول رہا ہوں اور تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا مارٹن مینڈوزا کے ساتھ کبھی تمہیں کوئی مسئلہ ہوا؟ کیا کوئی ایسی وجہ بنی جس کی بنا پر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ کیا وہ تم سے اس لیے حسد تو نہیں کرنے لگا کہ اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا اور تم ابھی تک کام کر رہے ہو؟''

فرنانڈو جواب دینے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا

جب کافی دیر ہوگئی تو ولی نے پوچھا۔ ''کیا تم لائن پر ہو؟''

''ہاں، میں بول رہا ہوں۔ میرا مارٹن مینڈوزا سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ کبھی نہیں۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اجازت دو، مجھے کام پر واپس جانا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ولی نے ایک گہری سانس لے کر کار اسٹارٹ کی۔ اب اس کا رخ ایک ریستوران کی طرف تھا جہاں رک کر اس نے ہلکا سا کھانا کھایا۔ وہ جانتا تھا کہ فصل کاٹنے کے سیزن میں دیر تک کام ہوتا رہتا ہے۔ جب وہ ریستوران سے باہر نکلا تو سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ وہ گاڑی چلاتا ہوا دوبارہ ٹریلر پارک کی جانب گیا لیکن اس بار اس نے گاڑی باہر ہی روک دی اور پیدل چل پڑا۔ پہلے ٹریلر کے باہر ہی آرام کرسی پر ایک بوڑھی لاطینی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ولی نے اس وقت بھی اسے دیکھا تھا جب وہ دوپہر میں یہاں آیا لیکن جاتے وقت وہ اسے نظر نہیں آئی البتہ اب وہ واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔

اس نے ولی کا بغور جائزہ لیا اور اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی غیر سرکاری گیٹ کیپر ہو اور اس کا کام ہی آنے جانے والوں پر نظر رکھنا ہو۔ ولی نے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا کہ اس کا نام مسز لارا تھا۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے اس ٹریلر میں رہ رہی تھی اور پانچ سال پہلے کام سے ریٹائر ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ موسم کی سختی سہتے سہتے سیاہ پڑ گیا تھا اور بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ اس نے ولی کو بتایا کہ وہ میکسیکو کی ریاست سنالووا کے ایک چھوٹے گاؤں سے تعلق رکھتی ہے اور طویل عرصے سے ٹریلر پارک میں رہنے کے باعث وہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں ہر بات جانتی ہے۔

ولی نے اس سے ماریا والڈیز کے بارے میں پوچھا تو مسز لارا نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کم جانتی ہے کیونکہ وہ عورت حال ہی میں یہاں آئی ہے۔ البتہ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کام نہیں کرتی اور میں حیران ہوں کہ اس کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کا کہنا ہے کہ وہ حال ہی میں میکسیکو سے آئی ہے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ چھوٹی بچی نے بتایا ہے کہ وہ گزشتہ سال اورلینڈو کے قریب ایک اسکول میں جاتی تھی۔ ان کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی ہوں۔''

البتہ مارٹن مینڈوزا کے بارے میں اس کے پاس کافی معلومات تھیں جو گزشتہ کئی سالوں سے ٹریلر پارک میں رہ رہا تھا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ ماریا اور مارٹن کے درمیان کوئی تعلق ہے۔''

''تم نے ایسا کیوں سوچا؟'' ولی نے پوچھا۔

مسز لارا نے ادھر ادھر دیکھا اور ولی کی طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ وہ عورتوں کو پسند کرتا ہے۔ میں نے کبھی اس کے ساتھ کوئی گرل فرینڈ نہیں دیکھی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ ایک زمانے میں کوئی شخص بیس بال کی ٹوپی پہنے اس سے ملنے آیا کرتا تھا لیکن وہ بھی رات گئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ کھیتوں میں کام کرتا تھا کیونکہ اس نے ہمیشہ پورے کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے۔ اس نے کبھی کسی کی طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی سے کوئی بات کی۔ یہاں تک کہ وہ رات میں بھی سیاہ چشمہ لگاتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ اسے آواز بھی دی تھی جب وہ رات گئے یہاں سے واپس جا رہا تھا لیکن وہ آگے بڑھ گیا پھر تھوڑی دیر کے لیے مارٹن مینڈوزا کے ٹریلر میں رکا اور چلا گیا۔ اس بات کو ایک سال یا اس سے زیادہ ہو چکا ہے۔ میں نے اسے کچھ عرصے سے نہیں دیکھا۔ مارٹن اکیلا ہی تھا جب تک یہ عورت ماریا اور اس کی بیٹی یہاں نہیں آئے تھے۔''

مسز لارا نے کچھ اور واقعات کی تفصیل بھی بتائی جو اس نے گزشتہ کئی سالوں کے دوران اس آرام کرسی پر بیٹھ کر دیکھے تھے۔ اسے بولتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی پھر اس کی نظر ٹریلر پارک کے داخلی دروازے پر گئی جہاں ایک پرانی اسکول بس آکر رک گئی تھی۔ اس میں سے مرد اور عورتیں، بالٹیاں اور خالی لنچ بکس پکڑے باہر آ رہے تھے۔ ان کا رخ اپنے اپنے ٹریلروں کی جانب تھا۔ اچانک مسز لارا چلائی۔

''وہ دیکھو، مارٹن۔''

اس نے وہاں سے گزرتی ہوئی ایک پرانی وین کی طرف اشارہ کیا۔ اسے ایک لمبے بالوں والا خوش شکل شخص چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ وہ دیکھنے میں ویسا ہی سنجیدہ نظر آ رہا تھا جیسا کہ مسز لارا نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

اس نے مسز لارا کا شکریہ ادا کیا اور مینڈوزا کے ٹریلر کی جانب چل پڑا جو پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔ اس کی بالٹی سیڑھیوں کے نزدیک رکھی ہوئی تھی لیکن ماریا والڈیز یا اس کی بیٹی وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ولی نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ اس نے اندر کسی کے بولنے کی

آواز سنی لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ ولی نے دوبارہ دستک دی اور مینڈوزا کا نام لے کر پکارا لیکن اس بار بھی کسی نے دستک کا جواب نہیں دیا پھر اس نے دروازہ کھلنے اور کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ تیزی سے ٹریلر کے دوسرے حصے کی طرف گیا تو دیکھا کہ مینڈوزا عقبی دروازے سے نکل کر باہر جارہا ہے۔ وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

وہ راستہ ٹماٹر کے کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا۔ ولی نے دن بھر کھیتوں میں کام نہیں کیا تھا اور وہ تازہ دم تھا اسی لیے اس نے تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنے اور مینڈوزا کے درمیان فاصلہ کم کرلیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مینڈوزا کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو پکڑ رکھا تھا جو شاید ٹماٹر توڑنے کے کام آتا ہو لیکن اس وقت لگ رہا تھا کہ وہ اس چاقو سے ولی کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

ولی اس سے دس فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ اس وقت بھی اتنی روشنی تھی کہ ولی اس کے ہاتھ میں واضح طور پر چاقو دیکھ سکتا تھا۔ ولی نے اپنے کوٹ کے بٹن کھول دیے تاکہ مینڈوزا کو اس کے کندھے پر لٹکا ہوا ہولسٹر نظر آجائے جس میں نائن ایم ایم کا پستول موجود تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کے دستے پر گرفت مضبوط کرلی۔

''اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو وہاں سے بھاگنے کی حماقت کبھی نہیں کرتا۔''

مینڈوزا نے کوئی حرکت نہیں کی اور نہ ہی اس کی بات کا کوئی جواب دیا۔

''تم فرنانڈو اورٹز کی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کیوں کررہے ہو۔ اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا کردیا؟''

مینڈوزا نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اورٹز نے میرے ساتھ کچھ نہیں کیا پھر میں اس کی زندگی کیوں تباہ کروں گا؟''

''شاید اس لیے کہ وہ اب بھی فریڈ کے پاس جاب کررہا ہے جبکہ تم فارغ ہوچکے ہو۔''

مینڈوزا نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''بہت سے لوگ فریڈ کے پاس کام کرتے ہیں اور فرنانڈو بھی ان میں سے ایک ہے پھر میں اس کی پروا کیوں کروں گا۔ تم فرنانڈو سے کیوں نہیں پوچھتے۔ وہ تمہیں بتادے گا کہ ہمارے درمیان کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

یہ بات ولی پہلے ہی فرنانڈو سے پوچھ چکا تھا اور اس نے بھی بالکل یہی جواب دیا تھا۔ ولی نے اس کے ٹریلر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ عورت جو تمہارے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ نہیں ہے جو وہ اپنے آپ کو بتاتی ہے۔''

مینڈوزا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پھر وہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میں نہیں۔ گوکہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ تم سے دوبارہ بات کرنا چاہے گی۔ تم نے اسے خوف زدہ کردیا ہے۔''

''کیا میں نے تمہیں بھی خوف زدہ کیا تھا۔ شاید اسی لیے تم مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے؟''

مینڈوزا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کیا معلوم کہ تم کون ہو۔ ممکن ہے کہ تمہارا تعلق امیگریشن پولیس سے ہو۔''

اس وقت تک وہ وہاں غیر قانونی طور پر رہ رہا تھا اور ڈر تھا کہ امیگریشن والے اسے پکڑ کر ملک بدر نہ کردیں۔ ولی کو اس کی بات پر لمحہ بھر کے لیے یقین نہیں آیا لیکن وہ کہیں نہیں جارہا تھا، وہ واپس چلتا ہوا کار تک آیا۔ اس نے مینڈوزا کو چاقو کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا۔ ممکن ہے کہ اسے کھیتوں میں مزید کام کرنا ہو۔ ولی اپنی کار چلاتا ہوا اسی راستے پر ہولیا جہاں سے آیا تھا پھر اس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے کار روک دی۔ وہ تقریباً بیس منٹ تک کار میں بیٹھا اپنے دماغ میں ان واقعات کو ترتیب دیتا رہا جو صبح اس کی یہاں آمد کے بعد پیش آئے تھے۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور فرنانڈو کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر پک اپ بھی کھڑی ہوئی تھی لیکن وہ وہاں نہیں رکا بلکہ سیدھا کیمپ ہاؤس پہنچا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ تقریباً تیس سیکنڈ بعد سوزان دروازے پر آئی۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ جالی کے پیچھے سے بولی۔

''میرے والدین گھر پر نہیں ہیں۔''

''میں ان سے ملنے نہیں بلکہ تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔'' ولی نے جواب دیا۔

''مجھے تم سے باتیں کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن میں تم سے مارٹن مینڈوزا کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں ورنہ مجھے تمہارے والدین سے بات کرنا ہوگی۔''

سوزان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور اسے لیونگ روم میں لے گئی پھر اس نے ولی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

''ہاں کہو، کیا بات ہے؟''

ولی اپنی جگہ پر کھڑا اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”تمہارا مارٹن مینڈوزا سے بھی تعلق رہ چکا ہے۔ تم رات کے وقت اس سے ملنے اس کے ٹریلر پر جایا کرتی تھیں۔ تمہارے سر پر بیس بال کیپ اور جسم پر اوورآل ہوتا تھا جو عام طور پر مزدور کھیتوں میں کام کرنے کے دوران لیتے ہیں تاکہ کوئی تمہیں نہ پہچان سکے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ فریڈ کی بیٹی نے اپنے ایک ملازم سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔“

سوزان کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ احتجاجاً کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن ولی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ مینڈوزا کی نوکری کیوں ختم ہوئی اور تم نے اس سے قطع تعلق کب کیا۔ نوکری ختم ہونے سے پہلے یا بعد میں۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ اسے ملازمت سے اسی لیے فارغ کیا گیا کہ وہ کھیتوں میں کام کرنے کے بجائے زیادہ وقت تمہارے قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔“

”میں نے اس سے قطع تعلق اس لیے نہیں کیا کہ اس کی ملازمت ختم ہوگئی تھی۔“ سوزان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں فرنانڈو سے محبت کرنے لگی تھی۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“ ولی نے کہا۔ ”وہ ایک اچھا انسان ہے اور ان لوگوں میں سے نہیں جو راتوں کو چھپ کر عشق لڑاتے ہیں لیکن تم سے وہی غلطی ہوئی جو عام طور پر نوجوان لڑکیاں کرتی ہیں۔ فرنانڈو کا ماضی بالکل بے داغ ہے اور اس کے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں لیکن تمہارے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ مارٹن مینڈوزا کو اس بات پر شدید غصہ تھا کہ تم نے اسے چھوڑ کر فرنانڈو سے تعلق استوار کرلیا تھا چنانچہ اس نے تمہارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گوکہ اسے فرنانڈو سے نہیں بلکہ تم سے انتقام لینا تھا لیکن اس کے لیے بہت آسان تھا کہ فرنانڈو کے ماضی کے بارے میں جھوٹی کہانی گھڑی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قریبی میکسیکو کے سفارت خانے سے رابطہ کیا جائے کہ ماریا والڈیز نے تمہارے باپ کو جو دستاویزات دکھائیں وہ جعلی تھیں۔ غیر قانونی تارکینِ وطن کی وجہ سے جعلی سوشل سیکیورٹی کارڈ اور ورک پرمٹ کا دھندا عروج پر ہے۔ اسی طرح میکسیکو کا شادی سرٹیفکیٹ اور پیدائش کا سرٹیفکیٹ بھی بنوایا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ثابت کرنا بہت آسان ہے کہ ماریا کبھی بھی فرنانڈو سے نہیں ملی

گدگدیاں

☆ دماغ ہمارے جسم کا سب سے اہم حصہ ہے جو پیدائش سے اس وقت تک کام کرتا رہتا ہے جب تک ہماری شادی نہیں ہوجاتی۔

☆ بیویاں الفاظ کی جادوگر ہوتی ہیں۔ پل بھر میں بات کا بتنگڑ بنانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔

☆ ”دنیا کے سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔“ اس فقرے کی موجد غالباً کوئی چینی خاتون تھی جس کا شوہر شنگھائی کے پرہجوم بازار میں گم ہوگیا تھا۔

☆ کوئی خاتون قریب المرگ ہو تو اسے بچانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اسے بتا دیا جائے کہ صدر بازار میں نوّے فیصد کی رعایتی سیل لگی ہوئی ہے۔ یعنی سو والی چیز دس روپے میں مل رہی ہے۔

☆ خواتین جنگل میں نہیں رہ سکتیں کیونکہ وہاں بازار نہیں ہوتے۔

☆ گھریلو مصالحت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ غلط ہیں اور آپ کی اہلیہ کا فرمان درست ہے۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے مقابلے میں آپ کو اپنے سر کی سلامتی عزیز ہوتی ہے۔

☆ دنیا کا کوئی بھی مرد چار چیزوں سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکتا۔ موبائل فون، گاڑی، ٹی وی اور بیوی... کیونکہ اڑوس پڑوس میں بہتر سے بہتر ماڈل موجود ہوتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر نے مریض سے پوچھا کہ اس کا دردِ سر کیسا ہے۔ مریض نے جھٹ کہا کہ وہ گھر پر سو رہی ہے۔

☆ شوہر دفتر سے جلد گھر آگیا۔ بیوی بہت حیران ہوئی۔ وجہ پوچھی تو شوہر نے کہا۔ ”باس بہت خفا تھا۔ کہا کہ جہنم میں جاؤ... سو میں گھر چلا آیا۔“

امریکا سے شعیب مختار کے چٹکلے

”کیا گزشتہ رات تم نوجوان سرمایہ دار کے ساتھ کلفٹن پر گھومنے گئی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟“

”یا تو وہ بہت ہی شریف ہے یا بہت ہی احمق۔“

تحسین مرزا، لنڈی کوتل سے

اور مارٹن نے اسے اس جعل سازی کے لیے تیار کیا تھا۔ شاید اس نے ماریا کو لالچ دیا ہو کہ اس کے عوض وہ دونوں ماں بیٹی کی کفالت کرتا رہے گا یا پھر اسے کوئی دھمکی دی ہو اور جب میں یہ ثابت کردوں گا تو تمہارے والدین یہ ضرور پوچھیں گے کہ مارٹن نے ایسا کیوں کیا؟''

اس نے لحہ بھر توقف کیا۔ اس دوران سوزان فرش پر نظریں جمائے بیٹھی رہی..... ولی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے والدین کو سب کچھ بتادینا چاہیے۔ اب تمہاری باری ہے کہ صحیح فیصلہ کرو اور فرنانڈو کے ساتھ کھڑی ہوجاؤ۔ تم اسے مینڈوزا کے بارے میں بتا چکی ہو۔ اس کے باوجود اس نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ وہ تمہارا ماضی چھپانے کی خاطر اپنی ساکھ اور عزت کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے اور اس عورت نے فرنانڈو پر جو الزام لگایا ہے، اس کی وجہ سے وہ تمہارے والدین کی نظروں میں گر گیا ہے۔ تمہارا ایک سچ اس ساری صورتِ حال کو بدل سکتا ہے۔''

سوزان کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ اپنے باپ کو یہ بتانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ ماضی میں مارٹن مینڈوزا سے اس کا تعلق رہا ہے اور وہ رات کی تنہائی میں اس سے ملنے کے لیے جایا کرتی تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ مرجائے۔

ولی نے اس کی کیفیت کو محسوس کرلیا اور بولا۔ ''اگر تم واقعی فرنانڈو سے محبت کرتی ہو اور اس کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرنا چاہتی ہو تو یہی ایک راستہ ہے۔''

وہ تقریباً ایک منٹ تک سوچتی رہی پھر اس نے ولی کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں خوف اور اداسی تیر رہی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ حقیقت جان لینے کے بعد والدین کی نظر میں اس کی معصومیت کا بھرم ٹوٹ جائے گا لیکن فرنانڈو کو حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

چند منٹوں بعد مونیکا اور فریڈ بھی آگئے۔ ولی جانے لگا تو سوزان نے اصرار کرکے اسے روک لیا۔ وہ اپنے والدین کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اگلے چند منٹوں میں ساری حقیقت بیان کردی۔ اس نے بتادیا کہ کس طرح وہ مارٹن مینڈوزا سے چھپ چھپ کر ملتی تھی لیکن جب اس سے قطع تعلق کیا تو مینڈوزا ناراض ہوگیا اور اس نے انتقام لینے کی خاطر ماریا اور اس کی بیٹی کو سامنے کردیا۔ فرنانڈو اچھی طرح جانتا تھا کہ ماریا کے اس جھوٹ کے پیچھے کون ہے لیکن اس نے اپنے دفاع میں کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے حقیقت بیان کردی تو سوزان کی بدنامی ہوگی۔

اس دوران ولی بڑے غور سے ان دونوں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ نتیجہ اس کی توقع کے مطابق سامنے آیا۔ فریڈ نے اپنی عادت کے مطابق غصہ کرنا چاہا لیکن مونیکا نے اسے سنبھال لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی پاکباز ہے اور نوجوانی میں لڑکیوں سے ایسی غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں۔ وہ مطمئن تھی کہ اس کی بیٹی نے ایک ایسے شخص سے پیچھا چھڑا لیا جو دھوکے باز تھا اور اپنی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ چکا تھا۔ سوزان کے اعتراف کے بعد ان کے ذہن سے بوجھ اتر گیا اور فرنانڈو کے بارے میں جو غلط فہمی تھی، وہ دور ہوگئی۔

ولی کا کام ختم ہوچکا تھا۔ اس نے مونیکا اور فریڈ سے اجازت چاہی، مونیکا نے اصرار کیا کہ وہ کھانا کھا کر جائے لیکن ولی نے معذرت کرلی گوکہ وہ مونیکا کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا لیکن فریڈ کی موجودگی اسے گراں گزر رہی تھی اس لیے اس نے مصروفیت کا بہانہ بنادیا۔ مونیکا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ ولی کی طرف بڑھایا اور بولی۔

''تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے، یہ اس کا بدل تو نہیں لیکن اسے ایک حقیر نذرانہ سمجھ کر رکھ لو۔''

''تم نے مجھے دوست سمجھ کر مدد کے لیے بلایا تھا اور میں دوستوں سے کبھی معاوضہ نہیں لیتا۔'' ولی نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے دعوت نامے کا شدت سے انتظار کروں گا۔''

اس نے وہ رات موٹیل میں گزاری اور دوسری صبح میامی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کا دل مطمئن تھا کہ مونیکا نے اس پر جو اعتماد کیا تھا، وہ اس پر پورا اترا۔ کاش وہ اسے ہمیشہ اسی طرح بلاتی رہے اور وہ اس کے کام آتا رہے۔ کاش فریڈ سے اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی، کاش......

دو مہینے بعد اسے ڈاک سے سوزان کی شادی کا دعوت نامہ ملا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی کوشش رائگاں نہیں گئی تھی اور اس کی کوشش کے نتیجے میں دو پیار کرنے والے ایک ہورہے تھے۔ اس نے الماری کھولی اور شادی میں شرکت کے لیے بہترین سوٹ کا انتخاب کرنے لگا۔

اختیار

تنویر ریاض

بیتے دنوں کی یادیں وجود کو زخمی ہی نہیں افسردہ بھی کر دیتی ہیں... زندگی کے شب و روز کہیں بھی گزر رہے ہوں بعض واقعات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ ان کی ذرا سی کھوج گویا کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے... ایک گمشدہ کار کی تلاش سے شروع ہونے والی کہانی... جو رفتہ رفتہ ایک کڑی سے دوسری کڑی تک جڑتی چلی گئی...

اختیار و اقتدار... ایثار و انتشار سے جنم لینے والا شاہکار نامہ

میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ جگہ غوطہ خوروں کا مسکن تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی مطلوبہ ہستی سے ملنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن مجھے وہاں کسی فرد کی موجودگی کے آثار نہیں ملے جو کہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لہٰذا میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ وہاں غوطہ خوری کا ساز و سامان پڑا ہوا تھا جو دیکھنے میں ہی قیمتی اور اجنبی لگ رہا تھا۔ ان میں غوطہ خوروں کے ماسک، اسنارکل، ریگولیٹرز، بیلٹ، غوطہ خوری کا لباس اور

دیگر آلات شامل تھے جن کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

''ہیلو۔'' میں نے آواز لگائی۔ ''کیا یہاں کوئی ہے؟''

''کیا میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں؟'' ایک عورت نے کاؤنٹر کے عقب سے برآمد ہوتے ہوئے کہا اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے لگی۔ میرا قد چھ فٹ دو انچ ہے اور وہ دیکھنے میں مجھ سے ایک دو انچ زیادہ ہی لگ رہی تھی البتہ اس کا جسم دُبلا پتلا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی، وہ دیکھنے میں خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔

''میں بچ مچل کو تلاش کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ یہاں موجود ہے؟''

''تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''میں سراغ رساں ڈیلن لاکروز ہوں اور میرا تعلق نارتھ شور کرائمز سے ہے۔'' میں نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پولیس کیس ہے۔''

''کس قسم کا؟'' وہ مجھ سے متاثر ہوئے بغیر بولی۔

''میں اس بارے میں مسز مچل سے ہی بات کرنا چاہوں گا۔''

''تم اسی سے بات کررہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میں ہی بچ ہوں۔ میرا پورا نام مچلی مچل ہے لیکن لوگ مجھے بچ کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اس محکمے میں نئے آئے ہو اور تمہیں میرا درست نام نہیں بتایا گیا۔''

''دراصل میں نے تمہارا کارڈ ایک فائل میں دیکھا تھا لیکن تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں واقعی نیا ہوں اور میں نے چند ماہ قبل ہی میجر کرائمز یونٹ کا چارج سنبھالا ہے۔''

''اب میں پولیس کے لیے غوطہ خوری کا کام نہیں کرتی۔''

''لیکن تمہارا نام تو ہماری فائل میں موجود ہے۔''

''میں نے صرف ایک مرتبہ وال ہالا پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے غوطہ خوری کی تھی۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک کار کو تلاش کرنے کے لیے دریا کی تہ میں جانا پڑا اور میں کامیاب بھی ہوگئی لیکن اس کے بعد مجھے کبھی نہیں بلایا گیا۔ شیرف اور پولیس والوں کے پاس اپنے غوطہ خور ہیں۔''

''مجھے اسی کی تلاش ہے۔ تم اسے ایک نظر دیکھ لو۔'' میں نے اس کی جانب اپنا اسمارٹ فون بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے فون لے لیا اور ایک نظر فوٹو کو دیکھنے کے بعد بولی۔ ''یہ کیا ہے؟ کوئی خلائی جہاز؟''

''یہ ایک کار ہے۔ انیس سو اٹھاون ماڈل کی پلائی ماؤتھ فیوری، اس کا اگلا حصہ کیچڑ میں دھنسا ہوا ہے اور اس کی دم اوپر کو اٹھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ خلائی جہاز جیسی لگ رہی ہے۔ یہ تصویر قریب سے گزرتی ہوئی کشتی سے کسی لڑکے نے کھینچی تھی۔''

''اس کا محلِ وقوع بتا سکتے ہو؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن وہ لوگ واربرگ کے پاس سے گزر رہے تھے۔''

''میں اس جگہ سے واقف ہوں اور کئی مرتبہ وہاں جا چکی ہوں۔ کار وہاں سے کتنے فاصلے پر ہوگی؟''

''شاید شمال مشرق میں سو گز دور۔''

اس نے لمحہ بھر غور کیا اور بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر... کچھ بتا سکتے ہو کہ یہ کار وہاں تک کیسے پہنچی؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ تم یہ بات مجھے بتا سکتی ہو۔ جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو کہ کار آدھی سے زیادہ تہ میں دھنس چکی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ کافی عرصے سے وہاں موجود ہے۔''

''تم یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''جب طوفان آتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سی مٹی بھی آجاتی ہے۔''

''اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ طوفان آنے سے پہلے کوئی غوطہ خور کار تک پہنچ جائے۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں کار کو کسی وزنی چیز سے باندھ دوں تاکہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔''

''ہاں اور اس کی نمبر پلیٹ بھی دیکھ لو تاکہ ہمیں شناخت میں آسانی رہے۔''

''یہ ایک فضول کوشش ہوگی۔'' اس نے فون مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کار واربرگ کے نزدیک ہے تو وہ چالیس فٹ یا اس سے زیادہ گہرائی میں ہوگی اور اس کی وجہ سے جہازوں کے گزرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ تم بتاؤ کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ابھی تک کوئی شخص اس کار میں موجود ہے؟''

''تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''کیونکہ جہاز کم گہرائی میں تباہ ہوا تھا اور نارتھ پوائنٹ سے ایک میل کے فاصلے پر ڈوب گیا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کار چلانے والا موڑ کاٹنا بھول گیا ہو اور حادثاتی طور

پر پانی کے اندر چلا گیا ہو۔ اگر کسی نے اس کار کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی ہو تو اسے بہت مشکل پیش آئی ہوگی۔ تم نے اس کار کا کیا نام بتایا تھا؟''

''فیوری، لوگ ان گاڑیوں کو اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں اور اگر کار اچھی حالت میں ہو تو اس کے چالیس پچاس ہزار ڈالر بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ میں نے ایسی دو گاڑیاں چوری ہونے کی رپورٹ دیکھی ہے۔ ان میں سے ایک ٹینیسی اور دوسری فلوریڈا کی ہے۔ مشی گن میں صرف ایک فیوری غائب ہوئی ہے جسے ڈیل کاؤنٹی کا ایک شخص چلا رہا تھا۔ یہ انیس سو چورانوے کی بات ہے۔''

''اس وقت میں دس سال کی تھی۔''

''اور میں بارہ سال کا۔'' میں نے کہا۔'' کچھ اندازہ ہے کہ کار ساحل سے اتنی دور پانی میں کیسے چلی گئی؟''

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ کار کب ڈوبی تھی۔ گرم موسم میں اسے بجرے پر لاد کر پانی میں لے جایا جاسکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا؟''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اگر وہ کار بجرے پر لے جائی گئی ہوتی تو ایک میل کے بجائے دس میل اندر چلے جاتے اور سوفٹ گہرائی میں ڈبو دیتے تاکہ وہ کبھی کسی کو نظر نہیں آتی۔ ویسے یہ رپورٹ کس مہینے میں درج ہوئی تھی؟''

''فروری۔''

''اس مہینے میں شدید سردی ہوتی ہے اور پانی کی سطح پر برف کی تہ جم جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے رات کے وقت برف پر گاڑی چلائی ہوگی اور ایک میل جانے کے بعد وہ رک گیا۔ کوئی پاگل شخص ہی ایسا کرسکتا ہے اور جب اس نے واپسی کے لیے موڑ کاٹا تو برف کی سطح میں شگاف پڑ گیا جیسے کسی نے اسے آری سے کاٹ دیا ہو اور گاڑی تہ میں چلی گئی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اسے تلاش کرسکتی ہو۔''

''اگر فیوری میں کوئی شخص تھا تو وہ انیس سو چورانوے سے پانی کی تہ میں پڑا ہوا ہے۔ ہم خوش قسمت ہوں گے اگر اس کا ایک جوتا بھی تلاش کرسکیں۔''

''ممکن ہے کہ وہ کار خالی ہو۔'' میں نے کہا۔

''کوئی شخص بھی چالیس ہزار ڈالر مالیت کی کار کو کسی وجہ کے بغیر نہیں ڈبو سکتا۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ کار میں کوئی تھا۔''

میری قسمت اچھی تھی کہ شرط نہیں لگائی ورنہ ہار جاتا۔

ہم بچ کی کشتی میں سوار ہو کر اس جگہ تک آئے، وہ اپنے کام میں ماہر تھی، اس نے بہ آسانی وار برگ کو تلاش کرلیا پھر آہستہ آہستہ کشتی چلاتی ہوئی اس جگہ تک پہنچی جہاں اس کار کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ اس نے کشتی کا انجن بند کیا اور اینکر گرادیا۔

''یہاں گہرائی پچاس فٹ تک ہوسکتی ہے اور پانی گدلا ہے۔'' اس نے کہا اور کمر پر ایک ہلکے وزن کا بیگ اور آکسیجن سیلنڈر باندھ لیا۔

''تم غوطہ خوری کا لباس نہیں پہنو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے امید نہیں کہ زیادہ دیر پانی میں رہنا ہوگا۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی اور اپنے آلات چیک کرنے لگی۔ اس کی کمر میں لگی بیلٹ میں دو ٹارچیں اور ایک بڑا چاقو نظر آرہا تھا جبکہ سر پر بندھی ہوئی پٹی میں بھی ایک لائٹ لگی ہوئی تھی۔ اس نے قدم آگے بڑھایا اور اپنی لائف لائن کا سرا مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔'' اگر میں نے چاہا کہ تم مجھے اوپر کھینچ لو تو اسے تین جھٹکے دوں گی۔ تمہیں کوئی سوال کرنا ہے؟''

''اگر تم زیادہ دیر تک پانی میں رہیں تو کیا کرنا ہوگا؟''

''ایک گھنٹے میں واپس نہ آئی تو مدد کے لیے لوگوں کو بلا لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے پانی میں چھلانگ لگادی۔

بیس فٹ گہرائی میں جانے کے بعد بچ کو پچھتاوا ہونے لگا کہ اس نے غوطہ خوری کا لباس کیوں نہیں پہنا گو کہ وہ تقریباً روزانہ ہی جھیل میں تیراکی کی کلاس لیا کرتی تھی لیکن کئی دنوں سے گہرے پانی میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چالیس فٹ تک پہنچنے کے بعد اسے یوں لگا کہ وہ کرسمس کی رات میں گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ زیادہ دیر سردی میں رہنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ فیوری کو تلاش کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ گہرے پانی میں بھی اس کا پچھلا حصہ کیچڑ میں اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔

اس کے اندر جھانکنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ گاڑی کا اگلا حصہ جھیل کی تہ کی جانب جھکا ہوا تھا اور اس کے دروازے آدھے سے زیادہ کیچڑ میں لت پت تھے۔ پوری گاڑی پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی جو بچ کے قریب پہنچنے پر ٹوٹ گئی۔ اس نے کار کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کیچڑ نے اس کے ماتھے پر لگے ہیڈ لیپ کو بھی دھندلا دیا تھا۔ اس روشنی سے اسے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی اور رفتہ رفتہ نظر

پر پانی کے اندر چلا گیا ہو۔ اگر کسی نے اس کار کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی ہوتو اسے بہت مشکل پیش آئی ہوگی۔ تم نے اس کار کا کیا نام بتایا تھا؟''

''فیوری، لوگ ان گاڑیوں کو اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں اور اگر کار اچھی حالت میں ہو تو اس کے چالیس پچاس ہزار ڈالر بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ میں نے ایسی دو گاڑیاں چوری ہونے کی رپورٹ دیکھی ہے۔ ان میں سے ایک ٹینیسی اور دوسری فلوریڈا کی ہے۔ مشی گن میں صرف ایک فیوری غائب ہوئی ہے جسے ویل کاؤنٹی کا ایک شخص چلا رہا تھا۔ یہ انیس سو چورانوے کی بات ہے۔''

''اس وقت میں دس سال کی تھی۔''

''اور میں بارہ سال کا۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ اندازہ ہے کہ کار ساحل سے اتنی دور پانی میں کیسے چلی گئی؟''

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ کار کب ڈوبی تھی۔ گرم موسم میں اسے بجرے پر لاد کر پانی میں لے جایا جاسکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا؟''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اگر وہ کار بجرے پر لے جائی گئی ہوتی تو ایک میل کے بجائے دس میل اندر چلے جاتے اور سوفٹ گہرائی میں ڈبو دیتے تاکہ وہ کبھی کسی کو نظر نہیں آتی۔ ویسے یہ رپورٹ کس مہینے میں درج ہوئی تھی؟''

''فروری۔''

''اس مہینے میں شدید سردی ہوتی ہے اور پانی کی سطح پر برف کی تہ جم جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے رات کے وقت برف پر گاڑی چلائی ہوگی اور ایک میل جانے کے بعد وہ رک گیا۔ کوئی پاگل شخص ہی ایسا کرسکتا ہے اور جب اس نے واپسی کے لیے موڑ کاٹا تو برف کی سطح میں شگاف پڑ گیا جیسے کسی نے اسے آری سے کاٹ دیا ہو اور گاڑی تہ میں چلی گئی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اسے تلاش کرسکتی ہو۔''

''اگر فیوری میں کوئی شخص تھا تو وہ انیس سو چورانوے سے پانی کی تہ میں پڑا ہوا ہے۔ ہم خوش قسمت ہوں گے اگر اس کا ایک جوتا بھی تلاش کرسکیں۔''

''ممکن ہے کہ وہ کار خالی ہو۔'' میں نے کہا۔

''کوئی شخص بھی چالیس ہزار ڈالر مالیت کی کار کو کسی وجہ کے بغیر نہیں ڈبو سکتا۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ کار میں کوئی تھا۔''

میری قسمت اچھی تھی کہ شرط نہیں لگائی ورنہ ہار جاتا۔

ہم بچ کی کشتی میں سوار ہوکر اس جگہ تک آئے۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھی، اس نے بہ آسانی وار برگ کو تلاش کرلیا پھر آہستہ آہستہ کشتی چلاتی ہوئی اس جگہ تک پہنچی جہاں اس کار کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ اس نے کشتی کا انجن بند کیا اور اینکر گرا دیا۔

''یہاں گہرائی پچاس فٹ تک ہوسکتی ہے اور پانی گدلا ہے۔'' اس نے کہا اور کمر پر ایک ہلکے وزن کا بیگ اور آکسیجن سلنڈر باندھ لیا۔

''تم غوطہ خوری کا لباس نہیں پہنو گی ہے'' میں نے پوچھا۔

''مجھے امید نہیں کہ زیادہ دیر پانی میں رہنا ہوگا۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی اور اپنے آلات چیک کرنے لگی۔ اس کی کمر میں لگی بیلٹ میں دو ٹارچیں اور ایک بڑا چاقو نظر آرہا تھا جبکہ سر پر بندھی ہوئی پٹی میں بھی ایک لائٹ لگی ہوئی تھی۔ اس نے قدم آگے بڑھایا اور اپنی لائف لائن کا سرا مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں نے چاہا کہ تم مجھے اوپر کھینچ لو تو اسے تین جھٹکے دوں گی۔ تمہیں کوئی سوال کرنا ہے؟''

''اگر تم زیادہ دیر تک پانی میں رہیں تو کیا کرنا ہوگا؟''

''ایک گھنٹے میں واپس نہ آئی تو مدد کے لیے لوگوں کو بلا لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

بیس فٹ گہرائی میں جانے کے بعد بچ کو پچھتاوا ہونے لگا کہ اس نے غوطہ خوری کا لباس کیوں نہیں پہنا گو کہ وہ تقریباً روزانہ ہی جھیل میں تیراکی کی کلاس لیا کرتی تھی لیکن کئی دنوں سے گہرے پانی میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چالیس فٹ تک پہنچنے کے بعد اسے یوں لگا کہ وہ کرسمس کی رات میں گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ زیادہ دیر سردی میں رہنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ فیوری کو تلاش کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ گہرے پانی میں بھی اس کا پچھلا حصہ کیچڑ میں اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔

اس کے اندر جھانکنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ گاڑی کا اگلا حصہ جھیل کی تہ کی جانب جھکا ہوا تھا اور اس کے دروازے آدھے سے زیادہ کیچڑ میں لت پت تھے۔ پوری گاڑی پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی جو بچ کے قریب پہنچنے پر ٹوٹ گئی۔ اس نے کار کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کیچڑ نے اس کے ماتھے پر لگے ہیڈ لیمپ کو بھی دھندلا دیا تھا۔ اس روشنی سے اسے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی اور رفتہ رفتہ نظر

مزید دھندلاتی جارہی تھی۔ کار بڑی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہورہی تھی۔ بچ نے ڈرائیور سائڈ کے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر زور سے کھینچا لیکن اس میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ وہ لاک تھا یا پھر کیچڑ جم جانے کی وجہ سے مضبوطی سے بند ہوگیا تھا۔ دروازہ نہ کھلنے کی وجہ سے مسئلہ ہورہا تھا۔ گو کہ کار پر لگی ہوئی مٹی اب جھڑ چکی تھی لیکن اس کے اندر جانا تقریباً ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ چھت پر سے ہوتی ہوئی پسنجر سائڈ پر گئی لیکن وہاں کیچڑ اور زیادہ گہری تھی۔ پانی اتنا زیادہ گدلا تھا کہ وہ بمشکل کار کو دیکھ سکتی تھی۔

وہ ایسی جگہ پر تھی جہاں کوئی مدد ملنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ چند گز پیچھے ہٹ گئی اور گاد کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے اپنی لائف لائن کو جھٹکا دینے کے بارے میں بھی سوچا لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ دس منٹ بعد جب گاد بیٹھ گئی تو وہ دوبارہ آہستہ آہستہ فیوری کی جانب بڑھی۔ اس مرتبہ اس نے کار کے پچھلے حصے کا رخ کیا اور عقبی شیشے کے پاس پہنچ کر لائٹ جلادی۔ جیسے ہی اس کی نظر کار کے اندر گئی، اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہاں ایک انسانی ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ اس نے قلابازی کھائی اور تارپیڈو کی طرح تیرتی ہوئی دور نکل گئی لیکن چند غوطے کھانے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس نے اپنی سانس قابو میں کی اور حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ ایک لاش تھی۔ محض ایک ڈھانچا۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ گزشتہ بیس سال سے اس کار میں بند تھا اور اس نے بچ پر چھلانگ بھی نہیں لگائی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی یا نہیں لیکن خشکی پر پہنچ کر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کار میں ایک لاش کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ ممکن ہے کہ لاکروز کچھ نہ کہتا لیکن سوچتا ضرور اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ اگلی مرتبہ وہ کسی مرد غوطہ خور کا انتخاب کرتا۔ اس نے تمام خدشات کو ذہن سے جھٹکا اور دوبارہ تیرتی ہوئی کار کی طرف گئی۔

ڈھانچا اب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے بغور اس کا معائنہ کیا۔ اب اس کا خوف کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ لاش جزوی طور پر لباس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چمڑے کی جیکٹ اور جینز، حیرت انگیز طور پر یہ دونوں چیزیں اچھی حالت میں تھیں۔ اس نے کار کے گرد کئی چکر لگائے اور ٹارچ کی روشنی سے ڈیش بورڈ، سیٹوں، فرش اور آگے پیچھے کا جائزہ لیا لیکن اسے وہاں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اس کا شناختی کارڈ تلاش کرنے کے بارے میں سوچا لیکن خود ہی اس خیال کو مسترد کردیا۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں بلکہ پولیس کیس بن گیا تھا۔

اس نے کار کا نمبر اچھی طرح ذہن نشین کیا اور واپسی کے لیے روانہ ہوگئی۔ اس کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز تھی اور وہ ایک میزائل کی طرح اوپر آرہی تھی۔ وہ پانی سے باہر آئی اور اپنا ماؤتھ پیس ہٹاتے ہوئے بولی۔

''میں نے فیوری کو تلاش کرلیا ہے۔ اس میں ایک مرد کی باقیات موجود ہیں۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ مرد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ محض ایک اندازہ ہے۔ اس نے سیاہ چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی ہے جو مردوں کے سائز کی معلوم ہوتی ہے گو کہ اب وہ تھوڑی سی ڈھیلی ہے لیکن جب وہ زندہ ہوگا تو یقیناً اس کے جسم پر پوری طرح فٹ رہی ہوگی۔''

''کیا وہ جیکٹ کچھ اس طرح کی ہے؟'' میں نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اسے دکھائی جس میں ایک جوان شخص کیمرے کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے کچھ نمبر درج تھے۔

''ہاں، وہ جیکٹ بالکل اس جیسی ہی ہے۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''یہ کون ہے؟''

''ابھی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کے بارے میں کس سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔''

☆☆☆

مجھے اسپتال جانا کبھی اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں مریضوں کو علاج کے لیے نہیں بلکہ موت کا انتظار کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے لیکن یہ اسپتال میری توقعات کے برعکس ثابت ہوا۔ یہاں کی نرسیں خوش اخلاق تھیں، راہداریوں میں روشن پینٹ ہوا تھا اور ان پر جابجا خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ میں نے ایسا آراستہ اور سہولتوں سے مزین اسپتال پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اپنے مطلوبہ شخص کو ئن روم میں وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے پایا جس میں آکسیجن سلنڈر نصب تھا۔ وہ دیوار پر نصب ٹی وی میں کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی ناک کے ساتھ ایک پلاسٹک کی نلکی لگی ہوئی تھی تاکہ اسے سانس لینے میں آسانی ہو۔

''سارجنٹ کوپر؟'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''دوست مجھے کوپ کہتے ہیں۔ تم کون ہو؟''

''میں سراغ رساں ڈیلن لاکروز ہوں اور میرا تعلق نارتھ شور میجر کرائمز سے ہے۔''

''معاف کرنا، میں اٹھ نہیں سکتا۔'' کوپر نے کہا۔ ''میری بافتوں میں ہوا بھر گئی ہے۔ میڈیکل کی اصطلاح میں اسے ایمفائزیما کہتے ہیں اور اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ میں سگریٹ نہیں پی سکتا۔ میں سگریٹ کے لیے ترس گیا ہوں۔''

میں نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔ تم وہی سپاہی ہو...''

''معاف کرنا، میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''ضروری نہیں کہ تمہیں بھی وہ بات یاد ہو۔ یہ بیس سال پہلے کا قصہ ہے۔ اس وقت میں بچہ ہی تھا۔ میں اور کچھ دوست ہاکی کھیل رہے تھے۔ میرے کزن اینڈری نے گیند کو ہٹ لگانے کے لیے اپنی ہاکی زور سے گھمائی جو میرے منہ پر لگی اور میرا ہونٹ پھٹ گیا۔ ابھی تک اس زخم کا نشان موجود ہے۔'' میں نے اپنی ناک کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہم ایک قریبی مکان کی طرف بھاگے لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اینڈری نے ان کی کار نکالی اور تیزی سے دوڑاتا ہوا اسپتال کی طرف گیا۔ تم نے اس کار کا تعاقب کیا لیکن جب اسپتال پہنچ کر میرے چہرے پر نظر گئی تو مجھے اسپتال کے اندر لے گئے اور میری کچھ مدد بھی کی۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ میں اور اینڈری دونوں ہی چودہ سال کے تھے اور دونوں میں سے کسی کے پاس بھی ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا پھر کار بھی چوری کی تھی۔ تم ہمیں سخت ٹائم دے سکتے تھے لیکن اس کے بجائے تم ہمارے ساتھ کھڑے رہے۔ جب کار کا مالک وہاں آیا اور چلاتے ہوئے کہنے لگا کہ وہ ہمیں گرفتار دیکھنا چاہتا ہے تو تم نے اسے دیوار کی طرف دھکیل دیا اور اس کی کوئی بات نہیں سنی۔''

''اے مولیسٹر!'' کوپر نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے یاد آگیا۔ وہ بہت غصے میں تھا اور چاہتا تھا کہ تمہیں اس جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ میں نے اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا، یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔''

''یقیناً میرے لیے بڑی بات ہی ہوتی اگر تم ہمارا چالان کر لیتے۔''

''اچھا ہوا کہ تم نے اسے یاد رکھا۔ اب میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم نے بیس سال قبل فروری انیس سو چورانوے میں ایک لاپتا شخص کا کیس ڈیل کیا تھا؟''

''اگر تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوا ہوگا۔ وہ لاپتا شخص کون تھا؟''

''ایک نوجوان شخص، اس کا نام ہارلین لینی تھا۔''

''کون؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''ہارلین لینی۔ اس کا خاندان برسوں سے پیپر مل کا مالک ہے اور وہ بڑے دولت مند لوگ ہیں۔ ہارلین جب لاپتا ہوا تو اس وقت میں اٹھاون ماڈل کی ہلائی ماؤتھ فیوری چلا رہا تھا۔''

''ہاں، فیوری۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے یاد آگیا۔ دراصل وہ ایک غیر اہم شخص تھا۔ اسے کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصے منشیات کا کاروبار بھی کرتا رہا جو نری حماقت تھی کیونکہ اس کے خاندان میں پیسے کی کوئی کمی نہیں اور میل ہل سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے بھی اس کے بارے میں چند میٹنگز کی تھیں۔''

''میل ہل؟''

''ہاں، یہ بوڑھے لوگوں کا کلب ہے۔ میرے زمانے میں شیرف، سرکاری وکیل اور سٹی کونسل کے کچھ لوگ اس کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ میل ہل کنٹری کلب میں لنچ کرتے اور ماورائے قانون مسائل حل کیا کرتے تھے گو کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ طریقہ بہت مؤثر ثابت ہوا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کلب اب بھی کام کر رہا ہوگا۔''

''میں نے وہاں چند مرتبہ لنچ کیا ہے۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''اب بھی وہی لوگ معاملات کو دیکھ رہے ہیں؟''

''ہاں وہی خاندان والے گزشتہ سو سال سے نارتھ شور کو چلا رہے ہیں۔ صرف چہرے بدل جاتے ہیں۔ تم نے کہا کہ ہارلین کا نام بھی وہاں زیر بحث آیا تھا؟''

''ہارلین اسی فیوری کے ذریعے منشیات کا کاروبار کر رہا تھا۔ اس کی حرکتیں کسی سے پوشیدہ نہیں تھیں لیکن سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ وہ ایک اچھے خاندان کا فرد ہے اور ایک برے دور سے گزر رہا ہے اگر اسے منشیات کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو اس کا مستقبل تباہ ہو جائے گا لہٰذا میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا تاہم اس پر نظر رکھی۔ ہمارے لیے وہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا جب تک اس نے جولین پیلے کے

ساتھ دست درازی نہیں کی، وہ اب اولڈ ٹاؤن میں جولین ڈیلائٹس کے نام سے کپڑوں کی دکان چلاتی ہے۔''

''میں اسے جانتا ہوں، وہ بھاری بھرکم جسم کی مالک ہے۔''

''ممکن ہے کہ اب وہ بھاری ہو گئی ہو۔ اس وقت صرف دس سال کی تھی اور اس کے علاوہ ایمالین گوتھیئر کی بہت ہی عزیز بھتیجی بھی۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''کیا وہ گوتھیئر خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟''

''دور کی رشتے داری ہے۔'' کوپر نے کہا۔''لیکن وہ اس کے بہت قریب تھی۔ وہ ہارلین کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اس نے لڑکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ اسے مارتا پیٹتا اور اس کی کوشش تھی کہ بچہ ضائع ہو جائے۔ جب ان باتوں کا گوتھیئرز خاندان کو علم ہوا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ ہارلین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ تم تو ان لوگوں کو جانتے ہی ہو۔''

''دراصل میری بھی ان سے دور کی رشتے داری ہے۔ مس ایمالین کی ماں کے سات بیٹے ہیں اور اس کے پوتوں کی تعداد ایک جرائم پیشہ گروہ کے برابر ہے اور اس نے منظم جرائم کی تربیت دے کر انہیں ایک مافیا کی شکل دے دی ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' کوپر سر ہلاتے ہوئے بولا۔''مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ لوگ ہارلین کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں اور اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے اس کے باپ لینی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے فوری طور پر اپنے بیٹے کو کچھ رقم دے کر شہر سے باہر بھیج دیا۔''

''ریکارڈ کے مطابق اس کے باپ نے ہی ہارلین کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ بعد کی بات ہے۔'' کوپر بولا۔''وہاں سے جانے کے بعد عرصے تک ہارلین کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی لیکن کسی کو اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے تھے۔ جب مسٹر لینی نے شکایت درج کروائی تو میں نے اپنی توجہ فیوری پر مرکوز کر دی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہارلین کے مقابلے میں اس کی کار کو تلاش کرنا آسان ہوگا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔''

''اور ہارلین؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے جولین سے بات کی تو معلوم ہوا کہ ہارلین بچے کی پرورش کے لیے باقاعدگی سے پیسے بھیج رہا ہے۔ اگر وہ اپنے باپ سے رابطے میں نہیں رہنا چاہتا تھا تو یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ تھا لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ مسٹر لینی کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ کیا ہارلین واپس آ گیا؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی یہاں سے گیا تھا۔ ہمیں جھیل کی تہ میں فیوری مل گئی ہے۔ اس میں ایک لاش بھی ہے اور اس نے ویسی ہی چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی ہے جو ہارلین کی تصویر میں نظر آ رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اسی کی لاش ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد ہی اس کی تصدیق ہو سکے گی۔''

''تم مذاق کر رہے ہو۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔''وہ فیوری میں موجود ہے لیکن ہم چند دنوں تک اس کار کو باہر نہیں نکال سکتے کیونکہ پولیس غوطہ خوروں کی ٹیم شہر سے باہر ہے۔ تب تک تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو۔ کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''نہیں، بیس سال ہو گئے ہیں۔ میں اس بات کو بھول چکا ہوں۔''

''میں بھی اس وقت اسکول میں تھا اور اس واقعے سے براہِ راست میرا کوئی تعلق نہیں لیکن تم ان لوگوں کو جانتے ہو، مجھے کسی ایک کا نام بتا دو۔''

''میں تمہیں بیس نام دے سکتا ہوں۔ وہ سب گوتھیئر فیملی کے لوگ یا ان کے قریبی رشتے دار ہیں۔''

''وہ بہت قیمتی کار ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ گوتھیئرز چالیس ہزار ڈالر پانی میں پھینک دیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے ہارلین کو جنگلوں میں دفن کر کے اس کی کار کسی کے ہاتھ بیچ دی ہو۔ کیا تمہارے ذہن میں ایسا کوئی نام آ رہا ہے؟''

کوپر نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر کہنے لگا۔''ایسا ایک شخص ہو سکتا ہے لیکن امید ہے کہ یہ اندازہ غلط ہوگا۔''

''تم نام بتاؤ؟'' میں نے کہا۔

''بوبی ڈوپری۔ اس نے ہارلین کے جانے کے ایک سال بعد جولین سے شادی کر لی اور اس کی بچی کو گود لے لیا۔ وہ فوج میں تھا اور اس نے عراق کی جنگ میں حصہ بھی لیا تھا جس پر اسے سلور اسٹار ملا۔''

''تم اسی لیے بوبی کو پسند کرتے ہو؟''

''وہ اور جولین ہائی اسکول کے زمانے سے ہی

ڈیٹنگ کر رہے تھے۔ بوبی گریجویشن کرنے کے بعد لازمی بھرتی کے قانون کے تحت فوج میں چلا گیا جہاں سے سیدھا اسے عراق جانا پڑ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو جولین کی زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ وہ منشیات کے زیر اثر تھی اور ہارلین اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے کوپر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اپنے پاجامے کی جیب ٹٹول کر ایک گولی نکالی اور اسے نگل لیا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پریشان مت ہو۔ یہ دوا میرے نسخے میں شامل ہے۔''

''مجھے بوبی ڈوپری کے بارے میں بتاؤ؟'' میں نے کہا۔

''فوج میں جا کر وہ سدھر گیا تھا لیکن جب اس نے جولین کی حالت دیکھی تو پاگل ہو گیا۔''

''اس سے زیادہ وہ ہارلین کے لیے پاگل ہوا ہو گا۔''

''وہ عراق میں لوگوں کو مار رہا تھا کیونکہ فوج سے اسے تنخواہ ملتی تھی لیکن وہ ہارلین کو کسی معاوضے کے بغیر بھی ختم کر سکتا تھا اور جولین بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو تم اب کیا کرو گے۔ تمہاری حیثیت تو بلیونائٹ جیسی ہے اور اب یہ تمہارے اوپر ہے۔''

''بلیونائٹ؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو لاکروز۔ تم نارتھ شور میں پلے بڑھے ہو۔ یہاں لوگ اجرتی غلام ہیں، میری طرح۔ ہر کوئی کسی دوسرے کے لیے کام کر رہا ہے۔ میئر، کونسل، کنٹری کلب، سب بادشاہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہاتھ گندے نہیں کرتے اور ان کاموں کے لیے ہماری خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور ہمارے کاندھوں پر تلوار رکھ کر نائٹ بنا دیا جاتا ہے۔ ہم ان کے احکامات کی تعمیل کرتے اور ان کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس کام میں عزت ہے اور کبھی کبھی ہمیں اپنی طاقت کے استعمال کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ عموماً ہم قانون یا احکامات پر عمل کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ہمیں صورتِ حال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا موقع مل جاتا ہے جیسا کہ اس رات میں نے اسپتال میں تمہارے اور تمہارے کزن کے ساتھ کیا تھا۔''

''وہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ یہ تو قتل کا کیس ہے۔''

''اگر تم ایسا کہتے ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہارلین لینی کی موت ایک نقصان ہے اگر میں اب بھی ملازمت پر ہوتا تو جانتے ہو کہ اسے کیا نام دیتا؟''

میرا گھر

جنوبی افریقا کے ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے میں ایک امریکی جوڑا سیر و سیاحت کے لیے گیا تو اسے وہاں قدیم اشیا اور نوادرات کی کئی چھوٹی چھوٹی دکانیں نظر آئیں اور ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ گھومتے پھرتے وہ ایک لکڑی کے کیبن کے سامنے پہنچے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر بہت ساری پرانی اور عجیب چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں اندر گئے تو کوئی نظر نہیں آیا۔ خاتون نے چند چیزیں پسند کیں تو اچانک ایک خستہ حال مقامی عورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔ خاتون نے اس سے ان چیزوں کی قیمت پوچھی۔

''یہ دکان نہیں، میرا گھر ہے میڈم۔'' اسے جواب ملا۔

''خودکشی کا بدترین کیس جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' ہم دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''ممکن ہے کہ میں بھی آخر میں بالکل یہی بات کہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''سارجنٹ کوپر، میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ پر لڑکپن میں ایک احسان کیا ورنہ میں آج ایک مختلف زندگی گزار رہا ہوتا۔ تم ایک اچھے سپاہی تھے۔''

کوپر نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب میری منزل جولین ڈیلائٹس تھی۔ یہ دکان بندرگاہ کے نزدیک پرانے شہر میں واقع تھی اور یہ جگہ ابھی تک ویسی ہی تھی جیسا کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ہو گی۔ پتھر کی بنی ہوئی سڑکیں اور فٹ پاتھ، پرانے وقتوں کے اسٹریٹ لیمپ اور انیسویں صدی طرز کی عمارتیں، ان میں سے کچھ اصل حالت میں تھیں جبکہ چند ایک کو نیا بنا دیا گیا تھا لیکن یہ سب وکٹورین عہد کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

جولین کی دکان بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ بیرونی شیشوں میں جدید قدیم اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں فیشن سے متعلق تصاویر اور انیسویں صدی کی نادر و نایاب پینٹنگز نمایاں تھیں۔ میں نے دکان میں داخل ہو کر مالکن کے بارے میں پوچھا تو وہ فوراً ہی عقبی روم سے نمودار ہو گئی۔ جب میں نے اس کے سامنے ہارلین لینی کا ذکر کیا تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ فوراً ہی غائب ہو گئی اور وہ مجھے جلدی سے دکان کے عقب میں بنے ہوئے دفتر میں لے گئی جس میں صرف

ایک میز اور فائل کیبنٹ رکھی ہوئی تھی اور وہاں سے دکان کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔

جولین ڈوپری نے پرانی طرز کا لباس پہن رکھا تھا یعنی نیوی بلیو سوٹ اور اس سے ہم رنگ جوتے گوکہ اس کا وزن بڑھ گیا تھا تاہم وہ اب بھی پُرکشش نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی تھی جب میں نے اسے فیوری اور اس میں موجود لاش کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بولی۔

''وہ ہارلین نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔ ''ماضی میں جو کچھ ہوا، تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''مجھے اتنا معلوم ہے کہ تمہارا ہارلین سے تعلق تھا اور کچھ مسائل پیدا ہوگئے تھے۔''

''اس نے مجھے برباد کیا اور ہوا کے جھونکے کی طرح شہر سے چلا گیا۔ اس وقت میں دل شکستہ تھی لیکن اب؟ ہارلین لینی سے جدا ہونا میرے لیے خوش قسمت ثابت ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک بہتر آدمی سے شادی کرلی۔''

''بوبی ڈوپری۔'' میں نے پوچھا۔

''بوبی کے ساتھ میں نے بہت کم وقت گزارا لیکن میرے گزشتہ زخم بھر گئے۔ پھر آخری دنوں میں ہارلین منظر عام پر آگیا۔ وہ میرے لیے خطرہ ہوسکتا تھا لیکن اس نے میری بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ جب کونی پیدا ہوئی تو اس نے بچی کی پرورش کے لیے ہر مہینے چیک بھیجنا شروع کر دیے اور کبھی ناغہ نہیں کیا۔''

''اس نے کبھی کوئی چیک نہیں بھیجا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس دوران پورا عرصہ وہ جیل کی تہ میں رہا۔ کیا اس کے یہاں سے جانے کے بعد تمہارا کبھی کوئی رابطہ ہوا۔ تم نے کبھی اسے دیکھا یا اس سے بات کی؟''

''نہیں، براہِ راست ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میرے مرحوم شوہر نے شادی کے وقت ہی کونی کو گود لے لیا تھا اور وہ بھی بوبی کو ہی اپنا باپ سمجھتی رہی۔ وہ ہارلین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں ایسا چاہتی ہوں۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے میڈم! تم نے جن پیسوں کا ذکر کیا، وہ تم تک کس طرح پہنچتے تھے؟''

''مجھے ڈاک کے ذریعے چیک ملا کرتے تھے لیکن جب کونی کالج جانے لگی تو مجھے اس کی پڑھائی کے لیے پیسوں کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے ہارلین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ مجھے جو چیک ملتے تھے، ان پر کسی وکیل کا پتا درج تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس رقم کے ذریعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ شاید یہ کسی نامعلوم ٹرسٹ کی جانب سے بھیجی جارہی ہے لیکن اگر ہارلین وہ چیک نہیں بھیج رہا تھا تو...؟''

''بوبی سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہم دونوں ہائی اسکول میں ساتھ پڑھا کرتے تھے پھر گریجویشن کے بعد وہ فوج میں چلا گیا اور میں ہارلین کے جال میں پھنس گئی۔''

''کیا بوبی کو یہ بات معلوم تھی؟''

''بالکل، تم جانتے ہو کہ اس چھوٹے شہر میں کوئی بات نہیں چھپ سکتی۔''

''یہ سن کر وہ ناراض تو ہوا ہوگا؟''

''جو کچھ ہوا اس میں میری نیت شامل نہیں تھی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خوش نہیں تھا۔''

''اس پورے عرصے میں تمہاری بوبی سے کوئی ملاقات ہوئی، کیا وہ چھٹیوں میں گھر آیا...''

''وہ صرف ایک مرتبہ گھر آیا تھا۔ مرنے سے چند ماہ پہلے...'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پھر اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے سختی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتادیا ہے۔ اگر ہارلین مرچکا ہے اور بوبی بھی تو سمجھ لو کہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ میری بیٹی کو یقین ہے کہ اس کا باپ عراق کی جنگ میں ایک ہیرو کی طرح لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اگر تم میں ذرا سا بھی لحاظ ہے تو امید کرتی ہوں تم اس یقین کو تباہ نہیں کروگے۔ اس بات کو یہیں ختم کردو۔ اب کوئی بھی نہیں بچا جسے سزا دی جاسکے۔''

تقریباً اندھیرا پھیل رہا تھا جب میں اسپتال واپس آیا۔ کھانے کا وقت ہوچکا تھا لیکن کوپر ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ غالباً اسے میرا ہی انتظار تھا۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم واپس آگئے۔'' اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ کامیابی ہوئی؟''

''کافی حد تک۔'' میں نے کہا۔ ''جولین کا خیال ہے کہ بوبی نے ہی ہارلین کو قتل کیا ہوگا۔ اب وہ چاہتی ہے کہ میں اس قصے کو یہیں ختم کردوں تاکہ اس کی بیٹی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے کیونکہ وہ بوبی کو اپنا باپ سمجھتی ہے جو جنگ میں

بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے مارا گیا۔''

''شاید تمہیں یہی کرنا چاہیے۔اس سے کیا فائدہ ہوگا اگر تم نے اس لڑکی کو بتا دیا کہ جسے وہ اپنا باپ سمجھتی ہے وہ اس کے حقیقی باپ کا قاتل ہے۔''

''شاید کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔''اور شاید ہارلین کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی کا مستحق تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اسے بوبی نے قتل کیا ہوگا۔''

''کیوں؟''

''پیسا۔'' میں نے سیدھے سادے انداز میں کہا۔''جولین کو ہر مہینے ایک ٹرسٹ فنڈ سے چیک مل رہا تھا۔ تمہارا کہنا ہے کہ ہارلین کے باپ نے اسے شہر سے جانے کے لیے ایک بڑی رقم دی تھی۔ہم فرض کر لیتے ہیں کہ بوبی نے اسے قتل کر کے وہ رقم اپنے قبضے میں کر لی۔ اس نے جولین سے شادی کی اور اس کی بیٹی کو گود لے لیا۔انہوں نے کبھی بھی اس لڑکی کو ہارلین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو پھر بوبی ہر مہینے ہارلین کے نام سے چیک کیوں بھیجتا رہا؟''

''لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے تاکہ وہ یہی سمجھتے رہیں کہ ہارلین ابھی زندہ ہے اور اس طرح اس کے جرم پر پردہ پڑا رہے۔''

''یہ ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔''لیکن ہارلین کے باپ کے مر جانے کے بعد کوئی بھی ہارلین کو تلاش نہیں کر رہا تھا۔لہٰذا یہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں تھی اور اس سلسلے کو ختم کیا جا سکتا تھا۔اس کے باوجود یہ چیک آتے رہے۔''

کوپر کو ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔اس نے گولی نگلی اور بولا۔''کہتے رہو۔''

''ہارلین فیوری میں تھا۔اس لیے ہم جانتے ہیں کہ وہ چیک نہیں بھیج رہا تھا اور نہ ہی یہ چیک بوبی نے بھیجے۔میرا خیال ہے کہ چیک بھیجنے والا ابھی زندہ ہے اور اس وقت میرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔''

''تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''ثبوت تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا کوپر! یہ چیک تو بہت کمزور کڑی ہیں۔اس نامعلوم ٹرسٹ کا کوئی وجود نہیں ہے اگر میں اس وکیل کو گھیروں تو وہ تمہارا نام لے گا۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں اس معاملے میں شامل تھا؟''

''تم نے خود ہی مجھے بتایا ہے کہ ہارلین اور اس کے

باپ کے درمیان تعلقات ٹھیک نہیں تھے اور بوڑھے کے پاس بہت پیسا تھا۔ وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو صورتِ حال کو قابو کر سکے اور اس سے پہلے کہ اس کا بیٹا مارا جائے، وہ اسے یہاں سے نکال دے۔ اسے ایک سورما کی ضرورت تھی اور ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ان دنوں سورما کون تھا۔ البتہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ گڑبڑ کہاں پر ہوئی۔ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

کوپر کا ہاتھ گن نکالنے کے لیے کمر تک گیا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس وقت وہ ایک جانور کی طرح بے بس نظر آ رہا تھا جو جال میں پھنس گیا ہو اور جانتا ہو کہ موت لحہ بہ لحہ اس کے قریب آ رہی ہے۔

''تم میرے احسان مند ہو لاکروز۔ تم نے ہی خود یہ بات کہی تھی۔''

''میں اب بھی اس پر قائم ہوں لیکن سچ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کوپر، ہارلین کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

''مسٹر لینی نے میل ہل پر ایک میٹنگ بلائی جس میں مجھ سمیت میئر اور سرکاری وکیل شریک ہوئے۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ گوتھیئر ز فیملی کے لوگ ہارلین کو تلاش کر رہے ہیں اور انہیں اس کی وجہ سے بھی آگاہ کر دیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہارلین کو فرار ہونا پڑے گا ورنہ وہ مارا جائے گا۔ مسٹر لینی نے مجھے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس دیا جس میں ایک لاکھ ڈالر تھے اور کہا کہ ان کے بیٹے کو خطرے سے دور کر دیا جائے۔''

''گویا انہوں نے تمہیں نائٹ کے طور پر استعمال کیا؟''

''ہاں، یہ اسی نوعیت کا کام تھا۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہارلین ان دنوں پول ٹاؤن کی ایک پرانی عمارت میں رہ رہا تھا۔ میں جب اس سے ملنے گیا تو وہ ایک میز پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ جج ہو اور میں اس سے انصاف کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ لوگ ساری عمر اسے سدھارنے کی کوشش کرتے رہے جن میں والدین، استاد اور دوست بھی شامل تھے۔ اب ان میں میرا بھی اضافہ ہو گیا تھا لیکن اس نے مجھے بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔

اس کے باوجود میں نے کوشش کی۔ اسے گوتھیئر کے لوگوں کے خطرناک عزائم سے آگاہ کیا۔ مسٹر لینی کے دیے ہوئے ایک لاکھ ڈالر دیے اور کہا کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور اپنے لیے ایک بہتر زندگی کا انتخاب کرے۔''

اس نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ وہ چند بدمعاشوں سے ڈر کر نہیں بھاگے گا بلکہ وہ ان پیسوں سے ڈیٹرائٹ کے گینگسٹرز کی خدمات حاصل کرے گا تاکہ وہ گوتھیئر ز کا مقابلہ کر سکیں۔''

''وہ اس لڑائی میں دور افتادہ علاقے کے غنڈوں کو استعمال کرنا چاہ رہا تھا؟''

''ہاں، یہی اس کا منصوبہ تھا۔'' کوپر نے تلخی سے کہا۔ ''اس کے بعد یہاں اتنا بڑا فساد ہوتا کہ لوگ تیسری جنگِ عظیم کو بھول جاتے۔''

وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔ اس مرتبہ دورہ شدید تھا۔ مجھے لگا کہ اس کا سانس رک جائے گا لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ اس نے ٹشو پیپر سے اپنا منہ صاف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے اپنا پستول نکال لیا اور اس کی نال میرے چہرے پر رکھ کر مجھے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ بے وقوف میری ناک کے نیچے ایک ایسا جرم کر رہا تھا جس کی سزا پانچ سال قید ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے زور سے جھٹکا دیا تو پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گرا اور جھٹکا لگنے سے ٹریگر دب گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے سینے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ ایک منٹ پہلے ہم بحث کر رہے تھے اور دوسرے منٹ میں یہ حادثہ ہو گیا۔ میرے خدا، آج بھی مجھے اس کا چہرہ یاد ہے۔ وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا اور میں بھی۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی لیکن اس سے مجھے کوئی مدد نہیں ملتی۔ میں بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ مجھے اس لڑکے سے بات کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ مر گیا۔ میں کوئی بادشاہ نہیں تھا کہ مجھے بچانے کوئی آتا۔''

وہ لحہ بھر کے لیے رک گیا۔ شاید انتظار کر رہا تھا کہ میں کوئی تبصرہ کروں جب میں کچھ نہ بولا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ چاہتے تھے کہ ہارلین شہر چھوڑ کر چلا جائے لہٰذا میں نے اس معاملے کو نمٹانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے اس کی کار میں بٹھایا اور جھیل کے کنارے سطح پر جمی ہوئی برف پر کار کو چلتا ہوا چھوڑ دیا۔ ایک میل جانے کے بعد کار ڈوب گئی۔ اس کا اگلا حصہ ٹائی ٹینک کی طرح جھیل کی تہ میں چلا گیا۔''

''تم نے مسٹر لینی کو کیا بتایا؟''

''یہی کہ میں نے ہارلین کو وہ پیسے دے دیے تھے اور وہ لاس اینجلس چلا گیا ہے۔ جب انہیں کچھ عرصے تک اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تو انہوں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دی لیکن اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور ہارلین کی گمشدگی کا معاملہ بھی سرد خانے میں چلا گیا۔ میں نے وہ رقم جولین کی بیٹی کے لیے ایک ٹرسٹ میں جمع کروا دی۔ اگر بوڑھا لینی پہلے ہی یہ کام کر لیتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا لیکن وہ چاہتا تھا کہ مسئلہ حل ہو جائے اور میں نے وہ حل کر دیا۔ ہم ان دنوں ایسا ہی کرتے تھے۔ اب تم کیا کرو گے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے سچائی سے کہا۔ ''تیکنیکی طور پر تم سے تین جرم سرزد ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ تمہیں ہتھکڑی لگاؤں اور جیل میں بند کر دوں لیکن میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے اور مجھے صرف تمہارے بیان پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ تم بیمار ہو۔ اس لیے جج تمہارے اعتراف کو نا کافی سمجھے گا۔''

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور میں بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں گزار سکتا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیس بیس سال پرانا ہو چکا ہے اور کوئی بھی اسے دوبارہ کھولنا نہیں چاہتا۔ کم از کم میں بالکل نہیں۔ میں اسے جس طرح دیکھ رہا ہوں...''

''ہاں کہو۔''

''میں نے اپنی زندگی میں خودکشی کا اس سے زیادہ بُرا کیس نہیں دیکھا۔''

اس بار یہ جملہ میں نے اکیلے ہی ادا کیا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں مسکرایا۔

کوپر نے سرد مہری سے سر ہلایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یقیناً یہ خودکشی نہیں بلکہ قتل کا کیس تھا۔ اگر وہ مجھے سب کچھ سچ بتا دیتا کہ ہارلین لینی کا زندہ رہنا کتنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر وہ لینی کو قتل نہ کرتا تو کوتھیئر اور باہر سے آئے ہوئے گینگسٹرز کے درمیان شدید لڑائی چھڑ جاتی اور عین ممکن تھا کہ انہیں شہر میں قدم جمانے کا موقع مل جاتا۔ اس لیے دیکھا جائے تو اس نے ہارلین کو قتل کر کے شہریوں کے مفاد میں یہ قدم اٹھایا تھا بالکل اسی طرح جیسے کئی برس پہلے اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ مجھے آج بھی وہ منظر اچھی طرح یاد ہے جب میں اسپتال کی بینچ پر بیٹھا ایک تولیے سے اپنے چہرے سے بہتا خون صاف کر رہا تھا کہ نشے میں بھناتا ہوا اے مولیئر وہاں آیا۔ اسے میری تلاش تھی۔ اس لمحے یوں لگا جیسے میری زندگی کے دن ختم ہو گئے۔ میں نے صرف کار ہی نہیں چرائی تھی بلکہ ہم دونوں کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ ہمیں یقیناً جیل بھیج دیا جاتا اگر اس وقت کوپر ہمارا ساتھ نہ دیتا۔

لیکن اس نے یہ سب میرے لیے نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ اسے صحیح سمجھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے مولیئر کی ضد میں ایسا کیا کیونکہ وہ اس پر زور دے رہا تھا کہ ہم دونوں کو جیل میں بند کر دیا جائے۔ وہ کوئی بادشاہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دولت مند... اور یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی کہ وہ ایک پولیس والے پر چلایا۔ جس کے ردعمل میں کوپر نے اسے دیوار کی جانب دھکیل دیا اور ہم دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ یہ انصاف نہیں بلکہ اپنے اختیارات کا استعمال تھا۔ اس نے یہ اس لیے کیا کیونکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ اس نے چند برس قبل ہارلین لینی کی لاش کو اس کی کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور جھیل میں گرا دیا کیونکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ کسی لڑکی کو بے آبرو کرنا سنگین جرم نہیں اور نہ ہی کسی پر ہتھیار نکالنا لیکن کوپر کا جرم بہت سنگین تھا۔ اس نے قانون کو ہاتھ میں لے کر ایک انسان کو قتل کیا لیکن اگر میں اسے گرفتار کر لیتا تب بھی اسے سزا ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ عدالت میں مقدمہ چلتا۔ کوپر کا وکیل اور سرکاری وکیل مہینوں بحث کرتے اور شاید اس کی سزا میں تخفیف ہو جاتی لیکن کوپر کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے تین ہفتے بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

میں نے کوپر کے بیان کا حوالہ دیے بغیر اس کیس کو بند کر دیا کیونکہ یہ میرے اختیار میں تھا اور میں ایسا کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ کوپر نے اپنا اختیار استعمال کیا تھا اور اب میری باری تھی۔ چیف ڈیٹیکٹو نے میری رپورٹ پڑھنے کے بعد کہا۔ ''گولی کے زخم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی کی تھی لیکن اس کی لاش جھیل میں ڈوبی ہوئی کار میں پائی گئی۔ کیا تم اس رپورٹ میں چند سطور کا اضافہ کرنا چاہو گے کہ یہ کار وہاں کس طرح پہنچی؟''

اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ میں چپ رہا۔ میرا محسن مر چکا تھا، اس کی رسوائی مجھے منظور نہ تھی۔

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر ورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑی توند والا سب انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ہولسٹر لگا تھا اور ہولسٹر میں سے پستول کا دستہ صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ یہ نہایت برق رفتار حرکت تھی۔ میں نے ہتھیلیوں پر زور دے کر اپنا سینہ اور پیٹ زمین پر سے اٹھایا پھر پاؤں کے زور سے خود کو کھڑا کیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ پلک جھپکتے میں توند والے سب انسپکٹر کا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ اس حرکت اور ''مومینٹم'' کو جاری رکھتے ہوئے میں نے آگے کی طرف جست لگائی اور گرانڈیل قیصر چودھری پر جا پڑا۔ اس کے منہ پر لگنے والی میرے سر کی ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ اڑتا ہوا سا پیچھے کی طرف گیا۔ اس کی پشت پولیس جیپ کی آہنی سائڈ سے ٹکرائی۔ پشت پر لگنے والی اس ضرب نے اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لی اور اس کے عقب میں آگیا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں مکمل ہوگیا تھا۔

جب تک پولیس اہلکاروں کا اسلحہ میری طرف سیدھا ہوتا، میں قیصر چودھری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کے سر سے لگائی اور دہاڑ کر کہا۔ ''خبردار! اس کی جان چاہتے ہو تو اسلحہ نیچے کرلو... میں کہتا ہوں نیچے کرلو۔''

یہ بڑے فیصلہ کن لمحات تھے۔ جو کچھ ہونا تھا انہی چند سیکنڈز کے اندر ہونا تھا۔ مجھے عقب سے اطمینان تھا کیونکہ عقب میں پولیس کی خالی جیپ تھی۔ میں نے لحیم شحیم قیصر چودھری کو ڈھال بنالیا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے تین چار انچ زیادہ ہی ہوگا یقینا حرام کھا کھا کر اس کے جسم میں بہت طاقت بھی آچکی تھی لیکن اس کی کنپٹی پر پستول کا بے پناہ دباؤ اسے بتا رہا کہ وہ غلط حرکت کرے گا تو کچھ بھی ہوجائے گا۔

سب انسپکٹر قادر نے بھیانک لہجے میں کہا۔ ''چھوڑ دو سر کو۔ مارے جاؤ گے۔'' اس کے ہاتھ میں بھی سرکاری پستول تھا اور رخ ہماری طرف ہی تھا۔ دو رائفلیں اور ایک پستول مزید تھے جو میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔

قیصر چودھری نے زور مارا۔ مجھے لگا کہ کام بگڑنے لگا ہے۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا کر گردن پر رکھا اور فائر کردیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی قیصر چودھری چلایا۔ اس کی گردن سے خون کی پچکاری نکل کر اس کے کندھے پر گری۔ میں نے پستول پھر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور گرج کر کہا۔ ''دوسری گولی سے اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔ کوئی حرکت نہ کرے۔''

فائر کی آواز نے جیسے سب کو سسرائز کردیا تھا۔ میں جانتا تھا، میری چلائی ہوئی گولی نے قیصر کو مارا نہیں صرف زخمی کیا ہے اور وہ بھی معمولی۔

قیصر چودھری کے لمبے چوڑے جسم میں پیدا ہونے والا تلاطم ایک دم ہی سکوت میں بدل گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں صرف دھمکا نہیں رہا۔ مارنے کی ہمت بھی رکھتا ہوں۔

میں نے اس کے کان میں سفاک سرگوشی کی۔ ''ان سے کہو، اسلحہ نیچے کریں اور دس قدم پیچھے ہٹ جائیں... کہو ان سے۔''

قیصر چودھری نے چند لمحے سوچا پھر ہاتھ کے اشارے سے اہلکاروں کو میری ہدایت پر عمل کرنے کو کہا۔

تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ انہوں نے اسلحہ نیچے کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں قیصر کو گھسیٹتا ہوا جیپ میں آبیٹھا۔ قیصر ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور میں اس کے پہلو میں۔ میں نے پستول کی نال مسلسل اس کے سر سے لگا رکھی تھی اور انگلی کو لبلبی پر تیار رکھا ہوا تھا۔ جیپ کے اگنیشن میں چابی موجود تھی۔

''چلو چودھری گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' میں نے کہا۔

''تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ اب بھی وقت ہے باز آجاؤ۔'' وہ بولا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ اب بھی وقت ہے... جان بچانی ہے تو گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے نکلو۔'' میری آنکھوں کے سامنے ولید کا بے حرکت جسم کیچڑ میں اوندھا پڑا تھا اور اس منظر نے میرے اندر درندگی بھر دی تھی۔

قیصر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ اہلکار ہکا بکا کھڑے تھے۔ اردگرد کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جس پر وہ تعاقب کرسکتے پھر ان میں سے کسی اہلکار نے دو تین ہوائی فائر کیے۔ اسے ایک اضطراری حرکت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا تھا۔

گاڑی ٹرن لے کر کشادہ سڑک پر پہنچی اور تاریکی کا سینہ چیرتی آگے بڑھنے لگی۔ قیصر چودھری یقینا بہت سخت اعصاب کا مالک تھا مگر اس وقت اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور گاڑی جیسے لہرا رہی تھی۔ اسے سب سے زیادہ فکر یقینا اپنی گردن کی رہی ہوگی جس میں سے مسلسل خون ٹپک ٹپک کر اس کے کالر پر گر رہا تھا۔

''شیر بنو چودھری، لوگوں پر دھڑتے سے گولیاں

چلاتے ہو۔ اب اگر ایک خراش آ گئی ہے تو مر کیوں رہے ہو۔ صرف ایک رگ کٹی ہے تمہاری... اور کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

قیصر چودھری نے اپنی زخمی گردن کو چھوا۔ اسے جیسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ غصے اور بے بسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ میرے سر اور کنپٹی پر بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لمبا لیٹا ہوتا لیکن میرا تو کام ہی چوٹوں کو برداشت کرنا تھا۔

''کہاں جانا چاہ رہے ہو؟'' قیصر نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

''میں کہیں جانا نہیں چاہ رہا لیکن ہوسکتا ہے کہ تمہیں وہیں پہنچانا پڑ جائے، جہاں تم نے ابھی ولید کو پہنچایا ہے اور کچھ دیر پہلے اس کی ماں اور بہن کو پہنچایا ہے۔'' میرے لہجے میں شعلے پھنکار رہے تھے۔

''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اس لڑکے پر بھی اس لیے گولی چلائی گئی کہ اس نے پہل کی تھی۔''

''لیکن پہل سے بھی بہت پہلے ایک پہل ہوتی ہے اور وہ تم نے کی ہے۔ قیصر چودھری، تمہارے گماشتوں نے آگ لگائی ہے گھر کو اور بیکری کو اور اب تم کو بھی اس آگ میں جلنا ہوگا۔'' میرے لہجے نے اسے سرتاپا دہلا دیا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ گاڑی خم دار سڑک سے گزرتے ہوئے کسی نہر کے پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''سامنے دیکھو چودھری... لگتا ہے کہ مرنے کی جلدی ہے تمہیں۔'' میں نے کہا۔

قیصر چودھری نے جلدی سے گاڑی کو سنبھالا ورنہ وہ سڑک سے اتر جاتی۔ چند سیکنڈ بعد وہ پھر بولا۔ ''دیکھو... تم اپنے دماغ کو ٹھکانے پر لاؤ۔ ہم کہیں رک کر بات کرلیتے ہیں... اور اگر...''

''سامنے دیکھو۔'' میں پھر چلایا۔ گاڑی ایک پل پر سے گزر رہی تھی اور قیصر چودھری نے اسے سڑک سے تقریباً اتار ہی دیا تھا۔

میرے چلانے پر وہ پھر چونکا۔ اس نے اسٹیئرنگ کو دائیں طرف گھمایا۔ گاڑی جنگلے سے ٹکرانے سے بچ گئی لیکن بدحواسی میں اس نے اسٹیئرنگ زیادہ گھما دیا تھا۔ گاڑی سڑک کے تقریباً وسط میں آگئی۔ سامنے ڈھلوان سے ایک تیز رفتار ٹرک نمودار ہوا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سیدھی ہماری آنکھوں پر پڑیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اب یہ تصادم ہوجائے گا۔ آخری کوشش کے طور میں نے خود اسٹیئرنگ گھمانے کی کوشش کی مگر اب دیر ہوچکی تھی۔ گاڑی اتنی زیادہ گھوم گئی تھی کہ وہ دوسری طرف کے جنگلے سے جا ٹکرائی۔ میں نے ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے کی آواز سنی، اس کے ساتھ ہی ہوا میں چنگاریاں سی اڑیں۔ ان چنگاریوں کی وجہ گاڑی اور جنگلے کے لوہے کا تصادم تھا۔ مجھے لگا کہ میں ٹوٹی ہوئی اسکرین کے اندر سے اڑتا ہوا گزرا ہوں۔ قریباً دو ڈھائی من وزنی جیپ میرے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی گئی اور ایک زوردار چھپاکے سے نہر کے تاریک پانی میں گری۔

میں پل کے ٹوٹے ہوئے جنگلے کے ساتھ لٹکا رہ گیا تھا پھر مجھے اس ٹرک کی عقبی بتیاں نظر آئیں جس کے ساتھ ہمارا تصادم ہوتے ہوتے رہا تھا۔ ٹرک برق رفتاری کے ساتھ موقع سے فرار ہو رہا تھا۔ (اس حادثے کی ایک وجہ یقیناً اس کی برق رفتاری بھی تھی) مجھے لگا جیسے حادثے کے موقعے پر رکنے یا مدد کرنے کا رواج اپنے ملکِ عزیز میں موجود ہی نہیں۔ حواس بحال ہوتے ہی پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ میں دونوں ہاتھوں سے جنگلے سے جھول رہا ہوں۔ میرے گھٹنوں اور کہنیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں لیکن مجموعی طور پر میں ٹھیک تھا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

میں نے گہرائی میں دیکھا۔ قریباً تیس فٹ نیچے پانی میں جیپ پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی ایک ہیڈ لائٹ ابھی تک روشن تھی۔ اس روشنی میں مجھے کوئی شخص پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا نظر آیا یقیناً یہ انسپکٹر قیصر ہی تھا۔ میری طرح وہ بھی موت کو جُل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

میں زور لگا کر جنگلے پر چڑھا اور سڑک پر آگیا۔ دیہاتی طرز کی ایک کھٹارا بس کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی تھی۔ غالباً اب بس کی سواریوں کو جائے حادثہ کی طرف آنا تھا۔ اس بات کا شدید خطرہ بھی موجود تھا کہ تھانے کے قریب رہ جانے والے اہل کاروں نے بھی کوئی سواری ڈھونڈ لی ہو اور اب تیزی سے ہماری طرف آرہے ہوں۔ میں نے اطراف میں دیکھا۔ پل کے آخری سرے پر اونچے کھیت دکھائی دیے۔ میں لنگڑاتا ہوا بھاگا اور ان کھیتوں میں گھس گیا۔ یہ مکئی کے کھیت تھے۔ پودوں کی اونچائی چھ سات فٹ سے کم نہیں رہی ہوگی۔ اس اونچائی نے مجھے ڈھانپ سا لیا۔

میں گیلے اور نیم خشک کھیتوں میں تیزی سے بھاگتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ میرے سارے جسم پر چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ خاص طور سے سر اور کنپٹی پر لگنے والی چوٹیں

تکلیف دے رہی تھیں۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب رات کا تیسرا پہر تھا اور گھڑی کی سوئیاں دو کے ہندسے پر گلے مل رہی تھیں۔

ایک جگہ مجھے ٹیوب ویل دکھائی دیا۔ یہاں دور کچے پکے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف ٹریکٹر کے بغیر ٹرالی کھڑی تھی۔ میں پاس ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ میرا سیل فون آن تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کزن ایڈووکیٹ عبداللہ کا نمبر پریس کیا۔ چند سیکنڈ بعد عبداللہ کی اشک بار آواز ابھری۔

''ہیلو شاہ زیب! کہاں ہو تم؟''

''میں زیادہ دور نہیں ہوں اور تم کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سسک کر بولا۔ ''یہاں سب کچھ ختم ہو گیا شاہ زیب۔ چچی آمنہ، فائزہ... دونوں ختم ہو گئیں۔ مکان جل کر کوئلہ ہو گیا... یہ کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ؟''

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''عبداللہ! تھانے کے قریب ولید شدید زخمی ہوا تھا اس کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں... اس کا بھی کچھ پتا نہیں بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسے اسپتال لے گئے ہیں۔ پتا نہیں لاش لے گئے ہیں یا ابھی زندہ تھا... لیکن تم کہاں ہو شاہ زیب؟''

''مجھے ٹھیک سے خود بھی پتا نہیں۔ بڑی نہر کا پل ہے جس کے پاس سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے۔ یہاں انسپکٹر قیصر کی گاڑی کے ساتھ حادثہ ہوا ہے۔ گاڑی نہر میں گر گئی ہے... میں تمہیں تفصیل بعد میں بتاؤں گا، فی الحال تم کسی طرح مجھ سے مل لو۔''

''کس طرح ملوں... مجھے صحیح ٹھکانا تو پتا ہو۔''

میں نے تفصیل کے ساتھ عبداللہ کو بتایا کہ میں کہاں اور کس جگہ موجود ہوں۔ ایک دو نشانیوں کے ساتھ وہ میری لوکیشن کو سمجھ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اچھا شاہ زیب، میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

پس منظر میں رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بہت سے لوگ بلند آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عبداللہ آتش زدگی والی جگہ پر ہی موجود ہے۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہ دلدوز مناظر گھومنے لگے۔ فائزہ کا جلتی ہوئی بالکونی میں پہنچنا اور پھر شعلوں کی نذر ہونا۔ وہ خوف ناک لمحے جیسے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ یقیناً چچی آمنہ کی سن ہو سی صورت بھی اسی طرح شعلوں کا رزق بنی تھی۔

فون بند کر کے میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ٹیوب ویل کی طرف آیا۔ ٹیوب ویل بند تھا، ہلکے سے کہرے نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ٹیوب ویل کے ساتھ واقع دونوں کمروں میں تاریکی تھی اور دروازے بند تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک کمرے میں ایک دو افراد سو رہے ہیں لیکن دوسرا خالی ہے۔ اس کمرے کے باہر زنجیر والی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں احتیاط سے اندر داخل ہوا۔ یہاں دو خالی چارپائیاں تھیں اور لکڑی کی ایک الماری میں کچھ دیگر سامان پڑا تھا۔ یہ کسی محنت کش کسان کے روزمرہ استعمال کی اشیا تھیں۔ مجھے میری مطلوبہ چیز فوراً ہی مل گئی۔ یہ سفید رنگ کی ایک شلوار قمیص تھی۔ اس کے علاوہ ایک بوسیدہ سا کوٹ بھی نظر آگیا۔ میرے کپڑے کیچڑ میں بری طرح لتھڑ چکے تھے اور ان پر جگہ جگہ خون بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے اس لباس سے فوری نجات حاصل کی۔ گھڑے میں سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا اور دوبارہ درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں عبداللہ سے ملاقات متوقع تھی۔

ابھی میں جھنڈ میں پہنچا ہی تھا کہ موٹر سائیکل کی مدھم آواز سنائی دی پھر اس کی ہیڈ لائٹ نظر آئی۔ عبداللہ کی ون ٹو فائیو سی موٹر سائیکل کی بھاری آواز میں پہچانتا تھا۔ میں نے سیل فون کی ٹارچ کے ذریعے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

جلد ہی ہم اس جھنڈ کے اندر آمنے سامنے موجود تھے۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عبداللہ مجھ سے لپٹ گیا۔ کتنی ہی دیر ہم اسی طرح سوگوار انداز میں کھڑے رہے۔ میں نے عبداللہ سے پھر پوچھا کہ ولید کے بارے میں کچھ پتا چلا۔ عبداللہ نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''عبداللہ... انسپکٹر قیصر نے ولید کو جان بوجھ کر شوٹ کروایا ہے۔ وہ لوگ اسے زخمی کر کے آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔''

عبداللہ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ جو کچھ کر رہے ہیں جان بوجھ کر ہی کر رہے ہیں۔ بیکری کے پرانے ملازم عبدالرشید نے کہا ہے کہ کل شام دو مشکوک بندے چار دیواری کے آس پاس منڈلاتے رہے ہیں۔ وہ سادہ لباس میں تھے لیکن لگتا ہے کہ کسی تھانے کے اہلکار تھے۔ اب چار دیواری سے باہر ایسے نشان بھی ملے ہیں جن

سے پتا چلتا ہے کہ کوئی اوپر سے کود کر احاطے میں آیا ہے۔ یہ سراسر سازش کے ساتھ ہوا ہے، حادثہ نہیں ہے یہ......''

''اب کیا کرنا چاہیے ہمیں؟'' میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ مجھے ابھی میرے ایک دوست نے لاہور سے فون کر کے بتایا ہے کہ ٹی وی پر بہت بری خبر چل رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

عبداللہ ذرا دیر ہچکچاتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس کے بتانے سے میری پریشانی میں اضافہ نہ ہو جائے۔ آخر حوصلہ کر کے بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ پورے ضلع کی پولیس تمہیں ڈھونڈنے کے لیے حرکت میں آگئی ہے۔''

''کیوں، میں نے کیا کیا ہے؟''

''ان کے مطابق تو بہت برا کیا ہے بلکہ بہت ہی زیادہ برا۔'' عبداللہ کی آواز دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

''کچھ پتا بھی تو چلے؟''

عبداللہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''شاہ زیب! یہ لوگ ولید کی طرح تمہیں بھی شوٹ کر دیں گے۔ انہوں نے پورا پلان بنالیا ہے۔ تم جان بچانا چاہتے ہو تو کسی طرح چند دن کے لیے کہیں اور روپوش ہو جاؤ یا پھر... نکل سکتے ہو تو ڈنمارک واپس چلے جاؤ۔''

''تمہیں پتا ہے عبداللہ میں کاغذات کے بغیر واپس نہیں جاسکتا اور کاغذ چچا کے پاس تھے جل گئے ہوں گے دوسری چیزوں کے ساتھ ہی اور یہاں روپوش کیسے ہو جاؤں؟ میں تو یہاں جانتا نہیں ہوں کسی کو۔ راستوں تک سے واقف نہیں ہوں... لیکن تم ادھوری بات کیوں کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ کہ ٹی وی پر کیا بری خبریں چل رہی ہیں؟''

عبداللہ نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''پرسوں لاہور کے نواح میں دہشت گردی کا واقعہ ہوا تھا۔ دو نقاب پوشوں نے رائفلوں سے اندھا دھند فائرنگ کی تھی اور تین چار ہینڈ گرینیڈ بھی پھینکے تھے... پتا ہے نا تمہیں؟''

''ہاں... سات افراد ہلاک ہو گئے تھے، کچھ زخمی ہوئے تھے...''

''وہ لوگ... یہ دہشت گردی تمہارے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔''

میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو عبداللہ؟ میں نے دہشت گردی کی ہے؟''

وہ دکھ سے بولا۔ ''یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم تو پھر ایک بالغ شخص ہو اور تم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی بھی ہے۔ یہ لوگ تو آٹھ دس سال کے بچوں پر ڈکیتی اور آبروریزی کے پرچے کاٹ دیتے ہیں۔ میرا دوست باذان بتا رہا تھا کہ ٹی وی چینلز پر بار بار ایک فوٹیج دکھائی جارہی ہے جس میں تمہارے ہی قد کاٹھ کا ایک شخص پمپ ایکشن گن سے فائرنگ کر رہا ہے۔ پمپ ایکشن گن کو سرخ دائرے میں دکھایا جارہا ہے اور دعویٰ کیا جارہا ہے کہ یہی خاص گن..... تمہارے پاس سے ملی ہے۔''

''مجھ سے ملی ہے؟'' میں ہکابکا رہ گیا۔

''اپنے ناپسندیدہ لوگوں پر اسلحہ اور منشیات وغیرہ کے کیس ڈال دینا قیصر جیسے تھانے دار کا پرانا وتیرہ ہے۔ تم پر یہ پمپ ایکشن گن ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ جب تم قیصر کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر جارہے تھے تو تمہاری جیکٹ سے ایک ہینڈ گرینیڈ بھی گرا ہے اور یہ بالکل اسی ساخت کا ہے جو دہشت گردی میں استعمال ہوا ہے۔''

میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رہ گیا۔ اسی دوران میں عبداللہ کے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف اس کا وہی صحافی دوست باذان ہے۔ دو تین منٹ عبداللہ اس کی بات سنتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ ''شاہ زیب! تم سخت خطرے میں ہو۔ وہ لوگ تمہیں ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔''

میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ ایک نڈر وکیل ہونے کے باوجود عبداللہ موجودہ صورت حال سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے مشورے تو دے رہا تھا لیکن فی الوقت مجھے پناہ دینے یا پناہ کے سلسلے میں میری مدد کرنے کا رسک نہیں لے رہا تھا اور وہ اپنی جگہ پر شاید ٹھیک ہی تھا۔ اس کی بیوی تھی، دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک بڑا وکیل ہونے کے باوجود وہ قیصر چودھری، شکیل داراب اور عطاءاللہ داراب جیسے لوگوں سے لڑنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اچھا عبداللہ! مجھے مشورہ دو کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''یہ ایس پی تبریز، محکمے کے اچھے پولیس افسروں میں سے ایک ہے۔ تم اس سے مل بھی چکے ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم کسی طرح اس

سے مل لو تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔''

''اس سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق وہ دو ہفتے کی چھٹی پر ہے۔ لاہور میں بیدیاں روڈ پر اس کا چھوٹا سا فارم ہاؤس ہے۔ نوے فیصد امید ہے کہ وہ فارم ہاؤس پر ہی ہوگا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر وہ تمہاری مدد کرنے پر تل گیا تو پھر یہ لوگ اتنی آسانی سے تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

عبداللہ نے جلدی جلدی سے مجھے تفصیلات فراہم کیں کہ میں ایس پی تبریز سے کہاں اور کس طرح ملاقات کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر عبداللہ کو بتایا کہ اس وقت تو میرے پاس خرچے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔ اتفاقاً عبداللہ کے پاس دو ڈھائی ہزار روپے تھے۔ وہ اس نے مجھے تھما دیے۔ تب پہلی بار اس نے غور سے میرے لباس کو دیکھا۔

''یہ تمہارے اپنے کپڑے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اسے بتایا کہ کس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے سامنے والے ڈیرے پر گھس کر یہ لباس حاصل کیا ہے اور اپنے خون آلود کپڑے جھاڑیوں میں چھپائے ہیں۔

باتیں کرتے ہوئے ہماری آواز بار بار دکھ کی شدت سے ٹوٹ جاتی تھی۔ یہ اس خوف ناک واقعے کا دکھ تھا جس نے دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہمیں کچھ انمٹ زخم لگائے تھے۔ میں سوچتا تھا تو کلیجا منہ کو آنے لگتا تھا۔

عبداللہ نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ''میں زیادہ دیر موقع سے غائب رہوں گا تو وہ لوگ مجھ پر شبہ کرنے لگیں گے۔ ویسے بھی میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ رشتے دار اکٹھے ہو رہے ہیں۔ چچا حفیظ کی حالت بھی خراب ہے۔ مجھے تو لگتا ہے انہیں بھی اسپتال لے جانا پڑے گا۔ انہیں میں نے ابھی تک ولید کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

دو تین منٹ کی مزید گفتگو کے بعد عبداللہ مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں کھیتوں اور جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا پکی سڑک تک پہنچا۔ عبداللہ نے ابھی بتایا تھا کہ ایک دو بسیں صبح سویرے نکلتی ہیں اور دودھ فروش و سبزی فروش حضرات ان سے فائدہ اٹھا کر لاہور پہنچتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پہلی بس اس سڑک سے گزرنے ہی والی ہوگی۔

عبداللہ کی اطلاع بالکل درست تھی۔ ابھی مجھے پکی سڑک پر پہنچے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ ٹریکٹر ٹرالی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ ایک پرانی دیہاتی بس تھی۔ اس کی چھت پر بھی سواریاں بیٹھی تھیں۔ میرے اشارے پر بس رک گئی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سیڑھی چڑھ کر بس کی چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں آٹھ دس افراد چادریں لپیٹے اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ دودھ کے برتن، چارے کے گٹھے اور سبزی وغیرہ کی گانٹھیں بھی دکھائی دے رہی تھیں حتیٰ کہ ایک موٹر بائیک بھی کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھالی گئی تھی۔ ڈنمارک کی لگژری بسوں اور یہاں کی بسوں کے سفر میں بہت فرق تھا لیکن جو کچھ بھی تھا ایک سادہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا۔ کسی نے مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ میں ایک گوشے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے میں نے اپنا منہ اور سر اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں لاہور شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ شہر کے گلی کوچے جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر خاصی ٹریفک نظر آرہی تھی۔ مجھے صرف ایک دو جگہ کے علاوہ کہیں کوئی پولیس ناکا نظر آیا۔ وہاں سے بھی ہم بخیریت ہی گزر گئے۔

میں مزنگ چونگی کے قریب ایک بس اسٹاپ پر اترا۔ اب مجھے بیدیاں روڈ جانا تھا۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق میں فیروز پور روڈ کی طرف چل دیا۔ بیس تیس قدم آگے گیا تھا کہ ایک پولیس موبائل سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ پولیس والے بڑی چوکس حالت میں موٹر سائیکل سواروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں ان پولیس والوں سے کنی کترا کر ایک چائے خانے میں گھس گیا۔ آٹھ دس افراد یہاں موجود تھے۔ کچھ حلوہ پوری کا ناشتا کر رہے تھے، کچھ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک کپ چائے منگوائی، کھانے کی خواہش کہاں تھی۔ گلے میں جیسے غم کا ایک بڑا سا گولا اٹکا ہوا تھا فوراً ہی چائے آگئی اس پر ملائی تیر رہی تھی۔ باہر کے ملکوں میں اس طرح کی چائے کا تصور نہیں ہوتا۔ میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا کہ ایک دم چونک گیا۔ ٹی وی پر ایک نیوز چل رہی تھی اور اس نیوز کا تعلق براہِ راست مجھ سے تھا۔ میں عالمِ حیرت میں ٹی وی اسکرین کو گھورنے لگا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ مطلوبہ شخص کی تلاش میں پولیس کی ٹیمیں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہیں۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ شاہ زیب نامی یہ شخص بیرونِ ملک سے

دہشت گردی کی خاص تربیت لے کر یہاں آیا ہے اور اگر یہ جلد ہی گرفتار نہ ہوا تو خدانخواستہ تخریب کاری کا کوئی اور بڑا واقعہ پیش آسکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر وہ فوٹیج دکھائی جانے لگی جس کا ذکر کچھ دیر پہلے گاؤں میں عبداللہ نے کیا تھا۔ یہ سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج تھی۔ ایک دراز قد شخص جس نے اپنا منہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، پمپ ایکشن گن سے لگاتار فائر کررہا تھا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک نوعمر لڑکے کی لاش پڑی صاف نظر آرہی تھی۔ پمپ ایکشن کو سرخ دائرے میں دکھایا جارہا تھا۔

مختصر فوٹیج کو دو تین بار چلایا گیا پھر مجھے اسکرین پر قیصر چودھری کی منحوس شکل نظر آئی، اس کے ماتھے اور گردن پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک دیسی ہی پمپ ایکشن پڑی تھی جو فوٹیج میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ہینڈ گرینیڈ تھا۔ قیصر چودھری میڈیا رپورٹرز سے باتیں کررہا تھا لیکن اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بجائے نیوز کاسٹر کی آواز اوورلیپ ہورہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''پولیس ذرائع کے مطابق مبینہ دہشت گرد نے پولیس انسپکٹر قیصر چودھری کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر نے بڑی دلیری سے یہ کوشش ناکام بنادی اور گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود گاڑی کو پل کے جنگلے سے ٹکرادیا۔ گاڑی نہر میں گرگئی اور ملزم زخمی حالت میں فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ انسپکٹر قیصر معجزانہ طور پر محفوظ رہا۔''

اس کے بعد اس سارے واقعے کی مزید تفصیل بھی بتائی گئی۔ میرے ساتھ ساتھ ولید کو بھی خطرناک دہشت گرد قرار دیا جارہا تھا۔ اتنی بے باکی سے اس قدر بے بنیاد جھوٹ بولے جارہے تھے کہ عقل دنگ رہ گئی اور دماغ گھوم گیا۔ اس سارے واقعے میں فقط ایک خبر ایسی تھی جسے کسی حد تک مثبت قرار دیا جاسکتا تھا اور وہ یہ کہ اسپتال میں ولید تاحال زندہ تھا... تاہم اس کی حالت شدید خطرے میں بتائی جارہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پولیس والے اپنی گاڑی سمیت موقعے سے ہٹ چکے تھے۔ میں باہر آیا اور ایک بار پھر فیروز پور روڈ پر پیدل چل پڑا۔ جلد ہی مجھے سواری مل گئی۔ یہ ایک ویگن تھی۔ میں بیدیاں روڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ایس پی تبریز سے میری ملاقات کس طرح ہو پائے گی، بس میں چلا جارہا تھا۔

فارم ہاؤس کا ایڈریس مجھے عبداللہ نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ راستے میں مجھے ایک دو جگہ ٹریفک کا شدید ازدحام نظر آیا۔ میں نے اسکول کے بچوں کو بسوں سے لٹکتے اور رکشاؤں پر لدے ہوئے دیکھا۔ یہ مناظر اور اس جیسے دوسرے مناظر میرے لیے آج کل بہت حیرت کا باعث بن رہے تھے۔ بہرحال یہ موقع ایسا تھا کہ میں زیادہ حیران بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ ویگن سے اترنے کے بعد میں پیدل چل پڑا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ تبریز صاحب سے میری ملاقات اتنی آسانی سے ہوجائے گی۔ میں فارم ہاؤس سے ابھی سوڈیڑھ سومیٹر دور ہی تھا کہ میں نے درختوں میں ایک شخص کو ٹریک سوٹ میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ایک بڑے سائز کا کتا اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آرہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جواں سال ایس پی تبریز تھا۔

''سنیے سر۔'' میں نے تیزی سے کہا اور اس کے نزدیک چلا گیا۔

ایس پی تبریز مجھے دیکھنے کے بعد ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ تیس بتیس سال کا ایک خوبرو اور اسمارٹ شخص تھا۔ کشادہ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چھٹی پر ہونے کے باوجود اس تہلکہ خیز خبر سے آگاہ ہوچکا ہے جو صبح سویرے سے ٹی وی چینلز پر چل رہی ہے۔

وہ رک گیا تو کتا تیزی سے میری طرف آیا اور دھمکانے والے انداز میں میرے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔

''ایڈی... ایڈی۔'' ایس پی تبریز نے کتے کو پچکارا اور پھر اس کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے ایک درخت سے منسلک کردیا۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی ہے۔'' تبریز نے سخت الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یقیناً آپ کو حیرانی ہونی چاہیے۔ جو کچھ میرے بارے میں ٹی وی پر چل رہا ہے، اس کے بعد تو آپ کو حیرانی کے ساتھ ساتھ طیش میں آنا چاہیے۔ میں آپ کے ایک خوب صورت دن کو برباد کرنے کے لیے آپ کے پاس آن

پہنچا ہوں۔"

"تم صرف کام کی بات کرو۔" تبریز کے لہجے میں روکھاپن نہایت واضح تھا۔

ہم نے وہیں شبنم آلود گھاس پر کھڑے کھڑے تقریباً پانچ منٹ گفتگو کی۔ میں نے ایس پی تبریز کو ہر بات پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ بتادی۔ انسپکٹر قیصر کے سسر کی طرف سے بچا کی زمین زبردستی خریدنے کے ارادے سے لے کر حویلی کی آتشزدگی اور ولید کے شدید زخمی ہونے تک میں نے سب کچھ ایس پی تبریز کے گوش گزار کردیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں سے اکثر باتیں وہ پہلے سے یا شاید بہت پہلے سے جانتا تھا۔ بہرحال میرے اندازِ بیان نے اسے متاثر کیا اور شاید وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی اصل حقیقت ہے لیکن اس کے چہرے پر بہت زیادہ الجھن بھی نظر آرہی تھی۔

میں نے کہا۔ "تبریز صاحب! میں بڑی آس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے بہت مختلف نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنا دل آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ یہاں کے طور طریقوں سے میری واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔"

ایس پی تبریز نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم بری طرح پھنس گئے ہو۔ اب کچھ بھی ہے تمہیں ایک بار گرفتاری تو دینا ہی پڑے گی۔"

"اور اس کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔ اس کے بارے میں آپ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جیسے چند دن پہلے راجو پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا اور سیکڑوں دوسرے مارے جاتے ہیں، میں بھی مارا جاؤں گا اور میں ایسے مرنا نہیں چاہتا۔"

تبریز کے ماتھے پر سوچ کی بے شمار لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "شاید ایک شخص تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ ملک اختر عباس، وہ ملک کے نامور قانون دان ہیں۔ حال ہی میں جج کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ قانون دان حلقوں میں بہت اثر ورسوخ ہے ان کا۔ پولیس گردی کے بھی ہمیشہ سے خلاف رہے ہیں... ٹھہرو، میں ان کے سیکریٹری سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔"

تبریز نے اپنا سیل فون نکالا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر جاکر نمبر ملانے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے چہرے پر مسلسل تذبذب کی دھوپ چھاؤں تھی۔ اچانک میری چھٹی حس نے پکار کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ ایس پی نے پہلے جو نمبر پریس کیا تھا اس کو ری جیکٹ کردیا اور ایک دوسرا نمبر پریس کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ میری طرف سے پھیر لیا تھا۔ شاید فرض کا احساس اس کی سوچ پر غالب آرہا تھا۔ اپنی چھٹی حس پر مجھے ناز تھا۔ اس نے مجھے زندگی میں بہت کم دھوکا دیا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ "سر کیے... ایک سیکنڈ۔"

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ چوکس نکلا۔ اس نے اپنی شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنی کمر کی طرف اڑسا ہوا چھوٹے سائز کا پستول نکال لیا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا سامنا کس شخص سے ہے۔ وہ اس سے دو تین گنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو شاید مجھ پر حاوی نہ ہوسکتا۔ میں نے اس پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے کچی زمین پر گرا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے تبریز کا پستول والا ہاتھ جکڑ لیا تھا لیکن جب میں نے اس سے پستول چھیننا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کا بھرپور طمانچہ میرے گال پر رسید کیا۔ میری بائیں آنکھ کے سامنے سرخ ستارے سے چمک گئے۔ میں نے جوابی وار کیا اور اپنے سر کی ضرب اس کے جبڑے پر رسید کی۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ میرا خیال تھا کہ تبریز ہاتھ پاؤں پھینک دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا مدِمقابل کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔

ایس پی تبریز کے کتے نے بلند آواز میں شور مچانا شروع کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے طرح اچھل کود بھی کررہا تھا۔ اگر چند منٹ پہلے تبریز نے اس کی چین کو درخت سے باندھ نہ دیا ہوتا تو اس وقت یہ جانور میرے لیے سخت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں میرے اور جواں سال ایس پی کے درمیان سخت جدوجہد ہوئی تاہم وہ مجھ پر غلبہ حاصل نہیں کرسکا۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو میں نے اسے زیادہ سخت چوٹیں لگائی ہی نہیں تھیں ورنہ اس کی دو چار ہڈیاں تو ضرور ٹوٹ جاتیں مگر پھر مجھے اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ میں اس وقت تبریز کے اوپر تھا اور اس کی گردن کو اپنی کہنی سے رگیدے ہوئے تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کتے کے شور نے کام دکھایا ہے۔ تقریباً سو میٹر دور فارم ہاؤس کا ایک گیٹ کھلا اور مجھے دو افراد نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل دکھائی دے رہی تھی۔

جس وقت میں گیٹ کی صورت حال دیکھ رہا تھا، تبریز نے فائدہ اٹھایا۔ میری ایک لمحے کی غفلت نے اسے میرے نیچے سے نکال دیا۔ میں الٹ کر لمبی گھاس میں گرا، اس سے پہلے کہ میں اٹھتا تبریز نے کسی درخت کی ایک توانا شاخ اٹھالی۔ یہ شاخ ایک بھاری بھرکم لٹھ سے مشابہ تھی۔

''سن آف بچ۔'' وہ پھنکارا۔ اس نے شاخ پوری طاقت سے میرے سر پر ماری۔ بڑی غلط پوزیشن میں ہونے کے باوجود میں نے اس کا یہ وار بچانے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب رہا۔ لٹھ نما شاخ میرے سر کو چھوتی ہوئی کندھے پر لگی۔ پورا بازو جیسے جھنجھنا اٹھا۔

میں نے شاخ کو تھاما اور راؤنڈ کک کے انداز میں تبریز کی کنپٹی پر ضرب لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ اس کے گرتے گرتے میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے شاخ گھما کر تبریز کی گردن پر رسید کی۔ وہ اٹھتا اٹھتا پھر گر گیا۔

''سوری ایس پی صاحب۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

دوسری ضرب میں سر پر لگا سکتا تھا لیکن میں نے پھر اس کی گردن کو ہی نشانہ بنایا۔ میں اس جواں سال ایس پی کو شدید نقصان سے بچانا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس دوسری چوٹ نے تبریز کو اوندھے منہ گرا دیا اور نیم بے ہوش کر دیا۔

اچانک میری نظر گھاس کے اندر ایک سیاہ چیز پر پڑی۔ یہ وہ سیاہ پستول تھا جو کچھ دیر پہلے ایس پی کے ہاتھ سے نکلا تھا۔ میں نے جھپٹ کر پستول پکڑ لیا۔ گیٹ سے برآمد ہونے والے افراد اب بلا کی تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ دور سے ان کی آوازیں بھی ہوا کے دوش پر تیر کر مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ آوازیں کچھ اس قسم کی تھیں۔

''اوئے کون ہے... اوئے خبردار... گولی چلا دیں گے۔''

دوسری طرف کتا بھی اپنی زنجیر کو جھٹکے پر جھٹکے دے رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے آزاد ہو سکتا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کا رخ کیا اور دوڑ لگا دی۔

میرے عقب میں دو فائر ہوئے۔ اندازہ یہی تھا کہ یہ ہوائی فائر ہیں۔ میرے پیچھے آنے والے ابھی مجھ سے کافی دور تھے۔ میرے پاس نکل بھاگنے کا ایک اچھا موقع تھا۔ کچھ فاصلے پر گنے کے اونچے کھیت تھے۔ میں ان میں گھس کر کسی سمت نکل سکتا تھا، کہیں پناہ لے سکتا تھا مگر پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ کوئی بڑی تیزی سے میرے پیچھے آرہا تھا اور یہ انسان نہیں جانور تھا۔

ایس پی تبریز کا وہی کتا جسے چند لمحے پہلے میں نے بندھا ہوا چھوڑا تھا۔ میرے دماغ میں انگارے سے بھر گئے۔ یہ بستی، یہ گلی کوچے اور یہ لوگ مجھے راستہ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا۔ کتے کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکی ہوئی تھیں۔ اس کے نوکیلے دانت چمک رہے تھے۔ وہ بلا کی رفتار سے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس پر فائر کر دوں اور میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر فائر کیا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی۔ وہ مجھ پر جھپٹتے ہوئے کسی شرابی کی طرح جھوما اور پھر کھیت میں پلٹیاں کھاتا ہوا ساکت ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر پوری رفتار پکڑی۔ اب میرے اردگرد اونچی سبز فصل کا کھیت تھا، نیچے زمین ناہموار تھی۔ کئی دفعہ میں گرتے گرتے بچا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا میرے پیچھے مشتعل افراد ہیں۔ مجھے ان سے اپنا آپ بچانا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے یقیناً فارم ہاؤس کے لوگ ہی تھے۔ وہ پولیس کے سادہ پوش اہلکار ہو سکتے تھے اور فارم کے پرائیویٹ ملازم بھی۔ میں ان کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ چکا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید راہ میں آنے والے کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ ہلکا سا شور بھی مجھے سنائی دے رہا تھا۔

تب ایک بار پھر دو تین فائر ہوئے۔ اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ نہیں ہے۔ شاید کھیتوں میں میری جھلک دیکھی گئی تھی اور نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ میں بھی ایک دو فائر کروں۔ چاہے وہ ہوا میں ہی ہوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے دو ہوائی فائر کیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا فائدہ ہوا لیکن اتنا فائدہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ پیچھے آنے والے نڈر نہیں رہے ہوں گے اور انہوں نے اپنی رفتار بھی کچھ کم کر دی ہوگی۔

اچانک ایک مقام پر مجھے چھپنے کی بڑی محفوظ جگہ نظر آئی۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کا ڈھانچا تھا۔ یہ آدھا زمین میں دبا ہوا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کیا اور تیزی سے رخ پھیر کر اس ڈھانچے کے نیچے گھس گیا۔ یہ بڑا رسک والا فیصلہ تھا مگر ایسے موقعوں پر ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے

ہیں۔ اگر مجھے دیکھ لیا جاتا تو یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بھی ثابت ہوسکتی تھی۔

پستول ضرور میرے ہاتھ میں تھا لیکن مجھے پتا چل چکا تھا کہ اب اس میں صرف ایک گولی باقی ہے اور اس ایک گولی سے میں اپنا دفاع کرنے کے قابل ہرگز نہیں تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق میرے تعاقب میں آنے والوں کی تعداد دس اور پندرہ کے درمیان تھی اور میرا یہ اندازہ غلط نہیں نکلا۔ قریباً ایک منٹ بعد جو افراد شور مچاتے اور لاٹھیاں وغیرہ لہراتے چند فاصلے سے گزرے وہ دس پندرہ کے قریب ہی تھے۔ ان میں سے دو چار کے پاس یقیناً آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ ان میں سے شاید کسی ایک نے بھی ٹرالی کے خستہ حال ڈھانچے کی طرف دھیان نہیں دیا۔

بس ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا ایک فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ کسی نے بھاری بھرکم دیہاتی لہجے میں ایک موٹی سی گالی دی اور پکار کر بولا۔ ''کچھ لوگ دائیں طرف جاؤ، کچھ چھپڑ (جوہڑ) کی دوسری طرف دیکھو...''

جونہی وہ لوگ کچھ آگے نکلے میں ٹرالی کے ڈھانچے کے نیچے سے نکلا اور بائیں طرف والے کھیتوں میں گھس گیا۔ اب میں تیز بھاگنے کے بجائے چل رہا تھا۔ کسی وقت آٹھ دس قدم بھاگ بھی لیتا تھا۔ تسلی کے لیے میں نے ایس پی تبریز کا پستول پھر چیک کیا۔ چھوٹے سائز کے میگزین میں صرف ایک گولی تھی۔ یکایک میں چونک گیا۔ کھیت کے اندر مجھ سے دو تین میٹر کے فاصلے پر دو دیہاتی خواتین نظر آئیں۔ یہ درمیانی عمر کی عورتیں پاس پاس بیٹھی تھیں اور اس جگہ کو ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کر رہی تھیں۔ انہوں نے ڈری ڈری آوازیں نکال کر مجھے اپنی طرف آنے سے خبردار کیا۔ میں نے فوراً اپنا رخ بدل لیا اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ ایسا منظر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ ہوگیا تھا۔ قریباً آدھ فرلانگ دور ایک اونچے کھیت میں مجھے پھر اس سے ملتا جلتا سین دکھائی دیا۔ اس مرتبہ ایک ادھیڑ عمر شخص کو اپنی دھوتی سنبھال کر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''سوری چاچاجی۔'' میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اپنے کپڑے میں نے جھاڑ لیے تھے اور چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر میں نے اپنی کیچڑ آلود شلوار بھی اچھی طرح صاف کرلی۔ سامنے ہی کسی آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا رخ اس طرف پھیر لیا۔ یہ نیم پختہ بستی تھی۔ بہت سے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ اکثر گھروں پر پلاستر نظر نہیں آرہا تھا اور سرخ اینٹوں کا رنگ ہی گھروں کا رنگ تھا۔ میں ایک گلی میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ یہ بستی پار کرکے ہی کسی سڑک وغیرہ کے آثار نظر آسکتے تھے۔ اب دن کے قریباً نو بج چکے تھے۔ گلیوں میں چہل پہل تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ناشتے کی ایک دکان پر رش نظر آیا۔ یورپی ممالک میں علی الصباح ناشتا کرلیا جاتا ہے۔ پاکستان میں، میں نے دن بارہ بجے تک ناشتے کی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔

دفعتاً میں بری طرح ٹھٹکا۔ میں نے چند باوردی پولیس اہلکاروں کو دیکھا۔ وہ جیسے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ناشتے والی دکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں تیزی سے پلٹا اور ایک بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے شک گزرا کہ پولیس والوں نے مجھے دیکھا ہے۔ یہ موہوم شک تھا لیکن اسے یکسر بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مجھے تیس چالیس قدم کی دوری پر ایک گھر کی عقبی دیوار نظر آئی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ گلی بھی تقریباً خالی ہی نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھا پھر تیزی سے حرکت کی اور چھ فٹ اونچی دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ یہاں نرم زمین تھی اور چھوٹا سا باغیچہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر بے حرکت، پنجوں کے بل بیٹھا رہا اور ارد گرد کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے پاس ہی کسی کمرے میں ہارمونیم بج رہا ہو یا پھر ٹی وی پر ہارمونیم اور طبلے وغیرہ کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ اس گھر میں مکمل سکوت تھا بس چپس کے نیلے فرش پر ایک بلی دھوپ میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

میں اپنی جگہ چھوڑ کر پھول دار پودوں کے اندر سے نکلا اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ ایک ستون کی اوٹ میں کھڑے ہوکر دیکھا۔ ایک ہال نما کمرے کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ یہاں فرش پر چاندنی بچھی تھی۔ چند سازندے اپنے ساز وغیرہ درست کرنے میں مصروف تھے۔ اچانک مجھے عقب میں زنانہ قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ کہیں پر چھپنے کا وقت نہیں تھا۔ میں جلدی سے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ایک گوری چٹی صحت مند عورت چمک دار لباس پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرے اندیشے کے برخلاف وہ مجھے دیکھ کر گھبرائی نہیں، نہ ہی اس نے چلانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''نواب کے ڈیرے سے آئے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔

''نواب تو کہتا تھا آدھی رات تک پہنچ جاؤ گے۔''

''بس دیر ہوگئی۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

اس نے دوپٹے سے بے نیاز سر پر لگے چمکیلے کلپ کو چھوا اور بازاری انداز میں بولی۔ ''پر اس وقت تو ساری کڑیاں تھک ٹٹ کر سوئی ہوئی ہیں۔ تیرے ساتھ کوئی نہیں بیٹھے گی۔ دوپہر دو ڈھائی بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں کرلوں گا۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''پیسے کتنے خرچے گا؟'' وہ پھر بازاری انداز میں مسکرائی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے دانت نمایاں ہوگئے اور وہ پینتیس چالیس کے بجائے چالیس پینتالیس کی نظر آنے لگی۔

''پیسے کافی ہیں جی۔'' میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

اس نے مجھے بڑے دھیان سے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور گردن ٹیڑھی کر کے بولی۔ ''ویسے تو تم آدھے انگریز لگ رہے ہو۔ نواب کے ڈیرے پر کیسے پہنچ گئے؟ اور یہ پینڈو کپڑے۔''

''بس پہنچ گیا کسی طرح۔ نواب صاحب سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے ایک بار پھر گول مول جواب دیا۔ ''اور یہ کپڑے بس شوقیہ ہی پہنے ہوئے ہیں۔''

''اچھا چلو آؤ، اِدھر بیٹھو، چائے پانی تو پیو۔''

وہ میری رہنمائی کرتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔ اپنے حلیے اور چال ڈھال سے وہ واضح طور پر بازاری عورت ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چربی دار جسم اس کے لباس میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ اب تک میں یہ اندازہ اچھی طرح لگا چکا تھا کہ پولیس والوں سے بچتے بچاتے میں ایک بالا خانے جیسی جگہ پر آپہنچا ہوں۔

عورت نے مجھے ایک آرام دہ کمرے میں بٹھایا۔ یہاں الکحل کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔ دیوار پر ایک بڑی ایل سی ڈی لگی تھی اور وڈیو سسٹم بھی نظر آرہا تھا۔ ایک چھوٹی الماری کا پٹ عورت نے کھولا تو اس میں وھسکی اور رم وغیرہ کی چمکیلی بوتلیں پڑی نظر آئیں۔ یہ مکمل طور پر ایک عشرت کدہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں یہ نائیکا نما عورت مجھ سے نواب نامی شخص کے حوالے سے کوئی مزید سوال نہ کرے بہر حال خیریت گزری۔ اس نے ایل سی ڈی آن کردی اور بولی۔

''تمہارے لیے ناشتا وغیرہ بھجواتی ہوں۔ تم ٹی وی دیکھو، اتنی دیر میں کوئی لڑکی تیار ہوجائے گی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ کنپٹی پر آنے والی چوٹ کافی تکلیف دے رہی تھی۔ ہلکا سا زخم بھی تھا جو بالوں میں چھپ گیا تھا۔ ڈیٹول سے زخم صاف کیا اور باہر آگیا۔ بستر بڑا نرم اور آرام دہ تھا۔ میں نے ریشمی لحاف کمر تک اوڑھا اور نیم دراز ہوگیا۔ ٹی وی آن کیا اور مختلف نیوز چینل کا جائزہ لینے لگا۔ فی الحال کہیں پر اپنے بارے میں کوئی نیوز دکھائی نہیں دی۔ فقط ایک چینل پر آتشزدگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی دو اموات کی خبر آرہی تھی۔ یہ خبر پٹی کی صورت اسکرین کے نچلے حصے پر چل رہی تھی۔ میں چینل بدلنے ہی والا تھا کہ پٹی پر آنے والے دو فقرے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ فقرے کچھ اس طرح تھے۔

''معتبر ذرائع کے مطابق یہ بتایا جارہا ہے کہ گھر میں دھماکا خیز مواد تیار کیا جارہا تھا۔ دونوں تخریب کار شاہ زیب اور ولید اسی حویلی نما مکان میں قیام پذیر تھے۔''

''یا خدا... یہ کیا ہورہا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر سر پکڑلیا۔

جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کوئی بری بھلی بنیاد ہوتی ہے لیکن یہاں تو بلاتر دد رات کو دن اور سفید کو سیاہ کہا جارہا تھا۔ اتنے میں دروازے کی طرف آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے چینل تبدیل کردیا۔ اندر آنے والی ایک جواں سال لڑکی تھی۔ شکل وصورت معمولی تھی، لباس اور چال ڈھال سے گھر کی نوکرانی ہی لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جہازی سائز ٹرے تھی۔ ٹرے میں دکھائی دینے والا ناشتا بے حد دھانسو قسم کا تھا۔ انڈوں کا حلوہ، گاجر کا حلوہ جس پر پستے اور بادام کی پھبڑیاں تھیں۔ چھوٹے پائے کا سالن، دیسی گھی کا چوڑا چکلا پراٹھا، گرم دودھ کا نصف جگ اور اس کے علاوہ بھی کافی کچھ۔ اس نے ناشتا میز پر دور تک پھیلا دیا اور دانت نکال کر بولی۔ ''کوئی اور چیز چودھری صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''اس ناشتے کے بعد پرسوں تک تو شاید کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' پتا نہیں کہ اس نے میری بات سمجھی یا نہیں لیکن زور سے سر ہلا کر چلی گئی۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے اب قریباً 16 گھنٹے ہوچکے تھے لیکن ان 16 گھنٹوں میں، میں جس طرح کے حالات سے گزرا تھا انہوں نے میرے دماغ کو ہی ماؤف نہیں کیا تھا میری بھوک کا گلا بھی گھونٹ دیا تھا۔

میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے تھوڑا بہت کھایا اور کچھ ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ ریموٹ کنٹرول پر اے وی آئی کا بٹن دبایا تو ڈی وی ڈی آن ہوگیا۔ ایک نہایت نازیبا ڈانس کی وڈیو چلنے لگی اور اس کے فوراً بعد عریاں فلم شروع ہوگئی۔ پرلے درجے کی فحش فلم تھی، یہاں پر اسی قسم کی خرافات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے ایک انٹرٹینمنٹ چینل لگا دیا۔ پتا نہیں کیوں نیوز چینل دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اتنا جھوٹ تھا کہ دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔

کچھ دیر گزری اور پھر ایک بنی سنوری لڑکی چھم سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ''سلاماں لیکم چودھری صاحب۔'' اس نے بھی مجھے چودھری صاحب کہہ کر ہی مخاطب کیا شاید اس کی وجہ میرا لباس تھا۔

وہ آتے ہی بے تکلفی سے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا نام نیلی بتایا۔ اس کی نائیکا کا نام ترانہ بائی معلوم ہوا۔ میں نے کہا۔ ''نیلی... یہاں چھاپے شاپے والا چکر تو نہیں ہوتا؟''

''یہ ترانہ بائی کا ڈیرا ہے چودھری جی، کوئی مخول نہیں ہے۔ کسی پلسیے کی اتنی ہمت نہیں کہ ادھر پر مار سکے۔ آپ بے فکر ہوکر کھاؤ پیو۔''

میں نے کہا۔ ''پینے کو تو ظاہر ہے لال پری ہوگی لیکن کھلاؤ گی کیا؟''

''مجھے کھالونا جی اسی لیے تو حاضر ہوئی ہوں تمہارے سامنے۔'' وہ طوائفوں کے خاص انداز میں بولی۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ میک اپ کی تازہ تہ کے نیچے اس کے چہرے پر تھکاوٹ نظر آتی تھی۔ اسے نائیکا نے شاید اوور ٹائم کے لیے زبردستی جگایا تھا اور تیار کر کے یہاں بھیجا تھا۔ ویسے وہ زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی اس کے چہرے پر جیسے درج تھا ''بہ حالتِ مجبوری'' اس کے چہرے کی اس کیفیت پر نہ جانے کیوں مجھے ایک اور چہرہ یاد آگیا۔ ایک شریف زادی کا چہرہ۔ حاجی نذیر کی بیٹی کا چہرہ۔ وہ بھی تو حالتِ مجبوری میں تھی۔ شکیل داراب جیسے مگرمچھ نے عاشرہ نام کی اس خوش رنگ مچھلی کو اپنے جبڑوں میں دبوچ لیا تھا اور کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میری ساری بھاگ دوڑ بھی بے کار ہوگئی تھی۔ کچھ دیر اس بارے میں سوچنے کے بعد میں پھر موجودہ صورتِ حال کی طرف پلٹ آیا۔

میرے ذہن میں مسلسل کھلبلی مچی تھی۔ یہاں ہر طرف میری تلاش ہو رہی تھی۔ کسی بھی وقت مجھے ٹریس کیا جاسکتا تھا۔ کیا پتا کہ کسی چینل پر میری کوئی تصویر بھی دکھائی جا رہی ہوتی، یا زبانی ہی حلیے سے آگاہ کیا جا رہا ہوتا، ایسی صورت میں اس عشرت کدے کے مکینوں میں سے ہی کوئی مجھے پہچان سکتا تھا۔

میرے پاس اپنے دفاع کے لیے فقط ایک گولی تھی یا پھر ٹانگیں تھیں جن کے ذریعے میں یہاں سے راہِ فرار اختیار کرسکتا تھا۔ یہاں پر اپنا کردار نبھانے کے لیے میں نیلی کے کچھ قریب ہوگیا۔ اس کے بالوں سے انکھیلیاں کرتا رہا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام بھی کیا۔ اچانک نیلی کو اندازہ ہوگیا کہ میرے لباس کے نیچے کوئی ہتھیار موجود ہے۔ اس نے پستول کی چبھن محسوس کی اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے پستول کی سختی کو کپڑے کے اوپر سے ہی چھوتے ہوئے کہا۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔''

''کیوں؟''

''میں دشمنی دار آدمی ہوں۔ اپنی حفاظت کے لیے رکھنا پڑتا ہے۔''

اس نے پستول کو کپڑے کے اوپر سے ہی آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جی دار لوگ اچھے لگتے ہیں۔ جی دار اور ذرا کڑک۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آنکھیں کچھ نیم باز ہوگئیں۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تم شراب وغیرہ نہیں پیتے؟''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

''یہاں عام طور پر شرابی ہی آتے ہیں۔ یہ جھوٹ موٹ کے کڑک ہوتے ہیں اندر سے بالکل چلے ہوئے کارتوسوں کی طرح۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔

میں اس کی باتوں کے جواب میں ہنکارا بھرتا رہا۔ میرا دماغ تو کہیں اور الجھا ہوا تھا اور اتنی الجھنیں تھیں کہ اعصاب شل ہو رہے تھے۔ ہم ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ وہ کسی وقت نفسیاتی مریضہ جیسا رویہ دکھانے لگتی تھی۔ میں نے لیٹتے وقت پستول اپنے جسم سے علیحدہ کرنا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی۔ ''نہیں رہنے دو جی اسی طرح اچھا لگتا ہے۔'' وہ پستول کی چبھن کو انجوائے کر رہی تھی۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ اسی طرح مجھ سے لپٹی رہی... میں نے سارا وقت یورپ میں گزارا تھا۔ عمرِ عزیز کے قریباً چوبیس سال انہی رنگین گلی کوچوں میں غرقاب

ہوئے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ میں کوئی ایسا پارسا بھی نہیں تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں، میں اس نیلی نامی لڑکی سے قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بس اسے تھوڑا بہت مصروف رکھا اور وقت گزارتا رہا۔ مجھے شام کا اور اندھیرے کا انتظار تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ٹھکانا میرے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ایک بے ہودہ سی نیم عریاں فلم میں دلچسپی ظاہر کی اور ہم ایل سی ڈی پر وہ فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ مختصر دن کے ٹھٹھرے ہوئے سائے جلد ہی طویل ہونے لگے تھے۔ فلم اختتام پذیر ہوئے دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گھر کے کسی بیرونی دروازے پر کال بیل بجائی گئی اور ترانہ کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ اب گھر میں چہل پہل کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکیاں جاگ گئی تھیں۔ ان کے گھومنے پھرنے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کسی کمرے میں شاید رقص وغیرہ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔

نیلی ایک بار پھر بستر پر میرے ساتھ نیم دراز تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ طوائفیں بظاہر پُرجوش نظر آتی ہیں لیکن اندر سے ہوتی نہیں ہیں۔ نیلی کا معاملہ مختلف لگ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے میرا سیل نمبر بھی لیا تھا اور مس کال کر کے اپنا نمبر بھی مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کا پکا گاہک بننے جا رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ نیلی کے سیل فون پر میسج کی ٹون ہوئی ہے۔ سیل فون سرہانے کی طرف رکھا تھا۔ اس نے چور نظروں سے فون کی طرف دیکھا پھر میسج پڑھا۔ میسج پڑھنے کے بعد اس کی سرگرمی ایک دم ماند پڑ گئی۔ وہ جو مجھ سے چمٹی ہوئی تھی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کان لگا کر سنا، باہر سے کسی کے بھاری آواز میں بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ لہجہ تحکمانہ تھا۔ ''کہیں پولیس تو یہاں آنہیں دھمکی؟'' یہ سوال میرے ذہن میں کسی انگارے کی طرح دہک اٹھا۔

نیلی اب آئینے کے سامنے کھڑی اپنا لباس درست کر رہی تھی اور بال سمیٹ رہی تھی۔ اس کا سرخ اونی سوئٹر پاس ہی پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا باہر نکلنے سے پہلے وہ سوئٹر بھی پہنے گی۔ میں نے تھوڑی سی پھرتی دکھائی۔ نیلی کے سیل فون پر اپنا نمبر ری ڈائل کیا اور جلدی سے کال وصول بھی کر لی۔

نیلی کا فون میں نے اس کے سوئٹر کی جیب میں ڈال دیا۔

نیلی نے جلدی جلدی سے سوئٹر پہنا۔ اس کے بٹن لگائے اور دوپٹا گلے میں ڈالتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے فون کے ساتھ میری کال ملی ہوئی تھی۔

میں نے اپنا سیل فون کان سے لگا لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میری یہ احتیاط اتنی کامیاب رہے گی۔ پہلے نیلی کی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی رہی پھر کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ تب ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

''کہاں ہے وہ؟''

''کمرے میں ہی ہے۔'' نیلی نے ہکلا کر کہا۔ ''لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

مردانہ آواز کے بجائے نائیکا ترانہ بائی نے جواب دیا اس کی آواز قدرے مدھم تھی۔ وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولی۔ ''یہ وہی ہے... جس کی خبر صبح سے ٹی وی پر چل رہی ہے۔ بڑا خطرناک بندہ ہے۔'' ترانہ غالباً سرتاپا کانپ رہی تھی۔

مردانہ آواز نے پوچھا۔ ''ہتھیار ہے اس کے پاس؟''

''ج... جی ہاں ایک پستول ہے... قمیص کے نیچے لگایا ہوا ہے اس نے۔'' نیلی نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی چاقو وغیرہ؟''

''میرے خیال میں تو نہیں جی۔''

بات چیت جاری تھی لیکن میرے لیے اب مزید سنتے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں تیزی سے اٹھا، جوتے پہنے اور کھڑکی سے کود کر پچھلے صحن میں آ گیا۔ یہ وہی سائڈ تھی جہاں سے میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ باغیچے میں دو بلیاں آپس میں گتھم گتھا تھیں۔ میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا چھ فٹ اونچی چار دیواری تک پہنچا اور پلک جھپکتے میں اسے پار کر گیا۔ ایک موٹر سائیکل سوار گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے چھلانگ لگا کر دیوار سے اترتے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ایک دم بریک لگائے۔ اس کے عقب میں ایک ٹریکٹر آ رہا تھا۔ ٹریکٹر والے کو بھی یکایک بریک لگانا پڑے۔ موٹر سائیکل کو ہلکی سی ٹکر لگی اور موٹر سائیکل سوار لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ ٹریکٹر پر بیٹھے ہوئے دو افراد بھی لڑھک کر کچے پکے راستے پر آن گرے۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لپک کر سامنے والی گلی میں داخل ہو گیا۔ ایک خالی پلاٹ کے اندر سے گزرتے ہوئے میں ساتھ والی سڑک پر آ گیا۔ یہاں مجھے ایک

موٹر رکشا دکھائی دے گیا۔ میں نے اسے اشارہ دیا۔ دیہاتی لباس پہنے ہوئے رکشا ڈرائیور نے فوراً رکشا روک دیا۔ میں سوار ہوگیا۔ "کہاں جانا ہے جی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"چونگی تک جانا ہے۔" میں نے کہا۔

رکشا ڈرائیور نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ چونگی وہاں سے کافی دور تھی۔ بہر حال اس نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ کچھ فاصلے پر جاکر میں نے دیکھا۔ ایک پولیس موبائل ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی تیزی سے اس گھر کی طرف جارہی تھی جہاں سے میں نے ابھی راہِ فرار اختیار کی تھی۔

رکشا اپنے راستے پر اڑا جارہا تھا۔ میرے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے دیکھا یہ نیلی کا نمبر ہی تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔

ہم کھیتوں اور درختوں کے درمیان تنگ سڑک پر سفر کرتے قریباً چار پانچ کلومیٹر آگے آئے اور پھر بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ میرے ذہن میں منزل کا کوئی تعین نہیں تھا۔ فی الحال میں اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کوئی گمنام ہوٹل یا پھر رات بھر کھلا رہنے والا ریسٹورنٹ ہی میری جائے پناہ ہوسکتا تھا۔ اب اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی طویل رات میرے سامنے تھی اور بے شمار نادیدہ نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں لاہور میں داخل ہوکر انسانوں کے سمندر میں گم ہونے کے بارے میں سوچنے لگا مگر خطرات تو ہر جگہ موجود تھے۔ یہ روشنیوں کا شہر میرے لیے شہرِ ستم ثابت ہوسکتا تھا۔ عبداللہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

"شاہ زیب! یہ لوگ ولید کی طرح تمہیں بھی شوٹ کردیں گے۔ انہوں نے پورا پلان بنالیا ہے۔ تم چند دن کے لیے کہیں روپوش ہوجاؤ۔"

میں خطرات سے ڈرنے والا ہرگز نہیں تھا۔ مجھے میرے وعدے ڈرا رہے تھے۔ وہ وعدے جو میں نے پاکستان آنے سے پہلے اپنے آپ سے کیے تھے۔ میں اپنے وطنِ عزیز میں کسی اور روپ سے رہنا چاہتا تھا، کسی اور ڈھنگ سے جینا چاہتا تھا۔ میں خون اور بارود کی بو نہیں چاہتا تھا۔ میں روتی بلکتی آوازوں کو اپنی سماعت سے دور رکھنا چاہتا تھا، میں امن چاہتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو مانگتا تھا۔ حسین شاموں اور صبحوں کے رنگ دیکھنے کا خواہاں تھا۔ لیکن یہاں جو کچھ ہورہا تھا یہ بہت مایوس کن تھا۔ یہ تو میرے بدترین اندیشوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ جرمِ بے گناہی کی پاداش میں مجھے دہشت گرد قرار دیا جارہا تھا اور قیصر چودھری جیسے پولیس والے میرے لیے موت کے فرشتوں کا روپ دھار گئے تھے۔

اتنی جلدی اتنا کچھ ہوجائے گا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی، میں نے نئی امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ وطنِ عزیز کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔

میرا دل چاہا، میں لاہور کے کسی بارونق چوک میں پہنچ کر رکشا رکواؤں۔ کسی بلند جگہ پر کھڑا ہوجاؤں اور پکار کر کہوں۔ "اے میرے شہر کے لوگو! میرے ہم وطنو! میں بڑی دور سے بڑی آسیں لے کر آیا ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں، انہی گلیوں میں زندگی کے دکھ سکھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سرزمین پر اپنا خون پسینا گرا کر یہاں خوشیوں کے پھول کھلانے کی خواہش رکھتا ہوں... لیکن دیکھو میرے پیارو، کچھ لوگوں نے آتے ساتھ ہی مجھے دہشت گرد بنادیا ہے۔ میری جان لینے کے درپے ہوگئے ہیں۔ مجھے کہیں پناہ نہیں مل رہی۔ مجھے تمہاری قسم میں بے گناہ ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں، میری مدد کرو۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں کھودوں، اور تم مجھے کھودو میری مدد کرو۔"

لیکن یہ سب کچھ خیال ہی تھا۔ میں جانتا تھا میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا جس کو دیکھ کر لوگ رک جاتے اور اس کی آواز کے لیے ہمہ تن گوش ہوجاتے۔ ویسے اپنے طور پر تو میں بھی ایک معروف شخص تھا مگر یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور جانتا بھی تو پہچان نہیں سکتا تھا۔ رکشا کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر وہ قریباً رک گیا۔ سامنے دور تک ٹریفک جام تھا۔ دور تک گاڑیوں کی ٹیل لائٹس نظر آرہی تھیں۔ انہی گاڑیوں کی طویل قطاروں میں کہیں کوئی ایمبولینس بھی پھنسی ہوئی تھی اور بے بسی سے ہوٹر بجاتی چلی جارہی تھی۔ باہر کے ممالک میں ایسے مناظر کا تصور بھی محال تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ باہر نکل کر کھڑا ہوگیا اور دیگر ڈرائیوروں سے بات کرنے لگا۔ اس نے آکر مجھے بتایا۔ "کوئی حکومتی بندہ گزر رہا ہے جی یہاں سے... وہ کیا کہتے ہیں وی وی پی موومنٹ۔"

"وی وی پی نہیں... وی آئی پی۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں جی وہی۔ وارا ب فیملی کا کوئی پہنچنے خاں ہوگا۔"

اس نے جلے ہوئے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "بہتر تو یہی ہے کہ آپ پیدل آگے نکل جائیں اور پرلے کنارے سے کوئی اور سواری ڈھونڈ کر بیٹھ جائیں۔ یہ معاملہ اتنی جلدی ٹھیک ہونے والا نہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے کرایہ دیا اور پیدل

ہی چل پڑا۔ لوگ ایمبولینس میں سے ایک بے ہوش بچے کو نکال کر ہاتھوں ہاتھ آگے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی حالت نازک لگتی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر سڑک سے اتر گیا اور درختوں کے درمیان پیدل ہی چلنے لگا۔ میرا رخ لاہور کی طرف ہی تھا۔ میرا لباس سوئٹر کے بغیر تھا۔ سرد ہوا جسم کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کنپٹی کی چوٹ بھی تکلیف دے رہی تھی۔ چلتے چلتے میں نے موبائل پھر آن کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ عبداللہ کا نمبر ملایا۔ دیر تک بیل جاتی رہی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ مجھے لگا جیسے عبداللہ جیسا شخص بھی اس وقت مجھ سے کنی کترا رہا ہے۔

میں سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے درختوں میں چل رہا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کسی کھیت کے اندر سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ جونہی میں شیشم کے ایک جھنڈ میں سے آگے نکلا میری رگوں میں خون جم سا گیا۔ بالکل غیر متوقع طور پر بلکہ حادثاتی طور پر میں ایک پولیس ناکے کے رُوبرو پہنچ گیا تھا۔ یہ تین اہل کار تھے اور ایک نیم پختہ راستے کو روک کر کھڑے تھے۔ سرکاری گاڑی اس طرح کھڑی کی گئی تھی کہ قریباً آدھا راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ دو باوردی افراد مسلح نظر آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی۔ میں نے جلدی سے واپس پلٹ جانا چاہا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

''کون ہے؟'' ایک اہلکار نے گرج کر کہا۔

اب بھاگنا خطرناک تھا۔ میں دھیمے قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ لوگ چوکس ہو گئے۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ عین میرے چہرے پر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں پہچان لیا گیا ہوں۔

''ہاتھ کھڑے کرو، سیدھے اوپر کھڑے کرو۔'' گرج دار آواز نے ایک بار پھر تحکم سے کہا۔

میں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ دو رائفلیں میری طرف سیدھی ہو چکی تھیں۔ ایک شخص تلاشی لینے کے لیے میری طرف بڑھا۔ مجھے اس کی غفلت پر حیرانی ہوئی۔ شاید ایسے کاموں کے لیے اس کی پراپر ٹریننگ ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے خود مجھے مزاحمت کا آسان موقع فراہم کیا۔ میرے جیسے شخص کے لیے یہ بہت آسان ثابت ہوا کہ میں تلاشی کے لیے آگے بڑھنے والے کو ڈھال بنالوں اور اس شخص پر دھکیل دوں جس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ یہ بڑا زوردار دھکا تھا۔ دونوں اڑتے ہوئے کچی زمین پر گرے۔ دوسری رائفل میری طرف پوری طرح سیدھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رائفل کا بیرل پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور گولی کہیں تاریک فضا میں گم ہو گئی۔ میری ٹانگ کی شدید ضرب مدِمقابل کی گردن کے اس حصے پر لگی جو میری تربیت کے مطابق ریڑھ کی ہڈی کا مرکز کہلاتا ہے اور ایک توانا بندے کو بھی ایک تہائی سیکنڈ کے اندر اندر معطل کر دیتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ یہ پولیس اہلکار کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیم پختہ راستے پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

اوپر نیچے گرنے والے دونوں اہلکار اب کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دونوں عام پولیس والوں کے برعکس چست جسموں کے مالک تھے۔ رائفل بردار کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی تھی۔ وہ رائفل کی طرف لپکا تو میں نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایس پی تبریز کا پستول نکال کر اس کی ران میں گولی ماری۔ وہ وہیں تڑپ کر گر گیا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ یہ پستول کی آخری گولی تھی جو میں نے استعمال کر لی تھی۔ دوسرا اہلکار جست لگا کر میری طرف آیا اور گالیاں بکتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ان پولیس والوں سے اتنی پھرتی کی اور ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ اسپیشل برانچ کے کمانڈوز وغیرہ ہیں۔ میرے اور اس توانا اہلکار کے درمیان تقریباً ایک منٹ تک شدید لڑائی ہوئی۔ بے شک مدِمقابل لڑائی بھڑائی کے فن میں غیر معمولی طور پر طاق تھا لیکن آج اس سرد تاریک رات میں شیشم کے ان درختوں تلے اس کا پالا ایک چیمپئن سے پڑا تھا۔ میں نے اسے بچی تلی کارگر چوٹیں لگائیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے ایک دو ہڈیاں تڑوا بیٹھتا ایک چوتھا شخص سامنے آیا۔ یہ شاید انسپکٹر تھا۔ اس نے اہلکار کی گری ہوئی رائفل اٹھا کر مجھ پر سیدھی کر لی اور دھاڑا۔ ''بس ختم کرو یہ تماشا نہیں تو گولی آ رہی ہے۔''

اس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں نظرانداز نہ کر سکا۔ میں نے خالی پستول پھینک دیا اور غور سے اس انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور ٹھوڑی کافی بڑی تھی۔ آنکھوں میں عقابی چمک نظر آتی تھی۔ شاید اس ساری دھینگا مشتی کے دوران میں وہ پولیس موبائل کے اندر ہی موجود رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے میرے سر کو نشانہ بنا رکھا تھا اور کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔

وہ پاٹ دار آواز میں اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''فاروق کو گاڑی میں ڈالو... واحد کو بھی سہارا دے کر بٹھاؤ اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ گاڑی اسٹارٹ کرو۔''

ماتحت اہلکار نے انسپکٹر کی ہدایات پر عمل کیا۔ پہلے

بے ہوش ساتھی کو پولیس موبائل کے اندر پہنچایا پھر زخمی ران والے کو سہارا دے کر موبائل کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ تب اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی دراز قد انسپکٹر نے مجھے مسلسل گن پوائنٹ پر رکھا اور گاڑی کی۔ درمیانی نشست پر بٹھا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے غافل نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت اس پولیس پارٹی نے صرف ایک غلطی کے سوا کوئی غلطی نہیں کی تھی اور یہ وہی غلطی تھی جب فاروق نامی اہلکار میری تلاشی لینے کے لیے بے پروائی سے میرے قریب آ گیا تھا۔

انسپکٹر نے رائفل کی نال میرے سر سے لگائی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ یہی وقت تھا جب کچھ فاصلے سے کچھ مزید گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ درختوں کے اندر سے ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کم از کم دو گاڑیاں ہیں جو ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ شاید یہ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں کیونکہ ان کی آوازیں سنائی دیتے ہی پولیس پارٹی جلدی میں نظر آنے لگی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میں بھی اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ مجھے ڈر صرف اس وقت تک تھا جب ابھی ایکشن شروع نہیں ہوا تھا۔ اب چونکہ مجھے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور کر دیا گیا تھا، میرے اندر کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں اور میری رگوں میں لہو کی گردش رفتار پکڑتی جا رہی تھی۔ جونہی پولیس کی گاڑی ایک موڑ پر مڑی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھا ہوا انسپکٹر ذرا ان بیلنس ہو کر مجھ سے پیچھے ہٹا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے گاڑی سے نیچے گرا۔ ہم دونوں نے کئی پلٹیاں کھائیں تاہم انسپکٹر نے اپنے حواس بحال رکھے اور مسلسل مجھ سے چمٹا رہا۔ رائفل بھی بدستور اس کے ہاتھ میں رہی۔ جب ہم ساکت ہوئے تو رائفل کی نال مسلسل میری گردن سے چھو رہی تھی۔ میں آخری بار کہتا ہوں گولی چلا دوں گا۔'' انسپکٹر نے خوفناک لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس موقع پر انسپکٹر کی دھمکی کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔ ہم دونوں درختوں کے درمیان لمبی لمبی نوکیلی گھاس (داب) میں گرے تھے۔

پولیس جیپ ایک جھٹکے سے آہستہ ہوئی لیکن رکی نہیں۔ شاید اب ان کے لیے رکنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ گاڑیاں بالکل قریب پہنچ چکی تھیں جن کو دیکھ کر پولیس پارٹی کو پسوڑی پڑی تھی۔

مجھے اور انسپکٹر کو ہمارے حال پر چھوڑ کر پولیس موبائل تیزی سے آگے نکل گئی۔ ہم دونوں وہاں پانی اور کیچڑ میں پڑے رہے۔ بالکل ساکت اور بے حرکت۔ یہ درحقیقت ایک جوہڑ تھا۔ ہم پھسلتے ہوئے قریباً کمر تک سرد کیچڑ میں ڈوب گئے۔ چند سیکنڈ بعد شور مچاتی ہوئی گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کوئی سو میٹر دور اس جگہ پر رکی جہاں میں نے واحد کی ران میں گولی ماری تھی اور اس کا خون نیم پختہ راستے پر گرا تھا۔ دوسری گاڑی تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی یقیناً وہ اس گاڑی کے پیچھے گئی تھی جس میں سے انسپکٹر اور میں گرے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر ازحد حیرت ہوئی کہ موقع پر پہنچنے والی یہ دونوں گاڑیاں بھی پولیس کی تھیں۔ ان میں مسلح نفری بھری ہوئی تھی۔ ان پولیس والوں کو دیکھنے کے باوجود انسپکٹر میرے ساتھ جوہڑ کے اندر چھپا رہا۔ اس کی چھوٹی نال کی رائفل بدستور میرے سر سے لگی ہوئی تھی۔

وہ میرے کان میں پھنکارا۔ ''خاموش رہنا، آواز نکالنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔''

''یہ تو تمہارے پیٹی بھائی ہیں۔ ان سے کس چیز کا پردہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا، چپ رہو۔'' اس نے پھر زہریلی سرگوشی کی۔

اچانک ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جن پولیس والوں سے میرا ٹاکرا ہوا ہے وہ اصلی نہیں ہیں۔ اصلی پولیس والے یہ ہیں جو اب آئے ہیں۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آنے لگی کہ نقلی پولیس والوں کو فرار کیوں ہونا پڑا ہے۔ شاید اس کا سبب وہ دو فائر تھے جو کچھ دیر پہلے یہاں ہوئے تھے۔ ان فائروں کی آواز نے ہی غالباً پولیس والوں کو یہاں موقع کی طرف کھینچا تھا۔

دراز قد انسپکٹر نے میری گردن اپنے مضبوط بازو کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور رائفل کا بیرل میری کنپٹی میں گھسا رکھا تھا۔ میں چاہتا تو اس صورتِ حال میں بھی مزاحمت کا کوئی طریقہ ڈھونڈ سکتا تھا لیکن اس سلسلے میں مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے رائفل بردار سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر صبر کرو۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔''

اصلی پولیس والے اب اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے جہاں فائرنگ ہوئی اور خون گرا تھا۔ اس دوران میں پولیس کی ایک سفید موٹر سائیکل بھی موقع پر پہنچ گئی۔ اس پر دد

مسلح اہلکار سوار تھے۔ یہ سب لوگ ٹارچوں کی مدد سے اِدھر اُدھر روشنی پھینکتے رہے۔ ایک مرتبہ ٹارچ کا ایک دائرہ ہمارے قریب سے بھی گزرا بہرحال ہم محفوظ رہے۔

وہ آپس میں باتیں بھی کررہے تھے جو ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ فائرنگ اور خون کے سلسلے میں مختلف قیاس لگا رہے تھے۔

''یہ گولی کا ایک خول ملا ہے سر جی۔'' کسی اہلکار نے اپنے افسر سے کہا۔

''اور یہ دیکھیں جی... یہ دو خالی بٹوے پڑے ہیں یہاں۔'' ایک دوسرے اہلکار نے اپنے افسر کو اطلاع دی۔

''لگتا ہے کچھ بدمعاشوں نے لوٹ مار کی ہے یہاں۔'' افسر نے اپنے فقرے میں ایک موٹی گالی دیتے ہوئے کہا۔

اب صورتِ حال کچھ تو میری سمجھ میں بھی آنے لگی تھی۔ ناروے میں قیام کے دوران میں، میں نے ایک پاکستانی اخبار میں پڑھا تھا کہ پولیس کی وردی پہن کر وارداتیں کرنے کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔ جرائم پیشہ گروہ اس طرح جعلی ناکے لگاتے ہیں اور راہگیروں کو قیمتی اشیا سے محروم کرتے ہیں۔ شاید کچھ دیر پہلے تک یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ میں اتفاقاً یہاں پہنچ گیا تھا اور جعلی پولیس والوں سے میرا تصادم ہوگیا تھا۔ اب میرے لیے دونوں طرف ہی شدید خطرہ تھا۔ میں اصل پولیس والوں کے ہتھے چڑھتا تو عین ممکن تھا وہ مجھے پولیس مقابلے میں مار ڈالتے۔ دوسری طرف میں ان نقلی پولیس والوں کی دشمنی بھی مول لے چکا تھا۔ ان کا ایک بندہ میری گولی سے شدید زخمی ہوا تھا۔ دوسرا بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے گیا تھا۔ بہرحال اصلی پولیس والوں کی طرف سے خطرہ نسبتاً زیادہ شدید تھا۔

دو چار منٹ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد پولیس کی گاڑی نفری سمیت آگے روانہ ہوگئی۔ موٹر سائیکل پر سوار پولیس والے بھی چار پانچ منٹ وہاں رکنے کے بعد آگے نکل گئے۔ ٹیکنیکل طور پر یہ بھی غلط تھا۔ کم از کم دو تین اہلکاروں کو یہاں ضرور موجود رہنا چاہیے تھا۔ جعلی انسپکٹر کے لیے یہاں سے نکلنے کے لیے یہ موقع بڑا مناسب تھا۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر رکھے رکھے جوہڑ سے باہر لے آیا۔ سخت سردی میں جیسے نچلا دھڑ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے کپڑے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے اور جسم میں ایک طرح کی کپکپی پیدا کر رہے تھے۔

اب ہماری آنکھیں اندھیرے میں اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ دراز قد شخص نے مجھے سرتاپا گھورا اور بولا۔ ''تم نے گولی چلا کر بڑا غلط کیا ہے لیکن لگتے اپنے ہی قبیلے کے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہارا قبیلہ... پولیس کا نہیں ہے؟''

''نہیں ہے... اور میرے خیال میں اب تک تم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہو۔'' وہ اب نارمل لہجے میں بول رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم دونوں کی ایک ہی چاہت ہونی چاہیے کہ کسی طرح نکلا جائے یہاں سے۔'' اس نے کہا۔ رائفل کا رخ بدستور میری طرف تھا لیکن اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری طرف سے بہت زیادہ فکرمند یا چوکس نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اس کے لہجے کے نیچے کہیں دوستی کی لہر سی محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر سرتاپا گھور کر بولا۔ ''مجھے پچانوے فی صد یقین ہوگیا ہے کہ تم پولیس سے بھاگے ہوئے ہو۔''

''تم بھی پولیس سے بھاگے ہوئے ہو؟''

''چلو ایسا ہی سمجھ لو۔''

''کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''کر سکتے ہیں... اور اگر کہو تو میں اپنی یہ رائفل بھی کندھے سے لٹکا سکتا ہوں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم پھر مارا ماری پر نہیں اتر آؤ گے؟'' اس کے لہجے میں طیش کی جگہ اب ایک طرح کی اپنائیت نے لے لی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر ہم ایک ہی گاڑی کے سوار ہیں تو پھر ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار بھی کرنا چاہیے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

یقیناً وہ ایک باہمت اور زیرک شخص تھا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے رائفل کی نال میری گردن سے ہٹالی۔

ہم گھنے درختوں میں چلتے پہلو بہ پہلو آگے بڑھنے لگے۔ سرد ہوا ہمارے جسموں کو کاٹ رہی تھی۔ جوتوں میں بھی کیچڑ بھر گئی تھی اور چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دراز قد شخص کی حرکات و سکنات میں کسی شکاری جانور کی سی چوکسی اور تیزی ہے۔ اندھیرے میں اس کی نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ اب میری یہ حیرت بھی یقیناً دور ہوگئی تھی کہ کچھ دیر پہلے میں جن پولیس والوں سے لڑا تھا وہ اتنے پھرتیلے اور جی دار کیوں تھے۔ وہ پولیس والے تھے ہی نہیں۔ وہ اس دراز قد بدمعاش کے ساتھی تھے۔ دراز قد شخص چلتے چلتے بار بار اپنے سیل فون سے بھی

چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا مگر بھیگ جانے کی وجہ سے سیل فون کام کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ جلد ہی ہمیں اینٹوں کے ایک بھٹے کے آثار دکھائی دیے۔ یہاں بالکل ویرانی تھی، کہیں ہلکی سی روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم بھٹے سے دھواں نکل رہا تھا اور قرب و جوار کی فضا میں ایک خوشگوار حرارت کا احساس بھی ہوتا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ دراز قد شخص اس جگہ سے ناواقف نہیں ہے۔ ہم دونوں بڑی احتیاط سے چلتے بھٹے کی عقبی سمت میں آ گئے۔ یہاں ایک جگہ اینٹوں کے حصار میں تھوڑے سے ادھ بجھے انگارے نظر آ رہے تھے۔ شاید شام کے وقت یہاں آگ جلائی گئی تھی اور دو چار مزدوروں نے بیٹھ کر گپ شپ کی تھی۔ سگریٹوں کے ٹکڑے اور چائے کی ایک ٹوٹی ہوئی پیالی بھی دکھائی دی۔ فی الحال یہ جگہ بالکل سنسان تھی۔

ہم انگاروں کے قریب بیٹھ گئے۔ قدرے راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جوتے اتار کر ان میں سے کیچڑ نکالی۔ دراز قد شخص نے مجھے اپنا نام داؤد بتایا۔ میں نے اپنا نام اعجاز احمد بتایا۔ اب پتا نہیں کہ اعجاز کی طرح داؤد بھی اصلی تھا یا نہیں۔ داؤد نہایت مضبوط کاٹھی کا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ اس کا چہرہ کافی لمبا اور ٹھوڑی آگے کی طرف نکلی ہوئی اور چوڑی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ نیم تاریکی میں بھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عقابی چمک نمایاں نظر آتی تھی۔

''داؤد صاحب کس کو فون کرنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ایسا جو ہمیں یہاں سے نکال سکے۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تمہارے پاس ہے فون؟''

میں نے دو سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرا سیل فون بھیگنے سے محفوظ رہا تھا اور ورکنگ پوزیشن میں تھا۔ داؤد نامی اس شخص نے ایک نمبر پریس کیا اور کچھ فاصلے پر جا کر مدھم لہجے میں کسی سے بات کرنے لگا۔ رائفل مسلسل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری طرف سے بالکل غافل بھی نہیں تھا۔ یہ بھی ویسی ہی پوزیشن تھی جو کل صبح ایس پی تبریز کے حوالے سے پیش آئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کچھ فاصلے پر جا کر فون کرنے میں مصروف ہو گیا تھا اور مجھے شک ہو گیا تھا کہ وہ مجھے گرفتار کروانا چاہ رہا تھا بعد ازاں یہ شک بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

بہر حال رسک کے بغیر تو کچھ نہیں ہو سکتا اور مجھے داؤد نامی اس شخص کے حوالے سے رسک لینا ہی تھا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ واپس آ گیا اور فون میری طرف بڑھا دیا۔

''کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس چاروں طرف موجود ہے۔ کئی جگہ ناکے لگے ہیں اور گشت بھی ہو رہی ہے۔ وہ یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔''

''کہاں جائیں گے ہم؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ذرا غصے سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''فی الحال تو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔''

''اور اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟''

''تو پھر بھاڑ میں جاؤ۔ یہ پولیس والے تمہیں مردہ کتے کی طرح گھسیٹ کر یہاں سے لے جائیں گے۔''

ابھی داؤد کا فقرہ ختم ہی ہوا تھا کہ دو تین فرلانگ کے فاصلے پر پختہ سڑک کی جانب پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ وہ بڑی تیزی سے کسی سمت جا رہی تھیں۔ داؤد نے کہا۔ ''یہ سارا علاقہ پولیس کے گھیرے میں ہے شاید کوئی اور واردات بھی ہوئی ہے یہاں جس کی وجہ سے ہائی الرٹ ہے۔''

ہم ادھ بجھے انگاروں کے پاس دبکے بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ داؤد کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زبردست مردم شناس بندہ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے جس طرح اس کے ساتھیوں کی درگت بنائی تھی اس نے بھی اسے کافی متاثر کیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس کے دو بندے زخمی ہوئے تھے۔ وہ مجھے قدر کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور شاید دوستانہ تعلقات بھی چاہ رہا تھا۔ بہر حال ابھی اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ لاہور میں داؤد کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہے جہاں وقتی طور پر مجھے تسلی بخش پناہ مل سکتی ہے۔

کچھ دیر بعد میرے سیل فون کی بیل پھر بج اٹھی۔ میں نے سوچا شاید پولیس والوں کی مدد کرنے کے لیے نیلی نے پھر فون کیا ہے مگر یہ کوئی اور نمبر تھا۔ داؤد نے گردن لمبی کر کے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بولا۔ ''یہ میرا ہی فون ہے۔''

میں نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک بار پھر رائفل سمیت مجھ سے کچھ فاصلے پر چلا گیا اور مدھم آواز میں باتیں کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو کچھ ریلیکس دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرت بھی ہوئی کہ رائفل اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ کندھے سے جھول رہی تھی۔ وہ میرے قریب ہی ایک ڈبل اینٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تمہاری

قسمت نے ساتھ دیا ہے۔ بچ بچا ہو گیا ہے۔ داحد کی مرہم پٹی ہو گئی ہے۔ گولی اس کے پٹ (ران) کو چھید کر نکل گئی تھی۔ فاروق بھی ہوش میں آ گیا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو بڑا مسئلہ ہو جاتا تھا۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ میں نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا تھا۔ اگر میں اس وقت واحد نامی اس بندے پر گولی نہ چلاتا تو وہ یقیناً رائفل اٹھا کر مجھ پر گولی چلا دیتا۔

چند لمحے بعد میں نے پوچھا۔ ''ہماری مدد کو کوئی آ رہا ہے یا نہیں؟''

''آ رہا ہے... بالکل آ رہا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ کتنا بڑا کام ہوگا اگر آج رات ہم یہاں سے بچ بچا کر نکل گئے۔ یہ سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔''

ایک بار پھر کہیں کافی فاصلے پر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ شاید تلاشی آپریشن کے دوران میں کوئی چور اچکا پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ داؤد نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ اسی طرح اور گزرے پھر مجھے انجن کی مدھم گھرر گھرر سنائی دی تاہم لائٹ کہیں نظر نہیں آئی۔

داؤد الرٹ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے جھارا آ گیا ہے۔''

اس نے رائفل پھر ہاتھ میں لے لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد انجن کی آواز واضح ہو گئی اور پھر گاڑی کا مدھم سا ہیولا نظر آیا۔ وہ بڑی سست روی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا یہ شہ زور لوڈر تھا اور اس پر دودھ کے برتن لدے ہوئے تھے۔ لوڈر ہم سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں اور داؤد احتیاط سے آگے بڑھے۔

قریب پہنچنے کے بعد داؤد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا جھارا؟''

''نہیں بھا جی۔'' جھارے کی آواز آئی اور پھر وہ چھلانگ لگا کر لوڈر سے اتر آیا۔

میں اسے دیکھ کر دنگ ہوا۔ ڈنمارک میں رہنے کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ جھارا ایک طاقتور پاکستانی پہلوان کا نام تھا جس نے جاپانی پہلوان انوکی کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ میرے ذہن میں جھارے کا تصور ایک تیم شحیم شخص کا تھا لیکن جو شخص پھدک کر لوڈر میں سے برآمد ہوا وہ خاصا دبلا پتلا بلکہ مخنی تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہمارے لیے لوڈر کا عقبی راستہ کھولا۔ یہاں مضبوط پلاسٹک کے بہت سے نیلے ڈرم نظر آ رہے تھے۔ ان ڈرموں کے درمیان بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی خالی جگہ بنائی گئی تھی۔ ہم سمٹ سمٹا کر وہاں بیٹھ گئے۔ جھارے نے اوپر ایک میلی سی ترپال ڈال دی اور ترپال کے اوپر چارے کے تین چار گٹھے رکھ دیے پھر لوڈر ایک جھٹکے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

داؤد نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں سے بچ کر نکلنا سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔ اگلے آدھ گھنٹے میں ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا۔ ایک جگہ تو دو پولیس اہلکار لوڈر کے اوپر بھی چڑھ آئے اور دودھ کے وزنی ڈرموں کو اِدھر اُدھر کیا۔ اس دوران میں ہم بالکل دم سادھے بیٹھے رہے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم لاہور شہر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ ٹریفک کا شور کافی بڑھ گیا تھا اور اس میں موٹر سائیکلز اور رکشاؤں کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ دودھ کے ڈرموں میں غالباً برف وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ وہ یخ بستہ ہو رہے تھے اور ہمارے بھیگے ہوئے کپڑوں کو مزید ٹھنڈا کر رہے تھے۔

قریباً پندرہ منٹ مزید گزرے اور پھر لوڈر ایک خاموش جگہ رک گیا۔ داؤد نے ترپال اٹھائی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک بڑا گیراج تھا۔ یہاں چار پانچ گاڑیاں آسانی سے کھڑی ہو سکتی تھیں۔ گیراج کے تین شٹر تھے اور وہ بند تھے۔ یہاں آوازیں گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہم نیچے اترے۔ داؤد نے کانگڑی پہلوان جھارے کے ساتھ کچھ دیر کھسر پھسر کی۔ تب ایک دروازے سے گزر کر ہم... چند سیڑھیاں اترے اور ایک طویل راہداری میں داخل ہو گئے۔ راہداری کا اختتام ایک بڑے سلائڈنگ دروازے پر ہوا۔ جھارے نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لمبوترا کمرا نظر آیا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں محسوس ہوا کہ ہم کسی بارونق جگہ پر داخل ہونے والے ہیں۔ تب ہم ایک دروازے میں سے گزرے اور وہ بارونق جگہ ہمارے سامنے آ گئی۔ میں دنگ رہ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اس میں ایک دو جگہوں کے سوا کوئی ستون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں درجنوں مرد و زن موجود تھے۔ رات میں دن کا سماں نظر آتا تھا۔ ہال کے چاروں جانب

دروازے نظر آرہے تھے۔ یہ رہائشی کمرے تھے۔ ایک طرف ریسٹورنٹ نما جگہ تھی۔ وہاں میزوں کے گرد نیم عریاں لڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ بہرحال اکثریت مردوں کی تھی جو سگریٹ پی رہے تھے اور شراب نوشی کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مجھے شریف صورت نظر نہیں آیا۔ کرخت چہرے، بے ڈھنگے لباس، جھگڑالو آوازیں، یہاں بلیئرڈ کی دو تین میز اور جوئے کی چند مشینیں بھی نظر آئیں۔ دو گروہ کسی طرح کی نعرہ بازی میں مصروف تھے۔ داؤد کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ کئی افراد نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر داؤد کو سلام کیا اور اس کے کیچڑ آلود کپڑوں کو حیرت سے دیکھا۔ جھارے کے ساتھ چلتے ہم فوراً ہی ایک آرام دہ اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری جگہ ایک وسیع بیسمنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چھت پر بہت سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

روشنی میں، میں نے داؤد کو ایک بار پھر سرتاپا گھورا۔ وہ واقعی ایک دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ انسپکٹر کی وردی بالکل اس کے ناپ کی تھی اور کیچڑ آلود ہونے کے باوجود اس کے توانا جسم پر جچ رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر فریش ہو جاؤ پھر بات کریں گے شاہ زیب۔'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں دنگ رہ گیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ''حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے شک تو پہلے سے تھا لیکن لوڈر میں سوار ہونے سے پہلے پہلے مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم ہی وہ جناب دہشت گرد صاحب ہو جس کے بارے میں میڈیا پر نیوز چل رہی ہے۔''

میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور داؤد سے پوچھا۔ ''کیا میرے چہرے پر کچھ لکھا ہوا ہے؟''

وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ''یہی سمجھ لو کہ لکھا ہوا ہے۔ جھارا بلا کا چہرہ شناس ہے، ٹی وی پر تمہاری کوئی تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ وہاں بھٹے پر لوڈر کے نیچے ہی جھارے نے تمہیں پہچان لیا تھا۔''

میں نے فی الحال اس بارے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ داؤد نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا کمرا ہے۔'' پھر اس نے پکارنے والے انداز میں کہا۔ ''روبی۔۔۔ اِدھر آؤ۔''

ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک خوش شکل لڑکی چھم سے اندر آگئی، وہ بالکل نوخیز تھی بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہو گی۔ وہ چست پتلون اور ہاف سلیو شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ موسم کے لحاظ سے یہ ناکافی لباس تھا لیکن یہ ساری جگہ چونکہ سینٹرلی گرم تھی اس لیے لباس کا کوئی ایشو نہیں تھا اس لیے کہیں لباس تھا اور کہیں نہیں تھا۔

روبی نام کی اس نوعمر لڑکی نے بڑی ادا سے اپنی گردن ہلائی اور بولی۔ ''آئیں جناب! میں آپ کو واش روم دکھاؤں۔''

چند منٹ بعد میں ایک لگژری واش روم میں موجود تھا اور نیم گرم پانی سے غسل کر رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹا پہلے تک میں نے ایسے عیش و آرام کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وسیع و عریض ہال کے اندر سے نعرہ بازی کی مدھم آوازیں واش روم کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ چھت کی طرف سے بھی چلنے پھرنے اور گاہے بگاہے میزیں وغیرہ گھسیٹنے کی آوازیں آتی تھیں۔

مجھے نہایت صاف ستھرا لباس فراہم کر دیا گیا تھا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سرخ جرسی پر مشتمل تھا۔ اب جسمانی طور پر مجھے کنپٹی کی چوٹ کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بہرحال ذہنی اذیت بے پناہ تھی اور اس اذیت کا تعلق ان اندوہناک واقعات سے تھا جو مراد پور میں پیش آئے تھے۔

میں باہر نکلا تو روبی بڑی خوش دلی سے میرے استقبال کے لیے موجود تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''بھاؤ جی سے آپ کی ملاقات تو اب سویرے ہی ہو سکے گی۔ آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گے؟''

''نہیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اگر ہو سکے تو ایک کپ چائے لا دو۔''

''جو حکم جی۔'' اس نے حکم کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا تھا۔ اس کا یہ انداز یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ حکم کے مطابق ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔

کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ ساتھ میں لوازمات بھی تھے۔ بہرحال میں نے بستر پر نیم دراز ہو کر چائے کے گھونٹ بھرنے پر اکتفا کیا۔ ذہن میں ہلچل تھی۔ یہ داؤد یہاں کا کرتا دھرتا نظر آتا تھا اور یہ کافی پہنچا ہوا شخص تھا۔ یہ وہاں بھٹے پر ہی میرے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا لیکن اس نے اپنا اطمینان برقرار رکھا تھا اور مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اب یہاں اس وسیع و عریض بیسمنٹ میں، میں اس کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ یہ کسی بہت بااثر شخص کا انڈر گراؤنڈ ڈیرا لگتا تھا۔ اپنے دو بندوں کے زخمی ہونے کے باوجود داؤد کا رویہ مجھ سے دوستانہ تھا۔

یہ رویہ آئندہ کیا شکل اختیار کرے گا اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اب مجھے یہ اندازہ بھی ہورہا تھا کہ وہاں پولیس والوں کے بھیس میں داؤد اور اس کے ساتھیوں نے جو جعلی ناکا لگا رکھا تھا اس کا مقصد صرف راہگیروں سے لوٹ مار ہی نہیں تھا وہاں یہ لوگ غالباً کسی خاص شکار کی تلاش میں تھے۔

باہر سے مدھم شور کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کردی اور دیوار گیر کھڑکی کا دبیز پردہ تھوڑا سا کھسکایا۔ کھڑکی کے شیشے کی دوسری طرف ایک اور شیشہ نظر آیا بلکہ یہ شیشے کی دیوار سی تھی۔ اس دیوار کی دوسری طرف اسی ہال کے مناظر تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی ایل سی ڈی دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ بیس پچیس افراد اسکرین کے سامنے جمع تھے اور دکھائے جانے والے مناظر میں گم تھے۔ میں دم بخود رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس کھڑکی سے پردہ ہٹاؤں گا تو کچھ دور ایل سی ڈی کی اسکرین پر خود کو دیکھوں گا۔ ہاں... یہ میں ہی تھا۔ یہ دو افراد کی ایک زوردار فائٹ تھی جو کسی غیر ملکی چینل پر دکھائی جارہی تھی۔ یہ کوئی ڈی فائٹ نہیں تھی۔ یہ سچی لڑائی تھی۔ بڑی بے رحم اور خون رنگ۔ میں اور میرا اٹالین مدمقابل ایک دوسرے پر گھونسوں اور لاتوں سے کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا یہ میری زندگی کی دوسری فائٹ تھی۔

بے شک یہ میں ہی تھا۔ بے شمار لوگ مجھے اس روپ میں جانتے پہچانتے تھے۔ میں ان کے دلوں کی دھڑکن تھا لیکن یہاں اس زمین دوز ٹھکانے پر مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ نہ ہی لاہور میں اور مراد آباد میں گھومتے پھرتے مجھے کسی نے پہچانا تھا۔ یہی بات میں نے شروع میں بھی کہی تھی کہ ایک معروف کھلاڑی ہونے کے باوجود مجھے یہاں کوئی شناخت نہیں کررہا تھا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ تھی، سامنے اسکرین پر جو شاہ زیب اپنے خونخوار حریف کو ناکوں چنے چبوانے میں مصروف تھا، اس کی داڑھی تھی، گھنی مونچھیں تھیں جنھوں نے اس کے تقریباً سارے ہونٹوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ لمبے بال کندھوں کے قریب قریب پہنچ رہے تھے۔ ان دنوں میں مقامی فیشن کے مطابق اپنے بالوں کو سرخی مائل رنگ دیا کرتا تھا۔ اب میرے چھوٹے چھوٹے بال اپنے اصل کالے رنگ میں تھے اور میں کلین شیوڈ تھا۔ چیمپئن فائٹر کے روپ میں بہت قریب سے جاننے والے بھی مجھے اس پاکستانی روپ میں دیکھ کر مشکل سے ہی پہچان پاتے پھر یہ بات کس کے تصور میں آسکتی تھی کہ انٹرنیٹ کی خصوصی سائٹس پر خوف ناک لائیو فائٹس کرنے والا یورپی چیمپئن لاہور اور مراد آباد کی گلیوں میں پھر رہا ہے۔ انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کی جھڑکیاں کھا رہا ہے اور پولیس والوں کے تھپڑ جھیل رہا ہے۔

فائٹ اب فیصلہ کن مرحلے میں تھی۔ اٹلی کے فائٹر ڈیوس نے مجھے نیچے گرایا ہوا تھا اور گردن کا لاک لگانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ اس کی ناک منہ سے خون جاری تھا۔ میرے دونوں گھٹنے بھی بری طرح چھلے ہوئے تھے اور ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہی ہوگئی تھی۔ اس بند آنکھ پر ڈیوس نے جان بوجھ کر ضربیں لگائی تھیں اور اسے مزید زخمی کردیا تھا۔ اگر وہ مجھے نیک لاک لگانے میں کامیاب ہوجاتا تو شاید یہ چیمپئن شپ کا سیمی فائنل یہیں پر ختم ہوجاتا لیکن عین موقع پر میں نے بازی پلٹ دی۔ میں نے پوری طاقت سے خود کو پلٹا اور اسے اپنے نیچے کرلیا۔ میرے طوفانی گھونسے نے اس کا بالائی ہونٹ پھاڑ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بازو میرے شکنجے میں آگیا۔ جدید طرز کی لڑائی میں ایسے آرم لاک بڑے کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے ڈیوس کو پوری طرح اپنے نیچے دبالیا اور اس کے بازو کو پورے زور سے مروڑنے لگا تاکہ وہ ہار تسلیم کرلے۔ رنگ کے گرد موجود سیکڑوں تماشائی فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ بھدے نقوش والے اس غنڈا صورت سیاہ فام کے مقابل میں میرے سپورٹر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ میں نے آخر وقت تک کوشش کی کہ ضدی ڈیوس ہار مان لے اور فرش پر ہاتھ مار کر یا ویسے ہی بول کر اپنی شکست کا اعلان کردے لیکن وہ مسلسل مزاحمت کررہا تھا۔ میں خود بھی زخمی تھا۔ اس لیے زیادہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے زور لگایا اور ڈیوس کا بازو تین جگہ سے ٹوٹ گیا۔ ہڈی کڑکڑانے کی آواز اتنی واضح تھی کہ ڈیوس کے کئی سپورٹر چلا اٹھے۔ مقابلہ ختم ہوگیا۔ میں نے دونوں ہاتھ فاتحانہ انداز میں بلند کیے۔ میرے سپورٹرز دیوانہ وار رنگ میں گھسے اور انہوں نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔

میوزک بج رہا تھا۔ بیسیوں فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ رنگ کے گرد لوگوں کی ٹولیاں پرجوش انداز میں رقص کررہی تھیں پھر میری فتح کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ میں رنگ سے نیچے اترا اور گاؤن پہن کر ڈریسنگ روم کی طرف روانہ ہوا۔ راستے کی دونوں جانب سیکڑوں تماشائی کھڑے تھے۔ وہ مجھے چھونا چاہتے تھے، ہاتھ لگانا چاہتے تھے۔

سیکیورٹی مجھے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ماضی قریب کے یہ لمحے میرے لیے بھی یادگار تھے۔ میرے خیالوں کا تسلسل روبی کی آمد نے توڑا۔ وہ لہراتی بل کھاتی اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں خوشنما ٹرے تھی اور اس میں ڈرائی فروٹس کے علاوہ اسٹابری کا جوس تھا۔ ٹرے میرے قریب رکھتے ہوئے وہ ذرا شوخی سے بولی۔ ''جناب لگتا ہے کہ آپ بھی فائٹس وغیرہ شوق سے دیکھتے ہیں۔''

''ہاں... کبھی کبھی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اگر ایسا ہے تو آپ کو پرسوں یہاں ایک لائیو فائٹ بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ باکسنگ کا زبردست مقابلہ ہونے والا ہے دو بندوں کے بیچ۔''

''باکسنگ کا مقابلہ دو بندوں کے بیچ ہی ہوتا ہے۔'' میں نے روکھے پن سے کہا۔

وہ ذرا خجل ہوکر بولی۔ ''بڑے جوش سے تیاری ہورہی ہے جی۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے جو نعرے بازی سنی تھی وہ اسی مقابلے کے سلسلے میں تھی۔

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیسی مارکٹائی ہورہی تھی؟''

وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''یہ دونوں بڑے مشہور فائٹر ہیں جی۔ ایک شاید اٹلی کا ہے دوسرا ڈنمارک کا۔ یہ جو ڈنمارک والا ہے ناں اس کے ماں باپ ہمارے ہی علاقے سے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں انڈین ہیں، کچھ کہتے ہیں پاکستانی ہیں۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور ہوگا لیکن اس فیلڈ میں اسے ایسٹرن کنگ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور واقعی پچھلے دو چار سالوں میں اس نے خود کو کنگ ثابت بھی کیا ہے۔''

''ایسٹرن... کنگ۔'' میں نے منہ میں دہرایا۔ وہ مجھے میرے ہی بارے میں بتارہی تھی اور یقیناً اس کے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ بات موجود نہیں ہوگی کہ وہ جس شخص کے بارے میں باتیں کررہی ہے، وہ اسی کمرے میں اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود ہے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دراصل یہی فائٹ تھی جی... جس نے اس بندے کو اوپر تک پہنچایا۔ یہ فائٹ اس نے بڑے جذبے کے ساتھ لڑی تھی، اس کے پیچھے ایک اسٹوری ہے جی۔ اگر آپ سننا پسند کریں تو میں مختار جھارا کو بلاؤں، وہ آپ کو پوری تفصیل کے ساتھ سناسکتا ہے۔''

''نہیں... اس کی ضرورت نہیں پھر بھی۔'' میں نے کہا۔

اسکرین پر اب ایک عمر رسیدہ کوچ کا انٹرویو نشر ہونے لگا تھا اور اسکرین کے سامنے موجود افراد خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے تھے۔

میں نیرنگیٔ حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور حیران ہورہا تھا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس بیسمنٹ سے باہر حالات کیا ہیں اور میرے بارے میں کچھ کہا سنا جارہا ہے یا اب میڈیا والوں کے ہتھے کوئی اور تازہ خبر چڑھ گئی ہے؟ میں نے روبی سے کہا کہ وہ کمرے کا ٹی وی آن کرے۔ اس نے ٹی وی آن کردیا۔ میں نے کئی چینل بدلے لیکن فی الحال کہیں کوئی نیوز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ٹی وی آف کیا اور لیٹ گیا۔ آنکھوں کے سامنے پھر وہی دردناک فلم چلنے لگی جس نے مجھے میری بنیادوں سے ہلا ڈالا تھا۔ میں نے سوچا، فائزہ مہندی لگے ہاتھوں کے ساتھ قبر میں جالیٹی ہوگی، چچی آمنہ بھی جرم بے گناہی کی سزا میں منوں مٹی اوڑھ چکی ہوں گی۔ اسپتال میں ولید کی حالت معلوم نہیں کیا تھی، وہ زندہ بھی تھا یا نہیں اور چچا حفیظ وہ پتا نہیں کس قیامت کا سامنا کررہے ہوں گے؟ اگر مجھے اور ولید کو دہشت گرد ٹھہرایا جارہا تھا تو پھر یقیناً چچا بھی دہشت گردوں کے پشت پناہ تصور کیے جارہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے گھر کے بجائے پولیس کی کسٹڈی میں ہوں۔ سوچ سوچ کر میرا سر درد سے پھٹنے لگا۔

پتا نہیں کس وقت غنودگی طاری ہوئی اور پھر میں سوگیا۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی چلا چلا کر میرے کان کے پردے پھاڑ رہا ہے اور میرے جسم پر ہتھوڑے برسائے جارہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کوئی میرے اوپر چڑھا ہوا تھا اور اس کے فولادی گھونسے میرے چہرے پر برس رہے تھے۔

''ماردوں گا... جان سے ماردوں گا۔'' وہ شخص دہاڑ رہا تھا۔ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ الکحل کی تیز بو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے سر کی ٹکر میرے چہرے پر رسید کی۔ میں ٹیبل لیمپ پر گرا اور کمرے میں مکمل تاریکی چھاگئی۔ مجھے سنبھلنے میں چار پانچ سیکنڈ مزید لگے۔ اس دوران میں اس توانا شخص نے میرے جسم پر کئی ضربیں مزید لگائیں۔ یہ ضربیں کسی نہایت سخت چیز سے لگائی گئی تھیں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک ہاکی تھی۔ میرے کندھے پر لگنے والی ایک ضرب تو اتنی شدید تھی کہ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹنے میں معمولی سی کسر رہ گئی تھی۔

سنبھلنے کے بعد میں نے تاریکی میں تاک کر اپنے... مدِمقابل کے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ اسی دوران میں کوئی بھاری آواز میں زور سے بولا اور ساتھ ہی ٹرچ کی آواز کے ساتھ کمرے میں روشنی ہوگئی۔ اندر آنے والا خود داؤد عرف بھاؤ جی تھا۔

وہ دہاڑا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

مجھ پر حملہ آور ہونے والا نہایت گھٹے ہوئے جسم اور صفاچٹ سر والا ایک پہلوان نما شخص تھا۔ اس نے دھاری دار شرٹ اور جین پہن رکھی تھی۔ سانولا چہرہ نشے کے اثر سے مزید سانولا نظر آ رہا تھا۔ داؤد کے روکنے کے باوجود وہ ایک بار پھر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف آیا لیکن مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی چوڑے چکلے داؤد نے اسے روک لیا۔ داؤد نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر پیچھے ہٹایا اور پھر ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

''ہوش کر لودھی... یہ ہماری پناہ میں ہے۔'' داؤد گرجا۔

نشے نے جیسے اس شخص کی عقل خبط کر رکھی تھی۔ اس نے مچل کر خود کو چھڑانا چاہا۔ داؤد نے ایک اور تھپڑ اس کے چہرے پر جڑا اور چنگھاڑا۔ ''میری بات نہیں سن رہا تو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں... میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' وہ اس لودھی نامی شخص کو دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ روبی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کی دوسری طرف سے چند لمحے تک گرجنے برسنے کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے خون رسنے لگا تھا۔ ٹانگ اور کندھے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ مرے کو ماریں شاہ مدار والی بات تھی۔ میں تو پہلے ہی جسمانی اور ذہنی طور پر شدید اذیت کا شکار تھا۔ روبی جلدی سے آگے آئی۔ اس نے میری خونچکاں انگلیوں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور انہیں دبا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔'' وہ بولی۔

''نہیں... کوئی بات نہیں... ویسے کون تھا یہ؟''

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''راول... راول لودھی... کراچی سے آیا ہے۔ باکسنگ کرتا ہے۔''

''میرے ساتھ اسے کیا دشمنی ہے؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''یہ واحد کا بھائی ہے... چھوٹا بھائی۔''

''کون واحد؟''

''یہاں آنے سے پہلے بھٹے کے قریب آپ کی لڑائی ہوئی تھی ناں، جس بندے کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہی واحد ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا۔

''اچھا... تو وہ اس کا غصہ اتار رہا ہے۔''

''داؤد جی نے اسے خوب لتاڑا ہے۔ آپ کے سامنے ہی تھپڑ بھی مارے ہیں اسے۔ خبیث ابھی نشے میں ہے۔ نشہ اترے گا تو داؤد صاحب دوبارہ اس کی کلاس لیں گے۔ آج کل مقابلے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اکڑ آگئی ہے اس میں۔''

''مقابلہ؟''

''وہی باکسنگ کا مقابلہ۔ میں نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ یہاں آج کل مقابلے وغیرہ ہو رہے ہیں۔ یہ لودھی فائنل مقابلے تک پہنچا ہوا ہے اور پرسوں فائنل ہے۔''

اسی دوران میں داؤد تیز قدموں سے اندر آ گیا۔ وہ اب شلوار قمیص اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے میری چوٹیں دیکھیں اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے سنگل پسلی جھارے کو اندر بلایا اور اس سے کہہ کر میری انگلیوں کی مرہم پٹی کروائی۔ کمرے میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی، روبی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی صفائی کر دی۔ داؤد کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے لودھی کی اس حرکت پر شدید طیش ہے۔ میں نے اس کا طیش رفع کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ وال کلاک کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ اب صبح ہونے والی ہے۔ داؤد نے بھی اب پھر سے سونے کے بجائے جاگتے رہنا مناسب سمجھا۔ اب تک مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ نوخیز روبی کی حیثیت داؤد کی رکھیل کی سی ہے۔ (وہ عمر میں اس سے پندرہ سولہ سال چھوٹی ہوگی) لیکن وہ شاید ایسی رکھیل تھی جسے وہ اپنے تک پابند رکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ بوقتِ ضرورت کسی بھی مہمان یا دوست کو پیش کر سکتا تھا۔

داؤد نے اسے شراب اور ڈرائی فروٹس وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ میں نے اپنے لیے اوولٹین ملا دودھ منگوایا۔ یہ چیزیں آ گئیں تو داؤد کا طیش مزید کم ہو گیا اور وہ نارمل نظر آنے لگا۔

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ذرا سا مسکرا کر بولا۔ ''اب بتاؤ، اپنے بارے میں... کہاں کہاں بم پھوڑے ہیں اور کہاں کہاں دہشت گردیاں کی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''بتانے کی ضرورت نہیں، آپ سب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ یہ پولیس والے تو چوہے کو بھی ہاتھی ثابت کرتے

ہیں اور جو باخود اقرار کرتا ہے کہ وہ واقعی ہاتھی ہے۔''
داؤد بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ وہاں مراد پور میں کہیں آگ لگنے کا واقعہ بھی ہوا ہے جس میں دو تین ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ پولیس کہہ رہی ہے کہ وہاں دھماکا خیز مواد بنایا جارہا تھا؟''
''جی ہاں... وہاں گولے بارود کی فیکٹری میں اور میرا کزن ہی چلا رہے تھے اور ہماری اس مجرمانہ سرگرمی کی وجہ سے میری چچی اور چچی زاد بہن کی جانیں بھی گئی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میرا سینہ دکھ سے بھر گیا۔
''مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا... اوپر والا انہیں صبر دے۔'' داؤد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بغور میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے بتاؤ... کہیں یہ زمینوں پر قبضے وغیرہ کا چکر تو نہیں؟''
''آپ... یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟''
''جہاں تک مجھے پتا ہے، اس علاقے میں داراب فیملی ایک بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنارہی ہے۔ زمینداروں اور پروپرائٹرز سے ان کے جھگڑے چل رہے ہیں۔''
''آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''مجھے کچھ تفصیل بتاؤ۔'' داؤد بولا۔
میں نے اپنی زخمی انگلیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کافی کچھ بتا رہا ہوں لیکن آپ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ میں کہاں ہوں... اور یہاں میری حیثیت کیا ہے؟ اس کے علاوہ ابھی مجھے آپ کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔''
داؤد نے ایک قیمتی لائٹر سے امپورٹڈ سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''سمجھو کہ جس طرح کچھ لوگ سیلف میڈ ہوتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ پولیس میڈ ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ ہوتے ہیں انہیں پولیس گردی نے یا پھر جیل کے ماحول نے بنایا ہوتا ہے۔ شاید میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم اس شہر میں بلکہ شاید اس ملک میں نئے نئے آئے ہو۔ اگر تم لاہور یے ہوتے تو میرے بارے میں تھوڑا بہت تو ضرور جانتے ہوتے۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کچھ ہی دن پہلے ڈنمارک سے یہاں آیا ہوں اور آنے کے چند گھنٹے بعد ہی مراد پور کی پولیس نے مجھے پرلے درجے کا قانون شکن ثابت کر دیا تھا اور میری قانون شکنی یہ تھی کہ میں نے ایک زخمی کو سڑک سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے کی غلطی کی تھی۔''
داؤد زہریلے انداز میں بولا۔ ''یہ تو خیر کافی بڑی غلطی تھی، اس سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی یہاں لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دی جاتی ہیں۔''

میرے اور داؤد کے درمیان قریباً دو گھنٹے تک گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے ناشتا بھی کیا۔ داؤد کی باتوں سے پتا چلا کہ میں اس وقت لاہور شہر کے بیچوں بیچ ایک نہایت محفوظ ٹھکانے پر موجود ہوں۔ یہاں میرے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو پولیس کو فوری مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت اشتہاریوں یا مفروروں کی ہے۔ یہ سارے لوگ اس یقین اور اطمینان کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں کہ پولیس یا پولیس کا کوئی مخبر یہاں پر بھی نہیں مار سکتا۔ اس وسیع تہ خانے کے اوپر ایک بڑا بلیئرڈ کلب تھا اور اسنوکر وغیرہ بھی ہوتی تھی۔ اس تہ خانے میں اترنے کے لیے ایک راستہ بلیئرڈ کلب میں ہی موجود تھا لیکن اسے کسی ہنگامی صورت حال کے علاوہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ تہ خانے میں آنے جانے کے لیے ایک ملحقہ گیسٹ ہاؤس میں سے چور راستہ نکالا گیا تھا اور ہم رات کو اسی راستے سے تہ خانے میں پہنچے تھے۔

داؤد نے مجھے اپنے بارے میں بہت کم بتایا۔ تاہم جو کچھ بھی بتایا اس سے اندازہ ہوا کہ داؤد کی حیثیت ایک دبنگ جرائم پیشہ شخص کی ہے لیکن وہ ہر کام بہت صفائی سے کرتا ہے۔ انتظامیہ اس کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے میں سرگرداں رہتی ہے لیکن بہت کم کامیاب ہو پاتی ہے اور اگر کامیاب ہوتی بھی ہے تو داؤد قانونی لڑائی لڑنے کا ماہر ہے۔ وہ اپنے خلاف چلنے والے کئی کیسوں کو بڑی کامیابی سے ہینڈل کر رہا تھا۔ بہت سے کیس سرد خانوں میں جا چکے تھے اور جو سرد خانوں میں نہیں تھے ان میں اس کی ضمانتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ اس نے اب تک جو زیادہ سے زیادہ جیل کاٹی ہے وہ آٹھ ماہ پندرہ دن کی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کا فون اس کے لیے آیا جس میں اس کی خیر خیریت دریافت کی گئی اور اس سے ٹی وی کی کسی ماڈل گرل کو دھمکانے کے بارے میں کہا گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میں قانون کے محافظوں سے بھاگتے بھاگتے نادانستہ طور پر کچھ ایسے قانون شکنوں میں پہنچ گیا ہوں جن کے ہاتھ بہت لمبے اور حوصلے بہت اونچے ہیں۔ یہ اڈا ان مجرموں کی پناہ گاہ تھی جو کچھ عرصے کے لیے زیرِ زمین رہنا چاہتے تھے یا پھر ویسے ہی پولیس ان کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ وہ یہاں سے باہر نہیں نکلتے تھے اور انہیں یہیں پر داؤد کی طرف سے ساری سہولتیں اور عیاشیاں میسر تھیں۔

داؤد کی باتوں کے جواب میں، میں نے بھی اسے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا۔ بہرحال یہ بات دوسروں کی طرح داؤد کے لیے بھی ایک راز ہی رہی کہ میں ڈنمارک میں کیا تھا؟ اس کے باوجود داؤد جیسا گھاگ شخص اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ میں لڑائی بھڑائی کی خصوصی صلاحیت رکھتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ میں نے اس کے لیے کوئی خاص تربیت بھی حاصل کی ہو۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کچھ بتایا تو نہیں ہے لیکن مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے یہ سارا عرصہ واقعی ڈنمارک میں گزارا ہے تو پھر چین و سکون سے نہیں گزارا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟''

وہ مسکرایا۔ ''مطلب یہ کہ اپنے چین سکون کے علاوہ دوسروں کے چین سکون کی بھی واٹ لگائی ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے کہ کافی مارا ماری والی لائف گزارتے رہے ہو۔''

''کیسے اندازہ لگایا آپ نے؟''

''واحد اور فاروق میرے بڑے تگڑے بندوں میں سے ہیں۔ دو چار کو آسانی کے ساتھ خالی ہاتھوں سے لمبا لٹا سکتے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''تعریف کا شکریہ... لیکن مجھے افسوس ہے کہ مجھے فائر کرنا پڑا اور آپ کا بندہ زخمی ہوا۔''

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''اور جہاں تک میرا خیال ہے تم نے وہ ٹھیک ہی کیا۔ میں گاڑی کے اندر سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑائی کے اصول کے مطابق تمہارا وہ فیصلہ بہت بروقت تھا۔ اگر تم گولی نہ چلاتے تو یقیناً واحد رائفل اٹھا کر تم پر فائر کر دیتا اور شاید وہ تمہاری ٹانگ پر نہ کرتا۔ ویسے وہ پستول وہی تھا نا جو تم نے ایس پی سے چھینا تھا... ایس پی تبریز سے؟''

''ہاں، اس میں صرف ایک ہی گولی تھی۔ باقی گولیاں میں نے اس وقت ہوا میں چلائیں جب تبریز کے ملازم کھیتوں میں میرا پیچھا کر رہے تھے۔''

''اب کیا ارادے ہیں؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میری سمجھ میں تو ابھی کچھ نہیں آ رہا۔''

''تو جب تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ جاتا، بڑے اطمینان سے یہاں رہو۔ سمجھو کہ تمہاری حیثیت یہاں میرے خصوصی مہمان کی ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔

وہ میرا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلنے سے پہلے رک گیا۔ واپس میری طرف آیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور میں تو کہتا ہوں ابھی باہر جانے کا ارادہ ہی ترک کردو۔ باہر خطرہ ہے تمہارے لیے، ویسے بھی تم انصاف چاہتے ہونا اور انصاف یہاں مانگنے سے نہیں ملے گا اسے چھیننا پڑے گا۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بائے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنی شکل سے اور طرح کا لگتا تھا لیکن بول چال سے پڑھا لکھا بھی محسوس ہوتا تھا۔

وہ سارا دن میں نے سخت اذیت میں گزارا۔ اس بیسمنٹ میں سیل فون کے سگنل کمزور تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ کال نہ ہوسکتی۔ ایک گمنام نمبر سے میں نے کئی بار عبداللہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ اس کا فون بند جارہا تھا۔ چچا کی صورتِ حال کے بارے میں بھی کچھ خبر نہیں مل رہی تھی۔ بہرحال داؤد نے مجھے اتنا معلوم کرکے بتادیا تھا کہ ولید گنگا رام اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں ہے۔ اس بات کی امید دکھائی دے رہی تھی کہ اس کی جان بچ جائے گی۔

رات کے وقت میں نے یہاں کے وسیع عریض ہال میں گھوم پھر کر بھی دیکھا۔ اس وقت داؤد اور مختار جھارا میرے ساتھ تھے۔ داؤد اس جگہ کا بے تاج بادشاہ تھا اور اس کی رعایا بھی معمولی نہیں تھی۔ میں شکلیں دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ شہر کا ایک سے ایک بڑھ کر غنڈا، جرائم پیشہ اور سزا یافتہ یہاں موجود ہے۔ یہ معاشرے اور قانون سے بھاگے ہوئے لوگوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں وہ مکافاتِ عمل کے خوف سے وقتی طور پر آزاد ہوکر موج مستی کے دن گزار رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر چلنے والی نہیں تھی۔ بہت جلد یہ جگہ انتظامیہ کی نظر میں آجانا تھی مگر داؤد کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ اسے اس کی زیادہ فکر نہیں۔ اس کے پاس لاہور میں ہی ایسے درجنوں ٹھکانے تھے جہاں وہ اپنے ان خصوصی مہمانوں کی پناہ کا انتظام کرسکتا تھا۔ ایک چور راستے سے نکل کر دوسرا ٹھکانا اور دوسرے چور راستے سے نکل کر تیسرا ٹھکانا۔

ایک جگہ مجھے باکسنگ کے رِنگ جیسا ایک اسٹیج نظر آیا۔ یہاں کل کے مقابلے کی تیاری ہورہی تھی۔ رِنگ کے گرد رسے وغیرہ درست کیے جارہے تھے اور لائٹس لگائی جارہی تھیں۔ داؤد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فائنل مقابلے کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے مقابلے ہوں گے، کیا تم کسی میں حصہ لینا چاہو گے؟''

''نہیں داؤد بھائی... یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

☆☆☆

اگلے روز وسیع ہال میں کافی گہما گہمی نظر آئی۔ نعرے بازی بھی ہورہی تھی۔ لوگ چار پانچ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ یہ نعرہ بازی فائنل میں حصہ لینے والے دونوں باکسرز کے بارے میں تھی۔ پہلا باکسر تو وہی لودھی نامی سرمنڈا تھا جس نے کل شب نشے میں دھت ہوکر مجھ پر ہلا بولا تھا۔ دوسرا کریم نام کا ایک لڑکا تھا یہ حیدرآباد کا تھا۔ شکل کچھ کچھ مکرانیوں جیسی تھی۔ بال گھنگھریالے اور رنگ سانولا، نقوش عام باکسروں کی نسبت کافی اچھے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں باکسرز پر کافی شرطیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ یہاں موجود سارے تماشائی کھاتے پیتے جرائم پیشہ تھے۔ یقیناً کسی کے پاس چھینا جھپٹی اور دیگر وارداتوں سے حاصل ہونے والا مالِ حرام بھی ہوگا۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ کوئی ڈکیت یا قاتل لاکھوں سمیٹ کر بیٹھا ہو۔ ماحول سے پتا چل رہا تھا کہ کریم کی مقبولیت زیادہ ہے مگر شرطیں زیادہ لودھی پر لگائی گئی تھیں۔

مقابلوں کا آغاز شام سات بجے کے بعد ہوا۔ زوردار میوزک چلے ہورہا تھا اور اکثر تماشائیوں نے پی رکھی تھی۔ کئی ایک کی بغل میں قبول صورت لڑکیاں بھی تھیں جن سے وہ سرعام چھیڑ خانیاں کررہے تھے۔ دو چار افراد میں چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوئیں مگر داؤد کے اسسٹنٹ مختار جھارا نے معاملہ بگڑنے نہیں دیا۔ مختار جھارا کی صلاحیتیں آہستہ آہستہ آشکار ہورہی تھیں۔ کہنے کو تو وہ چوبیس پچیس سال کا ایک مخنی سا شخص تھا لیکن کم بخت میں زور بلا کا تھا۔ آواز بھی جسم کے برعکس کافی بھاری تھی۔ میں نے اس کانگڑی پہلوان کے دم خم کا مظاہرہ ریسٹورنٹ کے بار کے سامنے ہونے والی ایک چھوٹی سی جھڑپ میں دیکھا۔ ایک شرابی نے مستی کی۔ اس کی ایک آنکھ کسی پرانے حادثے کی وجہ سے ضائع ہوچکی تھی۔ وہ ٹھوکر لگنے کے بہانے ایک لڑکی کے اوپر جاگرا۔ اس گرنے کے دوران میں ہی اس نے لڑکی کو نوچا بھی تھا۔ لڑکی بے شک کوئی طوائف زادی ہی تھی مگر احتجاج کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے یک چشم شرابی کو تھپڑ دے مارا۔ اس نے اس کا بلاؤز پھاڑ دیا۔ لڑکی کا موٹا تازہ ساتھی یک چشم پر پل پڑا۔ ایسے میں کانگڑی پہلوان جھارا آگے

بڑھا۔ اس نے تصور وار شرابی کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑا۔ پہلے اس روکنے کی کوشش کی پھر گھما کر ایک ستون کے ساتھ دے مارا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ کچھ اور لڑکے آگئے اور وہ یک چشم کو گھسیٹ کر ہال سے باہر لے گئے۔

بالآخر رنگ کے اندر مقابلے شروع ہوئے۔ فائنل سے پہلے کل چار مقابلے تھے۔ دو جوڑ تو ٹھیک تھے اور لگتا تھا کہ کھلاڑیوں کو باکسنگ آتی ہے مگر دو جوڑ بالکل مار کٹائی کے تھے۔ یہ عام لڑاکو افراد تھے۔ بس انہیں دستانے پہنا دیے گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر الٹے سیدھے ہاتھ چلا رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ ایسے میں ہی ایک شخص کی ناف پر بہت زور سے مکا لگا اور وہ گر کر کچھ دیر کے لیے نیم بے ہوش ہو گیا۔

آدھ پون گھنٹے بعد اصل مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں حریف میدان میں آئے۔ انہوں نے باقاعدہ باکسرز والا کاسٹیوم پہن رکھا تھا اور طور اطوار سے بھی پتا چلتا تھا کہ وہ باکسنگ کی شد بد رکھتے ہیں۔ دونوں کے جسم کسرتی اور مضبوط تھے۔ یہ دس راؤنڈ کا مقابلہ تھا، ہر راؤنڈ تین منٹ کا تھا۔ ریفری ایک ریٹائرڈ کرچین باکسر تھا جو حال ہی میں جیل کاٹ کر لوٹا تھا۔

یہ اہم مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہال کی لائٹس بجھا کر نیم تاریکی پیدا کر دی گئی۔ صرف اسٹیج یعنی رنگ پر فل روشنی رہی۔ مقابلہ شروع ہوا، دونوں حریفوں نے ایک دوسرے پر آگے بڑھ کر حملے کیے۔ وہ خود کو جو بھی سمجھ رہے ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کس کیٹیگری کے فائٹر ہیں۔ مکے بازی جاری رہی۔ پہلا راؤنڈ شروع ہوئے بمشکل ایک منٹ ہی ہوا تھا کہ کھیل ختم ہو گیا۔

بالکل اچانک ہی لودھی کا ایک بھرپور پنچ کریم کی ٹھوڑی پر لگا اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے اسٹیج پر گرا۔ لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ ریفری نے گنتی شروع کی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ریفری بول رہا تھا۔ ''سات... آٹھ... نو... دس۔''

اس نے مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ تماشائی ہکا بکا رہ گئے۔ باکسنگ کے کھیل میں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہیوی ویٹ باکسرز کے شروع کے ایک دو راؤنڈ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ایک بھرپور اسٹاک پنچ لگ جائے تو وہ ناک آؤٹ ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

لودھی کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس نے چھاتی کوٹ کوٹ کر اور بلند آواز میں چنگھاڑ چنگھاڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ بہرحال اکثر تماشائیوں کو بالکل بھی مزہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو ایک اچھے اور سنسنی خیز مقابلے کی توقع کر رہے تھے۔ چند افراد نے ''نوری... نوری'' کے نعرے بھی لگائے یعنی یہ ایک فکسڈ مقابلہ تھا لیکن یہ آوازیں زیادہ زور نہیں پکڑ سکیں کیونکہ جو کچھ ہوا سب کے سامنے تھا۔ اتفاقیہ طور پر کریم کو واقعی ایک زبردست پنچ نے زمین بوس کر دیا تھا۔

تماشائیوں کی مایوسی دور کرنے کے لیے کچھ دیر بعد یہ اعلان کیا گیا کہ نیا کلب چیمپئن لودھی یہاں موجود کسی بھی شخص سے ایک اور مقابلہ کرنے کو تیار ہے اور یہ مقابلہ وہ صرف ایک ہاتھ سے کرے گا یعنی وہ اپنا اسٹاک پنچ استعمال نہیں کرے گا اور اس بازو کو اپنے جسم کے ساتھ باندھے رکھے گا۔

دو تین منٹ تک یہ اعلان ہوتا رہا لیکن کوئی بھی بپھرے ہوئے چیمپئن کے سامنے نہیں آیا۔ تب ایک اور اعلان ہوا۔

''لودھی بھائی دو بندوں سے ایک ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ اسی طرح بندھا رہے گا۔''

اب حاضرین میں تھوڑی سی ہلچل نظر آئی مگر سامنے آنے کو پھر بھی کوئی تیار نہیں تھا۔

داؤد نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب! اس کا غرور ذرا ٹوٹنا چاہیے، میرا خیال ہے کہ ایک تو تم کھڑے ہو جاؤ۔''

''نہیں داؤد بھائی۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا ویسے بھی...'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا... ویسے بھی؟'' داؤد نے پوچھا۔

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ ویسے بھی یہ میری کیٹیگری کے لوگ نہیں ہیں لیکن میں نے فقرہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی میری انگلیوں پر چوٹ آئی ہوئی ہے۔''

اس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر میری انگلیوں پر نگاہ ڈال کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں، ایسی چوٹیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہاری اس دلیل میں کوئی خاص وزن نہیں۔''

اسی دوران میں حاضرین میں سے ایک دراز قد شخص نے لودھی کا چیلنج قبول کر لیا۔ وہ جھجکتا ہوا رنگ پر چڑھ آیا۔ تماشائیوں نے نعرے لگائے۔ اب دوسرے شخص کا انتظار

تھا مگر یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ لودھی کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے کئی افراد کا نام لے لے کر انہیں اوپر آنے کی دعوت دی مگر کسی کی طرف سے یہ دعوت قبول نہیں کی گئی پھر اس نے جلتی نظروں سے داؤد کو دیکھا اور براہِ راست اس سے مخاطب ہو کر پکارا۔

"بھاؤ جی... کیا سب نے بھنگ پی لی ہے؟ نکالو نا کسی سورما کو۔"

"ابھی کوئی نکل آتا ہے۔" داؤد نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

لودھی کے معاندانہ لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اندرونی طور پر داؤد اور اس کے قریبی ساتھیوں سے خار رکھتا ہے۔ شاید اس خار میں اضافہ ان تھپڑوں کی وجہ سے بھی ہوا ہو جو پرسوں لودھی کو میرے بیڈروم میں سہنے پڑے تھے۔

وفعتاً لودھی کی توجہ میری طرف ہو گئی۔ اس نے وہی کہا جس کی توقع اس سے کی جا سکتی تھی۔ میری طرف اشارہ کر کے اس نے داؤد سے کہا۔ "بھاؤ جی! اپنے اس رانی خاں کے سالے کو نکالو نا۔ سنا ہے بڑی گرمی ہے اس کے اندر بھی۔"

بات کرتے ہوئے لودھی کا سانولا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں نفرت آمیز طیش لشکارے مار رہا تھا۔ انداز بے حد تاؤ دلانے والا تھا۔

داؤد نے ایک بار پھر مجھے ٹہوکا دیا۔ "شاہ زیب، میں تو کہتا ہوں دو چار ہاتھ دکھاؤ اس کو... میرے خیال میں تو تم اکیلے بھی اس سے نمٹ سکتے ہو۔ چلو اٹھو..."

میں نے دیکھا کہ سنگل پسلی مختار جھارا اور داؤد کے دو چار قریبی ساتھی بھی حوصلہ افزا نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

داؤد نے مجھے باقاعدہ بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ "پلیز داؤد بھائی، میرا ذرا ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ کہیں گے تو پھر کبھی سہی۔"

"شاید ڈر رہے ہو؟" داؤد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "رانی خاں کے سالے" والے الفاظ بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

میں ہموار قدموں سے چلتا لوگوں کے درمیان سے گزرا اور تین زینے طے کر کے رنگ میں داخل ہو گیا۔ صفا چٹ سر والے لودھی نے ایک بار پھر جلتی نظروں سے مجھے سر تا پا گھورا اور بولا۔ "آ گئے ہو رانی خاں کے سالے۔"

"ہاں آ گیا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے بدمعاشوں کے انداز میں گردن ٹیڑھی کی۔ "میں اکیلا ہوں اور تم دو ہو۔ میرا ہاتھ بھی ایک ہے، اگر تم بالکل ہی ہیجڑے نہیں ہو تو میں دوسرا ہاتھ استعمال کر لوں؟"

میں نے کہا۔ "دوسرا ہاتھ استعمال کر لو اور اس دوسرے بندے کو بھی باہر بھیج دو، میں اکیلا ہی تمہاری حجامت کروں گا۔"

میرے انداز نے اسے تھوڑا سا چونکایا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور اس کے چہرے پر سیاہی آمیز سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے رنگ میں موجود دراز قد شخص سے کہا۔ "تم باہر جاؤ... میں ذرا اکیلا ہی اس کی مردانگی چیک کرتا ہوں۔"

دراز قد شخص تو جیسے پہلے ہی کسی ایسے موقعے کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً میری آفر قبول کی اور رنگ سے باہر نکل گیا۔ تماشائیوں کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ انہوں نے شور مچا کر اور تالیاں بجا کر میرے فیصلے کو سراہا۔ خاص طور سے کریم کے ہمنواؤں اور داؤد کے قریبی ساتھیوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ کرسچین ریفری نے میرے لباس کی تلاشی لی پھر مجھے باکسنگ گلوز پہنا دیے۔ اس نے مختصر الفاظ میں مجھے مقابلے کی شرائط بھی بتائیں اور زبانی کلامی میری رضامندی بھی دریافت کی۔

اس نے کہا۔ "وڑی... یہ پانچ راؤنڈ کا مقابلہ ہوئیں گا۔ ہر راؤنڈ تین منٹ کا... اور دو راؤنڈز کے درمیان کھالی دو منٹ کا وقفہ ہوئیں گا۔ بیلٹ کے نیچے کوئی مُکا نہیں لگایا جائے گا۔ راؤنڈ کے بیچ میں اگر جیادہ چوٹ لگ جائے تو تم کسی بھی وقت مقابلہ ھتم کرنے کا کہہ سکتا ہے..."

میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے میں، میں نے اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ یہاں ایک بھی اس پائے کا فائٹر نہیں تھا کہ دو منٹ بھی میرا سامنا کر سکتا۔ تین تین منٹ کے پانچ راؤنڈ تو بہت زیادہ تھے۔ بہرحال میں یہ مقابلہ جلد ختم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

کچھ دیر بعد گھنٹی بجی اور باکسنگ شروع ہوئی۔ پہلے ہی منٹ میں اس گھمنڈی چیمپئن نے مجھے ایسا کھلا موقع دیا کہ میں اس کی ناک کی ہڈی برابر کر کے اسے رنگ میں لمبا لٹا سکتا تھا لیکن میں نے اسے ہلکے پنچ لگانے پر ہی اکتفا کیا۔ ان ہلکے پنچوں نے بھی اس کا بالائی ہونٹ پھاڑ دیا اور خون اس کی ٹھوڑی کو رنگین کرنے لگا۔ راؤنڈ کے ختم ہونے تک میں نے اسے کئی زوردار چوٹیں لگائیں مگر کوئی چوٹ بھی اتنی

سنگین نہیں تھی کہ اسے ناک آؤٹ ہونے کا موقع ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی حوصلہ افزائی اور تماشائیوں کی دلچسپی کے لیے میں نے خود بھی اس سے چند چوٹیں کھائیں۔

بلی چوہے کا یہ کھیل اگلے راؤنڈ میں بھی جاری رہا۔ اس راؤنڈ میں اس کا نچلا ہونٹ بھی زخمی ہوگیا۔ وہ ایک بار تیورا کر گھٹنوں کے بل بھی گرا مگر میں نے اسے مزید کوئی کاری چوٹ نہ لگا کر سنبھلنے کا موقع دیا۔ اس میں جتنی صلاحیت تھی اسے وہ آٹھ دس گنا بڑھا بھی لیتا تو میرا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال میں اسے تھوڑی سی سزا دینا چاہتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر یہ باؤٹ پانچویں راؤنڈ تک کھینچا۔ اس دوران میں دو تین موقع ایسے بھی آئے جب مجھے لگا کہ لودھی صاحب کا بولو رام ہوگیا ہے اور جناب ازخود ناک آؤٹ ہوکر اپنی جان چھڑانے کا سوچ رہے ہیں۔ بالآخر پانچویں راؤنڈ کے دوسرے منٹ میں، میں نے چیمپئن صاحب کی یہ خواہش پوری کردی۔ کراٹے کی طرز کا ایک راؤنڈ پنچ لگا کر میں نے اسے زمین بوس کردیا۔

کریم کے حمایتیوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کچھ رِنگ میں داخل ہوگئے اور مجھے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کی جسے کانگڑی پہلوان جھارا نے ناکام بنایا اور اپنی حفاظت میں مجھے لوگوں کے نرغے سے نکال لایا۔ یہاں ہونے والی لڑائی کی شرائط کے مطابق چیمپئن شپ تو لودھی کے پاس ہی رہی تھی لیکن چیمپئن بنتے ہی اس کی جو دھلائی ہوئی تھی اس نے اس کا سارا مزہ خاک میں بلکہ کہنا چاہیے گوبر میں ملادیا تھا۔

داؤد نے پُرجوش انداز میں میری پیٹھ ٹھونکی۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یہ بڑے پر پُرزے نکالنے لگا تھا۔ اب کچھ دن ٹھنڈا ہوکر بیٹھے گا۔''

مختار جھارا بولا۔ ''آپ سے سوتے میں اس نے جو مار پیٹ کی تھی اس کا بدلہ بھی چکادیا آپ نے۔''

روبی بھی بہت خوش نظر آرہی تھی۔ ہال میں موجود کئی لوگ اچک اچک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک یہ جانتے تھے کہ تین دن پہلے مضافاتی علاقے میں واحد، فاروق اور ان کے ایک ساتھی کی درگت میں نے ہی بنائی تھی۔ آج انہوں نے بچشمِ خود میرا زورِ بازو دیکھ لیا تھا (بہرحال اس بات سے ابھی تک داؤد اور جھارے کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں تھا کہ اس تہ خانے سے باہر شہر بھر کی پولیس مجھے ایک دہشت گرد کی حیثیت سے تلاش کررہی ہے)

داؤد مجھے لے کر اپنے خاص کمرے میں آگیا۔ وہ وسکی کی بوتل کھولتے ہوئے بولا۔ ''تم نے آج لاہور کے مانے ہوئے پھڈے بازوں کے سامنے لودھی کو مار لگا کر اپنی دھاک بٹھادی ہے۔ ویل ڈن... ویری ویل ڈن۔''

اس نے ایک گلاس میں وسکی انڈیلنے کے بعد دوسرے میں انڈیلنے کی کوشش کی تو میں نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ ''نہیں داؤد بھائی اس وقت بالکل موڈ نہیں۔''

''کیوں؟''

''میرا سینہ جل رہا ہے داؤد بھائی۔ میری آنکھوں کے سامنے لاشیں ہیں اور آگ ہے، میں وہ سب کچھ بھول نہیں پارہا ہوں۔''

''اوئے جھلے! بھولنے کے لیے ہی تو یہ چیز پی جاتی ہے۔ تم تیئس سال یورپ میں رہے ہو۔ کیا اتنا بھی پتا نہیں۔ ابھی ایک دو پیگ لو، غم کو تھوڑا سا غلط کرو پھر سوچتے ہیں تمہارے سینے کی جلن کے بارے میں بھی۔''

''نہیں داؤد بھائی، میں اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی بھی غیر قانونی طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے انصاف چاہیے۔ صرف انصاف... خالص انصاف۔''

وہ سر پیچھے کی طرف ڈال کر زور سے ہنسا۔ ''بھائی میرے، خالص تو یہاں دودھ تک نہیں ملتا، تم انصاف کی بات کررہے ہو۔ یہاں ہر اچھی چیز چھیننی پڑتی ہے اور انصاف تو پیار محبت سے مل ہی نہیں سکتا۔''

''کیوں نہیں مل سکتا بھائی؟ کیا ہم اندھے بہرے ہیں، کیا ہم پڑھے لکھے نہیں۔ بات کرنا نہیں جانتے، بات سمجھنا نہیں جانتے۔ اگر ایک بات سچ ہے تو پھر سچ کو ثابت کرنے میں دشواری کیوں پیش آتی ہے۔ وہ سارے جانے پہچانے محاورے کہاں ہیں؟ سانچ کو آنچ نہیں... سچ کا بول بالا... سچ کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے... کاغذ کے پھولوں سے خوشبو نہیں آسکتی، وغیرہ وغیرہ۔''

''شاہ زیب، تم پڑھے لکھوں والی باتیں کررہے ہو اور یہاں آج کل کچھ اور طرح کے محاورے چل رہے ہیں۔ مثلاً پڑھو گے لکھو گے ہوگے خراب، جو مارو گے کوٹو گے بنو گے نواب۔ یہ جن لوگوں سے زخم کھا کر تم آئے ہو، یہ مارو کوٹو والے لوگ ہی ہیں۔ یہ قبضہ مافیا ہے، لوگوں کی پراپرٹیوں پر قبضہ بھی کرتے ہیں اور ان سے معافیاں بھی منگواتے ہیں یعنی قبضہ مافیا شکیل داراب کو تو جان ہی گئے ہو نا تم؟ سنا ہے کہ اس نے علاقے کے ایک بڑے زمیندار حاجی نذیر سے معافیاں منگوائی ہیں اور اس کی بیٹی کا قبضہ بھی حاصل کیا

ہے۔''

میرے ذہن میں ایک بار پھر وہی سارا واقعہ تازہ ہوگیا۔ سینے میں ایک اور ٹیس اٹھی۔ عارف کا افسردہ چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ میں نے سڑک والے حادثے میں اس کی جان بچائی تھی اور وہ آج کل اس بات کی تمنا کررہا تھا کہ اسے موت ہی آجاتی تو اچھا تھا اور شاید اپنی جگہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ بے بسی کے شکنجے میں تھا۔ اس کی محبت کسی اور کی دسترس میں تھی اور وہ ان طاقتور لوگوں کو بس دیکھ سکتا تھا، ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ عاشرہ کوئی ''شاملات'' زمین نہیں تھی لیکن اس سے شاملات والا سلوک ہی ہوا تھا۔ اس کی کمزور چاردیواری پر اختیار کا بلڈوزر دوڑایا گیا تھا اور پھر راتوں رات اس پر ہوس کے پلازے کی تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ میرے وکیل کزن عبداللہ نے مجھے پورے وثوق سے بتایا کہ عاشرہ شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے ہی شکیل داراب کی بیوی بن چکی ہے۔

داؤد کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''حاجی نذیر جیسے لوگ اور اس سے بھی بڑے لوگ جب بے بس ہو جاتے ہیں تو میں اور تم کیا چیز ہیں۔ اب ان پولیس والوں کے لمبے ہاتھ ملاحظہ کرو۔ پلک جھپکتے میں ان لوگوں نے تمہیں ایک یورپ پلٹ پاکستانی سے یورپ پلٹ دہشت گرد بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے جال بڑے مضبوط ہوتے ہیں، اب تم لاکھ تڑپو پھڑکو گے لیکن نکل نہیں سکو گے۔ سمجھو کہ جو جھٹے چڑھ گیا وہ چڑھ گیا۔''

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''کچھ بھی ہے داؤد بھائی، میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ میں گرفتاری دوں گا۔''

''اور وہ تمہیں مفرور بنا کر شوٹ کریں گے اور پولیس مقابلے کا کیس بنا کر یا پھر خودکشی وغیرہ کا ڈراما رچا کر مٹی کے نیچے پہنچادیں گے۔ اگر کہو تو میں یہ بات تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں۔ اسٹام پیپر پر۔''

''اور اگر میں کسی بہت معتبر بندے کے ذریعے اور میڈیا کی موجودگی میں گرفتاری دوں تو پھر؟''

''پھر بھی کچھ نہیں ہوگا۔'' داؤد نے گھونٹ لیتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ایسا تگڑا بندہ کہاں سے ڈھونڈو گے جو قیصر چودھری جیسے پولیس والوں کو نکیل ڈال سکے۔ مچھلی پانی کب پیتی ہے کوئی جان سکا ہے؟ اسی طرح کوئی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ اپنے اختیار کے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے پولیس والے من مانی کب کرلیتے ہیں۔''

''لیکن میں جس بندے کے بارے میں سوچ رہا ہوں وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ مسئلہ صرف اس سے رابطے کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بار اس سے رابطہ ہوگیا تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''

''ہم بے خبروں کو بھی معلوم ہو نام، اس ذاتِ شریف کا۔'' داؤد نے لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''شاید آپ نے بھی نام سنا ہو، جسٹس اختر ملک۔''

''ریٹائرڈ جسٹس اختر... ملک۔'' داؤد نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

''اختر ملک صاحب کا نام میں نے ڈنمارک میں بھی ایک انگلش لائر سے سنا تھا، اس نے ان کی تعریف کی تھی اور اچھے لفظوں میں یاد کیا تھا۔ یہ نام اس وقت سے میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ بدھ کو بالکل اتفاقیہ طور پر ایک بار پھر یہ نام میرے کانوں میں پڑا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ بیدیاں روڈ کے فارم کے پاس ایس پی تبریز سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں تبریز نے بھی اختر ملک کا نام لیا اور بتایا کہ وہ ایسے معاملوں میں ڈٹ جانے والے بندے ہیں۔ کوئی حقیقی شکایت ہو اور ان کے پاس لے جائی جائے تو وہ پورا ساتھ دیتے ہیں۔''

داؤد نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تو پھر کیا رائے ہے؟''

''اختر ملک صاحب سے رابطہ کرنا چاہ رہے ہو؟''

''جس طرح کی پولیس گردی میرے اور ولید کے ساتھ ہوئی ہے، اس کے بعد تو رابطہ کرنا بنتا ہے۔ اگر وہ وقت دینے پر آمادہ ہوجائیں تو میں اپنے کزن ایڈووکیٹ کو بھی ساتھ لے جاسکتا ہوں۔'' میری آواز دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

داؤد نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو تم چاہتے ہو کہ اختر ملک صاحب کے ذریعے اپنی گرفتاری پیش کرو؟''

''میرا خیال ہے کہ ان جیسے نیک نام شخص پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ مجھے پولیس کے سامنے پیش ہونے کا کہیں تو میں ہو جاؤں گا۔''

''لیکن ان سے وقت لینا تو کافی مشکل ہوا کرتا

ہے۔"

"کیا آپ ان کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں؟"

"ہاں... جانتے ہی ہیں تھوڑا بہت۔" داؤد نے عجیب انداز میں کہا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ اختر ملک صاحب کے بارے میں تھوڑا بہت نہیں کافی کچھ جانتا ہے۔

اس نے ایک بار پھر چبھتی ہوئی نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔ آخری گھونٹ بھر کر وہسکی کا بدبودار گلاس خالی کیا اور اپنے سیل فون پر ایک نمبر پریس کرنے لگا۔

"کس کو فون کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ملک صاحب کے پرسنل سیکریٹری اسلم باجوہ کو۔ وہ آل اِن آل ہے۔"

چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ "کون؟" دوسری طرف سے ابھرنے والی مدھم آواز میرے کانوں میں بھی پہنچی۔

"میں داؤد بھاؤ بول رہا ہوں باجوہ۔"

"ہاں بھاؤ، کیا حال ہے؟" دوسری طرف سے روکھی سی آواز سنائی دی۔

"آپ سناؤ، کیا حال چال ہیں؟ ملک صاحب کیسے ہیں؟"

"ملک صاحب کے بارے میں تمہیں خبر نہیں ملی؟" باجوہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیوں... کیا ہوا؟" داؤد نے پوچھا۔

"ملک جی کے بڑے داماد فیروز خان فوت ہو گئے ہیں۔"

"او مائی گاڈ... فیروز خان فوت ہو گئے۔ کب... کیسے؟"

"ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ایکسپائر ہو گئے۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"آج چار دن ہو گئے۔"

"اوہ... ویری ویری سوری۔ میں دو تین دن سے اخبار دیکھ سکا ہوں اور نہ ٹی وی پر نظر پڑی ہے۔ پچھلے ہفتے کسی نے بتایا تھا کہ کلفٹن فائرنگ والے کیس میں فیروز کی ضمانت کینسل ہوئی ہے۔ بہرحال بہت افسوس ہے باجوہ۔ میں کوشش کر کے خود بھی ملک صاحب کے پاس حاضری دوں گا۔"

"اچھا... اب کس لیے فون کیا تھا؟" دوسری طرف سے قدرے خشک لہجے میں کہا گیا۔

"باجوہ، ایک بہت ضروری کام ہے... اور بہت ارجنٹ بھی ہے۔ ایک بالکل بے گناہ بندے کو پولیس مقابلے کا سخت خطرہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک صاحب کے ذریعے خود کو پیش کر دے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"یار... دس پندرہ منٹ کا وقت لے دو اُن سے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ صدمے میں ہوں گے لیکن یہ کام بھی بہت ایمرجنسی کا ہے۔ مجھے یقین ہے اس بندے کی پوری بات سننے کے بعد..."

"یار خدا کا خوف کرو... خدا کا خوف کرو بھاؤ۔" باجوہ سخت بیزاری سے بولا۔ "اب ان پیشیوں سے اور سلنڈروں سے معاف کر دو ملک صاحب کو۔ وہ بہت نیکیاں کما چکے ہیں اور بہت نیکیاں بھگت بھی چکے ہیں۔ کیا اب ان کی جان لے کر چھوڑو گے آپ لوگ۔"

"لیکن باجوہ..." داؤد کی بات ادھوری رہ گئی، دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

فون ایک طرف رکھ کر داؤد نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی عقابی آنکھوں میں طنز کے نشتر چمک رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے داؤد نے جس فیروز نامی بندے کی خبر سنی ہے اس خبر سے وہ پہلے ہی آگاہ تھا۔

"کچھ اندازہ ہو رہا ہے تمہیں کہ لوگ یہاں کس طرح بے بس ہو جاتے ہیں؟" داؤد نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو بھائی؟"

"ابھی تم نے سنا ہے کہ فیروز خان جو ملک صاحب کا بڑا داماد تھا ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہو گیا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ ہارٹ اٹیک اسے کہاں ہوا؟"

"کہاں؟"

"پولیس کی کسٹڈی میں۔"

"وہ کیوں؟"

"اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے بھی ہوتے ہیں۔ اختر ملک صاحب بہت ہی اچھے ہیں لیکن ان کا بڑا داماد دوسری ٹائپ کا نکلا۔ بری سوسائٹی نے اسے کالے دھندوں کی طرف لگا دیا۔ اب سال ڈیڑھ سال سے وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ جسٹس اختر صاحب کے سمجھانے بجھانے پر اس نے دبئی سے پولیس کو اپنی گرفتاری بھی دے دی تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ بندہ تو کمبل کو چھوڑتا ہے، کمبل بندے کو نہیں چھوڑتا۔ سرپٹ دوڑتے گھوڑے نے جو دھول اُڑائی

ہوتی ہے وہ بھی کبھی کبھی گھوڑے کے رکنے کے بعد بھی اس کو گھیر لیتی ہے۔ فیروز خان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے جو دشمنیاں پالی ہوئی تھیں انہوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ اپنے اچھے کریکٹر کی وجہ سے اختر ملک صاحب نے بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں میں اپنے کئی دشمن بنا رکھے ہیں۔ ان ملے جلے دشمنوں نے کام دکھایا اور بدھ کی رات گیارہ بجے بیالیس سالہ فیروز خاں پولیس کی حراست میں ہلاک ہوگیا۔''

''اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟''

''کہا تو یہی جا رہا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر دورہ ہی پڑا ہے تو کیوں پڑا ہوگا؟'' داؤد کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''تمہارا مطلب ہے داؤد بھائی کہ وہ تشدد سے ہلاک ہوا؟''

''صرف مار پیٹ ہی تشدد نہیں ہوتا۔ پولیس کے پاس ایک سو ایک حربے ہوتے ہیں۔ تمہیں کہا ہے نا کہ کون بتا سکتا ہے، مچھلی کب پانی پیتی ہے۔''

میں سناٹے میں داؤد بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بہت گہرا شخص تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ... اب یہاں کیا کہا جائے۔ اختر ملک صاحب کی دلیری اور ان کے اندر کی سچائی میں کوئی شک نہیں مگر جو شخص اپنے داماد کو اپنے ہاتھوں سے سلنڈر کروانے اور پیش کرنے کے بعد حالات کے جبر سے نہیں بچا سکا، وہ تمہیں یا مجھے کیا بچائے گا؟''

میرے پاس داؤد کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس ایک تکلیف دہ حیرت تھی جس نے مجھے سرتاپا گھیرا ہوا تھا۔

کمرے سے باہر ان لوگوں کا شور تھا جو میری اپ سیٹ جیت پر خوش تھے۔ اس شور میں کبھی کبھی نعرے بازی بھی شامل ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

وہ رات میں نے عجب بے قراری میں گزاری۔ میں رات کے تیسرے پہر تک جاگتا رہا اور مختصر کمرے میں بے چین گھومتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ کوئی میری مدد کرنے والا، مجھے سہارا دینے والا نہیں۔ مجھے ہر طرف سے بس ایک ہی مشورہ دیا جا رہا تھا۔ میں غیر مشروط طور پر خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ خود کو ان لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دوں جو رحم وکرم جانتے ہی نہیں اور جن کی بے حسی دور زندگی میں نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کی تھی۔ ان کے جی میں آئے تو کسی وجہ سے میری زندگی بخش دیں، نہیں تو کسی ویرانے میں لے جا کر شوٹ کر دیں یا پھر چاہیں تو مجھ پر سنگین ترین چارجز لگا کر پھانسی کے تختے تک پہنچا دیں۔

میرے اندر بغاوت جاگنے لگی تو میں نے خود کو ملامت کی۔ خود کو سمجھایا کہ مجھے ایسے ہلکے پن کا ثبوت نہیں دینا۔ اگر میں اس موقعے پر خود کو سنبھال نہ سکا تو یہ بڑی عام سی بات ہوگی۔ ہر دوسری فلم اور ہر تیسرے ڈرامے کا یہی موضوع ہوتا ہے۔ ماحول کا جبر اور حالات کی ناانصافی اور پھر ایک شریف شہری کا صبر کھو کر اینگری مین بن جانا۔ ہتھیار اٹھا لینا اور خود پر ظلم کرنے والوں سے چن چن کر انتقام لینا۔ بے شک جو کچھ ہوا وہ بہت ہی برا تھا لیکن میں یہ کہانی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس عامیانہ پن سے بچنا چاہتا تھا۔ میں آخر تک کوشش کرنا چاہتا تھا کہ میں قانون کے دائرے میں رہوں۔ سب کچھ سہنے کے باوجود وہی کچھ کروں جو ایک پڑھے لکھے، باشعور شہری کو کرنا چاہیے مگر پتا نہیں کیوں اب پچھلے ایک دو روز سے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں شاید کامیاب نہ ہو پاؤں۔ میری چھٹی حس میرے اندر سے پکار کر کہہ رہی تھی کہ کچھ لوگوں نے ایک راستے کے سوا میرے لیے باقی سارے راستے بند کر دیے ہیں اور یہ وہی راستہ ہے جس پر میں چلنا نہیں چاہتا۔ ہاں، وہی پُرخار راستہ جو آتش نگر کو جاتا ہے۔ جہاں زہریلی ہوائیں چلتی ہیں اور جہاں انگاروں کی بارش ہوتی ہے۔ جہاں کہرام مچتے ہیں اور جہاں شب وروز خونی تھلکوں کا راج رہتا ہے۔

میں نے اپنا سیل فون تو احتیاطاً بند کر چھوڑا تھا۔ داؤد بھاؤ کے اسسٹنٹ مختار جھارا نے مجھے ایک گمنام نمبر والا فون دے دیا تھا۔ اگلے روز میں نے اس سیل فون کے ذریعے ایک بار پھر عبداللہ کے نمبر پر ٹرائی شروع کر دی۔ ٹرائی کرتے کرتے اچانک عبداللہ سے کال مل گئی۔

''ہیلو!'' اس کی بھرائی ہوئی بوجھل آواز سنائی دی۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''عبداللہ بھائی کہاں ہو تم؟ میں نے پرسوں سے کوئی سو دفعہ فون کیا ہے، کبھی بیل جاتی تھی کبھی ویسے ہی آف ہوتا تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کیا کروں؟''

عبداللہ نے ذرا توقف کیا پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! یہاں بھی معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ ہماری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟''

''امی اور ابا جان آ گئے تھے پاکستان؟'' میں نے اپنے والدین کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں تمہاری امی تو گھٹنوں کے درد کی وجہ سے نہیں آسکیں۔ تایا جی پہنچ گئے تھے اور انہوں نے دونوں جنازوں میں شرکت بھی کی۔''

''ابا جان کو کیا بتایا ہے تم نے؟''

''نہ بھی بتاتے تو یہ سب کچھ چھپنا تو نہیں تھا پھر بھی کئی باتیں ان سے چھپائی ہیں۔ وہ بہت پریشان تھے۔ رکنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں زبردستی واپس کوپن ہیگن بھیج دیا ہے۔ ویسے بھی انہیں تائی جان کی تیمارداری کرنا تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی ان کا فون آیا ہوا تھا۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے تائی جان کو یہاں کی خبروں سے بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے یہاں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہے۔'' عبداللہ نے افسردہ آواز میں کہا۔ ''پرسوں پولیس اہلکار چچا حفیظ کے علاوہ مجھے بھی پکڑ کر لے گئے تھے پھر تمہاری بھابی کو بھی تھانے پہنچا دیا گیا۔ کل شام ہم میاں بیوی کی جان تو وقتی طور پر چھوٹ گئی لیکن چچا بدستور تھانے میں ہی رہے۔''

''اب کیا حال ہے ان کا؟ کہاں ہیں وہ؟''

''حال زیادہ اچھا نہیں ہے۔ ایک تو چچی اور فائزہ کی جدائی کا صدمہ، اوپر سے تفتیشی افسر نے ان کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ ان سے پوچھ تاچھ کے لیے لاہور سے اسپیشل افسر آیا ہوا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ زیب اگر تم جلدی پیش نہ ہو گئے تو یہ لوگ چچا حفیظ پر بھی سنگین چارج لگا دیں گے۔ وہ پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ تم اور ولید وہاں بیکری کی آڑ میں جو کچھ کر رہے تھے اس کا چچا حفیظ کو پورا علم تھا...''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی عبداللہ کی طرف کسی دوسرے سیل فون کا کال میوزک سنائی دینے لگا۔ عبداللہ نے کہا۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرنا شاہ زیب، دوسرے فون پر کال آرہی ہے۔''

میں نے ہولڈ کیا۔ عبداللہ ایک دوسرے فون پر بات کرنے لگا۔ اس کی بالکل مدھم آواز ہی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے اسی صحافی دوست باذان سے بات کر رہا ہے۔ یہ بات طول پکڑ گئی اور تین چار منٹ جاری رہی۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ بالآخر دوسرے فون پر ہونے والی بات چیت ختم ہوئی اور میرے والے فون پر عبداللہ کی بوجھل آواز سنائی دی۔

''ہیلو شاہ زیب۔''

''ہیلو عبداللہ... کون تھا؟''

عبداللہ نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھ لیا نا شاہ زیب! وہی ہوا جس کا ڈر تھا...'' اس کی آواز بیٹھ گئی۔ میرے ذہن میں سیکڑوں اندیشے چنگھاڑنے لگے۔

''کیا ہوا عبداللہ بھائی، مجھے بتاؤ؟''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر عبداللہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''شاہ زیب لگتا ہے کہ دنیا بھر کی بری خبروں کا رخ ہماری طرف ہی ہو گیا ہے۔ چچا حفیظ کو تفتیشی سینٹر سے اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ وہ آج صبح تین بجے سے...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا ہوا عبداللہ... پوری بات بتاؤ؟''

''چچا... کومے میں ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔'' عبداللہ کی آواز دلدوز تھی۔ میں سکتہ زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس گھرانے کے ساتھ اور میرے ساتھ۔ ہم پر بالکل بے بنیاد الزامات کی بارش کر دی گئی تھی اور اس سلسلے کو کہیں روکا نہیں جا رہا تھا۔ کوئی اس مصیبت میں مدد نہیں کر رہا تھا۔ ہاتھ نہیں پکڑ رہا تھا۔ جیسے یہ انسان کی بستی ہی نہیں تھی جنگل کا قانون تھا۔ درندہ ریوڑ میں سے ایک شکار کو دبوچ لے تو باقی سارے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔

چچا حفیظ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان پر آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی آبائی جگہ جہاں ان کی بے شمار یادیں تھیں بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ قبضہ مافیا کے لوگ جن کا سرغنہ یقیناً قیصر چودھری کا بدنام سسر لالہ نظام چودھری ہی تھا جو ان کے درپے ہو گیا تھا اور اب چچا اور ہم سب عام شہری نہیں تھے خطرناک دہشت گرد تھے۔ میڈیا کو اور عام لوگوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ آتش زدگی کی جگہ سے جو شواہد ملے ہیں ان میں گندھک، لوہے کے ٹکڑے اور نٹ بولٹ وغیرہ بھی شامل ہیں جو اس شک کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ یہاں دھماکا خیز مواد تیار کیا جا رہا تھا۔

میں فون سننے کے بعد قریباً پانچ منٹ تک وہیں بیٹھا رہا، ان پانچ منٹ کے اندر میرے ذہن میں زبردست قسم کی ہلچل رہی۔ آخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا، یہ ایک تہلکہ خیز فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کے سوا اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد داؤد بھاؤ نے مجھے وہی خبر سنائی جو مجھے فون پر عبداللہ کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب! حالات اسی رخ پر جا رہے ہیں جس کا مجھے ڈر تھا۔ تمہارے چچا تفتیشی سینٹر سے سیدھے اسپتال پہنچے ہیں اور وہ بے ہوشی میں ہیں۔''

''مجھے پتا چل گیا ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اور یہ لوگ کہیں رکیں گے نہیں۔ یہ تمہیں مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ تم پیش ہو جاؤ۔''

''تو پھر ہو جاتا ہوں پیش۔'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

داؤد نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ بے حد جہاندیدہ اور زیرک شخص تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں جیسے بندے کے اندر تک اتر جاتی تھیں۔ اس نے سگریٹ سلگا کر دو گہرے کش لیے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا تم نے کوئی فیصلہ کیا ہے؟''

''ہاں۔''

''داؤد بھاؤ اگر تم برا نہ مانو تو میں کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہتا ہوں۔''

''زبردست... بہت خوب... مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والے لوگ اچھے لگتے ہیں۔''

''شکریہ۔''

''دیکھو شاہ زیب! میں یاروں کا یار ہوں۔ تمہیں پناہ دی ہے تو تمہارا ساتھ دے کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ تم نے اپنے اندر کوئی جھجک نہیں رکھنی۔ اگر مجھ سے کسی طرح کا تعاون چاہیے ہوگا تو میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں وہ تعاون ملے۔''

''میں جانتا ہوں داؤد بھاؤ لیکن...''

''لیکن... کیا؟''

''اگر میں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔''

اس نے ایک اور گہرا کش لے کر کہا۔ ''میں تمہارے اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''شاید... میں آپ کو کل بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا بس گہری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح دس گیارہ بجے میں نے پھر داؤد بھاؤ سے ملاقات کی۔ وہ ابھی ابھی اپنے بیڈروم سے نہا دھو کر نکلا تھا۔ یقیناً روبی کی قربت میں اس نے ایک خوشگوار شب گزاری تھی۔ روبی بھی اپنے گیلے بالوں کی نمائش کرتی پھر رہی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ مجھے ایک ایسا بندہ چاہیے جو تمہارے بھروسے کا ہو لیکن پولیس کو مطلوب نہ ہو۔''

وہ مسکرایا۔ ''کافی مشکل ڈیمانڈ کی ہے تم نے لیکن چلو میں ڈھونڈ لیتا ہوں۔''

''اور ایک موٹر سائیکل اچھی حالت کی۔ ون ٹو فائیو سی یا اس سے اوپر کی ہو جائے۔ ساتھ میں گہرے شیشے والا ہیلمٹ بھی۔''

''اوکے، یہ دونوں چیزیں بھی مل گئیں۔ موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ اصلی چاہیے یا نقلی؟''

''نقلی... اور اگر ہو سکے تو ایک پستول اور قریباً دو درجن فالتو راؤنڈ۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے داؤد بھاؤ کو دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ ''توپ سے نیچے نیچے جو مانگو گے مل جائے گا لیکن کچھ اشارہ تو دو کہ ارادے کیا ہیں؟''

''داؤد بھاؤ ارادہ نہ ہی پوچھو۔ میں تمہیں اس معاملے میں انوالو کرنا نہیں چاہتا اور اس بات کی ضمانت بھی دیتا ہوں کہ میرے کسی اقدام کی وجہ سے تم پر زد نہیں پڑے گی۔ جو بندہ تم مجھے دے رہے ہو وہ بھی براہِ راست کسی کام میں ملوث نہیں ہوگا۔''

''مطلب ہے کہ اعتماد نہیں کر رہے ہو۔'' داؤد بھاؤ کا لہجہ ذرا افسردہ ہو گیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف کر کے کہا۔ ''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اگر فی الوقت میں پورے شہر میں کسی پر اعتماد کر سکتا ہوں تو وہ تم ہی ہو داؤد بھاؤ۔''

میری بات نے اس کی افسردگی ذرا کم کی۔ وہ سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو ہو۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اشارہ یہی ہے داؤد بھاؤ کہ آج کل لاہور کی سڑکوں پر ایکسیڈنٹ بہت ہو رہے ہیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ اس کی چمکیلی نظریں جیسے بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ مجھے میری

مطلوبہ چیزیں مل گئیں اور بندہ بھی مل گیا۔ یہ بالکل عام قد کاٹھ اور عام شکل وصورت والا ایک نوجوان تھا۔ بال تھوڑے گھنگھریالے تھے، حلیے سے یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہی لگتا تھا لیکن ظاہر تھا کہ اگر وہ داؤد بھاؤ جیسے شخص کے ساتھ رابطے میں تھا تو پھر بالکل عام شخص تو نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام انیق بتایا۔ وہ تک سک سے بڑی درست اردو بول رہا تھا اور قدرے باتونی بھی لگتا تھا۔ وہ لاہور کے گلی کوچوں کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم اس بیسمنٹ کے خفیہ راستے سے نکلے اور گیسٹ ہاؤس کی عمارت میں پہنچ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمنٹ سے گیسٹ ہاؤس کی تقریباً چار دیواری تک پہنچنے کے لیے قریباً بیس میٹر لمبی سرنگ بنائی گئی ہے اور یہ کام زیادہ پرانا بھی نہیں ہے۔ شاید ڈیڑھ دو سال پہلے ہی یہ چور راستہ تعمیر ہوا ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں چہل پہل تھی۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے، لڑکیاں ہی نظر آرہے تھے۔ سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ گیراج میں کئی موٹر سائیکل موجود تھیں۔ انیق نے ایک 175 موٹر سائیکل کی چابی مجھے تھمائی۔ ہینڈل کے ساتھ ایک گہری شیلڈ والا ہیلمٹ بھی جھول رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ہیلمٹ پہنا اور موٹر سائیکل کا سیلف اسٹارٹ بٹن دبایا۔ وہ بارعب آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوگئی۔ انیق کی رہنمائی میں، میں لاہور کی مختلف سڑکوں کو ناپنے لگا۔ اسکولوں اور دفاتر وغیرہ کو جانے والے اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس لیے ٹریفک نسبتاً کم تھا پھر بھی لاہور کی رونقیں جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتی تھیں۔ ایک خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی جس نے سردی کی شدت میں خاطر خواہ کمی واقع کردی تھی۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ”یہ کون سی سڑک ہے؟“

”اسے لوئر مال روڈ کہتے ہیں۔ ایم اے او کالج سے آگے جاکر یہ راستہ ہمیں ملتان روڈ تک پہنچادے گا۔ ملتان روڈ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے جس کے کنارے لاہور کے مشہور فلم اسٹوڈیوز واقع ہیں۔ شاہ نور اور ایورنیو وغیرہ۔ کمال کی فلمیں بنتی رہی ہیں ان نگار خانوں میں۔“

”صرف کمال کی؟ وحید مراد اور محمد علی وغیرہ کی نہیں؟“

وہ زور سے ہنسا۔ ”میرا مطلب ہے جی کہ بہت شاندار فلمیں بنتی رہی ہیں۔ ویسے آپ کی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پاکستانی فلموں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔“

”نہ ہی جانتا ہوتا تو اچھا تھا۔ کہتے ہیں کہ بوگس فلمیں بنانے میں پاکستان آج کل بہت نام پیدا کررہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جی... لگتا ہے اچھی فلمیں بھی بن رہی ہیں۔ مولا جٹ، شیر خان اور چوڑیاں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“ میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے اچھی فلموں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ بیان کردی۔

اس کی لسٹ پوری ہوتے ہوتے ہم اس مقام تک پانچ چکے تھے جہاں یہ شاہکار فلمیں تیار ہوئی تھیں اور اب وہاں الّو بول رہے تھے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”چلو یہ باتیں بعد میں کریں گے ابھی ہمیں اس جگہ پہنچنا ہے جہاں داراب فیملی کے لوگ ہاؤسنگ اسکیم کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ کیا یہی راستہ آگے جائے گا؟“

”ہاں جی، ابھی آپ سیدھے چلتے رہیں، آگے جاکر میں آپ کو بتاتا ہوں۔“

ہیلمٹ کا اصل مقصد تو سر کو خطرناک چوٹ سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے لیکن یہ ہیلمٹ مجھے آج جو فائدہ دے رہا تھا، یہ بیان سے باہر تھا۔ میں اس شہر کی سڑکوں سے بے دھڑک گزر رہا تھا۔ جہاں کئی جگہ مجھے تلاش کیا جارہا تھا۔ ایک دو پولیس ناکوں سے بھی ہم بخیر وعافیت گزر گئے۔ کسی نے میرا ہیلمٹ اتروانے اور چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شیشے کی شیلڈ اوپر بھی اٹھادی جائے تو ہیلمٹ میں کسی کی صورت پہچاننا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔

ہم بہ آسانی اس مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے جہاں اسکیم کا شروعاتی کام ہورہا تھا۔ مجھے چند ایک بلڈوزر اور ٹرک نظر آئے۔ ایک جگہ بڑے سائز کے کچھ جدید ٹینٹس لگے ہوئے تھے۔ انیق نے کہا۔ ”شاہ زیب صاحب یہ اسٹیٹ ڈویلپرز بڑے چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ سادہ لوح شہریوں سے ان کھیتوں کے معاوضے بھی وصول کرلیتے ہیں جن پر فصلیں کھڑی ہوتی ہیں اور جن پر ابھی صرف کسانوں کا حق ہوتا ہے۔ بس کچھ زمین خریدلی۔ اس پر بلڈوزر وغیرہ کھڑے کردیے اور لوگوں سے بکنگ کے پیسے وصولنا شروع کردیے۔“

مجھے اندازہ تھا کہ یہ موضوع چھڑ گیا تو وہ اس پر بھی ایک دو گھنٹے آسانی سے بات کرلے گا۔ میں نے کہا۔ ”ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہاری معلومات کے مطابق لالہ نظام اپنی اس سائٹ پر آتا جاتا رہتا ہے۔ کیا خیال ہے وہ آج بھی آیا

ہوا ہے۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ "انیق! تمہاری پہلی اطلاع ہی غلط ثابت ہوئی ہے۔ تم نے کہا تھا نظام ڈھائی بجے یہاں بیٹھتا ہے۔ ڈھائی بجنے میں ابھی پینتالیس منٹ باقی ہیں۔"

"آپ ڈنمارک سے آئے ہو جی۔ وہاں تو ٹرینیں بھی سیکنڈوں کے حساب سے اسٹیشن پر پہنچتی ہیں۔ یہاں اگر کوئی ٹرین وقت پر پہنچ جائے تو لوگ ٹرین ڈرائیور کی طبیعت کے بارے میں فکر مند ہو جاتے ہیں۔"

اس روز ہم نے لالہ نظام کی آمدورفت کا پورا جائزہ لیا اور موقع سے کچھ مزید معلومات بھی اکٹھی کیں۔ مجھے پتا چلا کہ کچے پکے راستے کی تعمیر شروع ہو رہی ہے اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک مٹی اور اسفالٹ وغیرہ لے کر سائٹ پر آجا رہے ہیں۔ شام تک میں اپنا ہوم ورک مکمل کر چکا تھا۔ جب نظام اپنی شاندار مرسیڈیز پر اپنے تنومند گارڈ اور دو ساتھیوں کے ہمراہ سائٹ سے واپس روانہ ہوا تو میں نے اس کا دیدار شریف بھی کر لیا۔ وہ بہت بڑے تھوبڑے اور بھاری جثے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ صورت سے ہی پرلے درجے کا پھڈے باز اور جاہ پرست لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہی انگارے میرے سینے میں دہکنے لگے جنہوں نے مجھے یورپ کے کئی بدنام ترین غنڈوں کے سامنے کھڑے ہونے کا اور ان سے ٹکر لینے کا حوصلہ بخشا تھا۔ وہی آگ جسے میں مٹی کے نیچے دفنا کر یہاں آیا تھا لیکن جو اب اپنے مدفن میں راستے بنا بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ لوگ اس آگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ بلا جھجک اپنے ظلم کو بڑھاوا دیتے چلے گئے۔ بالکل اندھا بڑھاوا۔ میری ہزار کوشش کے باوجود انہوں نے میرے سینے پر ایسے گھاؤ لگا دیے تھے جنہیں یکسر فراموش کر دینا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اب ان کو تھوڑا بہت سبق سکھانا تو ضروری ہو گیا تھا۔

اگلا روز بڑا اہم تھا۔ آج صبح سویرے سے ہی مطلع ابر آلود تھا اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بوندا باندی تھم بھی جاتی تھی۔ آج میں اور انیق علیحدہ علیحدہ موٹر سائیکل پر گیسٹ ہاؤس سے نکلے۔ میں نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا مگر انیق نے مقامی رواج کے مطابق اسے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مضافات تک پہنچتے پہنچتے میں تین ناکوں سے بخیریت گزرا۔ یہاں موٹر سائیکل سواروں کی چیکنگ ہو رہی تھی مگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر کوئی ایسی ہوگا؟"

"اگر آیا ہوتا تو کوئی چالیس پچاس لاکھ والی گاڑی بھی یہاں نظر آ رہی ہوتی اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں ابھی تو بس غریب غربا والی ہنڈا سوک اور ٹویوٹا وغیرہ نظر آ رہی ہیں۔"

"یہ جو ٹینٹ وغیرہ لگے ہیں یہاں کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اسکیم والوں کا عارضی دفتر ہوگا۔ بکنگ شروع کرنے کی جلدی ہوتی ہے ناں ان لوگوں کو اس لیے پکے دفاتر بننے سے پہلے عارضی دفتروں میں ہی رقمیں بٹورنا شروع کر دیتے ہیں۔"

ہم ذرا بلندی پر کھڑے تھے۔ ٹینٹ وغیرہ نشیب میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے انیق سے کہا۔ "ذرا گاہک بن کر جاؤ۔ ریٹ اور قسطوں وغیرہ کا حال معلوم کرو اور ساتھ ہی یہ جاننے کی کوشش بھی کرو کہ لالہ نظام کی آمد یہاں کب ہوتی ہے۔"

انیق کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کے کام وہ بڑے ذوق شوق سے کرتا ہے۔ وہ چلا گیا اور میں وہیں ایک درخت کے نیچے سنسان سی جگہ پر موٹر سائیکل کا پلگ کھول کر بیٹھ گیا۔ انیق کی آمد پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ یہ اس عظیم الشان ہاؤسنگ اسکیم کے بارے میں اشتہاری مواد تھا یعنی جلد سے جلد گاہک کو پھانسنے کا جال۔

انیق نے بتایا۔ "اچھی خبر ہے، لالہ نظام کی آمد یہاں سوموار اور منگل کے سوا قریباً روزانہ ہی ہوتی ہے۔ وہ ڈھائی بجے کے قریب تشریف لاتے ہیں اور کم از کم ایک گھنٹا رکتے ہیں یعنی آج بھی قریباً ایک گھنٹے بعد وہ یہاں قدم رنجہ فرمائیں گے۔"

"کوئی گارڈ وغیرہ بھی ساتھ ہوتا ہوگا؟"

"اس بارے میں پوچھا تو نہیں لیکن یقینی طور پر ایک دو تو ضرور ہوتے ہوں گے۔ میں نے دس پندرہ دن پہلے لالہ نظام کی سفید مرسیڈیز جیل روڈ پر دیکھی تھی۔ اس میں گارڈ موجود تھا۔"

میری نظر دور کچے پکے ناہموار راستے پر پڑی۔ ایک سفید کار ہچکولے کھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "کہیں یہی تو نظام کی گاڑی نہیں ہے؟"

اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ "ہاں جی... یہ لالہ نظام کی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ... وہ گاڑی میں بیٹھا بھی

صورتِ حال ہوتی بھی تو میرے کاغذ پورے تھے اور ان میں میرا نام شاہد محمود تھا۔

ہم ہاؤسنگ اسکیم کی وسیع وعریض سائٹ پر پہنچے۔ یہ تین بجے کا وقت تھا۔ نوے فیصد امید تھی کہ اس وقت لالہ نظام اسکیم کے عارضی دفتر میں موجود ہوگا۔ پروگرام کے مطابق ہم نے اپنی موٹر سائیکلز ایک سنسان مرغی خانے کے قریب کھڑی کیں۔ یہاں سے وہ نیم پختہ راستہ زیادہ دور نہیں تھا جہاں سے کل لالہ نظام گزرا تھا۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''تم اسکیم کے دفتر پہنچو اور مجھے کال کر کے بتاؤ کہ لالہ نظام وہاں موجود ہے یا نہیں۔''

انیق اثبات میں سر ہلا کر روانہ ہو گیا۔ اسکیم کا عارضی بکنگ آفس وہاں سے قریباً دو کلومیٹر دور تھا۔ میں ہلکی بارش میں خالی مرغی خانے کے ایک مختصر برآمدے میں کھڑا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد انیق کی کال آگئی۔

''جی شاہ زیب بھائی، لالہ نظام یہاں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ دس پندرہ منٹ تک وہ واپسی کے لیے چل پڑے گا۔ اس کا ڈرائیور گاڑی میں کچھ کاغذات وغیرہ رکھ رہا ہے۔ ابھی لالہ نظام اور اس کے دو دوست چائے پی رہے ہیں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ پندرہ بیس منٹ تک روانہ ہو جائیں گے؟''

''لگ تو یہی رہا ہے جی بلکہ ٹھہریں... ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ اٹھنے والے ہیں۔ ساتھ میں ایک بہت اونچا لمبا پولیس والا بھی ہے... میرا خیال ہے پولیس انسپکٹر ہے۔ ایک بندے نے بتایا ہے کہ یہ نظام چوہدری کا داماد ہے... یہ بھی لالہ نظام کے ساتھ ہی اٹھ رہا ہے۔ اب یہ لوگ گاڑی کی طرف جانے والے ہیں۔'' میری رگوں میں خون کی گردش یکدم انتہا کو پہنچ گئی۔ قیصر چوہدری کا چہرہ اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت ہے۔ سامنے کچے پکے ناہموار راستے سے لدے ہوئے ٹرک گاہے بگاہے گزر رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے نکلا اور راستے کے کنارے پہنچ گیا۔ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر تھا۔ مٹی سے بھرا ہوا ایک ہیوی لوڈر نظر آیا۔ میں بلاتردد اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ کیچڑ آلود راستے پر ڈرائیور نے بریک لگائے اور رک گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر ذرا حیران لہجے میں پوچھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور کچھ سمجھ پاتا میں برق رفتاری سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میرا ایک خطرناک گھونسا ڈرائیور کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ تیورا کر نشست پر گر گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرا گھونسا پھر اس کی ٹھوڑی پر لگا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ میں نے اسے بائیں طرف دھکیلا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ لوڈر کے کیبن میں سے مجھے چرس کی تیز بو آئی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے سازگار تھی۔ میں نے وائپر چلا کر ہیوی لوڈر کی ونڈ اسکرین صاف کی اور لوڈر کو ست روی سے آگے بڑھا دیا۔ یہ ساری کارروائی بمشکل پندرہ بیس سیکنڈ میں مکمل ہوئی تھی۔ اول تو امید نہیں تھی لیکن اگر کسی نے دور سے لوڈر کو دیکھا بھی ہوگا تو اسے بس یہی لگا ہوگا کہ چند سیکنڈ رکنے کے بعد لوڈر پھر حرکت میں آ گیا ہے۔

میرے آگے کافی فاصلے پر ایک زرد رنگ کا لوڈر نظر آرہا تھا۔ عقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی لہٰذا میں کافی ست روی سے پہلے دوسرے گیئر میں آگے بڑھتا رہا۔ اسی دوران میں وہ کال آگئی جس کا انتظار تھا۔ انیق نے مجھے بتایا کہ لالہ نظام اپنی سفید گاڑی میں روانہ ہو گیا ہے۔ گاڑی میں اس کے انسپکٹر داماد کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ یہ میرے لیے بڑی زبردست سچویشن تھی۔ چند منٹ پہلے تک مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ قسمت اس طرح ساتھ دے گی اور مجھے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ یہ تو سراسر ایک زبردست بونس تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''لو انسپکٹر قیصر چوہدری! جو بویا ہے وہ کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں آرہا ہوں تمہارا حساب چکانے۔''

وہیکل ہینوٹرک بلندی میں بھی کافی زیادہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں زمین سے سات آٹھ فٹ کی اونچائی پر بیٹھ کر ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔ ناہموار راستے پر اس سیکڑوں ٹن وزنی وہیکل کو ڈرائیو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میری نگاہیں سامنے راستے پر جمی ہوئی تھیں اور میرے سینے میں دہکے ہوئے انگاروں اور پھنکارتے شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے لوڈر کے ڈیش بورڈ کا ایک خانہ کھل گیا۔ کچھ تصویریں پھسل کر نیچے آگریں۔ یہ عریاں تصویریں تھیں بلکہ انہیں فحش کہنا چاہیے۔ سفید فام مرد وزن اپنی جانی پہچانی سرگرمیوں میں مصروف نظر آرہے تھے۔

یقیناً یہ اسی ڈرائیور کا اثاثہ تھا جو میرے پہلو میں بے ہوش پڑا تھا اور جس کی سانس میں چرس کی بو رچی بسی تھی۔ میں نے ان تصویروں کو ویسے ہی بکھرا رہنے دیا۔

اور پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا پوری وحشت کے ساتھ مجھے انتظار تھا۔ مجھے دور فاصلے پر لالہ نظام والی سفید گاڑی دکھائی دی۔ پوندا باندی کے درمیان وہ ہچکولے کھاتی میری طرف آرہی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کا فاصلہ تھا۔ میرے اندر ایک سفاک بے حسی پروان چڑھتی چلی جارہی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کردی۔ گاڑیاں مزید نزدیک آگئیں۔ مجھے لالہ نظام کی مدھم جھلک نظر آئی پھر قیصر چودھری کی وردی کی مختصر جھلک دکھائی دی۔ قیصر کا جسم شاید اس وردی کے لائق ہی نہیں تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب اس نے بے وجہ مجھے تھپڑ مارا تھا اور پھر اس تھپڑ کی معافی بھی مجھ سے منگوائی تھی اور دو بار منگوائی تھی کیونکہ وہ معافی کے الفاظ پر مطمئن نہیں ہوا تھا (اور یہ سب کچھ اس بڑی درندگی سے پہلے ہوا تھا جو اُن لوگوں نے فائزہ، چچی آمنہ اور چچا حفیظ کے سلسلے میں دکھائی تھی)

میرے جبڑے بے ساختہ بھنچ گئے۔ میں نے ٹرک کی رفتار بڑھائی۔ وہ اپنے بے پناہ وزن کے ساتھ اچھلتا اور چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ جیسے کوئی دیوہیکل شکاری جانور اپنے چھوٹے سے شکار پر جھپٹ رہا ہو اور پھر وہ جھپٹا۔ میں نے لوڈر کا اسٹیئرنگ گھمایا۔ وہ سفید کار کی طرف بڑھا۔ کار سواروں کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا ہوگا کہ ایسا ہو رہا ہے اور جب تک یقین آیا ہوگا بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ ٹرک اور کار کا تصادم ہوا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا، تڑخا، پچکا، شیشے چکنا چور ہوئے۔ دیوہیکل ٹرک کار کو روندتا اور گھسیٹتا ہوا آگے تک لے گیا۔ نیچے پھسلن تھی۔ کار پچکنے کے بعد راستے سے نیچے اتری اور قریباً چالیس پچاس فٹ دور موٹے تنے والے دو جڑواں درختوں سے ٹکرائی۔ دائیں جانب سے اسے لوڈر نے کچل کر رکھ دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک سرخ چادر تنی ہوئی تھی۔ اس چادر کی دوسری طرف مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے مجھے نظام کے ایک نیم گنجے ساتھی کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے آہنی فریم میں لالہ نظام کا ایک کٹا ہوا بازو دکھائی دیا پھر گاڑھے دھوئیں نے گاڑی کو بھر دیا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ کسی کے بچنے کی امید کم ہی تھی۔ نیم پختہ راستے سے اترنے کے بعد ہیوی ٹرک بھی خطرناک انداز میں ایک پہلو پر جھک گیا تھا۔ ٹرک کی جہازی سائز کی اسکرین چکنا چور تو نہیں ہوئی تھی مگر اس کا بایاں حصہ تڑخ گیا تھا اور مکڑی کے جالے کی طرح بڑی بڑی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ دائیں طرف والی کھڑکی بھی پچک گئی تھی۔

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ پھنسا ہوا تھا لیکن ٹانگ کی زوردار ضرب لگا کر میں نے دروازہ کھولا اور باہر کود گیا۔ سیاہ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں اس دھوئیں میں جھک کر بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہوگیا۔ اب میرا رخ اپنی موٹر بائیک کی طرف تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اسٹیئرنگ اور ہینڈل وغیرہ پر سے میں نے اپنے فنگر پرنٹس صاف کردیے تھے۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور انیق واپس بیسمنٹ میں موجود تھے۔ داؤد بھاؤ کا چہرہ متغیر تھا۔ اس نے سنسنی آمیز حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ ٹی وی پر حادثے کی خبر چلنا شروع ہوگئی ہے۔ ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ داؤد بھاؤ میرے ساتھ سیدھا اپنے پرائیوٹ کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ایل سی ڈی پر ایک معروف نیوز چینل ٹیون تھا اور نیوز کاسٹر بڑے جوش وخروش سے حادثے کی اطلاع دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''ہمارا نمائندہ موقع پر موجود ہے... وہاں کی تازہ ترین صورتِ حال سے ہم آپ کو آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ عدنان بخاری سے ہمارا رابطہ ایک بار پھر ہوگیا ہے۔ جی عدنان... بتائیے اب جائے حادثہ پر کیا صورتِ حال ہے؟''

نمائندے عدنان کی تصویر اسکرین پر نظر آئی۔ بیک گراؤنڈ سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ملی جلی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ بولا۔ ''جی... میں سڑک کے کنارے موقع پر موجود ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے لالہ نظام چودھری نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ ان کی اور ان کے ایک دوست کی باڈی کو فریم کاٹ کر کار کے ڈھانچے میں سے نکالا گیا ہے۔ ان کے دوست نے بھی گاڑی کے اندر ہی دم توڑا ہے۔ ان کا نام رانا امتیاز بتایا جارہا ہے۔ لالہ نظام کے داماد پولیس انسپکٹر قیصر چودھری کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ایک اور شخص شدید زخمی ہے اور اسے جنرل اسپتال پہنچایا گیا ہے...''

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''اچھا عدنان! ہمیں یہ بتائیے کہ

حادثے کی وجہ کیا بیان کی جارہی ہے؟''

عدنان نے کہا۔ ''ظاہری وجہ تو خراب راستے پر ٹرک کی تیز رفتاری ہی دکھائی دیتی ہے پھر یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ڈرائیور نشے میں تھا، پھسلن کی وجہ سے وہ ٹرک پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ لالہ نظام کی گاڑی سے جا ٹکرایا۔ ڈرائیور بشیر ابھی تک بے ہوش ہے۔ اس کے سر پر سنگین چوٹ آئی ہے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی صورتِ حال واضح ہو سکے گی۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''عدنان! متعلقہ حکام کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اس اندوہناک حادثے میں کسی سازش کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے؟''

''جی... ابھی میری بات انتظامیہ کے ایک ذمے دار افسر سے ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ لالہ نظام چودھری ہاؤسنگ اسکیم کے لیے رقبے ایکوائر کر رہے تھے۔ اس حوالے سے کئی لوگوں سے ان کے تنازعات بھی چل رہے تھے۔ بہت سے کیس عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔ اس امر کو ہرگز خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کے اَن گنت بدخواہوں اور کاروباری رقیبوں میں سے کسی نے انہیں راستے سے ہٹانے کی یہ سنگدلانہ کوشش کی ہو۔''

داؤد بھاؤ نے چینل بدلا۔ ایک اور نیوز چینل پر ایک ادھیڑ عمر شخص کو دہاڑیں مارتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے دکھایا گیا۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''او ظالموں نے میرا بھائی مار دیا۔ وہ میرا بھائی نہیں تھا میرا باپ تھا۔ میں لالے کے بغیر یتیم ہو گیا۔ میں تباہ ہو گیا...''

معلوم ہوا کہ یہ لالہ نظام کا چھوٹا بھائی وریام چودھری ہے۔

میں نے سوچا، اپنی پیاری بیٹی فائزہ اور بیوی کی موت کے بعد چچا حفیظ نے بھی تو ایسے ہی پچھاڑیں کھائی ہوں گی۔ ایسے ہی نوحہ گری کی ہوگی۔ ظالم کا ظلم سہتے جانا بھی ظلم ہی ہوتا ہے۔ شاید اس طرح ہم بالواسطہ طور پر جبر اور ناانصافی کو رواج دیتے ہیں۔

تب اسکرین پر ایک اور منظر ابھرا۔ یہ لالہ نظام چودھری کی نہایت فربہ اندام زوجہ تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''میرے سر کا سائیں چلا گیا۔ میں برباد ہوگئی۔ مجھے انصاف چاہیے...'' وہ اپنی وسیع و عریض چھاتی کوٹنے لگی۔

وہ انصاف کی دہائی دے رہی تھی اور جانتی نہیں تھی کہ یہ انصاف ہی ہوا ہے بلکہ شاید رعایت کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔

داؤد نے بٹن دبا کر ایل سی ڈی کی اسکرین تاریک کر دی۔ وہ یک ٹک میری طرف دیکھنے لگا پھر نیا سگریٹ سلگا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''لاہور کی سڑکوں پر ایک اور جان لیوا ایکسیڈنٹ؟''

میں نے کہا۔ ''چلتی کا نام گاڑی اور جو چلتی ہے وہ لگ بھی سکتی ہے۔''

''لوڈر کا ڈرائیور ہوش میں آ کر کیا بیان دے گا؟'' داؤد نے پوچھا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں۔ ویسے بھی وہ مجھے دیکھ نہیں پایا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

میرا اطمینان و سکون داؤد بھاؤ کو ورطۂ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس کی عقابی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ طویل کش کا دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم... ڈنمارک میں کیا کرتے رہے ہو؟''

''داؤد بھائی تمہیں بتایا تو ہے سب کچھ...''

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ چہرے پر عجیب کیفیت تھی پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو جس خول میں بند کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ تم باہر نکل آئے ہو اور تمہارے ساتھ ہی وہ آگ بھی نکل آئی ہے جس پر تم نے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اب سب کچھ بدل گیا ہے اور اس بدلاؤ کے عین مطابق... تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

اس نے چند لمحے توقف کیا پھر مجھے جانچنے والی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''حاجی نذیر کی بیٹی عاشرہ کی شادی ہونے والی ہے، شکیل داراب کے ساتھ... کیا خیال ہے، کیسی رہے گی یہ زورا زوری کی شادی؟''

میرے سینے میں جیسے بھک کے ساتھ کچھ جل اٹھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

وہ ایک رات

منظر امام

دوستی نبھانا آسان نہیں... ان تینوں دوستوں کو بھی اپنے دوست کی مدد کرنے کا شوق چرا رہا تھا... اور وہ اس سے دلی ہمدردی رکھتے تھے... ہنستی مسکراتی اور پُرپیچ راستوں سے گزرتی ایک پُرمزاح کہانی... تینوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے... اور تنہا بھی تھے۔
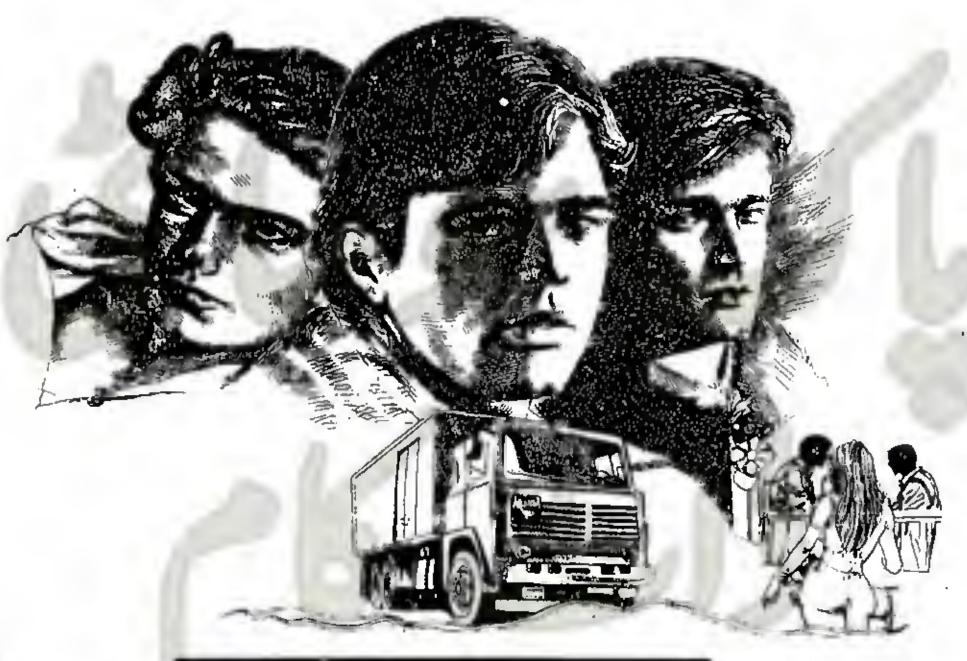
مغرب سے موصول کردہ ایک دلچسپ و تیز رفتار کہانی کے اتار چڑھاؤ

چھوٹے علاقوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

ان علاقوں میں کوئی عام سی خبر بھی یوں پھیل جاتی ہے جیسے جنگل میں آگ... اور علاقے کا ہر شخص اس خبر کو اپنے گھر کی خبر محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ خبر بھی پورے ہاکس ہل میں ذرا سی دیر میں پھیلتی چلی گئی تھی۔

ہاکس ہل کسی بڑے قصبے سے دور ایک چھوٹا سا پُرسکون علاقہ تھا۔ یہاں کی زندگی میں ہلچل بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے جب بیلی کے زخمی ہونے کی خبر آئی تو سب ہی

کو معلوم ہو گیا۔

حادثے کا تو پتا چل گیا تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔

بیلی اس قصبے سے دور سیم فیس میں ملازمت کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ سیم فیس ایک بڑا شہر تھا۔ وہاں تعمیراتی کام بہت زور و شور سے ہو رہا تھا۔ بیلی کو ایک کنسٹرکشن کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ جب بیلی کے گھر کے فون کی گھنٹی زور و شور سے بجنے لگی۔ بیلی کی ماں نے بہ مشکل فون ریسیو کیا تھا۔

وہ اس وقت کچن میں تھی جب اس نے فون کی گھنٹی سنی۔ اس کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے جانا بہت مشکل تھا۔

وہ اتنی موٹی ہو چکی تھی کہ کبھی کبھی اس کے لیے چلنا پھرنا بھی محال ہو جاتا تھا اسی لیے وہ بہت مشکل سے فون تک پہنچی تھی۔

فون کرنے والا بتا رہا تھا کہ بیلی کسی بلڈنگ میں کام کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے جہاں ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بیلی کی ماں نے یہ سنتے ہی رونا دھونا مچا دیا۔ وہ شور کرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں بہت سے پڑوسی اور دوست احباب اس کے گھر پر جمع ہو گئے۔

پھر یہ خبر ذرا سی دیر میں پورے ہاکس ہل میں پھیل گئی کہ بیلی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ حادثہ کیا تھا۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔

پھر بیلی کے ایک دوست کا فون آیا۔ وہ سیم فیس میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی گرل فرینڈ کو فون کر کے بتایا کہ بے چارہ بیلی بلڈوزر کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد اسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے کسی کا فون آیا۔ وہ بیلی کی ماں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ بیلی کی ماں اس وقت نیم بے ہوش ہے اور کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہے۔

جس پڑوسی نے یہ فون سنا تھا، اس نے فون کرنے والے سے جب تفصیل معلوم کرنا چاہی تو اسے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اسے صرف اتنا ہی بتایا گیا کہ بیلی کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد بیلی کی ماں کا چھوٹا سا گھر آنے جانے والوں سے بھر گیا۔ سب کے سب بیلی کے زخمی ہونے کی خبر سن کر صورتِ حال معلوم کرنے چلے آ رہے تھے۔

محلے کے دکاندار، پڑوسی، چرچ سے تعلق رکھنے والے لوگ... اور بیلی کی ماں کے پرانے جاننے والے۔

بیلی کی ماں کی حالت تو اس قابل نہیں تھی۔ پڑوس کی عورتوں نے کچن سنبھال لیا اور چائے بنا کر آنے والوں کو دینے لگیں۔

جبکہ مرد حضرات سگریٹ اور سگار کے کش لیتے ہوئے اس صورت حال پر گفتگو کرتے رہے۔ اس وقت ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اسی لیے جب کوئی نئی بات کسی کے ذہن میں آتی یا کوئی نیا خیال ظاہر کرتا تو وہ بات اندر تک پہنچا دی جاتی اور جب کسی عورت کے ذہن میں کوئی بات آ جاتی تو یہ بات مردوں تک پہنچ جاتی۔

کچھ لوگ تو یہ بحث بھی کرنے لگے کہ اگر اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کی آخری رسومات کس طرح ادا کی جائیں گی۔

پھر ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ اسی قصبے کی تھی۔ سب اسے جانتے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بیلی اس کا دوست ہے۔ وہ خوب صورت لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔

بیلی کی ماں بھی اس لڑکی کو جانتی تھی اور اس سے بہت شکایتیں بھی تھیں۔ اس لڑکی کے آنے کی خبر اس کو ہوئی تو اس نے کہا کہ اس لڑکی سے کہہ دیا جائے کہ وہ واپس چلی جائے۔ کسی کو اس کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ لڑکی کچھ دیر بعد واپس چلی گئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جو باہر ہی کھڑا تھا۔

ایک پڑوسی کا کزن سیم فیس میں ہی رہتا تھا۔ پڑوسی نے اپنے کزن کو فون کر کے بیلی کے بارے میں بتایا۔

کزن نے خود اسپتال جا کر صورتِ حال کو مانیٹر کیا پھر فون پر بتایا کہ بیلی کو بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔ ڈاکٹر اس کی سرجری کرنے والے ہیں۔ اس کے جسم کا بہت خون ضائع ہو چکا ہے۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ بیلی ایک فورمین کا اسسٹنٹ ہے۔ وہ دونوں کام کر رہے تھے کہ ایک بلڈوزر کے دھکے سے بیلی اچھل کر ایک طرف جا گرا اور کسی گڑھے کے اندر چلا گیا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ ایک اجنبی نمودار ہوا۔ وہ بہت

اچھے لباس میں تھا۔ وہ کسی کمپنی کا سراغ رساں تھا اور اس حادثے کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

مردوں کے درمیان بیلی کا ماموں بھی موجود تھا۔ وہ دونوں کچھ فاصلے پر جا کر باتیں کرنے لگے۔ پھر اس اجنبی نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر ماموں کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کارڈ رکھ لو۔ گلنٹن نام ہے اس کا۔ بہت زبردست وکیل ہے۔ کمپنی والوں سے ایک ایک پائی وصول کر لے گا۔''

بیلی کا ماموں اس اجنبی سے بہت مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ایک طرف کچھ لوگ سیم فیس جانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ ہاکس ہل سے اس کا فاصلہ اگرچہ دو ڈھائی گھنٹے کا تھا لیکن رات کی دشواریوں کی وجہ سے یہ مدت زیادہ بھی ہو جاتی تھی۔

سیم فیس ایک دوسری ریاست میں تھا۔ وہ ایک دوسری دنیا تھی۔ وہ ہاکس ہل کی نسبت بہت بڑا شہر تھا۔ وہاں جرائم بھی بہت زیادہ ہوا کرتے۔ بیلی کی ماں بستر پر لیٹی بیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سفر کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بیلی کے لیے خون کا بندوبست کیسے ہوگا۔ بیلی کی شادی شدہ بہن کلنٹن میں رہتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی اس کے علاوہ کلنٹن سے سیم فیس کا فاصلہ بھی بہت زیادہ تھا۔

کئی دشواریاں تھیں۔ ایک تو کئی گھنٹوں کا سفر طے کر کے سیم فیس پہنچنا۔ زخمی بیلی کے لیے خون کا بندوبست کرنا، پھر قصبے کی طرف واپس آنا۔

ایسا کون ہوسکتا ہے جو بے چارے بیلی کے لیے اپنی رگوں کا منہ کھول دے۔ ایسے میں ایک ہیرو سامنے آگیا۔ اس کا نام ڈان ایگر تھا لیکن اسے ایگی کہا جاتا۔ وہ ایک نوجوان تھا اور ہاکس ہل میں بیلی کا دوست۔

وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر ایک دکان چلایا کرتا۔ اس کے پاس ایک پک اپ بھی تھی جس کے ذریعے وہ سیم فیس تک جاسکتا تھا۔

''میں جاؤں گا بیلی کو خون دینے۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بلا کی بے نیازی اور فخر کا احساس تھا۔ سب اسے تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ''میں ابھی اور اسی وقت روانہ ہو جاؤں گا۔'' اس نے اعلان کیا۔

اس وقت ایک تجربہ کار عورت نے مداخلت کی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ صرف تمہارے خون سے کام چل جائے گا۔ نہیں، تم تو زیادہ سے زیادہ ایک ہی پنٹ دے سکو گے جبکہ بے چارے بیلی کو کہیں زیادہ کی ضرورت ہوگی۔'' پھر وہ رک کر بولی۔ ''اور خون دینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ موٹی ٹیوب اور خون کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔''

بیلی کے پڑوسی جو کچھ دیر پہلے بہت زیادہ محبت کا اظہار کر رہے تھے، وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تھے۔

''میں بھی چل رہا ہوں۔'' بالآخر ایک اور نوجوان کھڑا ہو گیا۔

اس کا نام کالون تھا۔ سب اسے ستائشی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایک دو نے تو باقاعدہ مبارک باد بھی دے ڈالی۔

کالون ایک جوشیلا نوجوان تھا۔ وہ ان دنوں بے روزگار تھا اور اس وقت اس کے پُرجوش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح وہ سیم فیس جیسے بڑے شہر کو دیکھ سکتا تھا۔

ایگی کو چونکہ ایک ساتھ دینے والا مل گیا تھا اس لیے اس کے لہجے میں اور بھی خود اعتمادی آگئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی اور ہے؟''

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

ایگی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''میں اپنا ٹرک ساتھ لے جاؤں گا اور فیول کے پیسے بھی میں ہی دوں گا۔''

''تو ہم لوگ کب روانہ ہو رہے ہیں؟'' کالون نے پوچھا۔

''ابھی، اسی وقت۔'' ایگی نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ہم انتظار نہیں کر سکتے، یہ ایمرجنسی کا معاملہ ہے۔''

''میں راجر کو ساتھ کر دوں گا۔'' ایک اُدھیڑ عمر شخص کی آواز آئی۔

کئی چہروں پر تلخیاں نمودار ہوگئیں۔ راجر کی بات کرنے والا اس کا باپ تھا۔ اس علاقے میں راجر کی شہرت بہت خراب تھی۔ وہ ایک نکما اور ناکارہ قسم کا شخص تھا۔ الکحل کا عادی، کئی بار اسے تنبیہ بھی کی گئی تھی۔

''بے چارہ بیلی اب راجر کے خون پر زندہ رہے گا؟'' کسی نے تبصرہ کیا۔

سب جانتے تھے کہ راجر کس قسم کا شخص ہے اور وہ

پریشانیاں پیدا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔
''آج کل وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' راجر کے باپ نے کہا۔ ''اس نے اپنے آپ کو بدل لیا ہے۔''
''لیکن وہ ہے کہاں؟'' بالآخر ایگی نے پوچھا۔
''وہ گھر پر ہے۔'' اس کے باپ نے بتایا۔
ظاہر ہے راجر کا اور کام ہی کیا تھا۔ وہ گھر میں ہی پڑا رہتا تھا۔
کچھ دیر بعد عورتوں نے لنچ باکس تیار کر کے دے دیے۔ جن میں سینڈوچز کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔
ایگی اور کالون اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے جیسے دنیا فتح کرنے جا رہے ہوں۔ راجر کے باپ نے اسے پیغام بھجوا دیا تھا۔ وہ پوسٹ آفس کے پاس کھڑا ایگی اور کالون کا انتظار کر رہا تھا۔
بالآخران کی روانگی شروع ہوئی۔ قصبے کے لوگ ٹرک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے رہے۔ کیونکہ یہ تینوں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دینے جا رہے تھے۔
راجر اسی جگہ کھڑا تھا جہاں کے لیے اسے ہدایت دی گئی تھی۔ ایگی نے اپنا ٹرک اس کے پاس لا کر روک دیا۔
''ہوں۔'' راجر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک وقت پر آئے ہو۔''
طے یہ پایا کہ راجر بیچ میں بیٹھے گا اور ایگی اور کالون کھڑکیوں کے پاس۔ کھانے کے ڈبے راجر کی گود میں رکھ دیے گئے۔
اس بندوبست کے بعد ٹرک روانہ ہوا۔ راجر نے کچھ دور کے بعد باکس سے سینڈوچ نکال کر کھانا شروع کر دیا تھا۔
ایگی اور کالون بھی رول کھا رہے تھے جو بیلی کے گھر سے انہیں ملے تھے۔
کالون نے کن انکھیوں سے راجر کی طرف دیکھا۔ وہ اب دوسرا سینڈوچ نکال رہا تھا۔ کالون نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر چپ ہو گیا۔ وہ راجر کے مزاج سے واقف تھا۔ ذرا سی کوئی بات بھی اسے بری لگ سکتی تھی اور وہ لڑائی جھگڑے پر اُتر آتا۔
اس وقت یہ بڑی بات تھی کہ وہ بیلی کو خون دینے جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ بیلی کو زیادہ نہیں جانتا تھا جبکہ ایگی اور کالون بیلی کے دوستوں میں سے تھے۔
وہ تینوں ہی کنوارے تھے۔ ایگی اور راجر نے تو لڑکیوں سے دوستی کر رکھی تھی لیکن کالون اس معاملے میں دونوں سے پیچھے تھا۔
''آگے کسی گیس اسٹیشن پر روک دینا۔'' راجر نے کہا۔ ''میں ذرا واش روم ہو آؤں۔''
آگے بلیوڈوٹ پر ٹرک روک دیا گیا۔ راجر ٹرک سے کود کر اسٹیشن کی طرف دوڑ گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ نشے میں ہے۔'' کالون نے کہا۔
''لیکن اس کے باپ کا تو کہنا ہے کہ راجر نے شراب چھوڑ دی ہے۔''
''وہ جھوٹ بولتا ہے۔ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔''
راجر کچھ دیر میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بیئر کا پیکٹ تھا۔ جس میں بیئر کے چھ کین تھے۔ یہ خریداری اس نے اسٹیشن کے اسٹور سے کی تھی۔
ایک بار پھر وہ درمیان میں بیٹھ گیا۔ ٹرک چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد راجر نے ایک ڈبا ایگی کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔''
''نہیں شکریہ۔ میں اس وقت گاڑی چلا رہا ہوں۔''
''کیا تم دونوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتے؟''
''نہیں۔''
''اچھا چلو، تم لو۔'' اس نے وہی ڈبا کالون کی طرف بڑھایا۔
''نہیں شکریہ۔ میرا اس وقت موڈ نہیں ہے۔''
''کیا بات ہے۔ لگتا ہے تم دونوں نے تہیہ کر رکھا ہے۔'' راجر نے اپنا ڈبا کھول رکھا تھا۔
''میں نے تو سنا تھا کہ تم نے چھوڑ دی ہے۔'' کالون نے پوچھا۔
''ہاں یار، دو تین بار چھوڑ چکا ہوں لیکن چھٹتی کہاں ہے یہ کافر لگی ہوئی۔''
کالون کے پاس کھانے کے ڈبے تھے۔ اس نے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کر دیے۔ راجر نے اپنا ڈبا خالی کر کے کالون کی طرف بڑھا دیا۔ ''پلیز اسے ذرا باہر پھینک دینا۔''
کالون نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے خالی ڈبا ایک طرف اچھال دیا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو راجر نے ایک اور ڈبا کھول لیا تھا۔
کالون اور ایگی ایک دوسرے کو الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔
''کیا تم نشے کی حالت میں کسی کو خون دے سکتے

وہ ابھی واپ

ہو؟'' ایگی نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' راجر نے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں کئی بار پہلے بھی اسی حالت میں خون دے چکا ہوں۔'' پھر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم دونوں نے کبھی خون دیا ہے؟''

''نہیں۔'' ان دونوں نے جواب دیا۔

راجر کے چہرے پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''چلو، میں بتاتا ہوں کہ خون کس طرح دیا جاتا ہے۔ پہلے تو خون دینے والے کو بستر پر لٹا دیتے ہیں۔ پھر اس کی کلائی پر ایک تسمہ باندھ دیتے ہیں جس سے کہنی کے پاس کی موٹی رگ واضح ہو جاتی ہے۔ پھر ایک بڑی سی سوئی اس رگ میں اتار دیتے ہیں۔ اس سوئی کا تعلق ایک ٹیوب سے ہوتا ہے اور وہ ٹیوب ایک تھیلی سے ملی ہوتی ہے۔ پھر گاڑھا گاڑھا سرخ خون اس کی رگ سے نکل کر ٹیوب سے ہوتا ہوا تھیلی میں گرنے لگتا ہے۔ تم خود اپنی آنکھوں سے اپنے خون کو جسم سے نکلتا ہوا دیکھ سکتے ہو۔''

اس تفصیل نے ان دونوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ راجر اطمینان سے گھونٹ بھرتا رہا۔ اس نے پھر کہا۔ ''الکحل سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خون پتلا ہو کر آسانی سے نکل جاتا ہے اور زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔''

کچھ دیر بعد ایگی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں بھی تھوڑی سا پی ہی لوں۔''

راجر نے فوراً ایک ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ضرورت ہے۔'' کالون بھی بول پڑا۔

راجر نے ایک ڈبا اس کے بھی حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اب مزہ آئے گا۔ بات یہ ہے کہ اصل شرابی کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ اکیلے نہیں پیتا۔''

ایگی اور کالون نے چسکیاں لینی شروع کر دیں جبکہ راجر لمبے لمبے گھونٹ بھر رہا تھا۔ پھر جب چھ ڈبوں کا پیکٹ ختم ہونے لگا تو اس نے اعلان کیا۔ ''مجھے پھر پیشاب کی حاجت ہو رہی ہے۔ کیو لے بار بی کیو پر روک دینا۔''

وہ اب نیو گرو و پہنچنے ہی والے تھے۔ جو ایک چھوٹا سا شہر تھا اور ایگی یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سفر آخر کتنا طویل ثابت ہوگا۔

ایگی نے ٹرک بار بی کیو پر روک دیا۔ راجر پھرتی سے نیچے اتر کر بار بی کیو کے برابر والے اسٹور میں گھس گیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو اور پیکٹ تھے۔

اس بار ان دونوں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ سفر پھر شروع ہو گیا۔ وہ چھوٹا شہر جب کچھ پیچھے رہ گیا تو راجر نے نیا پیکٹ کھولتے ہوئے کالون سے پوچھا۔ ''تم کبھی سیم فیس گئے ہو؟''

''نہیں، کبھی نہیں۔'' کالون نے جواب دیا۔

''اور تم؟'' اس نے ایگی سے پوچھا۔

''ہاں ایک دو بار سامان لے کر گیا تھا۔'' ایگی نے فخریہ طور پر بتایا۔ ''اور وہاں کے مشہور کلب میں بھی جانا ہوا تھا۔''

''کس کلب میں؟''

''اب نام تو یاد نہیں آ رہا۔ کیونکہ سارے کلب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

''نہیں، اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' راجر نے کہا۔ ''بعض کلب ایسے ہیں جن میں ماہر رقاصائیں ڈانس کرتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو راہ چلتیوں کو اٹھا لیتے ہیں۔''

پھر ان کے درمیان اس بات پر بحث شروع ہو گئی کہ کون سا کلب اچھا ہے اور کس کلب کی کیا تاریخ ہے اور کس کلب میں کون سی مشہور ماڈل یا اداکارہ رقص کیا کرتی تھی۔

راجر بڑی مہارت اور جوش سے بھری ہوئی آواز میں کلب میں ڈانس کرنے والی رقاصاؤں کے بارے میں تفصیل بتانے لگا اور جب اس نے بات ختم کی تو ان دونوں نے محسوس کیا کہ انہیں تھوڑی سی شراب اور پی لینی چاہیے۔

راجر نے اپنی باتوں سے ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا کہ کالون کی سانسیں چڑھنے لگی تھیں۔ اب ان کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سیم فیس میں داخل ہو کر اسپتال جانے سے پہلے انہیں تازہ دم ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے کوئی کلب ہی بہتر رہے گا۔

''میرا مشورہ ہے کہ ہم ڈیسپراڈو چلیں۔'' راجر نے کہا۔ ''وہ سستا بھی ہے اور اچھا بھی ہے۔'' ایگی نے راجر کے اس مشورے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس نے ٹرک کی رفتار بڑھا دی تھی۔ اچانک سامنے سے ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔

ایگی نے تھوڑا سا ٹرک کو لہرایا پھر وہ گاڑی ٹرک کے برابر سے گزر گئی لیکن کچھ دور جانے کے بعد وہ گاڑی

اچانک رک گئی۔ اس کے بریک لگنے کی آوازیں ان تک پہنچ گئی تھیں۔

''اوہ خدا! یہ تو پولیس والے ہیں۔'' راجر چلایا۔ ''اسپیڈ بڑھاؤ، جلدی۔''

''وہ تو ہمارے پیچھے آرہے ہیں؟'' کالون بہت خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''وہ دیکھو، اب ان کی نیلی روشنی بھی دکھائی دے رہی ہے۔''

''لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟'' ایگی نے کہا۔ ''ہمیں ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''بے وقوف رفتار بڑھاؤ۔'' راجر نے کہا۔ ''ہم پکڑے گئے تو بہت برا ہوگا۔''

اب وہ ٹرک اسی میل کی رفتار سے دوڑا جارہا تھا۔ پھر رفتار نوے ہوگئی۔ پولیس کی گاڑی ابھی تک تعاقب میں تھی۔ اس کی نیلی روشنیاں جل اور بجھ رہی تھیں۔

''شراب باہر پھینک دو۔'' کالون خوف سے بولا۔

''نہیں بے وقوف۔'' راجر غرایا۔ ''وہ ہمیں پکڑ نہیں سکتے۔'' پھر اس نے ایگی سے کہا۔ ''اسپیڈ اور بڑھاؤ اور تیز۔''

ٹرک ایک ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ پولیس کی گاڑی ابھی تک ان کے تعاقب میں تھی۔ ایگی بڑی مہارت سے گاڑی چلارہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک پوسٹ بکس دکھائی دے رہا تھا۔ ''ٹرک کو کچے میں اتارلو۔'' راجر نے ہدایت دی۔ ''پوسٹ بکس کے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔''

اب درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یہ تنگ سا راستہ ایک ایسی جگہ جاکر ختم ہوگیا تھا جہاں سامنے ایک مکان دکھائی دے رہا تھا۔

اندھیروں میں ڈوبا ہوا یہ مکان اس علاقے کے ایک بوڑھے کسان گیٹس کا تھا۔

''انجن بند کرو، روشنیاں بجھادو۔''

راجر اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے وہ اس قسم کی سچویشن سے گزرتا رہا ہو۔ ایگی نے ایسا ہی کیا۔ پولیس گاڑی کا سائرن قریب آرہا تھا... اور قریب اور قریب۔ یہ تینوں سیٹ کے نیچے سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ سائرن قریب آتے آتے دور ہوتا چلا گیا۔ پھر اس کی آواز غائب ہوگئی۔ پولیس والے درختوں اور اندھیروں میں چھپے ہوئے اس ٹرک کو دیکھ نہیں سکے تھے۔

کچھ دیر بعد یہ تینوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''اوہ خدا، ہم بال بال بچ گئے۔'' ایگی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تم نے بہت مہارت دکھائی ہے۔'' راجر نے اس کی کمر پر تھپکی دی۔ ''ایسے موقعوں پر ہمیشہ خود کو کنٹرول میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''سائرن کی آواز آرہی ہے۔'' کالون نے بتایا۔

''کم بخت شاید ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔'' راجر نے ایک موٹی سی گالی دی۔ ''جھک جاؤ، جلدی۔'' تینوں پھر جھک گئے۔ پولیس کی گاڑی اس بار بھی سامنے سے گزرتی چلی گئی تھی۔ اس بار وہ تینوں بہت دیر تک اسی پوزیشن میں رہے تھے۔ پھر اچھی طرح اطمینان ہو جانے کے بعد سیدھے ہوگئے۔

''ہم کب تک اس طرح رہیں گے۔'' کالون نے کہا۔ وہ سب سے زیادہ خوف زدہ تھا۔

''بس کچھ دیر اور۔'' راجر نے تسلی دی۔ ''اب ذرا دروازہ کھولو۔ مجھے پیشاب لگ رہا ہے۔''

''کیا تم کچھ دیر رک نہیں سکتے؟'' ایگی نے جھلا کر پوچھا۔

''نہیں یار، بہت مشکل ہے۔'' راجر نے کہا۔

کالون نے اس کے اترنے کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

راجر ٹرک سے اتر کر بوڑھے کسان گیٹس کے ٹرک کی طرف چلا گیا۔ گیٹس کا ٹرک مکان سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کسی خوفناک جانور کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

گیٹس اگرچہ بے خبر سو رہا تھا لیکن اس کی بیوی کی نیند بہت ہلکی تھی۔ اسے محسوس ہوگیا تھا کہ باہر کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے خراٹے لیتے ہوئے گیٹس کا کندھا جھنجوڑ دیا۔ ''کیا ہوا؟'' گیٹس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ باہر کچھ گڑبڑ ہے۔'' گیٹس کی بیوی نے کہا۔ ''کوئی ہے، شاید دو چار آدمی ہیں۔''

گیٹس کو بھی کچھ گڑبڑ کا احساس ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی شاٹ گن اٹھالی۔

راجر ابھی تک گیٹس کے ٹرک کی آڑ میں تھا۔ کالون اور ایگی نے کچن کی لائٹ جلتی ہوئی دیکھی، اس کے ساتھ ہی انہیں ایک آدمی دکھائی دے گیا جس کے ہاتھ میں ایک گن تھی۔

''دوڑو... بھاگو۔'' کالون نے شور مچادیا۔

ایگی اتنی دیر میں انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اس کے

ساتھ ہی باہر کی روشنیاں بھی جل گئیں۔ راجر نے بھی ٹرک کی طرف دوڑ لگا دی۔

کالون اور راجر دونوں اچھل کر ٹرک میں ایک ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ ایگی نے ٹرک کو ریورس کرنے میں بہت مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ پھر انہوں نے گولی کی آواز سنی۔ مکان کی طرف سے گولی چلائی گئی تھی۔

تینوں بالکل خاموش تھے۔ ٹرک مکان سے خاصے فاصلے پر آچکا تھا جب راجر نے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا۔

''یارو، میرا پرس وہیں گر گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟'' کالون اور ایگی ایک ساتھ بول پڑے۔

یہ تو طے تھا کہ اس کے پرس میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا سوائے چند ڈالرز کے۔ لیکن وہ ایسا آدمی تھا جو یہ دعویٰ ضرور کر دیتا کہ اس کے پرس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس کا شناخت نامہ تھا۔ کریڈٹ کارڈ تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' ایگی بالآخر بول پڑا۔

''ہاں بھئی سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا پرس اسی مکان کے پاس کہیں گر گیا ہے۔''

''اب لعنت بھیج دو اس پرس پر۔'' کالون نے کہا۔

''بے وقوفی کی بات مت کرو۔'' راجر غرایا۔ ''کل صبح وہ کسان اس پرس کو دیکھ کر پولیس کو فون کر دے گا اور پولیس اس کی مدد سے ہم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ ہم تینوں مارے جائیں گے۔''

چند لمحوں کی خاموشی رہی۔ پھر ایگی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم واپس چل رہے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے پرس میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

''شرط لگاؤ۔ میرے پرس میں تم دونوں سے زیادہ رقم موجود ہے۔'' راجر پھنکارا۔

''ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔'' ایگی نے کہا۔ ''وہ بوڑھا ابھی جاگ ہی رہا ہوگا۔ کچھ دیر بعد چلتے ہیں جب تک وہ اچھی طرح سو نہ جائے۔ لیکن ہم ٹرک کو فاصلے پر روکیں گے۔ ورنہ آواز سن کر وہ پھر ہوشیار ہو جائے گا اور راجر تم اپنا پرس تلاش کر کے لے آنا۔''

''یہ بھی اچھا ہے کہ اس مکان میں کتے نہیں ہیں۔'' کالون نے کہا۔ ''ورنہ ہم سب کے لیے مصیبت ہو جاتی۔''

وہ تینوں خاموشی سے بیئر پیتے اور انتظار کرتے رہے۔

انہوں نے بیس پچیس منٹ اس طرح گزار دیے جیسے بیس برس گزر گئے ہوں۔ پھر ٹرک کا رخ کسان کے گھر کی طرف ہو گیا۔

کچھ فاصلے پر آکر ایگی نے ٹرک کو روک کر راجر سے کہا۔ ''اب تم جاؤ، ہم دونوں یہیں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

راجر ٹرک سے کود کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

''اب تک ہم نکل چکے ہوتے۔'' کالون نے کہا۔ ''اس کم بخت نے عین وقت پر اپنے بٹوے کی کہانی چھیڑ دی۔''

''وہ نشے میں بھی ہے۔'' ایگی نے تبصرہ کیا۔ ''بتاؤ، کیا کریں۔''

''کچھ نہیں، یہیں بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔''

راجر کو فصلوں کے درمیان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان پانی بھرا ہوا تھا۔ ایک بار اس کا پیر ایک گڑھے میں جا پڑا تھا۔

وہ پچھلی طرف سے کسان کے مکان کی طرف آرہا تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ وہ بوڑھا شاید ابھی تک سامنے والے حصے میں جاگ کر پہرا دے رہا ہوگا۔

درختوں کے درمیان گہرا اندھیرا۔ وہ اس اندھیرے میں کسی بھوت یا جانور کی طرح کہنیوں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بوڑھے کسان کا مکان اب اس کے سامنے تھا۔ پھر اسے وہ ٹرک بھی نظر آگیا جو ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔

راجر نے ٹرک کے ٹائروں کے پاس پیشاب کیا تھا۔ شاید اس کا بٹوا وہیں کہیں گرا ہوگا۔ وہ کہنیوں کے بل چلتا رہا۔

وہ قدم قدم پر مختلف بیلوں اور پودوں سے الجھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ ٹرک کے پاس پہنچ گیا۔

ہر طرف سناٹا اور گہرا اندھیرا تھا۔ مکان کی ساری روشنیاں بند تھیں۔ اس نے گھاس پر ادھر ادھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کی انگلیوں نے بٹوے کو چھو لیا۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے وہ بٹوا اٹھا کر اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔

بوڑھا کلیس برآمدے میں اندھیرا کیے ایک آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے مکان کی طرف آنے والے بدمعاشوں نے اس کے مکان کا پیچھا نہیں چھوڑا ہوگا۔

پھر اس نے کچھ غیر معمولی آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں

چھوٹے جانوروں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ کوئی اس کے ٹرک کے آس پاس تھا۔

اس نے اپنی گن اٹھا کر ہوا میں دو گولیاں چلا دیں۔ صرف خوف زدہ کرنے کے لیے۔

گولیوں کی آوازیں رات کی اس خاموشی میں دور دور تک گونج کر رہ گئیں۔ گیٹس کی بیوی نے دروازہ کھول کر دریافت کیا۔ ''گیٹس کیا ہوا؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ بدمعاش ابھی تک آس پاس ہی ہیں۔'' گیٹس نے کہا۔

''کیا تم نے ان کو دیکھا ہے؟''

''دیکھا تو نہیں، لیکن ایسا لگ رہا ہے۔''

''تم خوامخواہ فائرنگ کر رہے ہو۔''

''تم جاؤ، اندر جاؤ۔'' گیٹس نے اپنی بیوی کو جھڑک دیا۔

گیٹس کی بیوی نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

ٹرک کے نیچے چھپے ہوئے راجر کی حالت اس وقت غیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے پیٹ میں شدید اینٹھن محسوس کر رہا تھا۔

اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ رینگتا ہوا آگے نکل جائے یا پھر واپسی کی راہ اختیار کرے جہاں اس کے دوست ٹرک میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھلنے اور کسان کی بیوی کی آوازیں سنیں۔ ''گیٹس تم باہر کیا کر رہے ہو، آؤ اندر آ جاؤ۔''

''تم اندر جاؤ اور شیرف کو فون کرو۔'' گیٹس کی آواز آئی۔

راجر نے پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ ٹرک کے نیچے دبکا بیٹھا رہا۔ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ بے پناہ خوف کے احساس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

چند منٹوں کے بعد دوبارہ دروازہ کھلنے اور گیٹس کی بیوی کے بولنے کی آواز آئی۔ ''میں نے فون کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ڈپٹی اس وقت پٹرولنگ پر گیا ہوا ہے۔ اس کے آتے ہی اس کو بھیج دیں گے۔''

''تم ایسا کرو، ٹرک کی چابی لے کر آؤ۔ میں خود جاؤں گا۔''

''نہیں گیٹس، اس وقت سخت اندھیرا ہو رہا ہے۔ تم ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔''

''جاؤ، چابی لے کر آ جاؤ۔''

دروازہ پھر بند ہوا۔ گیٹس کی بیوی چابی لینے جا چکی تھی۔ گیٹس نے ٹارچ جلا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

راجر کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ جب گیٹس کا ٹرک چلنے لگے تو وہ خاموشی کے ساتھ بمپر سے لٹک جائے۔ ابتدا میں ٹرک کی رفتار کم ہوتی۔ اس کی رفتار روڈ پر آنے کے بعد تیز ہوتی، وہ بمپر چھوڑ کر لڑھکتا ہوا اندھیروں میں گم ہو جاتا۔

یہ تیسرا امکان تھا۔ دو امکانات یہ تھے کہ یا تو وہ ٹرک کے ٹائروں کے نیچے آ جائے یا گیٹس کی گولیوں کا نشانہ بن جائے۔

اسے ایسی موت نہیں چاہیے تھی۔ اسی لیے اسے بمپر سے لٹکنے والے پلان پر عمل کرنا تھا۔

گولیوں کی آوازیں سنتے ہی ایگی نے ٹرک دوڑا دیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس بے چارے کا کام ہو گیا۔'' کالون نے کہا۔

''کچھ دور جانے کے بعد ایگی نے ٹرک روک دیا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''ایک تو اس طرح اسے چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہم قصبے والوں کو کیا جواب دیں گے۔ کم از کم انہیں بتا تو سکیں گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

اسی وقت پولیس کی شور مچاتی گاڑی تیز نیلی روشنی کے ساتھ ان کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔

''اوہ خدا۔'' راجر نے ایک گہری سانس لی۔ ''اگر اس کے بعد کوئی ایمبولینس بھی آ رہی ہے تو سمجھو ہم لوگ پھنس گئے۔''

راجر نے جب سائرن کی آواز سنی تو سہم کر رہ گیا جو اس کے سر پر آ گئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر ٹرک کے نیچے سے ایک بڑا سا پتھر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سائرن کی آواز سے ایک فائدہ یہ ضرور ہو گیا تھا کہ اس کے بھاگنے کی آواز اس شور میں دب کر رہ جاتی۔

اس نے کچن کی طرف پتھر اچھال دیا۔ پتھر شیشے پر لگا۔ اس نے دونوں میاں بیوی کی جھلک کچن میں دیکھ لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگلا حصہ خالی ہے۔

راجر نے روڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔ جھاڑیوں سے الجھتا، گرتا، پڑتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ پولیس گاڑی مکان کے گیٹ پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور دونوں میاں بیوی ڈپٹی کو صورتِ حال سے آگاہ کر رہے تھے جبکہ راجر اندھیرے

میں ایک طرف دوڑا چلا جارہا تھا۔

ایگی نے ایک جگہ ٹرک روکتے ہوئے کہا۔ ''کالون! ابھی تک کسی ایمبولینس کی آواز نہیں آئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ راجر خیریت سے ہے اور وہ کہیں چھپا ہوا ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ ہم واپس چلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

لیکن راجر کو تلاش کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ سڑک کنارے ایک جگہ کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔

اگرچہ اس کی حالت خستہ ہورہی تھی اس کے باوجود وہ خیریت سے تھا۔ ان کے درمیان گرم جوشی اور حیرت کے کچھ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر یہ سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

راجر کے کپڑے گرد آلود ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر خراشیں تھیں۔ جسم پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔

''میں اس حلیے میں شہر میں داخل نہیں ہوسکتا۔'' راجر نے کہا۔ ''راستے میں اگر کوئی اسٹور آجائے تو ٹرک روک لینا۔''

ایک بڑے پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی ایک اسٹور دکھائی دے گیا۔ ایگی نے ٹرک ایک طرف روک دیا۔ راجر ٹرک سے اتر کر واش روم کی طرف لپک گیا۔

اس نے منہ ہاتھ دھو کر اپنا حلیہ درست کیا۔ اسٹور سے ایک ٹی شرٹ اور ایک پی کیپ خرید لی۔ اس کے علاوہ اس نے بیئر کا ایک بڑا بکس بھی خرید لیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ واپس لوٹا تو وہ دونوں اسے تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''ہاں، اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم اب انسان دکھائی دے رہے ہو۔''

راجر ایک بار پھر درمیان میں بیٹھ گیا۔ سفر پھر شروع ہوا۔ بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ تینوں ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ایک خطرناک وقت آخر ٹل گیا تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس ہو چکے تھے اور شاید ابھی بھی انہیں بہت فاصلہ طے کرنا تھا۔ اب سیم فیس شہر کے آثار شروع ہوچکے تھے۔

سڑک کنارے لگے ہوئے بڑے بڑے اشتہاری بورڈز قریب ہوتے چلے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک بورڈ ڈسپراڈو کلب کا بھی تھا۔ جہاں جولیا نام کی مشہور رقاصہ کا رقص ہوا کرتا تھا۔ اس بورڈ پر جولیا کی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔

ایگی نے ٹرک کو اس بورڈ کے پاس لاکر روک دیا۔ وہ تینوں اس رقاصہ کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے کرتے اور ہنستے رہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے اسپتال چلنا چاہیے۔'' ایگی نے کہا۔ ''نہ جانے بیلی کیسا ہو۔''

اتنے گھنٹوں کے بعد پہلی بار بیلی کا ذکر ہوا تھا۔

''ارے بھائی، اسپتال تو ساری رات کھلا ہی رہتا ہے۔'' راجر نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ رات کو اسپتال بند کرکے مریضوں کو باہر نکال دیتے ہوں گے۔''

اس مذاق پر تینوں ہنسنے لگے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پہلے ڈسپراڈو چلیں۔'' ایگی نے پوچھا۔

''اور کیا۔'' کالون بھی بول پڑا۔ ''فریش ہوکر اسپتال چلتے ہیں۔''

ان کے درمیان ایک سنسنی خیز قہقہہ پھوٹ پڑا۔

ڈسپراڈو کے گیٹ پر ایک باڈی بلڈر قسم کے دربان نے روک لیا۔ ''اے، اس طرح منہ اٹھائے کہاں چلے جارہے ہو؟''

''تو پھر کیا کروں؟'' راجر نے پوچھا۔

''انٹری فیس دیتے جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بندے کا دس ڈالر۔''

''دس ڈالر تو بہت زیادہ ہیں۔''

''اگر زیادہ لگ رہے ہیں تو اپنے کھٹارے پر بیٹھو اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔''

وہ تینوں گیٹ سے کچھ فاصلے پر آگئے۔ ان کے درمیان یہی بحث ہورہی تھی کہ صرف انٹری فیس دس دس ڈالر دیں یا نہ دیں۔

''یار! یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' ایگی نے کہا۔ ''چلو کہیں اور چلتے ہیں۔''

''ہر جگہ کی انٹری فیس ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔'' راجر نے بتایا۔

کلب کے اندر سے آتی ہوئی تیز موسیقی کی آواز نے کالون کو پُرجوش کر دیا۔ ''بھائی! اب یہاں تک آہی چکے ہیں تو کہیں اور جانے کا کیا فائدہ پھر جولیا بھی تو یہیں ہوتی ہے۔''

بالآخر یہی طے پایا کہ اسی کلب میں انجوائے کیا جائے۔ تینوں نے اپنے اپنے ڈالرز اکٹھے کیے اور انٹری فیس ادا کرکے کلب کے ہال میں آگئے۔

ان کی کرسیاں اسٹیج کے قریب ہی تھیں جہاں سے وہ رقاصاؤں کو دیکھ سکتے تھے۔ اس وقت دو رقاصائیں رقص کر رہی تھیں۔ لیکن ان میں جولیا نہیں تھی جس کا اشتہار انہیں اس طرف کھینچ لایا تھا۔

اس دوران ایک ویٹرس ان کے سر پر آکر کھڑی ہو گئی۔

''ایک بوتل کتنے کی ہے۔'' ایگی نے پوچھا۔

''پانچ ڈالرز۔'' اس نے بتایا۔ ''اور ہر ایک کو تین تین بوتلیں لینی ہوں گی۔''

''تین تین بوتلیں۔''

''ہاں، یہ یہاں کا اصول ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر نہیں لے سکتے تو واپس چلے جاؤ۔''

انہیں آرڈر دینا ہی پڑا۔ ویٹرس کا لہجہ بہت خشک تھا۔

''حرام......'' راجر نے زیرِ لب گالیاں دیں۔

کلب میں بہت سے لوگ تھے۔ زیادہ تر نچلے طبقے کے اوباش صفت نوجوان، مزدور، ٹرک ڈرائیورز، گیراج میں کام کرنے والے، اسی قسم کے لوگ تھے جن کے درمیان فحش مذاق جاری تھا۔ ویٹرس کچھ دیر میں ایک ٹرے میں گلاس لے آئی تھی۔ ''چلو پینتالیس ڈالرز ادا کرو۔'' اس نے کہا۔

ان تینوں نے اپنی جیبوں سے رقم نکال کر ٹرے میں رکھ دی۔

پہلے ہی گھونٹ پر ان کے ہوش اڑ گئے۔

''کم بخت، آدھا تو پانی ملا ہوا ہے۔'' ایگی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ہاں یہ کم بخت اسی طرح لوٹتے ہیں۔'' راجر نے بتایا۔

بیئر ختم ہو گئی لیکن ان کا دل نہیں بھرا۔ رقص اب شباب پر تھا۔ ان کی من پسند ڈانسر اب اپنا رقص دکھا رہی تھی۔

''میں ذرا واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔'' راجر نے اعلان کیا۔

وہ جب واش روم کی طرف چلا گیا تو ایگی کی نگاہ اس کے پرس پر گئی جو وہ اپنی کرسی پر بھول گیا تھا یا جیب سے گر گیا تھا۔

''دیکھو اسے، اپنا پرس پھر پھینک گیا ہے۔'' ایگی نے کالون کی توجہ پرس کی طرف دلائی۔

کالون اب پوری طرح رقص دیکھنے میں محو تھا۔ وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ جولیا کو حاصل کرنے کا خواب۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے کا خواب۔ اس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کوئی کام کر کے خوب پیسے کمائے گا اور ہر ہفتے آیا کرے گا۔ اس دوران جولیا سے اس کی دوستی ہو جائے گی۔

ایگی کے توجہ دلانے پر وہ چونک گیا۔

''دیکھو اس کا پرس۔'' ایگی نے پھر کہا۔ ''کتنی بے پروائی سے پھینک گیا ہے۔''

''ہاں اس نے بتایا تھا کہ اس پرس میں اس کا کریڈٹ کارڈ اور اچھی خاصی رقم ہے۔''

''ذرا چیک تو کروں۔'' ایگی نے راجر کا پرس اٹھا لیا۔

اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس پرس میں سوائے الٹے سیدھے کاغذات اور پچیس ڈالر کے ایک نوٹ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

''کم بخت کتنا جھوٹ بولتا ہے۔'' ایگی نے برا سا منہ بنا کر پرس واپس کرسی پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد راجر واش روم سے واپس آ گیا۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔'' ایگی نے کہا۔

کالون کی نگاہیں ابھی بھی جولیا پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''اب چلو بھی۔'' ایگی نے اسے آگے کی طرف دھکا دیا۔ ''یہاں کیوں اٹک گئے۔''

گیٹ سے نکلتے ہوئے کالون نے باڈی بلڈر دربان سے پوچھا۔ ''یہ کلب کب تک کھلا رہتا ہے۔''

''تین بجے تک۔'' اس نے بتایا۔

''شاید ہم دوبارہ آئیں۔''

''ضرور آؤ، لیکن اس کو ساتھ مت لانا۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے راجر کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ، یہاں اسپتال کہاں ہے؟'' ایگی نے پوچھا۔

''کون سا اسپتال؟''

اس پر وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بلی کس اسپتال میں ہوگا۔

''یہاں دس بارہ اسپتال ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اب تمہیں کس میں جانا ہے؟''

''چلو جو سب سے قریب ہو، اس کا نام بتا دو۔''

''لوتھرن۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں سے سیدھے جاؤ پھر دائیں طرف مڑ جاؤ۔ پاپولر ایونیو آئے گا، اس کے بعد

سینٹرل لائن ہے۔ اسی بلاک میں لوتھرن اسپتال مل جائے گا۔ چلو اب دفع ہو جاؤ۔''

وہ اس طرح دفع ہوئے کہ کالون اور ایگی نے جھومتے ہوئے راجر کو اٹھا کر ٹرک میں ڈالا۔ لیکن آدھ گھنٹے خواریوں ہونے کے باوجود انہیں لوتھرن اسپتال نہیں مل سکا۔

''یار! کیا ہم اسی طرح رات بھر خوار ہوتے رہیں گے۔'' کالون نے کہا۔

ایگی نے اپنا ٹرک ایک ٹیکسی کے پاس روک دیا۔ جو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی اور اس کا ڈرائیور اندر ہی خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے جاگنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''کہاں جانا ہے تم لوگوں کو؟'' اس نے انہیں مسافر سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''یار جانا تو کہیں نہیں ہے۔'' راجر نے کہا۔ ''بس ہمیں لوتھرن اسپتال کا پتا بتا دو۔''

''لعنت ہو۔'' ڈرائیور نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہاں لوتھرن نام کا کوئی اسپتال نہیں ہے۔'' پھر اس نے دس دوسرے اسپتالوں کے نام گنوا دیے۔ لوتھرن کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

''چلو کسی قریبی اسپتال کا بتا دو۔''

''مرسی اسپتال سب سے قریب ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں ایکسیڈنٹ کے کیسز آتے ہیں۔''

''اوہ، پھر تو وہی ہوگا، بتاؤ کہاں ہے؟''

ڈرائیور نے تفصیل سے سمجھا دیا کہ انہیں کس طرف سے جانا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ مرسی اسپتال کے گیٹ پر تھے۔ یہ ایک پُرشور اسپتال تھا۔ حادثات، کلنگ میں زخمی ہونے والے، شراب کے نشے میں حادثے کرنے والے، خودکشی کرنے والے، سب کے سب یہیں آیا کرتے۔

اسی لیے پولیس گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آیا جایا کرتیں۔ ایک کے بعد دوسری ایمبولینس، وہاں ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔

کالون اور ایگی نے راجر کو ٹرک ہی میں رہنے دیا اور خود اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ہر طرف شور ہی شور تھا۔ بہت وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا اسپتال تھا۔ ان دونوں کو معلومات مرکز کی تلاش تھی جو بہت دور جانے کے بعد ملا تھا۔

کاؤنٹر پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہمیں خون دینا ہے۔'' ایگی نے کہا۔

''وہ سامنے والے راستے سے مڑ کر چلے جاؤ۔'' اس نے اشارہ کیا۔ ''بلڈ ڈونیٹ کرنے والے اسی طرف جاتے ہیں لیکن تم کس کو خون دینا چاہتے ہو؟''

''بیلی کو۔'' کالون نے بتایا۔ ''وہ کسی حادثے میں زخمی ہوا ہے۔ پلیز، کیا تم اس کے بارے میں کچھ بتا سکو گی۔''

لڑکی نے کمپیوٹر کھول لیا۔ کچھ دیر تک تلاش کرتی رہی پھر بتایا۔ ''نہیں اس نام کا کوئی مریض یہاں نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہ اس کا لاسٹ نیم ہو۔'' ایگی نے کہا۔ ''پلیز ذرا اب لاسٹ نیم سے چیک کر دو۔''

لڑکی دوبارہ کمپیوٹر پر جھک گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھائی۔ ''ہاں ایک جیروم بیلی نام کا مریض آیا ہے۔ پچاس سال عمر ہے اس کی۔ اس کو گولی لگی تھی۔''

''نہیں، یہ وہ نہیں ہے۔'' کالون نے کہا۔ ''شاید وہ کہیں اور ہوگا۔''

اور اس وقت جب اسپتال کے پارکنگ ایریا میں گولیاں چلنے لگیں تو راجر کے ہوش اڑ گئے۔ ذرا سی دیر میں اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

وہ فوراً سیٹ کے نیچے دبک گیا۔ دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ راجر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کہاں ہے اور اس کے اردگرد کیا ہو رہا تھا۔ البتہ اتنا احساس ضرور تھا کہ گولیاں چل رہی ہیں اور وہ ان کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ خود اس کو نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ فی الحال اس کی سمجھ میں یہی آیا تھا۔ لیکن کیوں؟

وہ سیٹ کے نیچے ٹٹولنے لگا۔ ایگی جیسے لوگ بغیر ہتھیار کے سفر نہیں کرتے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور رکھ لیتے ہیں۔

جلد ہی اسے سیٹ کے نیچے سے ایک آٹومیٹک پستول مل ہی گیا جو پوری طرح لوڈ تھا۔

اب اسے کچھ تقویت ہوئی تھی۔

اس نے ٹرک کی کھڑکی سے سر نکال کر جھانکا۔ کچھ فاصلے پر ایک گاڑی میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے فائرنگ کیے جا رہے تھے جبکہ دوسری طرف سے بھی فائرنگ کا جواب دیا جا رہا تھا۔

راجر نے سوچے سمجھے بغیر ایک اضطراری کیفیت میں

دو چار فائر کر دیے، کسی کا نشانہ لیے بغیر۔ اس کے ساتھ ہی اپنی گردن پھر نیچے کر لی۔
شیشے پر ایک گولی لگی اور کئی ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ ایک ٹکڑا راجر کی پیشانی کو زخمی کر گیا۔
وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ بدحواس ہو رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ اسے کسی طرح ٹرک سے نکل بھاگنا چاہیے۔ ورنہ گولیوں کی زد میں آ کر بری طرح مارا جائے گا۔
کچھ دیر کے لیے فائرنگ کا سلسلہ رکا تو اس نے ٹرک سے چھلانگ لگا دی۔ وہ گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔
جب گولیاں چلنے لگتیں تو وہ کسی گاڑی کی آڑ لے کر بیٹھ جاتا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی لیے اسے تھوڑا سا حوصلہ بھی تھا۔ ورنہ اب تک اس کے اعصاب جواب دے چکے ہوتے۔
وہ پورا علاقہ میدانِ جنگ بنا ہوا تھا اور راجر یہ سوچ رہا تھا کہ اس میدانِ جنگ میں وہ کیا کر رہا ہے۔ یہاں اس کا کیا کام ہے؟
کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر جو دھند چھائی ہوئی تھی، وہ تو کسی قدر ہٹ گئی تھی لیکن اس کے اعصاب ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آ سکے تھے۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ بس جان بچانے کی دھن میں ایک طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اب مرسی اسپتال کا پارکنگ زون پیچھے رہ گیا تھا اور گولیاں چلنے کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔
آگے ایک بڑا اسٹور دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے اسٹور رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ اس اسٹور سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی ہوئی دکھائی دے گئی۔
راجر نے زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں۔ پھر گاڑی سے ایک عورت اور ایک مرد باہر آ گئے۔ دونوں بری طرح ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ برا بھلا کہہ رہے تھے۔
پھر راجر نے دیکھا کہ مرد نے ایک زوردار تھپڑ عورت کو مار دیا تھا لیکن وہ عورت بھی خاموش نہیں رہی، اس نے اس زور سے اپنی ٹانگ مرد کی رانوں کے درمیان ماری کہ وہ کسی مرتے ہوئے جانور کی طرح ڈکراتا ہوا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔
راجر اس عورت کی پھرتی پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عورت اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔
''گھبراؤ نہیں۔'' راجر نے اسے تسلی دی۔ ''تم تو ٹھیک ہو نا؟''
''ہاں میں ٹھیک ہوں۔''
اسی وقت ایک طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے ان دونوں کی طرف آنے لگے۔
راجر اس نئی افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا تھا۔
''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟'' اس عورت نے پوچھا۔
''ہاں۔''
''آؤ گاڑی میں، جلدی۔''
راجر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی پہلے ہی اسٹارٹ تھی۔ اس نے وہاں سے گاڑی نکالنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔
''کس طرف چلوں؟'' اس نے پوچھا۔
''ابھی تو یہاں سے نکلو۔ اور یہ تم نے پستول کیوں ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ اس طرح کیسے ڈرائیونگ کر سکو گے۔''
راجر نے پستول اپنی گود میں رکھ لیا اور اسی وقت عورت نے جھپٹ کر پستول لے کر اس کی گردن سے لگا دیا۔
''بس اب چپ چاپ چلتے رہو۔'' وہ پھنکاری۔
ایگی اور کالون جب مرسی اسپتال سے باہر نکل کر پارکنگ کی طرف آئے تو یہاں گینگ وار ختم ہو چکی تھی۔ پولیس والے بھی اپنی رسمی کارروائی کر کے واپس جا چکے تھے۔ ٹرک کے شیشے بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور راجر غائب تھا۔
''وہ ذلیل میرا پستول بھی لے گیا ہے۔'' ایگی نے سیٹ کے نیچے ٹٹولتے ہوئے بتایا۔
''پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔'' کالون نے کہا۔
''اچھا ہے مر گیا ہو۔'' ایگی نے راجر کو دو چار گالیاں دے ڈالیں۔ ''چلو بیٹھو۔''
انہوں نے سیٹوں سے شیشوں کے ٹکڑے صاف کیے اور ٹرک ایک بار پھر چل پڑا۔ اب ان کا رخ سینٹرل اسپتال کی طرف تھا جس کا پتا مرسی اسپتال سے بتایا گیا تھا۔
تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد وہ سینٹرل اسپتال پہنچ گئے۔ یہاں انہیں بتایا گیا۔ ''نہیں بھائی، بلڈ یونٹ رات

دس بجے بند ہو جاتا ہے اور صبح آٹھ بجے کھلتا ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ، اس اسپتال میں بیلی نام کا کوئی بندہ لایا گیا ہے؟'' کالون نے پوچھا۔

لیکن یہ تلاش بھی بے سود رہی۔ یہاں بھی بیلی نام کا کوئی مریض نہیں تھا۔

''لعنت ہو، اب کہاں ڈھونڈیں کم بخت کو۔'' ایگی جھلا کر بولا۔

''یار، مجھے تو ڈیسپراڈو کلب کی جولیا یاد آرہی ہے۔'' کالون نے کہا۔''اس وقت بھی وہاں ڈانس ہو رہا ہوگا۔''

''لیکن ہم جائیں کیسے؟ ہمارے پاس تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔''

''یار، کیوں نہ کسی بلڈ بینک میں اپنا خون بیچ دیں۔'' کالون نے مشورہ دیا۔

ایگی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کالون کی یہ تجویز مان لی۔ سینٹرل اسپتال والے نے انہیں بلڈ بینک کا پتا سمجھاتے ہوئے بتایا۔''ذرا ہوشیار رہنا، شہر بھر کے جواری، بدمعاش اور شرابی وغیرہ وہیں اپنا خون بیچنے کے لیے جاتے ہیں۔''

ان پر جولیا کو دیکھنے کی دھن سوار تھی۔ انہوں نے پتا بتانے والے کا شکریہ ادا کیا اور اسپتال سے باہر آگئے۔

بلڈ بینک وہ واحد پتا تھا جہاں وہ آسانی سے پہنچ گئے۔ بینک اس وقت کھلا ہوا تھا۔ وہ جب ہال میں پہنچے تو دیواروں کے ساتھ بینچوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نیچے تقریباً بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ان کو چکر آنے لگے۔

کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''بتاؤ، کس لیے آئے ہو؟''

خون بیچنے آئے ہیں۔'' کالون نے بتایا۔''کتنے ملتے ہیں؟''

''پچاس ڈالرز۔''اس نے بتایا۔

پچاس ڈالرز دونوں دل ہی دل میں حساب لگانے لگے۔ کالون کی جیب میں چھ ڈالر تھے۔ اس طرح چھپن ڈالرز ہو جاتے۔ ڈیسپراڈو کلب میں جانے کا ایک اور سنہری موقع۔

ایگی کے پاس اٹھارہ ڈالرز تھے۔ اڑسٹھ ڈالرز نہ صرف کلب میں جانے کے لیے کافی تھے؟ بلکہ ان سے ٹرک میں پیٹرول بھی بھروایا جا سکتا تھا۔

اس وقت دونوں بھول گئے تھے کہ بیلی نام کا کوئی بندہ ان کے خون کے انتظار میں ہوگا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' ایگی نے کاؤنٹر والے کی طرف دیکھا۔ اب اس کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔

''اب یہ بتاؤ کس قسم کا خون ہے۔'' کاؤنٹر والے نے دریافت کیا۔ وہ بلڈ گروپ کی بات کر رہا تھا۔

''لال رنگ کا ہے۔'' کالون نے مذاق کیا۔

''تم دونوں نشے کے عادی تو نہیں ہو؟'' کاؤنٹر والے نے پوچھا۔

''کبھی کبھی، لیکن ہم اس شراب کے پیسے نہیں لیں گے۔'' ایگی نے دوسرا جملہ کسا۔

کالون بھی ہنسنے لگا۔

لیکن اس وقت ان دونوں کی خوش مزاجی ہوا ہو گئی جب کاؤنٹر والے نے پوچھا۔''کس سائز کی سوئی سے خون نکلوانا پسند کرو گے۔''

دونوں ہی خاموش تھے۔ کاؤنٹر والے نے ایک ایک فارم دونوں کے سامنے رکھ دیے۔''چلو، فارم بھر کے دو۔''

فارم بھرتے ہوئے دونوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

کاؤنٹر والے نے برابر سے گزرتے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔''ان دونوں کو اندر لے جاؤ۔ یہ خون دینے آئے ہیں۔''

''آؤ میرے ساتھ۔''اس آدمی نے کہا۔

اس کے ساتھ چلتے ہوئے ان دونوں کے پاؤں بھی کانپ رہے تھے۔ وہ آدمی انہیں ایک بڑے سے کمرے میں لے آیا۔ وہاں بہت سے بستر تھے جن پر لیٹے ہوئے لوگ خون دے رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ کسے ہوئے تھے اور ٹیوب کے ذریعے سرخ خون تھیلیوں میں جمع ہو رہا تھا۔

انہوں نے ایک بندے کی چیخ سنی۔ جس کی رگ میں سوئی اتار دی گئی تھی۔ وہ اچھل کر بستر سے نیچے گر پڑا اور شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔

کچھ لوگ اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ ایگی اور کالون کے حلق خشک ہونے لگے۔ وہ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ایک آدمی نے ایگی کو بازو سے پکڑ لیا۔ چلو آؤ۔''

بستر کی طرف جاتے ہوئے ایگی لرز رہا تھا۔

کالون نیم بے ہوش سا ہو کر ایک طرف رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ ایگی کو بستر پر لٹا کر اس کی کلائی جکڑ دی گئی تھی۔

''نہیں ، مجھے نہیں چاہئیں پیسے۔'' ایگی نے کہا۔

''جانے دو مجھے۔''

لیکن ہال کے شور میں خون نکالنے والے نے اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی یا شاید وہ سمجھا نہیں تھا۔

''چلو آنکھیں بند کرو۔'' اس نے ایک موٹی سی سرنج ایگی کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

ایگی نے پھر جدوجہد۔ لیکن وہ سوئی اس کی رگ میں اتار دی گئی۔ سرخ سرخ خون اس کی رگ سے نکل کر تھیلی میں جمع ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد جب اسے بستر سے اتارا گیا تو وہ چکرا کر لہراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت کالون کو بھی بستر کی طرف لے جایا جانے لگا جبکہ ایگی کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد کالون بھی خون دینے کے بعد اسی جگہ چکرا کر گر پڑا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایگی گرا تھا۔ اس کے بھی جسم سے خون نکال لیا گیا تھا۔

رات ابھی جوان ہی تھی جب وہ اسپتال سے لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے۔ دونوں کی جیبوں میں پچاس پچاس ڈالرز آ چکے تھے اور اب ٹرک کا رخ ڈسپراڈو کلب کی طرف تھا۔

ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ان کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ ڈسپراڈو کی رقاصاؤں کی یادوں میں گم تھے۔ زندگی اب انہیں بہت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔

ڈسپراڈو کلب میں داخل ہونے کے لیے دونوں نے بڑی شان کے ساتھ دس دس ڈالرز جمع کرا دیے اور اندر آ گئے۔

موسیقی کا شور اور ڈانس کا زور جاری تھا۔

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ الٹی سیدھی آوازیں نکال رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی ایک میز کے گرد اپنا ڈیرا ڈال دیا۔

رش عروج پر تھا۔ ویٹرس نے ان کے آگے بوتلیں لا کر رکھ دی تھیں۔ کالون سوچ رہا تھا کہ اتنا سا خون دینے میں جاتا ہی کیا ہے۔ اتنا خون تو دو دن میں بن جاتا ہے۔ اب وہ ہر ہفتے آیا کرے گا۔

ایک ویٹرس اس کے برابر سے گزری۔ اس نے ترنگ میں آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہو گئی۔

کلب کے اصول کے مطابق کسی ویٹرس کو چھونا بہت بڑا جرم تھا۔ ویٹرس نے چیخ ماری۔ قریبی میز سے ایک آدمی نے اٹھ کر کالون کو ایک گھونسا رسید کر دیا۔

کالون نے جوابی حملہ کیا۔ اس دوران میں کلب کا ایک ملازم ایگی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایگی نے بھی دو چار ہاتھ چلائے۔ کالون نے گھونسا مارنے والے کو قریبی میز کی طرف دھکا دے دیا تھا پھر بوتلیں اور گلاس ٹوٹنے لگے۔

ذرا سی دیر میں وہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

کچھ لوگ کالون اور ایگی کی حمایت میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے ایگی کے سر پر بوتل مار دی۔ ایگی کا سر پھٹ گیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

کچھ لوگوں نے کالون کو مارنا شروع کر دیا۔

میزیں گرنے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے پر گھونسے چلانے لگے۔ بوتلیں چلانے لگے۔ کسی نے پولیس اور ایمبولینس کو فون کر دیا تھا۔

ایگی کے علاوہ بھی کچھ لوگ بری طرح زخمی ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں شور مچاتی ہوئی آ گئیں۔ کالون کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں جبکہ ایگی کو ایمبولینس میں ڈال کر مرسی اسپتال کی طرف بھیج دیا گیا۔

پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے کالون نے ایگی کے ٹرک کو دیکھا جس پر وہ سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ وہ تین تھے۔ راجر، کالون اور ایگی۔

یہ تینوں جذبۂ ہمدردی کے تحت بے چارے بیلی کو خون دینے آئے تھے۔ لیکن ان تینوں میں سے راجر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ زخمی ایگی کو اسپتال بھیجا جا رہا تھا اور وہ خود پولیس کی تحویل میں تھا۔

اس کے بعد کی کہانی کچھ یوں ہے۔

کالون کو چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ ہنگامہ آرائی کے جرم ایگی کے ٹرک کو ضبط کر لیا گیا تھا جبکہ راجر کو اس لیے سزا ہو گئی تھی کہ وہ ایک عورت کو زخمی کر کے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس نے اسے پکڑ لیا تھا۔

اور جہاں تک بیلی کا سوال ہے تو اس کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ صرف اس کی ایک ٹانگ فریکچر ہوئی تھی جو کچھ دنوں کے بعد ٹھیک ہو گئی۔

وہ گھر واپس آ گیا جبکہ وہ تینوں ابھی تک واپس نہیں آ سکے تھے۔

ایڈم جونز مالی طور پر خوش حال تھا اور اسے کام کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن خالی بیٹھنا اسے پسند نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنے دوست والڈ یمر کے مشورے پر منفرد پیشہ اختیار کیا اور ایک آزاد سراغ رساں بن گیا جو اخبارات میں شائع ہونے والے گمراہ کن اشتہارات اور فراڈ کی تحقیقات کیا کرتا۔ وہ ایسے اشتہارات غور سے پڑھتا اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرکے اس کے بارے میں حقائق جاننے کی کوشش کرتا اور اس تحقیقات کے نتیجے میں ایسے

سرخ دھبّے

جمال دستی

جانوروں سے دوستی مغرب پرستوں کا دیرینہ شوق ہے... ہر گھر میں کتے کا وجود لازمی ہوتا ہے... اور اس کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہوتی ہے... کتوں سے انسیت رکھنے والوں سے ان کی جدائی برداشت نہیں ہوتی... ایک ایسی ہی سگ پرست کہانی... جس میں ایک سے زیادہ کتے غیر طبعی موت کا شکار ہو رہے تھے... ان کی ہولناک اموات شہر میں تشویش کا باعث بن رہی تھیں...

ساز باز اور سازشی دماغ رکھنے والے ٹولے کی سنگین وارداتیں...

حیران کن واقعات سامنے آتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔

وہ مارچ کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ایڈم جونز عمارت کی پانچویں منزل پر واقع اپنے دفتر میں بیٹھا اخبارات کا مطالعہ کررہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی توجہ ان میں شائع ہونے والے ذاتی اشتہارات پر تھی پھر اس کی نظر ایک ایسے اشتہار پر گئی جس کی عبارت نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''ایک ہزار ڈالر کا انعام، ریگنہ نامی بل ڈاگ کے قاتل کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے جسے میلکوم ڈور کے دفتر واقع اسٹینگل بلڈنگ، یونین اسکوائر میں مار دیا گیا۔''

''ایک کُتّے کے قاتل کو پکڑنے کے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے۔'' جونز نے سوچا۔ ''جبکہ اس کُتّے کا کوئی غیر معمولی ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ مجھے اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔''

اس نے کوٹ پہنا اور اشتہار میں دیے گئے پتے پر چل دیا۔ وہ ایک پرانی سی عمارت تھی۔ لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچ کر اس کی نظر دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پر گئی جس پر لکھا تھا۔ ''میلکوم ڈور کنسلٹنگ کیمسٹ۔'' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ہی میز پر ایک جوان لیکن قدرے فربہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جونز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ڈور؟''

''ہاں۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر تم کوئی رپورٹر ہو تو میں......''

''میں رپورٹر نہیں ہوں۔'' جونز نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا تعلق اشتہارات کے شعبے سے ہے اور میں ایک ہزار ڈالر کا انعام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

ڈور نے اپنی کرسی تھوڑا پیچھے کھسکائی اور ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''فی الحال نہیں لیکن جاننا چاہتا ہوں۔''

ڈور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہیں کُتّوں کا بہت شوق ہے مسٹر ڈور؟''

''اوہ...... ہاں یقیناً۔'' ڈور نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

جونز نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اس کُتّے کا مالک کون تھا؟''

''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ میں ہی اس کا مالک ہوں۔'' ڈور نے ناگواری سے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ یہ کُتا تمہیں کس نے دیا تھا؟''

''ایک دوست نے۔''

''بالکل ٹھیک اور شاید اسی دوست نے اس کُتّے کے قاتل کو پکڑنے کے لیے ایک ہزار ڈالر کا انعام بھی رکھا ہے؟''

''تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''سیدھی سی بات ہے ایک شخص جسے کُتّوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو، وہ اس کی موت کا انتقام لینے کے لیے ایک ہزار ڈالر کا انعام مقرر نہیں کرسکتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں بے وقوف بنایا گیا ہے۔ وہ کون ہے جس سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے؟''

کیمسٹ اپنی کرسی گھماتے ہوئے بولا۔ ''تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں، یہ میرا اندازہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک قیمتی بل ڈاگ ایسے شخص کو تحفہ میں دے دیا جائے جو کُتّوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا... اور نہ ہی ان کی مناسب دیکھ بھال کرسکتا ہے۔ اس کی ایک مناسب وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ کُتا تمہاری حفاظت کے لیے دیا گیا تھا۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' ڈور نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور اب وہ محافظ جاچکا ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مجھے اس بارے میں تفصیل بتاؤ۔''

''پہلے مجھے اپنے قانونی مشیر سے بات کرنا ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نمبر ملایا اور جج نیلسن سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی پھر جونز سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم چند لمحوں کے لیے دفتر سے باہر جانا پسند کروگے۔''

''بہت بہتر لیکن اگر تم ڈسٹرکٹ اٹارنی راجر نیلسن سے بات کررہے ہو تو اسے یہ ضرور بتادینا کہ یہ معلومات ایڈم جونز کو درکار ہیں اور اسے گم شدہ خطوط والا اشتہار بھی یاد دلادینا۔''

تھوڑی دیر بعد ہی ڈور نے جونز کو واپس بلالیا اور بولا۔ ''نیلسن نے کہہ دیا ہے کہ تمہیں سب کچھ بتادیا جائے لیکن یہ باتیں ہمارے درمیان ہی رہیں گی۔''

''میں سمجھ گیا، اب یہ بھی بتادو کہ وہ کون ہے جو تم سے جان چھڑانا چاہ رہا ہے؟''

''پیرا گون میٹ کمپنی۔''

''اچھا، وہ جو ڈبوں میں گوشت پیک کرکے بیچتے

ہیں۔ تم ان کے لیے کیا کر رہے تھے؟''

''میں نے انہیں اپنی ایک ایجاد فروخت کی تھی جو ضمنی پیداوار کی بدبو دور کرنے کے کام آتی ہے۔ کئی ماہ پہلے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس دوا کو ڈبوں میں بند ایسے گوشت میں استعمال کر رہے ہیں جو خراب ہو جاتا ہے اور دوسرے ڈبوں کے ساتھ ملا کر فروخت کر رہے ہیں۔''

''کیا اس طرح وہ گوشت زہر آلود ہو جاتا ہے؟''

''ہاں، یہ ان لوگوں کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے جو عادی گوشت خور ہیں۔ میں نے انہیں خط لکھا کہ وہ یہ سلسلہ روک دیں۔''

''انہوں نے کوئی جواب دیا؟''

''ایک آدمی مجھ سے ملنے آیا اور بولا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے اشارتاً کہا کہ اگر میں سمجھتا ہوں کہ میری ایجاد اس رقم سے زیادہ قیمتی تھی جو کمپنی سے مجھے معاوضے کے طور پر ملی تو کمپنی اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے۔ کچھ ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وفاقی حکام ٹرسٹ کے معاملات کی چھان بین کر رہے ہیں تو میں نے مسٹر نیلسن کو فون کر دیا۔''

''یہی تمہاری غلطی تھی۔ نیلسن سیدھا آدمی ہے لیکن اس کے دفتر میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اندر کی باتیں باہر پہنچاتے ہیں۔''

''شاید اسی لیے پندرہ دن بعد میری ذاتی لائبریری میں زہریلا دھواں بھر گیا۔ اگر میں فوراً ہی بیرونی کھڑکیاں نہ کھولتا تو میرا زندہ بچنا محال تھا۔ ایک ہفتے بعد لیبارٹری میں ایک دھماکا ہوا اتفاق سے اس وقت میں وہاں موجود نہیں تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ میری لیبارٹری میں کوئی دھماکا خیز مواد نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں دھماکا ہونا ایک عجیب بات ہے۔''

''یہ لیبارٹری کہاں ہے؟''

''فلیٹ بش میں جہاں میں رہتا ہوں بلکہ رہتا تھا۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد میرے ایک پڑوسی نے اپنے کیمرے سے ایک ایسے شخص کی تصویر لی جو خفیہ طریقے سے میرا تعاقب کر رہا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی اور مجھے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اس شخص نے مجھ پر گولی بھی چلائی لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ میں نے اس واقعے کی رپورٹ پولیس میں درج کروائی۔ انہوں نے مجھے اس شخص کی گرفتاری کا یقین دلایا اور کہا کہ یہ خبر اخبار میں نہ آئے۔ اس کے بعد وہ بھول گئے۔''

جونز نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بالکل بھول گئے ہوں گے۔ لوگوں نے نیویارک پولیس پر یقین کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو یہ بچوں کی طرح بے بس نظر آتے ہیں۔ تم نے اپنے طور پر کوئی احتیاط نہیں کی؟''

''میں نے اس کی اطلاع نیلسن کو دی تھی۔ اس نے سیکرٹ سروس کا ایک بندہ میرے پاس بھیج دیا پھر مجھے ایک کانفرنس کے سلسلے میں ڈینور جانا پڑ گیا۔ جب ایک ماہ بعد واپس آیا تو نیلسن نے مجھے دو عدد کتے دیے۔''

''دو۔'' جونز نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں، ان کے نام ریگز اور ٹیسٹرز تھے۔''

''ٹیسٹرز کہاں ہے؟''

''وہ بھی ریگز کی طرح مر گیا۔''

''یعنی تمہاری رہائش گاہ فلیٹ بش میں مارا گیا؟''

''نہیں، اسی کمرے میں۔''

جونز نے حیرانی سے کہا۔ ''یعنی دونوں کتے مر گئے؟''

''ہاں، دس دن کے وقفے سے دونوں کی موت واقع ہو گئی۔''

''تم کہاں تھے؟''

''یہیں، اسی جگہ جب ٹیسٹرز مرا تو میں یہیں تھا اور جب ریگز کو زہر دیا گیا تو میں ہال کے آخری سرے پر واقع باتھ روم میں تھا۔''

''تم نے یہ کیوں کہا کہ اسے زہر دیا گیا تھا؟''

''اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں کیونکہ کسی بھی کتے کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔''

''کیا زہر دینے کا کوئی ثبوت ملا؟''

''صرف یہ تھا لوجیکل...... ٹیسٹرز کے کیس میں یہ بالکل واضح تھا۔ وہ کونے میں ریڈی ایٹر کے قریب اونگھ رہا تھا جب میں نے اس کے بھونکنے کی آواز سنی پھر وہ کمرے میں دوڑنے لگا اور تھوڑی دیر بعد تھک کر بیٹھ گیا اور پندرہ منٹ کے اندر اس کا جسم سیاہ پڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کسی ڈاکٹر کو بلاتا، وہ مر چکا تھا۔''

''کیا تم نے کوئی معائنہ کروایا؟''

''میں نے اس کے معدے کے اجزا کا تجزیہ کیا تھا لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔''

''دوسرے کتے کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''یہ پرسوں کی بات ہے۔ ہمیں فلیٹ بش سے آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی اور ریگز کونے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا......''

''کیا یہ وہی کونا ہے جہاں ٹیسٹرز بھی بیٹھا ہوا تھا؟''

دوسری جنگ عظیم کے دوران لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کر کے محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ نوجوان اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر چھپتے پھر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دلیر نوجوان بھرتی کے دفتر میں پہنچا اور درخواست کی کہ اسے خدمت کا موقع دیا جائے۔

فوجی افسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کس قسم کی خدمت کرنا چاہتے ہو؟''

نوجوان بولا۔ ''میں پیراشوٹ کے ذریعے برلن میں ٹھیک ہٹلر کے محل میں اُتر جاؤں گا۔ میرے پاس ایک بھرا ہوا پستول ہوگا اور جیبوں میں دستی بم بھرے ہوں گے۔ پہرے داروں کو مارتا ہوا میں سیدھا ہٹلر کے پاس جاؤں گا اور پستول سے اس کے سینے پر ٹھائیں ٹھائیں کروں گا اور اس طرح میرے ہاتھوں جنگِ عظیم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔''

فوجی افسر نے کہا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''ازراہِ کرم اپنی پیشہ ورانہ بیش قیمت رائے مجھے لکھ کر دے دیں۔'' نوجوان بولا۔ ''تاکہ جبری بھرتی کے لیے مجھے آئندہ مجبور نہ کیا جائے۔''

عبدالغفار زاہد، ایبٹ آباد

''ہاں، ریڈی ایٹر کے قریب۔ میں جب کمرے سے باہر نکلا تو یوں لگا جیسے وہ وہاں موجود کسی چیز میں دلچسپی لے رہا ہو... میں صرف دو منٹ کے لیے باہر گیا تھا۔''

''کیا تم نے باہر جاتے وقت کمرا لاک کیا تھا؟''

''اس میں ایک خصوصی اسپرنگ لاک لگا ہوا ہے جسے میں نے خود بند کیا تھا۔''

جونز اٹھ کر گیا اور اس نے دروازے کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظر ایک بڑے اور پرانے فیشن کے کی ہول پر گئی جو نئے تالے کے نیچے تھا۔ ''تم نے بڑا تالا استعمال نہیں کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے کئی مہینوں سے اسے استعمال نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی چابی کھو گئی ہے۔''

جونز نے دروازے سے ریڈی ایٹر کا فاصلہ قدموں سے گنا اور ریڈی ایٹر کے پاس کھڑے ہو کر ہول کو دیکھنے کے بعد سر ہلا دیا۔

''یہ اس کی پہنچ میں نہیں آتا۔'' اس نے کہا۔ ''آگے بتاؤ، پھر کیا ہوا؟''

''جب میں واپس دروازے پر پہنچا تو میں نے ریگز کے بھونکنے کی آواز سنی۔ میں نے اندر آ کر دیکھا تو وہ وحشیانہ طریقے سے اپنی ناک زمین پر رگڑ رہا تھا۔ میں نے قریبی ڈاکٹر کو فون کیا۔ دس منٹ میں اس پر کپکپی طاری ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے آنے تک وہ مر چکا تھا یعنی پہلا دورہ پڑنے کے پندرہ منٹ کے اندر۔ ڈاکٹر کو یقین نہیں آیا کہ یہ زہر تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو لیکن مجھے اس کے معدے سے ایسی کوئی علامت نہیں ملی۔ ڈاکٹر اس کی لاش لے گیا اور اس کا مکمل پوسٹ مارٹم کروایا۔''

''کیا اس نے کچھ معلوم کیا؟''

''ہاں، اس کا خون جم چکا تھا اور اوپری ہونٹ پر ایک چھوٹے دانے کا دائرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دونوں کتوں نے شاید کوئی ایسی چیز نگل لی جو میرے دفتر میں پڑی رہ گئی ہو لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ایسی کوئی چیز وہاں کیسے پہنچی۔''

''ایسا نہیں ہوا ہوگا۔'' جونز نے کہا۔ ''اگر کتا کوئی زہریلی چیز نگل لے تو وہ کبھی نہیں چیخ مارتا۔ تاوقتیکہ وہ کڑوی یا کاٹ دار نہ ہو۔''

''وہ کڑوی نہیں تھی میں نے اس کے منہ کا معائنہ کیا تھا۔''

''ریڈی ایٹر کے بارے میں کیا کہو گے؟'' جونز نے گھٹنوں کے بل اس کے آگے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ ساری گڑبڑ اس کی وجہ سے ہے۔''

''اگر تم دھوئیں کے بارے میں سوچ رہے ہو تو یہ ممکن نہیں ہے۔'' کیمسٹ نے جواب دیا۔ ''میں اسے ٹیسٹ کر چکا ہوں۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں سوچ رہا لیکن یہ تجسس اپنی جگہ برقرار ہے کہ دونوں ہلاکتیں کمرے کے کونے میں ہوئیں جو دونوں کھڑکیوں اور دروازے سے کافی فاصلے پر ہے۔ کیا کھڑکیاں یا روشن دان رات میں کھلے رہتے ہیں؟''

''کبھی کبھی کھڑکیاں کھلی رہ جاتی ہیں لیکن روشن دان ہمیشہ بند رہتا ہے۔''

''کیا ان کے سامنے قریب میں کوئی دوسری کھڑکی ہے؟''

''تم خود دیکھ سکتے ہو ایسی کوئی کھڑکی نہیں ہے۔''

''یہاں کوئی آتش دان بھی نہیں ہے اور یہ جگہ اتنی بلندی پر ہے کہ سڑک سے کوئی چیز یہاں نہیں پھینکی جاسکتی۔''

جونز نے کمرے کی دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر وہ بڑے کی ہول کی جانب مڑا اور اس میں سے جھانکنے لگا۔

''کیا تم نے کبھی چیونگم چبائی ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

کیمسٹ نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔''

''لیکن مجھے اس کی خواہش ہو رہی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ اگر میں اپنے لیے چیونگم... منگوالوں؟''

''اگر تم کوئی خاص برانڈ استعمال کرتے ہو تو بتادو میں کونے پر واقع اسٹور کو فون کر دیتا ہوں۔''

''کوئی سی بھی منگوالو۔''

جب چیونگم آگئی تو اس نے پیکٹ کھول کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر اچھی طرح چبایا پھر اسے نکال کر سوراخ کے گرد اچھی طرح چپکا دیا تاکہ وہ پوری طرح ڈھک جائے۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' کیمسٹ نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' جونز نے کہا۔ ''لیکن جب اس کمرے میں عجیب اور مہلک واقعات ہو رہے ہوں اور اندر آنے کا راستہ بھی ایک ہی ہو تو ہمیں ہر چیز پر نظر رکھنا ہوگی چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ ورنہ شاید تمہیں یہ دفتر چھوڑنا پڑ جائے۔''

نوجوان کیمسٹ نے اپنے بال پیچھے کیے۔ کھڑکی کی طرف دیکھا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''نہیں، میں مار دیا جاؤں گا اگر یہاں سے گیا۔''

''تم کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے ہو۔'' جونز نے کہا۔ ''لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم غلطی پر ہو۔ اب تمہیں اس کی ہول پر نظر رکھنی ہے اگر یہ گم اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔''

''بہت بہتر۔'' ڈورنے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جو کھیل بھی کھیل رہے ہو، میں اس کا حصہ بننے کے لیے تیار ہوں۔''

''اب میں خصوصی آرڈر پر تمام اخبارات کے ایسے

> ماہر نفسیات نے ایک دعوت میں ایک شخص کو دیکھا وہ جب بھی سگریٹ پیتا، آدھا سگریٹ توڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیتا اور آدھا سلگا لیتا۔
>
> ماہر نفسیات نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔ ''آخر تم آدھا سگریٹ کھڑکی کے باہر کیوں پھینک رہے ہو؟''
>
> وہ بولا۔ ''سانپوں کو بھگانے کے لیے۔''
>
> ماہر نفسیات نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ ''مجھے تو کوئی سانپ نظر نہیں آتا۔''
>
> ''ہاں، نظر تو مجھے بھی نہیں آرہا ہے۔'' اس نے بھی کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا تم نے۔ سانپوں کو بھگانے کا کتنا زود اثر طریقہ مجھے معلوم ہے؟''
>
> ☆☆☆
>
> نئی نویلی دلہن۔ ''آج رات جب میں کھانے کی میز پر کھانا رکھوں تو کیا کہوں؟ یہ کہوں کہ کھانا نکال دیا ہے یا یہ کہوں کہ کھانا اتار دیا ہے؟''
>
> شوہر: ''اگر کل جیسا کھانا ہو تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کھانا گرا دیا ہے۔''
>
> نادر سیال، میانوالی، کندیاں

تراشے تلاش کرواؤں گا جن میں کتوں کو زہر دینے کے واقعات کی خبریں ہوں گی تاکہ معلوم ہوسکے کہ نامعلوم قاتل نے کتوں کو زہر دینے کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہو ممکن ہے کہ اس نے کسی اور جگہ بھی ایسی ہی کارروائی کی ہو۔ بہرحال تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

اخبارات کے تراشوں کا بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ نیویارک اور اس کے گرد و نواح میں کتوں کو زہر دینا ایک مشغلہ بن گیا ہے۔ کئی دن تک وہ ان خبروں کی چھان پھٹک کرتا رہا جن میں سے بیشتر غلط ثابت ہوئیں پھر ایک روز برج پورٹ مارننگ ڈیلی نیشنز میں شائع ہونے والے ایک مضمون نے اسے چونکا دیا۔ اس میں کئی کتوں کو زہر دینے کا ذکر تھا۔ تین گھنٹے بعد وہ کونیکٹی کٹ سٹی میں جہاں سب سے

زیادہ اس طرح کے واقعات ہوتے تھے۔ وہ ٹیکسی کے ذریعے مسٹر کرٹس فلیمنگ کے گھر پہنچا جن کا قیمتی کتا حال میں مارا گیا تھا۔

''تم کون ہو؟'' فلیمنگ نے انتہائی رکھائی سے پوچھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا اور اس کے رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اجنبیوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

جونز کو ایسے لوگوں سے نمٹنے کا طریقہ آتا تھا۔ اس نے صرف اپنا نام بتانے پر اکتفا کیا۔ ''جونز۔''

''اچھا...... اچھا۔'' بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمہارے کُتّے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''رپورٹر ہو؟''

''نہیں۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔ میرے رپورٹر اس کیس پر کام کر رہے تھے لیکن ابھی تک کچھ معلوم نہ کر سکے۔''

''تمہارے رپورٹر؟''

''ہاں، میں برج پورٹ ڈیلی نیشنز کا مالک ہوں۔''

''کُتّے کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟'' جونز نے پوچھا۔

''بہت اچھا کُتا تھا۔'' بوڑھے نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ پرسوں میرے ساتھ ٹہلنے گیا۔ اگلے چوک پر ایک خالی میدان پار کرتے ہوئے اس کی نظر ایک چوہے پر گئی اور وہ اس کے پیچھے گیا۔ چوہا بھاگ رہا تھا کہ ایک لکڑیوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ کُتّے نے اِدھر اُدھر سونگھا ایک مرتبہ بھونکا اور میرے پاس واپس آ گیا۔ اس کے بعد اس کے جسم میں اینٹھن شروع ہو گئی اور وہ پندرہ منٹ کے اندر مر گیا۔''

یہ کہہ کر وہ بوڑھا رونے لگا۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں جونز کے گھٹنوں پر رکھ دیں اور بولا۔ ''کاش، میں جان سکتا کہ اسے زہر کس طرح دیا گیا جس نے اس کی تھوتھنی بند کر دی۔''

''تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اسے زہر دیا گیا؟''

''گزشتہ ہفتے میں اس طرح مرنے والا یہ چوتھا کُتا تھا۔''

''اور یہ سب واقعات اسی علاقے میں پیش آئے؟''

''ہاں، سب گولڈن ہل میں ہی ہوئے۔''

''تمہیں کسی پر شبہ ہے؟''

''یقیناً، شبہے والی بات ہی ہے، یہ دیکھو۔''

جونز نے ہاتھ بڑھا کر اس سے اخبار لے لیا اور پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''وارننگ، گولڈن ہل کے رہائشیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ گھروں کے باہر اور کھلی جگہوں پر پڑی ہوئی غیر محفوظ لکڑیوں سے ہوشیار رہیں، خطرہ۔''

''یہ اشتہار کب شائع ہوا؟''

''ہم نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ یہ پاگل پن لگتا ہے۔''

''اشتہار دینے والا کون تھا؟''

''پروفیسر موسلے، اگلے چوک پر فریم ہاؤس میں رہتا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔ سارے کُتّے اس کے بعد ہی مرے تھے۔''

''کیا اس نے اس اشتہار کی کوئی وضاحت کی تھی؟''

''نہیں، جب وہ دفتر آیا تو نیم پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہا تھا۔ بزنس منیجر نے مجھے بتایا۔ اس نے اشتہار پر اپنا نام لکھا اور نہ ہی دستخط کیے اور نہ ہی اس بارے میں کچھ کہا بلکہ منیجر سے استدعا کی کہ اسے روزانہ موسم کی رپورٹ پیشگی دے دی جائے۔ منیجر نے اشتہار چھاپنے سے انکار کر دیا اور پیسے واپس کر دیے۔''

''یہ موسلے کون ہے؟''

''اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ شاید کوئی تجربے کرنے کا شوقین سائنس داں ہے۔ وہ کسی سے نہیں ملتا۔ کچھ خبطی بھی ہے میرا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہی خط لکھتا رہتا ہے جن میں کچھ نہیں ہوتا۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا؟'' جونز نے پوچھا۔

فلیمنگ نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''یہ غلطی سے اشتہار کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔ لفافے پر اس کی تحریر ہے اندر بھی دیکھ لو۔''

جونز نے لفافے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ 25 مارچ کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا اندر کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھا ہوا تھا جس پر ربر اسٹیمپ کے ذریعے تاریخ ڈالی گئی تھی اور اس پر کچھ نہیں لکھا ہوا تھا البتہ کاغذ کے وسط میں تین نقطے تھے جو لگتا تھا کہ سرخ سیاہی سے بنائے گئے ہیں۔

''تمہیں یقین ہے کہ لفافے پر پتا پروفیسر موسلے کی ہینڈ رائٹنگ میں ہے؟''

''میں قسم کھا سکتا ہوں۔''

''یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے اپنے آپ کو ہی خط بھیجا ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ کسی ایسے شخص نے بھیجا ہو جو نہیں چاہتا تھا کہ ہینڈ رائٹنگ کے ذریعے اس کی شناخت ہو سکے۔''

''شاید لیکن تم ان سب باتوں میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''نیویارک میں بھی دو کتوں کو اسی طرح زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

''اوہ۔'' بوڑھے نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''بہرحال اب میں تمہیں کہانی کا آخری حصہ سناتا ہوں۔ پروفیسر موسلے نے آج صبح خودکشی کر لی۔''

جونز آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی تک گیا' واپس آیا۔ اس نے وہ اجنبی ثبوت اٹھایا جس میں اَن جانا خطرہ جھلک رہا تھا اسے غور سے دیکھا۔ واپس کھڑکی کی طرف گیا اور باہر دیکھنے لگا۔

''اس نے آج صبح نو بجے اپنا گلا کاٹ لیا۔'' فلیمنگ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جب پولیس وہاں پہنچی تو وہ مر چکا تھا۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ تم ایک منٹ مجھ سے بات نہ کرو۔'' جونز نے رکھائی سے کہا۔

''تم میرے ہی گھر میں مجھے زبان بند رکھنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ عجیب آدمی ہو۔ بہرحال اپنا کام جاری رکھو۔''

پانچ منٹ کی خاموشی کے بعد جونز کھڑکی سے واپس آیا اور بولا۔ ''یہاں ایسی کوئی خطرے والی بات ہے جس کے لیے پروفیسر اپنے آپ کو ذمے دار سمجھتا تھا اور اس نے خود کو مار ڈالا، کیوں؟''

''کیونکہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔'' فلیمنگ نے کہا۔ ''وہ میرا سامنا کرنے سے ڈر رہا تھا۔''

''احمقانہ بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص اس چیز کی وجہ سے مارا گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھی اور اسی خوف سے موسلے نے خودکشی کر لی۔''

''اسے ثابت کرو۔''

''تم مجھے آج کا اخبار دے سکتے ہو؟''

بوڑھے نے اسے ڈیلی نیشنز کا تازہ شمارہ پکڑا دیا۔ جونز نے مقامی خبروں کا صفحہ پڑھا اور بولا۔ ''گیلون زائلی کہاں ہے؟''

''یہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر۔''

''یہ پڑھو۔'' جونز نے اسے اخبار واپس کرتے ہوئے کہا۔

فلیمنگ نے اس سے اخبار لے لیا اور اس کی نظریں ایک خبر پر جم گئیں جس میں گیلون زائلی میں رہنے والے ایک اطالوی بچے کی موت کی تفصیل بیان کی گئی تھی اور یہ

خوش فہم

اسمتھ کافی دنوں سے اپنی خوب صورت سیکریٹری پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ایک ابر آلود دن بات بن ہی گئی۔ پہلے سیکریٹری دفتر سے چھٹی لے کر اپنے گھر گئی۔ کچھ دیر بعد اسمتھ بھی اسٹاف سے ایک اہم میٹنگ کا عذر کر کے نکل کھڑا ہوا۔ وہ باس تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ کوئی سوال کرتا۔

سیکریٹری گھر پر اس کی منتظر تھی۔ دن بہت خوب گزرا۔ شام گہری ہونے لگی تو اسمتھ کو اپنے گھر کا خیال آیا۔ اس نے اپنے جوتے سیکریٹری کو دے کر کہا کہ وہ ان کے تلے اپنے چھوٹے سے لان کی گھاس پر خوب رگڑ لائے۔

فرمائش انوکھی تھی۔ سیکریٹری کچھ نہ سمجھی مگر اس نے باس کی ہدایت پر عمل کیا۔

اسمتھ گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے دیر سے آنے پر اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''دد... دراصل میرا اپنی سیکریٹری سے افیئر چل رہا ہے۔ آج تقریباً سارا دن میں نے اس کے گھر میں اسی کے ساتھ گزارا ہے۔ وہیں دیر ہو گئی۔'' اسمتھ نے جھجکتے ہوئے سچ بات بتا دی۔

''جھوٹ... بکواس!'' بیوی نے برہمی سے کہا۔ ''وہ تمہیں ہرگز منہ نہیں لگا سکتی، وہ جوان اور خوب صورت ہے۔ اسے ہزار بوائے فرینڈ مل سکتے ہیں... تمہارے جوتوں سے قالین پر جگہ جگہ گھاس کے دھبے پڑ گئے ہیں... سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ گالف کھیلنے میں وقت برباد کر رہے تھے۔''

اسپین سے سمانہ سمن کا انکشاف

موت تشنج کے باعث ہوئی تھی۔

''کیا تم میرے ساتھ گیلون زالیلی تک جانا پسند کرو گے؟'' جونز نے پوچھا۔

فلیمنگ راضی ہو گیا اور وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچ گئے۔ اس گھر میں رہنے والے اطالوی تھے جنہیں تھوڑی بہت انگریزی بولنا آتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ چار سالہ پیڑو سہ پہر کے وقت لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پاس کھیل رہا تھا کہ اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر آ گیا۔ ڈاکٹر بھی کچھ نہ کر سکا اور اس بچے کو تشنج کے دورے پڑنے لگے اور وہ ایک گھنٹے کے اندر مر گیا۔''

''کیا اس کے ہاتھ یا چہرے پر کسی جگہ دائرے کا نشان تھا؟'' جونز نے پوچھا۔

بچے کا باپ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا پھر اس نے بتایا کہ ایک عجیب اور انوکھی وضع کا شخص صبح کے وقت آیا تھا۔ اس کا سر گنجا اور آنکھوں پر بڑے شیشوں کا چشمہ تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر روتا رہا اور جاتے وقت کفن دفن کے لیے پیسے بھی دیے۔

''موسلے۔'' فلیمنگ کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر اس نے جونز سے پوچھا۔ ''بچے کی موت کس چیز سے واقع ہوئی؟''

جونز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیا تم مجھے پروفیسر موسلے کی رہائش گاہ پر لے جا سکتے ہو؟''

وہ پرانا مکان چوکور طرز کا بنا ہوا تھا جس کے ایک جانب محافظت خانہ بنا ہوا تھا۔ سامنے والے کمرے میں مرنے والے کی لاش رکھی ہوئی تھی اور وہاں ایک شخص نگرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کمرے میں کسی جراثیم کش دوا کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ جونز نے نتھنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسی بُو ہے؟''

''اس جگہ کی فیومیگیشن کروائی گئی ہے۔ لاش کے پاس سے ایک خط ملا تھا جس میں اس کی تاکید کی گئی تھی۔''

''تم یہاں کے انچارج ہو؟''

''یہ میرا مکان ہے اور ابھی تک اس کا کوئی رشتے دار نہیں آیا۔ تم اس کے کاغذات دیکھ سکتے ہو لیکن تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

ایک پرانی طرز کی میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر سائنسی تجربات سے متعلق تھے ایک بنڈل ڈیفی ریسرچ لیبارٹریز کے بھیجے ہوئے خطوط پر مشتمل تھا جن میں ان کے ساتھ بھیجے گئے چیکوں کی تفصیل درج تھی۔

اس کے علاوہ تین لفافوں پر پروفیسر کا پتا درج تھا اور نیویارک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ان پر بالترتیب بارہ، چودہ اور بیس مارچ کی تاریخ پڑی ہوئی تھی اور ہر لفافے میں ویسا ہی کاغذ موجود تھا جو مسز فلیمنگ نے اسے دکھایا تھا۔ سب سے پرانی تاریخ والے کاغذ پر دو، دوسرے پر تین اور تیسرے پر بھی دو سرخ نقطے نظر آ رہے تھے۔ تینوں لفافوں پر پروفیسر کی ہینڈ رائٹنگ میں مختلف الفاظ درج تھے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا۔

''پورا کیا۔'' دوسرے پر ''گرم موسم کے انتظار میں۔'' اور تیسرے پر ''ایک خراب حالت میں'' درج تھا۔

جونز نے ان الفاظ کو غور سے پڑھا اور ان کا مفہوم جاننے کی کوشش کی۔ اس وقت تک بخارات کی آواز رک چکی تھی۔ وہ دونوں محافظت خانے میں داخل ہوئے تو ان کی نگاہ پژمردہ پتوں اور مرجھائے ہوئے پھولوں پر پڑی جو طاقت ور گیسوں کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے۔ اچانک ہی جونز ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور اس نے جھک کر فرش پر سے ایک مردہ پتنگا اٹھا لیا جس کے سبز پر تھے اور وہ تقریباً ایک فٹ جسامت کا تھا۔

''یہ اس کا ساتھی ہے۔'' وہاں موجود شخص نے جو فیومیگیشن کا ماہر تھا، اسے ایک قدرے چھوٹا کیڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ جگہ ان کیڑوں سے بھری ہوئی تھی لیکن اب ان کا صفایا ہو گیا ہے۔''

جونز نے وہ دونوں پتنگے میز پر رکھے اور ان کی پیمائش لینے کے بعد احتیاط سے دراز میں رکھ دیا اور بولا۔ ''مجھے ایک ٹیلی گرام بھیجنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسٹر فلیمنگ کو ساتھ لے کر ٹیلی گرام آفس گیا اور اپنا تعارف کروانے کے بعد اس نے آپریٹر سے پوچھا۔ ''میرے لیے کوئی پیغام ہے؟''

''ہاں۔'' آپریٹر نے کہا اور ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ''جب میں صبح دفتر آیا تو چیونٹم فرش پر پڑی ہوئی تھی، ڈور۔''

اس نے جواب میں ٹیلی گرام لکھا۔ ''فوراً دفتر چھوڑ دو اور جب تک اس کی مکمل فیومیگیشن نہ ہو جائے واپس مت آنا۔ یہ اشد ضروری ہے۔ جونز۔''

پھر وہ مسٹر فلیمنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نیویارک واپس جا رہا ہوں۔ اگر کوئی تم سے ان کیڑوں کی بات کرنے کے لیے آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔ یہ کارڈ رکھ لو۔''

''تمہارے حکم کی تعمیل ہوگی۔'' بوڑھے فلیمنگ نے

چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لیکن کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ان کیڑوں کی خاطر مجھے پریشان کرنے آئے گا۔''

''کیونکہ عنقریب نیشنل سائنس ویکلی اور نیویارک ایوننگ رجسٹر میں یہ اشتہار شائع ہونے والا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک مسودہ اسے تھما دیا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''برائے فروخت...... غیر معمولی جسامت کے دو عدد ریشم کے کیڑے۔ اس کے علاوہ بھی آنجہانی پروفیسر موسلے کے ذخیرے سے مزید نمونے دستیاب ہیں۔ تفصیلات کے لیے رجوع کریں۔ جونز کمرا نمبر 222، آسٹر کورٹ ٹیمپل، نیویارک۔''

نیویارک واپس جاتے ہوئے جونز نے ٹرین میں دو خط لکھے۔ ان میں سے ایک سینٹ لوئیس میں واقع ڈیفی ریسرچ لیبارٹریز اور دوسرا واشنگٹن میں ڈیپارٹمنٹ آف ایگری کلچر کو۔ دوسرے روز وہ ڈور کے دفتر گیا جس کے چہرے سے خباثت صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''میں نے فیومیگیشن پر دس ڈالر خرچ کیے اور سو ڈالر کا نقصان ہو گیا۔ اب مجھے بتاؤ کہ وہ کون ذلیل شخص ہے جو میرے کتوں کو مارنا چاہتا تھا؟''

''وہ کتے تو حادثاتی طور پر مارے گئے۔ اصل نشانہ تم تھے۔'' یہ کہہ کر اس نے کی ہول کا معائنہ کیا پھر ریڈی ایٹر کی طرف گیا اور اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد بولا۔ ''یہاں کچھ نہیں ہے۔'' پھر اس نے کھڑکیاں، بک شیلف اور میز کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا۔

''اس فیومیگیشن کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بہرحال احتیاط ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔''

''یہ سب کیا ہے؟''

''یہ دوا جراثیم کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی ہلاک کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ریشم کے کیڑے...... چند دن انتظار کر لو پھر میں تمہیں اس موضوع پر آتے ہوئے خط دکھاؤں گا۔ اس دوران تم کسی پلمبر سے کی ہول اس طرح بند کروا دو کہ اس میں سے ایک ذرہ بھی نہ گزر سکے۔''

اشتہار کی اشاعت کے فوراً بعد ہی جونز کو ڈاک کے ذریعے خطوط موصول ہونے لگے۔ وہ ان سب کو ایک طرف رکھتا گیا اور اس نے صرف وہ خطوط چن لیے جن پر نیویارک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ روزانہ نئے ناموں سے آنے والے خطوط کا موازنہ اسٹینگل بلڈنگ میں رہنے والوں سے کرتا۔ اشتہار شائع ہونے کے ایک ہفتے بعد وہ ڈور کے دفتر میں داخل ہوا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔

''تم مارکوس ایل روز نامی کسی شخص کو جانتے ہو؟'' اس نے کیسٹ سے پوچھا۔

''میں نے کبھی یہ نام نہیں سنا۔''

''مارکوس صرف ریشم کے کیڑے ہی نہیں بلکہ پروفیسر موسلے کا باقی ذخیرہ بھی خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ بتانے کے لیے مجھے ڈیلد میٹرا پارٹمنٹس سے لکھا ہے جہاں اس کی رہائش ہے اور اسی عمارت میں اس کا دفتر بھی ہے جہاں وہ اکثر رات میں کام کرتا ہے اور آخری بات یہ ہے کہ وہ پیراگون میٹ کمپنی کے خفیہ لابسٹ سے ایک ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' ڈور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مسٹر روز کا دفتر اوپری منزل پر ہے۔ اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ رات گئے کام ختم کرنے کے بعد سیڑھیوں کے ذریعے نیچے جاتے ہوئے اس کی ہول سے اندر جھانک سکے کیونکہ اس وقت لفٹ بند ہو جاتی ہے۔''

ڈور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم مسٹر روز کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہے ہو لیکن پہلے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں اس کے ساتھ کچھ نہیں کرنے والا ہوں۔'' جونز نے جواب دیا۔ ''روز محض ایک ایجنٹ ہے۔ میں کسی بڑے کی تلاش میں ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''اب جو کچھ میں کرنے والا ہوں، اس کے نتیجے میں تین طرح کے امکانات متوقع ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ایک خونی مالدار شخص اتنا خوف زدہ ہو جائے گا کہ اس کے حواس ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دوسرا یہ کہ ایک قیمتی بجرا نامعلوم سمندروں کی جانب روانہ ہو جائے گا اور تیسرا یہ کہ شام میں شائع ہونے والے زرد صحافت کے علمبردار اخباروں کی اشاعت وقتی طور پر ایک ہزار گنا بڑھ جائے گی۔''

اس روز سہ پہر میں شائع ہونے والے اخباروں میں ایک عجیب و غریب نوعیت کا اشتہار دیکھا گیا۔ یہ اخبار زرد صحافت کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے اور ان میں عموماً جھوٹی یا من گھڑت خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ اشتہار دونوں اخباروں کے صفحہ اول پر تین کالموں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ایک نقشہ بنا ہوا تھا جس میں کونیکٹی کٹ سٹی سے سرخ نقطوں کی قطار شمال سے نیویارک میں داخل ہو رہی تھی۔ جو فورتھ ایونیو سے گزرتی ہوئی یونین اسکوائر تک پہنچی اور مغرب کی جانب مڑ کر منقطع ہو گئی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

''قطار کی سمت جاننے کے لیے اگلا شمارہ دیکھیے۔''

صحافت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب من گھڑت کہانیاں شائع کرنے والے اخباروں کو اشتہاری مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اس اشتہار کو دیکھ کر لوگوں کا تجسس بڑھ گیا اور وہ اگلے ایڈیشن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اخبار فروشوں نے قیمت بڑھا دی اور اگلا ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس بار اشتہار میں سرخ نقطوں کی قطار ففتھ ایونیو سے گزرتی ہوئی شمال کی جانب تیئیسویں اسٹریٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''بقیہ اگلے شمارے میں۔''

رات کو شائع ہونے والے ایڈیشن کی مانگ میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا اور لوگوں نے اس کے لیے پانچ دس یہاں تک کہ پندرہ سینٹ بھی اضافی ادا کیے۔ دوسرے اخبارات نے بھی اس اشتہار کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اسے خاص طور پر اہمیت دی اور خبر کے طور پر شائع کیا۔ اس بار سرخ لائن ففتھ ایونیو سے ہوتی ہوئی پچاسویں اسٹریٹ پر ختم ہوگئی اور اس کے نیچے ایک بہت ہی برا جملہ درج تھا۔ ''میں جب پلٹتا ہوں تو حملہ بھی کرتا ہوں۔''

اگلے روز شام میں شائع ہونے والی ایک خبر نے اس اشتہار کی اثر انگیزی کو دھندلا دیا۔ جہاز رانی کے شعبے سے متعلق ایک خبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ بھاپ سے چلنے والی کشتی الیکٹرا جنوبی امریکی بندرگاہوں کے سفر کے لیے تیار ہے اور یہ اعلان کشتی کے مالک مارک کولویل کی جانب سے تھا۔ دوسری صبح شائع ہونے والی ایک خبر نے نیویارک کے باسیوں کو چونکا دیا لیکن جونز کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ اسی کی توقع کر رہا تھا۔ خبر کے مطابق کینڈمیٹ ٹرسٹ کے صدر کولویل اپنے کشیدہ اعصاب کو سکون دینے کے لیے ڈاکٹروں کے مشورے پر ذاتی کشتی کے ذریعے طویل بحری سفر پر روانہ ہوگئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے اکیاون ویں اسٹریٹ پر واقع اپنا مکان بھی مقفل کر دیا اور اب وہاں ان کے عملے یا ملازموں میں سے کوئی موجود نہیں تھا۔

ان اشتہارات کی اشاعت کے بعد مسٹر کرٹس فلیمنگ نیویارک آئے۔ وہ نہ صرف حیران تھے بلکہ اس بارے میں وضاحت جاننا چاہ رہے تھے۔ جونز انہیں اور مسٹر ڈور کو اپنے ہمراہ لنچ کے لیے کاسمک کلب لے گیا۔ جہاں اس نے بہت سی باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت جاننے کے لیے ہمیں اس معاملے کو شروع سے دیکھنا ہوگا۔ نیویارک میں ایک ایسے آدمی کے دفتر میں دو کتوں کی موت ہوجاتی ہے جس کے بہت طاقت ور دشمن ہیں۔ یہ دفتر مکمل طور پر بند تھا اور اس میں ایک کی ہول کے سوا کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں سے کوئی چیز اندر داخل ہوسکے۔ کوئی زہریلی چیز اس کی ہول کے ذریعے اندر داخل کی گئی اور یہ بات اس چیونگم کے ہٹائے جانے سے ثابت ہوگئی ہے جو میں نے اس کی ہول پر چپکائی تھی۔ شاید یہ کام شام کے وقت کیا گیا جب عمارت تقریباً خالی ہوجاتی ہے۔ وہ زہریلی شے سیدھی اس کونے کی طرف جاتی ہے جہاں ریڈی ایٹر نصب ہے اور اس کی گرمائش سے مغلوب ہوکر وہ چیز اس جانب لپکتی ہے جس کا مطلب ہے وہ کوئی حساس کیڑا ہے۔''

''کیا وہ کوئی زہریلا سانپ تھا؟'' ڈور نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے لیکن ایک سانپ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو کتوں کی نظر میں فوراً آجاتا۔ اب ہم برج پورٹ چلتے ہیں۔ یہاں بھی ایک مہلک کیڑا تباہی کا سبب بنا لیکن اسے ایک حادثہ کہا جاسکتا ہے اور اس کا ذمّے دار ایک تجربے کرنے والا سائنس داں تھا اور یہاں بھی گرم موسم کی وجہ سے خطرہ بڑھ گیا۔ پروفیسر موسلے کا خیال تھا کہ شدید سردی کے موسم میں ان کیڑوں کی ہلاکت آفرینی غیر موثر ہوجائے گی لیکن بدقسمتی سے سرد موسم آنے سے پہلے ہی تمہارا کتّا اس کا شکار ہوگیا اور یہی کچھ اس معصوم بچے کے ساتھ بھی پیش آیا۔''

''کیا تم ہمیں یہ یقین دلانا چاہ رہے ہو کہ بے چارہ بوڑھا موسلے ہی ان واقعات کا ذمّے دار ہے؟'' فلیمنگ نے تلخی سے کہا۔

''اس سے بھی کہیں زیادہ۔'' جونز نے کہا۔ ''اس کی بے پروائی کی وجہ سے یہ خطرہ پورے علاقے میں پھیل گیا اور جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ تم ایک رابطہ کو بھول رہے ہو۔ میرا اشارہ اس خفیہ پیغام کی جانب ہے جو نیویارک سٹی سے پروفیسر کے پتے پر بھیجا گیا تھا اور یہ اس گاہک کی جانب سے تھا جس نے سرخ نقطوں کے ذریعے اپنا آرڈر بھیجا۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی اور ان ریشم کے کیڑوں کی مدد سے اس تک پہنچ سکا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیڑے کس طرح اندر آئے ہوں گے؟'' ڈور نے حیران انداز میں کہا۔ ''ایک فٹ چوڑا کیڑا اس کی ہول سے نہیں گزر سکتا۔''

''نہیں اور گزر بھی جائے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس لیے کہ یہ ایک بے ضرر کیڑا ہے۔ اس کیس میں بھی ان کا کوئی کردار نہیں۔ ان کی حیثیت صرف ایک

چلمنے جیسی ہے۔ ان کی غیر معمولی جسامت نے پروفیسر کو راستہ دکھایا اور اس نے ایسے کیڑے تخلیق کرنے کا تجربہ کیا جو عام کیڑوں سے دو تین گنا بڑے تھے اور مہلک ہونے کے ساتھ ساتھ اس بڑے کی ہول سے بھی گزر سکتے تھے۔ یہ تعین کرنے کے بعد.....''

''تمہیں معلوم ہوا کہ وہ کیا تھا؟'' ڈور نے پوچھا۔

''ایک منٹ، یہ جان لینے کے بعد مجھے نیویارک میں مقیم پروفیسر موسلے کے گاہک کا پتا چلانا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ پروفیسر موسلے کی اس مخصوص ریسرچ میں دلچسپی رکھتا ہے لہٰذا میں نے اسے گھیرنے کے لیے ریشم کے کیڑوں کے اشتہار کا ڈھونگ رچایا اور جب مجھے مسٹر روز کا جواب موصول ہوا جو مسٹر ڈور کا پڑوسی کرائے دار ہے تو یہ زنجیر مکمل ہوگئی۔ تم نے دیکھ لیا کہ ریشم کے کیڑے کتنے کارآمد ثابت ہوئے۔ ان کی جگہ اگر میں اشتہار میں مکڑی کا ذکر کرتا تو وہ ہوشیار ہوجاتا اور کبھی مجھ سے رابطہ نہ کرتا۔''

''یہ کون سی مکڑی ہے؟''

جواب میں جونز نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ یہ خط امریکی محکمۂ زراعت کے بیورو آف انٹامولوجی کی جانب سے تھا اور اس میں لکھا تھا۔ ''مسٹر جونز، آپ نے اپنے خط میں جس کیڑے کے بارے میں دریافت کیا ہے، وہ ایک چھوٹی مکڑی ہے جسے لیٹرو ڈیکٹس میکٹن کہا جاتا ہے اور یہ اس جنس میں سب سے زیادہ زہریلا کیڑا ہے اور اسے عام طور پر ریڈ ڈاٹ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کی پشت پر ایک سرخ نشان ہوتا ہے۔ ایسے کیسز بہت کم سامنے آئے ہیں جن میں اس کیڑے کے کاٹنے سے موت واقع ہوئی ہو۔ خوش قسمتی سے اس کے زہریلے دانت اتنے کمزور ہیں کہ وہ صرف بہت ہی نرم جلد میں سرایت کر سکتے ہیں ورنہ اس کے کاٹنے کی وجہ سے اموات کی شرح میں اضافہ ہوسکتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے خارج ہونے والا زہر انتہائی زہریلا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اس بارے میں کوئی معلومات نہیں کہ اس کیڑے کی افزائش کے بارے میں کوئی تجربہ کیا جارہا تھا۔ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے کہ عام جسامت سے دوگنا یا تین گنا بڑا کیڑا زندگی کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے اور ان کی افزائش انتہائی محفوظ طریقے سے کی جانی چاہیے کیونکہ بڑے دانت ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ زہر خارج کریں گے جو کو برا سے بھی مہلک ہوسکتا ہے۔ اس کے کاٹنے سے کسی بھی زندہ جسم میں تشنج کی علامت پیدا ہوتی ہے اور متاثرہ جسم شدید درد کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

آگ

ہوٹل میں قیام کے دوران میں ایک صاحب رات کو مخمور سی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچے اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔ ''منیجر کہاں ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

''وہ اس وقت ہوٹل میں موجود نہیں ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔'' کلرک نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے کمرے کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' وہ فضا میں ہاتھ لہرا کر بولے۔

''کیا بیڈ ٹھیک نہیں ہے؟'' کلرک نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بیڈ تو بہترین ہے۔ میں نے زندگی میں اتنا شان دار بیڈ نہیں دیکھا۔'' انہوں نے کہا۔

''تولیوں اور چادروں وغیرہ کے بارے میں کوئی شکایت ہے؟'' کلرک نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں تولیے چادریں تو بہترین ہیں میں نے زندگی میں اتنے شان دار تولیے اور چادریں نہیں دیکھیں۔'' انہوں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا باتھ روم میں گرم پانی نہیں آرہا؟ باتھ روم گندہ ہے؟'' کلرک ان کا مسئلہ جاننا چاہ رہا تھا۔

''نہیں گرم پانی بھی آرہا ہے۔ باتھ روم بھی صاف ستھرا ہے۔ میں نے زندگی میں اتنا شان دار باتھ روم نہیں دیکھا۔'' انہوں نے غنودہ لہجے میں دعویٰ کیا۔

''تو پھر آخر کمرے میں کیا کمی ہے؟ آپ کو کیا شکایت ہے؟'' کلرک نے تنگ کر پوچھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''دراصل کمرے میں آگ لگی ہوئی ہے!'' انہوں نے اطمینان سے انکشاف کیا۔

گرل فرینڈ

ایک سردار جی بائیک پر اپنی بہن کو کالج سے لے کر گھر واپس آرہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک سکھ دوست ملا اور اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''کیا بات ہے سردار جی! اکیلے اکیلے گرل فرینڈ کے ساتھ موجیں اڑا رہے ہو!''

سردار جی کو بہت غصہ آیا۔ بائیک روک کر غصے میں نیچے اترے اور اپنے سکھ دوست کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اوئے! گرل فرینڈ ہوگی تیری، میری تو بہن لگتی ہے!''

سائرہ مسعود۔ میرپور، آزاد کشمیر

مقامی طور پر اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی البتہ بعض صورتوں میں کاٹنے کی جگہ پر ایک چھوٹا سا چھالا بن جاتا ہے۔ تجارتی اعتبار سے یہ زہر خاص قیمتی ہے کیونکہ اسے دل کی بعض بیماریوں میں مفید پایا گیا ہے۔ مزید تفصیلات جاننے کے لیے آپ ڈیی لیبارٹریز سینٹ لوئس سے رابطہ کرسکتے ہیں جو اس زہر کے خریدار ہیں۔ یہ کیڑے سردی برداشت نہیں کرسکتے اور شدید سردی میں جب درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے ہو، یہ مرجاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر لکڑی کے ڈھیر اور کھلی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ آپ کا مخلص ایل او ہوورڈ، چیف آف بیورو۔''

ڈور نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''اس لیے روز... رات کے وقت اس عمارت میں منڈلاتا رہا تاکہ موقع دیکھ کر اس مکڑی کو کی ہول کے ذریعے میرے دفتر میں پھینک دے جو اسے پروفیسر موسلے نے بھیجی تھی۔ اسے امید تھی کہ ان میں سے کوئی ایک جلد یا بدیر میرا خاتمہ کردے گی۔''

''کیا تم بتاسکتے ہو کہ روز کو ہمارے دوست مسٹر ڈور سے کیا دشمنی ہوگئی تھی؟'' مسز فیلمنگ نے جوز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بظاہر تو کوئی دشمنی نظر نہیں آتی۔'' جوز نے کہا۔

''اگر کوئی دشمنی نہیں تھی تو پھر وہ یہ زہریلی مکڑیاں کی ہول کے ذریعے اندر کیوں پھینک رہا تھا؟''

''دراصل مسٹر ڈور نے ایک بہت بڑی کمپنی جو ڈبوں میں گوشت بند کرکے بیچتی ہے اس کے کام میں مداخلت کی تھی۔ اس کے پاس ایسی معلومات تھیں جن کی بنا پر کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا تھا لہٰذا اب ضروری سمجھا گیا کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔''

''نان سینس۔'' فلیمنگ نے غصے سے کہا۔ ''ٹرسٹ اصولوں سے ہٹ سکتے ہیں لیکن انفرادی جرائم نہیں کرتے۔''

''کیا پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا؟'' جوز نے کہا۔ ''میں ایسی کئی مثالیں دے سکتا ہوں جب بڑی بڑی کمپنیاں نقصانات سے بچنے کے لیے جعل سازی، چوری یا آتش زنی کا سہارا لیتی ہیں اور اگر جیل جانے کا خطرہ ہو تو حفاظتی تدبیر کے طور پر مخالفین کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ جیسا کہ مسٹر ڈور کے معاملے میں ہوا۔''

''لیکن مجھے مارنے کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟''

''پہلے انہوں نے تمہیں قتل کرنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے عام طریقے آزمائے لیکن کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ ٹرسٹ اس کام کے لیے اپنے کسی خاص اور خفیہ آدمی کا انتخاب کرے۔ روز ایک شوقیہ ماہر حشریات ہے۔ اس نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جو بظاہر محفوظ اور یقینی تھا۔''

''اور اس طرح تمہاری مہارت کا بھی امتحان ہوگیا؟'' مسز کرٹس نے پُرستائش انداز میں کہا۔

''اس میں اتفاقات کو بھی بڑا دخل ہے۔'' جوز نے کہا۔ ''ایک سراغ رساں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اتفاقات پر نظر رکھے اور ان سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کیس میں بھی کئی اتفاقات سامنے آئے مثلاً پروفیسر موسلے کے پنجرے سے ریڈ ڈاٹ کا باہر نکلنا۔ گولڈن بل میں کُتّے اور اس کے بعد ایک بچے کی موت، پروفیسر موسلے کی میز پر سے ریڈ ڈاٹ والے خطوط کا ملنا حالانکہ اسے چاہیے تھا کہ وہ ان خطوط کو ضائع کردیتا اور ڈور کے دفتر میں کتوں کی ہلاکت۔''

''اور سب سے بڑا اتفاق تو یہ ہے کہ تمہاری نظر اس اشتہار پر چلی گئی جو میں نے اپنے دوست کے لیے ہر اخبار میں دیا تھا اور تم اس کیس میں دلچسپی لینے لگے۔'' ڈور نے کہا۔ ''ان مکڑیوں کا کیا بنا جو میرے کی ہول سے اندر داخل کی گئی تھیں؟''

''ان میں سے شاید دو کو تو کُتّوں نے مار دیا اور بقیہ رات کے وقت سردی سے ٹھٹھر کر مرگئی ہوں گی جب ریڈی ایٹر بند اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کام کرنے والی عورت نے بھی دفتر کی صفائی کرتے وقت اس پر دھیان نہیں دیا ہوگا اور اگر روز یہ سلسلہ جاری رکھتا تو ایک نہ ایک دن کوئی مکڑی تمہارا کام تمام کردیتی اور گوشت کمپنی والے جشن مناتے۔''

''تم نے یقینی طور پر میری جان بچائی ہے اور اس کے لیے میں تمہارا تہِ دل سے مشکور ہوں۔'' ڈور نے کہا۔

جوز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کچھ قدرتِ خداوندی کا بھی دخل ہے اگر برج پوسٹ میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے پانچ ڈگری نیچے گرجاتا تو یہ زہریلی مکڑیاں مرجاتیں اور وہ اطالوی بچہ بچ جاتا اور پروفیسر بھی خودکشی نہ کرتا۔''

''خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔'' ڈور نے سر جھکاتے ہوئے کہا اور کھانے میں مصروف ہوگیا۔

آزادی

محمد ابراہیم جمالی

آزادی کا مہینہ... آزادی کا موسم... من پسند موسم ہوتا ہے... جہاں ہر طرف وطن کی محبت کے چشمے پھوٹ رہے ہوتے ہیں... مگر یہ آزادی آسانی سے نہیں ملی بلکہ اس کی خاطر ہمارے پُرکھوں نے اَن گنت قربانیاں دان کی ہیں... تب کہیں یہ آزاد فضائیں مقدر بنی ہیں... آزادیِ وطن کے تناظر میں لکھی گئی ایک انمول تحریر... حساس دل رکھنے والوں کے لیے ہندی ادب سے ماخوذ ایک خاص تحفہ...

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

غلامی سے نجات کی کوششیں... آزادی کا سفر دردناک...

میں صوفے سے ٹیک لگائے ٹی وی سے زیادہ اپنی پوتی ڈولی کی طرف دیکھ رہا تھا جو فرش پر آلتی پالتی مارے بڑے انہماک سے ٹی وی اسکرین پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھی۔ یہ ٹی وی سیریل نہ جانے کیوں اسے بہت پسند تھا جبکہ اس میں ماضی کے ظلم و ستم، آزادی کی جدوجہد اور اس سلسلے میں ہونے والی جان بازیوں اور قربانیوں کی داستانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

ہم جیسے لوگوں کے لیے تو خیر تحریکِ آزادی کی
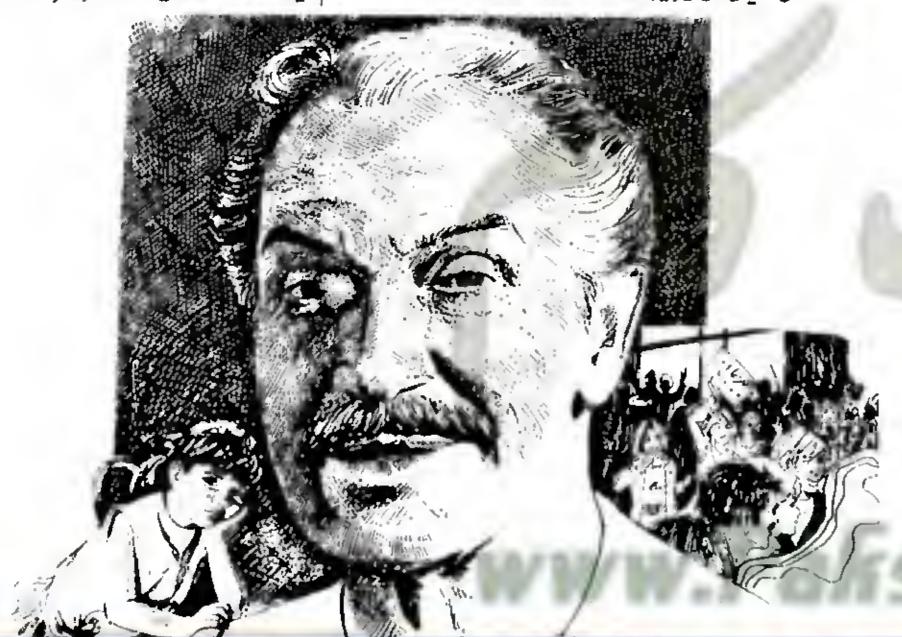
داستانیں کسی حد تک دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں کیونکہ ہم نے غلامی کا وہ بے رحم دور اپنے اوپر جھیلا تھا اور اس سے نجات پانے کی جدوجہد بھی ہمارے سامنے ہوتی رہی تھی۔ مگر میری پوتی، جو آزادی ملنے کے چوتھائی صدی بعد پیدا ہوئی تھی... نہ جانے کیوں ان سانحوں کو اس قدر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

سیریل ختم ہوا تو ڈولی اٹھ کر میرے پاس آگئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دادا جی! کیا آپ کے وقتوں میں واقعی ایسا ہوا تھا؟ کیا آزادی مانگنے والوں کو اس طرح بے رحمی سے مارا جاتا تھا؟ اوہ گاڈ! لوگ کس طرح نعرہ لگاتے ہوئے پھانسی پر چڑھ جاتے تھے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے... یہ آزادی ہمیں بہت مہنگے داموں ملی ہے... ہے نا دادا جی؟“

”ہاں بیٹا! آزادی ہمیشہ مہنگے داموں ہی ملتی ہے۔ لاکھوں لوگوں نے برسوں تک اس کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ جیلوں کی مصیبتیں برداشت کی ہیں، اپنی جانیں قربان کی ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اپنے دیس میں آزادی کا سانس لے سکیں اور وہ ظلم جو اُن پر ہوئے ہیں آئندہ ان کے بچوں پر نہ ہوں۔ یہ اُن ہی لوگوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے بیٹا کہ آج تم آزاد وطن میں رہ رہی ہو اور دنیا کے کسی بھی آزاد شہری کی طرح تمہیں ساری سہولتیں اور حقوق حاصل ہیں۔“

”مگر دادا جی! آپ نے بھی تو ظلم سہے ہوں گے۔ انگریز لوگ آپ پر کس طرح کی زیادتیاں کرتے تھے؟ بتائیے نا.....“ ڈولی کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

ڈولی کے استفسار پر میرے اندر ایک افسردگی چھا گئی تھی۔

”انگریزوں کے پاس ظلم کرنے کے بہت سے طریقے تھے بیٹا! ہر شخص کسی نہ کسی ڈھنگ سے ظلم کی چکی میں پستا ہی رہتا تھا مگر تم یہ سب نہیں سمجھ سکو گی۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو نا... جاؤ بیٹا! باہر جا کر کھیلو، دیکھو بھیا تمہیں بلا رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر میں نے ڈولی کو تو وہاں سے ٹال دیا مگر اس کا یہ چھوٹا سا سوال مجھے فوراً ماضی کے اس دور میں لے گیا جب میں تو ڈولی کی عمر کا تھا۔

مجھے جون 1934ء کی وہ دوپہر آج بھی یاد ہے جب میں مظفر گڑھ کے ایک مضافاتی اسکول سے اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ ڈیڑھ میل پیدل چل کر شہر تک آیا تھا اور اس وقت ملتانی دروازے کے باہر تارکول کی تپتی ہوئی بے سایہ سڑک کے کنارے کھڑا دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ اور اسکولوں کے بچے بھی تھے جو نہ جانے کہاں کہاں سے لائے گئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس تمام اسکولوں کے بچوں کی ایک لمبی قطار سمندر کی کسی لہر کی طرح دور دور تک بلتی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کے ہاتھوں میں یونین جیک تھے۔ یہ سارا اہتمام صوبے کے گورنر کے استقبال کے لیے کیا گیا تھا۔

کلاس ٹیچر چھڑیاں ہاتھوں میں لیے سڑک کے دونوں طرف بھاگ بھاگ کر بچوں کو لائن میں کھڑے رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ بچوں کے چہرے دھوپ اور گرمی کی شدت سے سرخ ہو رہے تھے۔ پسینے سے سب کی قمیصیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پیاس کی شدت سے سب کے ہونٹ خشک تھے۔ کچھ فاصلے پر صرف ایک ہینڈ پمپ تھا جہاں ایک وقت میں صرف دو بچوں کو جانے کی اجازت ملتی تھی۔

میرے پاس کھڑے ہوئے ایک کمزور سے لڑکے نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ”ہم یہاں کیوں لائے گئے ہیں....؟ ہمیں اور کتنی دیر یہاں کھڑا رہنا پڑے گا؟ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔“

اس کی بات سن کر قریب کھڑے ہوئے لڑکے نے سہمے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ”تمہیں پتا نہیں، لاٹ صاب اِدھر آ رہے ہیں۔ ان کے آنے پر ہمیں یہ جھنڈیاں ہلانی ہیں۔ جو کوئی ایسا نہیں کرے گا، لاٹ صاحب کی انگریز فوج اسے گولی مار دے گی۔“

اس کی بات پر ہم دونوں سہم گئے تھے اور ہم نے جھنڈیوں کو اپنے ہاتھوں میں اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

میں بھی بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ پیاس سے الگ حلق سوکھ رہا تھا۔ پانی مجھ سے دور تھا اور راستے میں یزیدوں کی فوج صف آرا تھی۔ استاد کی چھڑی ہر پانچ منٹ بعد ہمارے سامنے سے ہو کر گزر جاتی تھی۔

گورنر صاحب کے آنے کا وقت ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ٹیچروں کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ گورنر بہادر کے آنے کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹا اوپر ہو چکا ہے۔ دھوپ اور گرمی سے اب میرا بھی سر چکرانے لگا تھا۔ جی چاہ رہا تھا وہیں بیٹھ جاؤں مگر ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کا ڈر میرے جسم کو کسی طرح میری بے جان ٹانگوں پر سنبھالے ہوئے تھا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک لڑکا بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا، جسے ٹیچروں نے جلدی سے اٹھا کر دور ایک دیوار کے سائے میں لٹا دیا تھا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے تھے۔

آدھے گھنٹے کے مزید تکلیف دہ انتظار کے بعد لاٹ صاحب کی گاڑیوں کا کارواں وہاں سے گزرنا شروع ہوا مگر اس وقت تک بچوں میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ نڈھال ہاتھ جھنڈیاں تھامے بڑی مشکل سے اوپر اٹھ رہے تھے۔ سوکھے ہوئے گلوں سے بیٹھی بیٹھی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”لاٹ بہادر زندہ باد!“

”سرکار انگلشیہ زندہ باد!“

”جارج پنجم زندہ باد!“

قافلہ ان معصوم جانوں پر گزرنے والی آفتوں سے بے نیاز تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں چھٹی مل گئی تھی مگر چلنے کی سکت کسی میں نہ تھی۔ میں بھی گھر جاتے ہوئے راستے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ کچھ لڑکے مجھے اٹھا کر گھر چھوڑ آئے تھے۔ اس کے بعد سن اسٹروک کی وجہ سے میں پورے ایک ہفتے تک بخار میں جلتا رہا تھا۔

لاٹ صاحب اور ان کے مصاحبوں کو کس نے بتایا ہو گا کہ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے بچوں کا بعد میں کیا حشر ہوا؟ اس طرح کے ستم سرکار کی طرف سے براہِ راست نہ ہونے کے باوجود جان لیوا ہوا کرتے تھے۔ میں اپنی پوتی ڈولی کو ان کے بارے میں بتا کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ ایک آزاد ملک کی بچی تھی اور اسکول کے بچوں پر ہونے والے اس طرح کے مظالم کا ذکر اس کی شخصیت اور ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

.... لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے اپنے اس نظریے کو سڑک کے کنارے صلیب پر لٹکے دیکھا۔

دھوپ میں جلتی ہوئی پالم روڈ کے دونوں طرف آج بھی اسکول کے بچے اپنے ہاتھوں میں جھنڈے لیے کسی بڑے منتری اور اس کے ساتھ آنے والے یورپ کے ایک معزز مہمان کے استقبال کے لیے قطار باندھے کھڑے تھے، میری پوتی بھی ان میں شامل تھی۔ سب بچوں کے چہرے دھوپ میں تپ رہے تھے۔ ہونٹ پیاس سے خشک تھے۔ نظریں پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ اس بار استادوں کے ساتھ استانیوں نے بھی بچوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

میرے کھڑے کھڑے ہی کاروں کا قافلہ وہاں سے گزرا۔ تھکے ہوئے ہاتھوں میں جھنڈیاں اسی طرح ہلیں۔ خشک گلوں سے آوازیں بھی اسی طرح ابھریں۔ ”زندہ باد... زندہ باد....“

مجھے ایسا لگا جیسے میری پوتی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں نہیں کھڑی ہے... بلکہ پچاس سال پہلے میں خود اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ یونین جیک ہاتھ میں تھامے مظفر گڑھ کی اسی سڑک پر موجود ہوں اور بچوں کے پیاس سے خشک گلوں سے نکلتی ہوئی آوازوں میں میری آواز بھی شامل ہے۔

”لاٹ بہادر، زندہ باد!“

”سرکار انگلشیہ زندہ باد!“

”جارج پنجم زندہ باد!“

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی، اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

"اوخیر..."

میری بات پر اول خیر کے حلق سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں ہونٹ پر ہونٹ دبائے اس کار کے تعاقب میں تھا جو بلاشبہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا پلاٹز تھی۔ رنگ اس کا سلور کلر تھا۔ مجھے اس عورت کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ باپ کو اسے اپنے بچپن میں، میں نے "جانو" یا "جان" کہتے ہی مخاطب کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وزیر جان کا بھی اپنا نام پتا نہیں اس وقت کیا تھا۔ ماں کو اسے میں نے شیدا ہی پکارتے سنا تھا۔ اصل نام تو میں نے اطفال گھر میں اپنے بچپن میں بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی، شاید اس وقت میرا شعور نام اور شناخت وغیرہ کے حوالے سے اتنا پختہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ ماں باپ کے حوالے سے متعلق جذبات کو محسوس ضرور کرسکتا تھا۔

"شہزی کاکے! اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تو اس عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا لیکن تو چاہتا کیا ہے اس عورت سے؟ اور یہ ہے کون؟ لگتی تو مجھے وزیر جان کی بیوی ہی ہے۔" چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اول خیر نے کہا۔

جواباً میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

"یہ وزیر جان کی بیوی ہی ہے اور میں اسے اپنی سوتیلی ماں سمجھتا تھا۔"

"مگر کاکے! موجودہ صورت حال میں تو اب وزیر جان سے بھی تیرا کوئی رشتہ نہیں رہا پھر..."

"رشتہ میرا سوتیلی ماں سے بھی نہیں رہا مگر وزیر جان بہرحال میرا سوتیلا باپ ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اوخیر۔" اول خیر ہولے سے بڑبڑایا پھر بولا۔

"کاکے! اس زنانی کے سلسلے میں اپنا ہاتھ ذرا ہولا رکھنا ابھی تو بڑی مشکل سے پولیس سے جان چھوٹی ہے۔ کہیں یہ وزیر جان، ہم پر اغوا یا اور کسی گھٹیا قسم کا مقدمہ قائم نہ کردے۔"

میں بظاہر جوش میں آکر فوری طور پر جو قدم اٹھاتا تھا، اول خیر اس سلسلے میں فوراً اس کے مابعد متوقع نتائج ...... سے آگاہ کرنا اپنا فرض ضروری سمجھتا تھا لیکن بہرحال اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے کسی بھی طرح کے اٹھائے ہوئے اقدام سے خائف یا پہلوتہی برتنے کی کوشش کرتا ہو، مگر اس بار مجھے بھی صورتِ حال کچھ گمبھیر سی معلوم ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہی تھی کہ میرا ارادہ اس عورت پر قابو پانا اور اس سے "سچ" اگلوانا تھا۔ یقیناً اس عورت نے ایک طویل عرصہ اپنے شوہر وزیر جان کے ساتھ گزارا تھا۔ کافی سے زیادہ حقائق کا میرے بارے میں اسے بھی علم تو ہوگا ہی اور نہیں تو... یہ مجھے وزیر جان کی موجودگی کا بتاسکتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہوسکتا تھا، وغیرہ۔ مگر بات پھر گھوم پھر کر وہیں آن اٹکی تھی کہ اس عورت سے ضروری پوچھ گچھ کے لیے اسے پہلے کسی ایسی جگہ لے جانا ضروری تھا جو نسبتاً محفوظ بھی ہوتی اور خفیہ بھی... اس سے پہلے میں ایسے کسی "شکار" کو بیگم صاحبہ کے کسی اڈے کی طرف لے جایا کرتا تھا مگر اب اول خیر والے "معاملے" کے باعث وہاں کا رخ میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے بیگم صاحبہ نے اول خیر کو خود سے اور اپنے گروہ سے بے دخلی کا حکم جاری کردیا تھا تو میں نے بھی دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اب بیگم صاحبہ سے یا اس کے کسی ساتھی سے کسی قسم کا کوئی تعلق قائم نہیں رکھوں گا۔ یوں بھی موجودہ اور تازہ تر صورتِ حال کا تعلق خالصتاً میری "ذات" سے تھا۔

ایک آخری ایسی جگہ سرمد بابا کی کوٹھی بچی تھی۔ وہاں کے بارے میں کچھ سوچا جاسکتا تھا۔

"کاکے! لگتا ہے اس بار تیرا دماغ بھی نہیں چل رہا۔" اول خیر معنی خیز لہجے میں ہولے سے مسکرا کر بولا۔

"میرا دماغ کام کررہا ہے اول خیر۔" دفعتاً میں نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی اور تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن کے ساتھ کہا۔ "تو اب تماشا دیکھتا چل، میں یہ سب کیسے کرتا ہوں۔"

"اوخیر۔" اول خیر ہولے سے بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔

کار خاصی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی اور میں بڑی محتاط روی کے ساتھ بہ دستور اس کے تعاقب میں تھا۔ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں اچانک ہی اس صورتِ حال سے نمٹنے کا طریقہ آیا تھا گو اس میں بھی رسک تھا مگر اتنا نہیں جتنا کہ اسے اغوا یا یرغمال بنا کے سرمد بابا کی کوٹھی لے جایا جاتا۔

وہ سلور کار شہر کے معروف گنجان علاقے میں داخل ہو چکی تھی اور پھر ایک متوسط سے پختہ اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے رک گئی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں سامنے نظریں جماتے ہوئے اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ وزیر جان جیسے آدمی کی بیوی کا ایک متوسط علاقے کے اس گھر کے سامنے رکنا میرے لیے باعثِ حیرت تھا مگر مجھے اپنی "راہ" ہموار ہونے کی پوری طرح امید ہو چلی تھی۔ کیونکہ میرا ارادہ یہی تھا کہ یہ عورت جہاں کا رخ کرے گی اسے وہیں دبوچنے کی کوشش کروں گا۔

اب وہ گاڑی ایک متوسط سے مکان کے سامنے رکی تھی۔ وہاں مجھے ایک اور کار کھڑی نظر آئی تھی۔ یہ بسکٹ کلر کی لیانا تھی۔ میں نے فوراً شبہے کے پیشِ نظر اپنی کار دائیں جانب کی قدرے تنگ سی گلی میں کار روک دی اور اول خیر کو وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کرکے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ میرے انداز و اطوار سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس پر وہاں آنے جانے والوں کو مجھ پر کسی قسم کے چونکنے کا موقع ملے۔ ظاہر ہے دن کا وقت تھا اور وہاں بہت سے لوگوں کی "آوک جاوک" دیکھنے میں آتی تھی۔ میں گلی سے ابھرا تو عورت کو مذکورہ گھر کے دروازے پر کھڑے پایا۔ وہ غالباً دستک دے چکی تھی یا وہ غیر معمولی طور پر محتاط روی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ گویا معاملہ راز داری کا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔ میں پلٹا۔ اول خیر کار کے اندر سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں گلی کی دیوار کی آڑ میں تھا۔ دوبارہ اندر کار میں جا بیٹھا اور بولا۔ "وہ عورت گھر کے اندر جا چکی ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے کسی سے رازداری کے ساتھ ملنے آئی ہے۔ ایک سوزوکی لیانا بھی باہر موجود ہے۔"

"کون ہوسکتا ہے؟ معاملہ کچھ پُراسرار سا ہے۔" اول خیر نے تبصرہ کیا۔ میں نے کہا۔

"تم اِدھر ہی رہو، میں اندر جاتا ہوں۔"

"اوخیر، پھر ذرا خیال سے کاکا! یہ متوسط علاقہ ہے، لوگ شور شرابا ڈالنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے گا کیونکہ "اندر والے" بھی رازداری رکھے ہوئے ہیں۔" میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت کہا۔ پھر دوبارہ کار سے اتر گیا۔

گن ہم پھینک چکے تھے۔ ہمارے پاس صرف میگارو تھے۔ اس کے اندر بھی چند ہی گولیاں بچی تھیں۔ سرِدست کافی ہی تھیں۔ گھر کے دروازے کے قریب آکے میں نے دستک دے ڈالی۔ اپنا چہرہ سرِدست ترچھا کیا ہوا تھا۔

"کون؟" اندر سے کسی عورت کی آواز ابھری۔ آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ میں نے اپنے لہجے کو مخصوص بناتے ہوئے کہا۔

"او بی بی! باہر گاڑیاں کس کی کھڑی ہیں۔ ایک طرف تو کر لو ہمارا ٹرک پھنسا ہوا ہے۔" بڑھیا بھی کوئی خرانٹ عورت تھی۔ چند لمحوں بعد میں نے کنڈی کھولے جانے کی آواز سنی اور گردوپیش سے مطمئن ہو کے یک دم دروازے کو دھکا دیا۔ عمر رسیدہ عورت ہلکی چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کے چند قدم پیچھے کو ہٹی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عقب میں دروازے کو کنڈی چڑھا کے پستول نکال لیا۔ عورت کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوگئے۔ پل کے پل میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ مختصر سا نیم پختہ صحن تھا۔ ایک کھرّی چارپائی کونے میں رکھی تھی۔ دو کرسیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹا سا برآمدہ، اس کے دائیں جانب کچن، دو کمرے، دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک خالی تھا دوسرے میں دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ کھڑبڑاہٹ پر وہ برآمدے میں آئیں تو مجھے دوسری عورت کو دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔

ایک عورت وہی تھی جس کے تعاقب میں، میں یہاں آیا تھا جبکہ دوسری عورت جو نسبتاً جوان اور شوخ سی تھی اسے دیکھ کر مجھے جس طرح شناسائی کا جھٹکا لگا تھا، اس نے میرے سوچتے ذہن کو تیزی کے ساتھ برمایا تھا اور مہمیز کیا تھا کہ میں نے آخر اس نوجوان سی لڑکی کو کہاں دیکھا تھا؟

☆☆☆

یہ نوجوان لڑکی، نیلی کوٹھی کی نیلی خاتون تھی اور واقعی نیلی تھی، یعنی اس کی خوب صورت کشادہ آنکھیں جو ہر سے رمزیہ مسکراہٹ لیے ہوتی تھیں، نیلے رنگ کی تھیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ ان "دکھری" قسم کی خصوصیات کی بنا پر یہ خاتون مجھے یاد رہ گئی تھی۔

یہ نیلی خاتون... زبیر خان کی "اگلی" یعنی (پتا نہیں) دوسری یا تیسری بیوی تھی اور اس کی آدھی عمر سے بھی کم عمر نیلی خاتون کی تھی جبکہ نیلی کوٹھی وہی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے ایک عجیب سے ماحول میں میری زبیر خان کے ساتھ ملاقات اور نیلی کے ساتھ معنی خیز مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ خانم شاہ کی وہاں ایک پرانے مسئلے کے لیے رضاکارانہ انٹری ہوئی تھی اور پھر زبیر خان کے مقربِ خاص کار پرواز... تارڑ کے باعث کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے زخمی خانم شاہ کو کندھے پر ڈال کر اسپتال پہنچانا پڑا تھا اس کے بعد میرا زبیر خان سے دوبارہ سامنا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ ایک بدنصیب باپ تھا اور اپنے بیٹے شفقت راجہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے میری مدد کا خواں تھا۔

مگر اب... نیلی کو وزیر جان کی بیوی کے ساتھ یہاں دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا اور نیلی کو بھی

جو یقیناً مجھے ان مذکورہ ایام کے حوالے سے اچھی طرح پہچان رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ دونوں اس متوسط علاقے کے ایک عام اور عسرت زدہ گھر میں کیا کر رہی تھیں؟

نیلی خاتون کے دلکش چہرے پر توشناسائی کے باعث حیرت کے آثار منجمد تھے جبکہ عورت کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ خوفناک میگا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ عمر رسیدہ عورت کی اب گھگی بندھی ہوئی تھی۔

''تت... تم... کک... کون...'' وزیر جان کی بیوی نے خوف سے بھنچی بھنچی آواز میں پوچھا۔

''خبردار... کوئی بھی اونچی آواز میں نہیں بولے گا۔ نہ ہی کسی قسم کی کوئی چالاکی دکھانے کی غلطی کرنا۔ سب اندر چلو جلدی...'' میں نے درشت آواز میں کہا اور عمر رسیدہ خاتون کو بھی سامنے والے کمرے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

''تم شہزاد احمد خان عرف شہزی ہو نا؟'' نیلی خاتون جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی، بے اختیار بولی۔ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ عورت بوکھلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اب حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات سے پھٹی چلی گئیں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ ضرور... وزیر جان نے مجھ سے پہلے ''تاکرے'' کے بعد سے اسے... یعنی اپنی چہیتی بیوی کو غائبانہ ''اپ ڈیٹ'' کر رکھا تھا اور مجھے بلکہ اس معصوم سے آٹھ نو سالہ بچے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ جسے اس کے اصل ماں باپ سے دور کر کے ''اطفال گھر'' جیسے لاوارث بچوں کے ادارے میں داخل کر دیا گیا تھا۔

''ہاں، میں وہی ہوں... چلو اب اندر... ورنہ تم سب جان سے جاؤ گی۔'' میں نے ان کی طرف گھور کر کہا۔

اس بار تینوں خواتین نے بلاچون و چرا میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہم اندر کمرے میں آگئے، کمرے کی حالت نسبتاً بہتر تھی۔ وہ تینوں کرسیوں پر براجمان ہو گئیں۔ میں نے بھی ایک کرسی گھسیٹ لی۔ نیلی خاتون کے چہرے پر خوف کا سرے سے کوئی شائبہ تک نہ تھا جبکہ اس کی جگہ اب ایک عجیب سی طمانیت اور پُرسکون سوچ کے آثار غالب تھے جبکہ عورت بدستور میری طرف خوف و حیرت سے تکے جا رہی تھی۔ وہ مجھے اب پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ چودہ، پندرہ سال کے بیتے ہوئے عرصے نے اس کی صحت یا عمر کو کچھ خاص متاثر نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ان کی معاشی و مالی حالت کے یک دم کایا پلٹ جانے کی رہین منت تھی۔ باقی اس نے اعلیٰ درجے کا میک اپ اور بیش قیمت لباس سے چھپا رکھا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم ہم سے؟'' بالآخر وزیر جان کی بیوی نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ خاصی حد تک سنبھل چکی تھی جبکہ نیلی خاتون کو سنبھلنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی ''سنبھلی'' ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف اور پھر نیلی خاتون کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں مجھے اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ یہاں زبیر خان کی بیوی اور تم کیا کھچڑی پکانے آئی ہو۔ حالانکہ نیلی خاتون کو بھی اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہے کہ میرے زبیر خان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار تو نہیں لیکن اگر تم نے میرے ساتھ خاطر خواہ تعاون نہ کیا تو میں زبیر خان سے تم لوگوں کی اس خفیہ میٹنگ کا ذکر کر سکتا ہوں۔'' میں نے دانستہ ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ضروری سمجھا۔

''تمہیں کیا معلوم کہ ہم یہاں کیوں اکٹھی ہوئی ہیں؟ اور زبیر خان کو اس میں بتانے والی ایسی کیا خاص بات ہو سکتی ہے؟'' اس بار نیلی خاتون نے لب کشائی کی۔ وہ اپنے کھلنڈرے اور طمانیت بھرے لاابالی سے مزاج کے عین مطابق بولی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

''اعلیٰ ہائی اسٹینڈرڈ اور ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی دو بیگمات کے اس نچلے درجے کے ایک عسرت زدہ گھر میں ملاقات کو میں اور کیا معنی دوں؟''

''خاصے مکار اور ذہین ہو۔'' نیلی خاتون دلنشین مسکراہٹ سے بولی جبکہ وزیر جان کی بیوی دوبارہ پریشان اور تشویش زدہ سی نظر آرہی تھی، اسے نیلی خاتون کی گفتگو پسند نہیں آئی تھی، یہی سبب تھا کہ اس نے کڑی نگاہوں سے اپنے قریب والی کرسی پر بیٹھی نیسی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم اسے کیسے اور کب سے جانتی ہو؟'' جواباً نیلی خاتون بدستور میری طرف دلچسپ اور گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔

''یہ ایک بار نیلی کوٹھی آیا تھا میرے شوہر سے ملنے۔ بڑا دھانسو قسم کا نوجوان ہے۔ جس دھڑلے سے آیا تھا اسی دھڑلے سے خون خرابا کر کے واپس لوٹ گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ ماری تھی، اب پتا نہیں یہ اس نے ''ماری'' تھی یا مجھے کسی خاص قسم کا اشارہ دیا تھا کیونکہ اس کے جھوٹ میں قدرے سچ بھی شامل تھا۔

''مگر یہ تو کہہ رہا ہے کہ اس کے تمہارے شوہر سے اچھے تعلقات ہیں؟'' عورت نے چبھتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اچھے تھے کبھی مگر اب نہیں رہے۔'' نیلی خاتون نے پھر جھوٹ بولا۔ اب مجھے اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ ''بتایا ہے نا میں نے، اس روز اس نے نیلی کوٹھی میں خون خرابا کیا تھا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور زبیر خان کو بھی ہلاک کرنا چاہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پھر مجھے آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ اس بار میں بھی اندر سے چونکا۔ معاملہ مجھے ایکا ایکی پُراسرار سا محسوس ہونے لگا۔ ابھی تو میری کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ تاہم میں نے دونوں کو خاموش اور آپس میں الجھنے سے روکتے ہوئے روئے سخن وزیر جان کی بیوی کی طرف کیا اور بولا۔

''تم مجھے پہچان چکی ہو اور میں تو خیر تمہیں پہچان ہی چکا ہوں۔ لہٰذا اب نہ اپنا وقت ضائع کرو نہ میرا... باہر میرا ساتھی میرا منتظر ہے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ میرے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟''

''تمہارا ہم لوگوں کے ساتھ واسطہ تھا نہ ہے...'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھے اس کے لہجے اور بات پر طیش تو آیا تاہم ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''یہ والی بکواس میں تمہارے زن مرید شوہر وزیر جان سے بھی سن چکا ہوں اور اس پر مجھے دلی مسرت بھی ہوئی تھی مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں جو تم نے مجھے دیا ہے۔ کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟'' میں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا، نیلی خاتون کی دیکھا دیکھی وہ بھی مائل بہ جرأت ہونے لگی تھی، تنک کر بولی۔

''ہمیں نہیں معلوم کہ تمہارے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟''

''دیکھو خاتون! میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کو اچھا نہیں سمجھتا...'' میں نے تہدیدی انداز میں اس سے کہا۔ ''لیکن بات جب اپنی ذات اور اپنی شناخت کے حوالے سے ہو تو پھر میں کسی کے ساتھ کوئی بھی رعایت برتنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے جھوٹ مت بولو، تمہارا زن مرید شوہر سب جانتا ہے۔''

''تو پھر اسی سے جا کر کیوں نہیں پوچھ لیتے؟'' مجھے اس کی بات پر سخت طیش آگیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگا ریوالور اس کی طرف کر دیا۔

''اگر اب بھی تم نے سچ نہیں بولا تو میں تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔''

دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ خلافِ توقع وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے بڑی دلیری سے بولی۔ ''یہ کھلونا نیچے کر لو... شہزی! کہیں یہ گولی چل گئی تو تمہیں بڑی قیمت نہ چکانی پڑ جائے اس کی...''

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں اس کی دلیری کی وجہ سمجھنے لگا تھا۔ اسے زعم تھا اپنے شوہر وزیر جان پر جو اپنے تئیں بے شک بڑی طرم خان قسم کی شے بن چکا تھا لیکن اب بھی مجھے اس بے باکی کی وجہ کچھ اور ہی محسوس ہو رہی تھی جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وزیر جان نے اسے میرے سلسلے میں پہلے سے بریف کر رکھا تھا۔

میں غصے یا طیش میں آکر اپنی کسی اندرونی مجبوری یا بے بسی کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسی اطمینان سے بولا۔ ''ہوں... تو تمہیں بھی اپنے شوہر کی طرح خود پر اس بات کا گھمنڈ ہے کہ میں تم دونوں میاں بیوی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر یہ تمہاری خوش فہمی اس وقت دور ہو جائے گی جب ہم تمہیں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جائیں گے اور تم پر چوہے چھوڑ دیں گے۔'' میری دھمکی پر ایک لمحے کو اس کی مکار آنکھوں میں دوبارہ خوف کی پرچھائیں تھی۔ میں اپنی بات پر مزید اثر پذیری قائم کرنے کی غرض سے آگے بولا۔

''دیکھو، تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ میرے لیے یہ کس قدر اہم بات ہے۔ میں اپنی ذات اپنی شناخت کی جستجو کی خاطر ہر حد سے گزر سکتا ہوں یا سمجھ لو... اس دیرینہ مقصد کے حصول کی خواہش ایک آگ کی طرح میرے سینے میں بچپن سے لگی ہوئی ہے کیونکہ میں اپنے بچپن سے ہی غیر معمولی طور پر حساس اور مزاجاً جوشیلا واقع ہوا ہوں اور اب جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ میرے ماں باپ دونوں ہی زندہ ہیں تو یہ خواہش اب ایک جنون کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اب مجھے بتاؤ تم مجھ سے تعاون کرنا چاہتی ہو یا میں اپنے ساتھی کو ادھر بلا لوں؟'' یہ کہتے ہوئے میرے لہجے، میری آواز سے پُرغیظ جوش کے شعلے سے پھوٹنے لگے۔

''اس نے ایک نگاہ قریب بیٹھی نیلی پر ڈالی تو اس نے بے اختیار اسے مخاطب کر کے کہا۔ ''سعیدہ! یہ بہت خطرناک اور جوشیلا نوجوان ہے۔ تمہیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔ تم نہیں مانو گی تو اس میں تمہارے ساتھ مجھے بھی خطرہ ہے۔ ابھی تو مجھے بھی اس کی منت کرنی ہے کہ یہ ہمارے سلسلے میں کوئی ایسی بات میرے شوہر زبیر خان سے نہ کرے۔''

میں نے دیکھا نیلی کی بات پر سعیدہ نامی اس عورت کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر ٹھہر گیا جبکہ مجھے پل کے پل یوں محسوس ہوا کہ نیلی نے دانستہ بظاہر یہ غیر متعلقہ موضوع چھیڑ دیا ہو۔

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سب جاننے کے بعد... یہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ یعنی ہماری اس خفیہ ملاقات کا ذکر زبیر خان سے نہیں کرے گا؟'' سعیدہ نے بظاہر میری طرف تکتے ہوئے نیلی سے کہا۔ امید دیرینہ کو بر آتے دیکھ کر میرا دل اندر سے فرطِ مسرت کے ساتھ یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ گویا یہ طے تھا کہ صرف وزیر جان ہی نہیں بلکہ اس کی چہیتی بیوی سعیدہ بھی میرے ماں باپ کے سلسلے میں جانتی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھے؟

بہر حال نیلی کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے سعیدہ کی طمانیت کی خاطر کہا۔ ''مجھے تمہاری اس خفیہ میٹنگ اور ان مقاصد سے چنداں دلچسپی نہیں، جو تم دونوں یہاں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے بیٹھی تھیں۔ مجھے اپنے کام اور مطلب سے غرض ہے بلکہ یہ بات تو تمہیں نیلی بھی بتا کر مطمئن کر سکتی ہے کہ میں خود دوبارہ زبیر خان سے راہ و رسم بڑھانے کے موڈ میں سرے سے ہوں ہی نہیں۔''

''آف کورس۔'' نیلی نے گویا میری تائید میں بے اختیار کہا۔ ''شہزی ٹھیک کہہ رہا ہے سعیدہ! نیلی کوٹھی والے واقعے کے بعد تو یہ خود بھی زبیر خان کا سامنا کرنے سے کترانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی ایک وجہ میں بھی ہوں کہ میں اسے زبیر خان کے عزائم کے سلسلے میں خبردار بھی کر چکی ہوں۔''

سعیدہ پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ جیسے ''ہاں'' اور ''ناں'' کے درمیان جھول کے رہ گئی تھی، بالآخر بولی۔ ''ٹھیک ہے میں پہلے اس سلسلے میں وزیر جان سے مشورہ...'' کہتے ہوئے اس نے اپنے پرس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ شاید سیل فون نکالنا چاہتی تھی مگر میں نے درشتی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''خبردار! ایسی کوئی چالا کی چلنے کی کوشش بھی مت کرنا محترمہ! اِدھر اور اسی وقت تمہیں میرے ساتھ معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اب میرے پاس وقت نہیں بچا ہے لہٰذا میں اب صرف تمہارے منہ سے اپنے ماں باپ کے بارے میں سننا چاہوں گا مگر سچ... بہ صورت دیگر مجھے تمہارے بیان پر ذرا سا بھی شبہ ہوا تو... مجھے تصدیق کرنے کی خاطر تمہیں اپنے ساتھ اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جانا ہوگا۔'' میرے پُرقطعیت مگر محتاط لہجے نے اسے بے اختیار بولنے پر مجبور کر دیا۔

''نن... نہیں... میں تمہیں بتا دوں گی، سب سچ سچ بتا دوں گی۔ کیونکہ اس میں مجھے اپنا کوئی فائدہ یا نقصان محسوس نہیں ہوتا، باقی رہی بات میرے شوہر سے تمہاری دشمنی یا جنگ کی وہ تم جانو اور وہ۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دل و دماغ کی عجیب سی جذباتی و ہیجانی کیفیات ہونے لگیں۔

اس نے بتانے کے لیے اپنے لب وا کیے۔ میں جیسے سرتاپا سراپا سماعت بن گیا تھا۔ وہ بولنے اور بتانے پر پوری طرح آمادہ ہو چکی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں تک جیسے ساکت و جامد ہو چکی تھیں کہ میری زندگی کے ایک اہم ترین موڑ کی حقیقت آج کھلنے والی تھی کہ اچانک ایک آواز پر ہم سب ہی بیک وقت ٹھٹک گئے۔

☆☆☆

وہ آواز بڑی واضح اور کسی اچانک اٹھتے طوفان کا پتا دیتی محسوس ہوئی تھی۔ باہر گھر کے دروازے کے بہت قریب... کسی گاڑی کے تیزی کے ساتھ رکنے اور فوراً ہی دھڑا دھڑ کی آواز سے بیک وقت کئی دروازے کھلنے اور بند ہونے کی دھمک گونجی تھی۔ میں فوراً اپنے ہاتھ میں میگا رو سنبھالتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں عورتوں کے چہروں پر تشویش کے سائے لہرائے۔ میں ابھی پلٹ کر صحن کی طرف رخ کرنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکے سے مجھے باہر دروازہ دھڑ سے ٹوٹ کر کھلنے کی سمع خراش آواز سنائی دی۔ اِدھر میں نے بھی میگا رو والا ہاتھ سیدھا کر لیا اور کمرے کے دروازے کو ایک لات رسید کر کے وا کر دیا۔ سامنے صحن میں چار مسلح افراد انتہائی جارحانہ موڈ میں نظر آئے مگر ان میں ایک کو دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ میرا غیر شناسا آدمی نہیں تھا، وہ تارڑ تھا۔ زبیر خان کا خاص آدمی... اس کے لیے بھی میری یہاں موجودگی خلافِ توقع تھی اور میری طرح اسے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے، تاہم اسے مجھ پر تین مسلح ساتھیوں کی فوقیت حاصل تھی۔

نیلی کی خوف سے جھرجھرائی ہوئی چیخ سی سنائی دی۔ وہ اپنے شوہر کے آدمی تارڑ کو دیکھ کر اسے پہچان کے ہی بے اختیار چیخی تھی۔

''تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' تارڑ نے میری طرف گھورتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا۔ اب اس کے چہرے سے حیرت عنقا تھی۔ میرا دھیان باہر موجود اول خیر کی طرف جا رہا تھا۔ یقیناً اس نے بھی انہیں یوں درانہ وار اور اچانک اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا اور وہی ہوا۔ ان کے عقب سے اول خیر ہاتھ میں پستول لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ نمودار ہوا اور گرجدار آواز میں بولا۔

''خبردار! کوئی غلط حرکت نہیں چلے گی۔ ورنہ پیچھے سے سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

ان سب کے رخ چونکہ میری طرف تھے پھر انہیں پتا بھی نہ تھا کہ اول خیر باہر موجود ہے یا میرا کوئی ساتھی۔ اب وہ یہی سمجھے کہ ان کے عقب میں دہاڑتا گرجتا میرا ساتھی آیا... اپنے ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا یا بھاری مشین گن۔

''خیر پیچھے مڑے... اپنے ہتھیار پھینک دو۔'' اول خیر دوبارہ گرجا۔ وہ سب ساکت و جامد ہو گئے۔

''یہ کیا حرکت ہے... شہزی...؟ کیا یہ خفیہ میٹنگ تمہاری سرکردگی میں ہو رہی تھی؟'' تارڑ نے مجھے بدستور گھورتے ہوئے غصیلی آواز میں کہا۔ ''خان جی کے تم پر احسانات ہیں۔ وہ تمہیں اب بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں اور تم نے انہی کے گھر میں سیندھ لگائی اور ان کی پشت پر خنجر گھونپ دیا۔''

وہ یقینی طور پر میرے اور نیلی کے سلسلے میں شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خان جی کا میں اب بھی دل سے احترام کرتا ہوں اور میں ان کے کیا کسی کے گھر میں بھی ایسی سیندھ لگانے کی قبیح حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ میرا ایسا مکروہ مزاج نہیں۔ یہ بات خود خان جی بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں یہاں اپنے ساتھی کے ساتھ کسی اور سلسلے میں آیا تھا اور بالکل اسی طرح آیا تھا جس طرح تم... غالباً خان جی کے حکم پر ہی نیلی خاتون کی ریکی کرتے ہوئے یہاں آئے ہو جبکہ میں اندر موجود ایک اور خاتون کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں۔ کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ ہتھیار پھینک کر آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں یا پھر اپنے خان جی سے میری بات کرا دو۔''

مجھے اندازہ ہو گیا تھا بہ خوبی کہ تارڑ... ممکنہ طور پر زبیر خان... المعروف خان جی کی ہدایت پر ہی نیلی کی ریکی کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

تارڑ اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے کیونکہ صورتِ حال کی خطرناکی بالکل واضح تھی۔ میں ان چاروں کے نشانے پر تھا جبکہ میرے ہاتھ میں صرف ایک پستول تھا وہ جدید گنز سے مسلح تھے، فقط میرا ایک ساتھی ان کے عقب میں تھا، اگرچہ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی میری ہی طرح فقط ایک پستول ہی تھا۔

''ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے، جو بات کرنی ہے سامنے آکر کرو۔'' تارڑ نے واضح کر دیا۔ میں تارڑ کی سفاک فطرت کی جھلک دیکھ چکا تھا جب اس نے نیلی کوٹھی میں میرے منع کرنے کے باوجود ایڈووکیٹ خانم شاہ پر گولی چلا دی تھی، اگرچہ بعد میں خان جی نے اسے بری طرح لتاڑا تھا۔

''ہتھیاروں کی چھاؤں میں دوستانہ ماحول نہیں پیدا ہو سکتا تارڑ۔'' میں نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت میرے عقب سے نیلی کی ہسٹریائی آواز ابھری۔ ''نن... نہیں ایسا مت کرو۔''

''ٹھائیں'' کی آواز سے گولی چلی۔ میں بدکا۔ گولی کا آتشیں شعلہ... شوں کی جھپک کے ساتھ میری گردن کے بالکل قریب سے گزرتا محسوس ہوا اور تارڑ کا ایک بازو زخمی ہو گیا۔ شاید یہ حرکت سعیدہ کی تھی۔ یقیناً اس کے پرس میں پستول موجود تھا۔ اس گولی نے بلکہ سعیدہ کی ایک خطرناک بے وقوفی نے سب کو گویا پل کے پل خطرے میں ڈال دیا۔ مجھے یہی بہتر لگا جو میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کیا، یعنی فوراً نیچے جھک گیا مگر میری خود کو بچانے کی یہ حرکت... ان تینوں خواتین کو مہنگی پڑ گئی۔ کیونکہ میرے نیچے جھکتے ہی سعیدہ سمیت وہ تینوں خواتین تارڑ اور اس کے سفاک ساتھیوں کی زد پر آ گئیں، تارڑ گولی کا وار اپنے بازو پر سہہ گیا تب ہی میری جلتی سلگتی نظروں نے بیک وقت دو بھیانک سچویشنز کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ تارڑ اور اس کے برابر میں کھڑے ایک ساتھی کی گنز سے برسٹ فائر ہوئے، خواتین کے حلق سے کربناک چیخوں کی لرزہ خیز گونج ابھری۔ اس کے باقی دو ساتھی، اول خیر کی سمت پلٹے تھے مگر اول خیر نے تلے اوپر اپنے میگا رو کے ٹریگر پر انگلی سے دو تین بار حرکت دی۔ وہ دونوں تیورا کر گرے۔ اول خیر کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ میں نے جھکے جھکے پہلے تارڑ کے ساتھ کھڑے ساتھی پر گولی چلا دی۔ اور دوسری... تارڑ پر... جو اپنی گن کا رخ میری جانب کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ گولی دونوں کے پیٹ کے مقام پر ناف کے نیچے لگی اور

وہ کربناک چیخ مار کر گرے۔

اول خیر میری جانب لپکا۔ میں اٹھ کر پلٹا۔ سعیدہ اور عمر رسیدہ خاتون کی لاشوں کو میں نے خون کی ’’چھپڑی‘‘ میں پڑے پایا۔ جبکہ نیلی زخمی ہو کر کراہ رہی تھی۔

’’کاکے! تو ٹھیک ہے نا...؟‘‘ اول خیر حواس باختہ سا ہو رہا تھا۔ میں لپک کر سعیدہ کی طرف بڑھا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ ایک پستول اس کی لاش کے قریب گرا پڑا تھا۔ نہ جانے خوف یا بدحواسی یا پھر حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی سعیدہ کو لے ڈوبی تھی۔ ایک وجہ اور بھی تھی تارڑ کی غیر متوقع دخل اندازی اور اس کے خطرناک جان لیوا عزائم کا سعیدہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب کسی بھی وقت وہ اس کے ہاتھوں بھیانک موت سے دوچار ہو سکتی تھی۔

’’چل کاکے! نکل چل... جلدی۔‘‘ اول خیر چلایا۔

’’آہ... شش... شہزی...‘‘ مجھے نیلی کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے سنبھالا دینے کی کوشش چاہی۔ وہ زندہ تھی، میں اسے اٹھا کر باہر کو دوڑا۔ باہر لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے اور اول خیر نے چہروں پر رومال کا نقاب بنا کر چڑھا لیا تھا۔ ہمیں ہتھیار بہ دست دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کون آج کے دور میں پرائی آگ میں کودتا ہے۔ نیلی میں کچھ سانسیں باقی تھیں، وہ بچ سکتی تھی میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ اسے اس حالت میں چھوڑ کے بھاگ جاتا۔ ہم دونوں اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اول خیر کو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا اور خود زخمی نیلی کو اٹھائے ’ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کے نیلی کے زخمی وجود سمیت اندر جا سوار ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اول خیر نے کار ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

یہ سارا کشاکشی نہایت قلیل عرصے میں ظہور پذیر اور اختتام پذیر بھی ہو گئی تھی۔ کار پل کے پل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اول خیر پریشان نظر آ رہا تھا خود میرے اپنے حواس عجیب سی بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ نیلی کا زخمی وجود... سیٹ پر نیم دراز حالت میں تھا جبکہ اس کا سر میری گود میں رکھا تھا۔ وہ بار بار کراہتے ہوئے مجھے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک حسین و جمیل اور نوخیز کلی کے مانند دمکتی چہکتی جواں سال نیلی کی قابلِ رحم اور جان کنی کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ تاہم میں نے اس کے زخموں کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی۔ اسے ایک گولی بازو میں لگی تھی اور دوسری پیٹ کے کسی مقام پر... شاید پہلو میں کہیں لگی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’شش... شہزی... مم... مجھے کوٹ سلطان... لل... لے چلو... وہ دور نہیں... جلدی... پلیز۔ میں تم... تت... تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔‘‘

’’تمہیں اسپتال پہنچانا ہو گا۔‘‘ میں نے بمشکل گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

’’نہیں... مم دو... دوبارہ خان جی کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتی۔ کک... کوٹ سلطان... محفوظ جگہ ہے۔ تم فکر نہ کرو... وہاں جاں ورکھنا سب کچھ سنبھال لے گا۔‘‘

’’جاں ورکھنا...‘‘ میں یہ عجیب اور وکھرے ٹائپ کا نام سن کر بے اختیار ہولے سے بڑبڑایا۔

’’کوٹ سلطان... کی حد شروع ہو چکی ہے کاکا۔‘‘ اول خیر بولا۔ غالباً اس نے بھی نیلی کی کراہتی ہوئی آواز سن لی تھی اور علاقہ بھی اس کا دیکھا بھالا تھا۔ ’’اس سے پوچھو... وہاں کدھر جانا ہے؟‘‘

میں نے اول خیر کے یہی الفاظ دہرا دیے۔ نیلی نے بتایا۔ ’’یہ بھی کہ... جاں ورکھنا نامی شخص ہماری بھرپور مدد کرے گا۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ ایک دیسی ساختہ دیہاتی... ’’جراح‘‘ اور حکیم بھی ہے۔ اب پتا نہیں نیلی کا اس مذکورہ آدمی کے ساتھ کیا سمبندھ تھا۔ بات ماننا پڑی کیونکہ موجودہ صورتِ حال کی نزاکت میں ایک یہی شارٹ کٹ راستہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ پھر نیلی مجھے بمشکل جو پتا اور نشانیاں بتاتی گئی، وہ میں اول خیر کے آگے دہراتا گیا۔

لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی مزید تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم کچے کے راستے پر اتر گئے۔ یہاں دونوں طرف دور دور تک بنجر ویرانہ نظر آتا تھا۔ آبادی کے آثار تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ نیلی پر نیم بے ہوشی سی غالب آتی جا رہی تھی۔ خون اس کے زخموں سے رِس رِس کر کار کی سیٹ کو تر بہ تر کر رہا تھا۔ کار کچے دھول اڑاتے مگر قدرے کشادہ راستے پر ہچکولے کھاتی دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کھیتوں کھلیانوں کے ساتھ کچھ کچی آبادی کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے، تاہم نیلی کے بتائے ہوئے نشان زدہ پتے پر اول خیر بڑی مہارت اور دلجمعی کے ساتھ کار بڑھائے چلا جا رہا تھا۔

کوٹ سلطان نامی یہ علاقہ خاصا دور افتادہ گاؤں محسوس ہوتا تھا۔ آبادی سے ہٹ کر ایک نہر کی پلیا پار کی اور نیلی کے کہنے کے مطابق ایک سفید رنگ کی مسجد دکھائی دی۔ اس سے ذرا آگے پیلے رنگ کی مختصر سی عمارت تھی، بقول

نیلی کے یہ چاچا کمالے کی آٹے کی چکی تھی۔ اس سے تھوڑا ہی آگے کھجوروں کے جھنڈ کے قریب دائیں جانب ایک برساتی نالا تھا۔ ایک گارے مٹی کی کچی دیواروں کا کشادہ گھر بنا دکھائی دیا۔ اس کے دروازے کے ساتھ ہی مطب تھا جس کی پیشانی پر کوئلے سے بے ڈھنگے انداز میں ’’خوشی محمد کا مطب‘‘ لکھا تھا۔ وہاں باہر اب دو تین بیل گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ کچھ مقامی دیہاتی لوگ اندر مطب میں بیٹھے نظر آئے، ایک جوان مرد... جو تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا، اسے مریضوں میں مصروف پایا۔ کار مطب کے سامنے اول خیر نے روک دی تھی اور مجھے اندر ہی بیٹھے رہنے کا کہہ کر خود کار سے اتر کر مطب کے کھلے دروازے سے اندر جا گھسا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اول خیر کے ساتھ ہی اس مذکورہ نوجوان کو حواس باختہ عالم میں اندر سے نکلتے پایا اور سیدھا کار کی جانب بڑھا۔ تب تک میں نے دروازہ کھول دیا تھا اور نوجوان کا بہ غور جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ ٹھیٹھ دیہاتی طرز کا تھا جسم پر کرتہ تھا اور نیچے لنگی باندھی ہوئی تھی۔ بال گھنگریالے اور تیل سے چپڑے ہوئے تھے۔ رنگ سانولا تھا۔ نقوش موٹے تھے۔ مجھے کہیں سے بھی یہ ’’خوشی محمد‘‘ ٹائپ کا آدمی نہیں لگا تو میں نے پوچھ لیا۔ ’’تم ہی حکیم خوشی محمد ہو؟‘‘

وہ کار کے اندر جھک کر نیلی کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا اور چیخ پڑا۔ ’’نیلو... نیلو... یہ... یہ تیری کس نے حالت بنائی ہے۔‘‘ مجھے اس کے چیخنے کے انداز میں نسوانیت محسوس ہوئی۔

’’اسے اندر لے چلو... چلو...‘‘ وہ بولا۔ اس کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا۔ نیلی کے بے ہوش زخمی وجود کو اٹھا کر ہم اندر مطب میں لے آئے۔ ’’ایمرجنسی‘‘ صورتِ حال کو محسوس کر کے دیگر مریض اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مطب کے اندر دیوار کے پیچھے ایک اور گوشہ تھا جدھر آلاتِ جراحی سے متعلق سامان رکھا تھا اور بڑے بڑے شیشے کے مرتبانوں میں پتا نہیں کیا کیا محلول اور خمیرے وغیرہ بھرے ہوئے تھے، ایک تختہ نما بیڈ پر نیلی کو لٹا دیا گیا۔

ابھی تک واضح نہیں ہو سکا تھا کہ خوشی محمد کہاں ہے اور جاں ورکھنا صاحب کیا یہی نوجوان تھا، جس کا نیلی بار بار ذکر کر رہی تھی۔

نوجوان نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا اور مجھ سمیت اول خیر بھی اس نوجوان کا ’’کام‘‘ دیکھ کر ایک لمحے کو ششدر رہ گئے۔ آلات ایک گرم ابلے ہوئے پانی کے پتیلے میں بھگو کر نکالے گئے جس کے اندر کسی اینٹی سیپٹک دوائی کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی پھر نوجوان کے ہاتھ اور انگلیاں ماہرانہ انداز میں نشتروں اور نیلی کے زخموں سے کھیلنے لگے۔ بازو والی گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل چکی تھی جبکہ پہلو والی گولی نوجوان نے نکال لی جو خون سے تر بتر تھی، زخموں میں اس نے زرد رنگ کا مرہم بھرا۔ پھر مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس کے بعد نیلی کا منہ کھول کر چھوٹی سی کٹوری کے ذریعے دوائی چار و ناچار اس کے حلق میں ٹپکائی...

پہلی بار مجھے احساس ہوا، دور افتادہ اس دیہات میں یہ مطب... بلاشبہ مقامی لوگوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا مگر۔ بات اتنی ہی نہ تھی، یہ نوجوان اپنے کام میں بہت ماہر بھی معلوم ہوتا تھا۔ یہ اس کا جدی پشتی خاندانی پیشہ معلوم ہوتا تھا جس میں وہ بہرحال طاق و مشاق تھا۔ ورنہ تو میں اسے نیم حکیم خطرہ جان ہی سمجھا تھا۔

نیلی کی حالت قدرے بہتر ہونے لگی تھی۔

’’یہ اب ٹھیک ہے۔ آپ اندر چلو... میں ابھی تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔‘‘ نوجوان نے ہم سے کہا۔ وہ اب خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں اور اول خیر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ ’’خوشی محمد صاحب! آپ کی مہربانی، ہم رک نہیں سکتے۔ نیلی بی بی نے ہی ہم سے کہا تھا کہ آپ...‘‘

’’میں خوشی محمد نہیں...‘‘ نوجوان مسکرا کر بولا۔ ’’او میرا چاچا سی۔ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ فن میں نے اسی سے سیکھا ہے۔ میرا نام جاں ورکھنا ہے۔ آپ اندر ارمان (آرام) سے بیٹھو... آپ لوگوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔‘‘

اس کا نام سن کر ہم مطمئن ہو گئے۔ نیلی کی خواہش کے عین مطابق ہم اسے اسی نوجوان کے پاس کوٹ سلطان لے آئے تھے۔

’’اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یہ تو آپ کو بتانا پڑے گا۔‘‘ اس نے آخر میں کہا۔ اول خیر نے مجھے اشارہ کیا۔ پھر خود جاں ورکھنا سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’ہم ٹھہر جاتے ہیں مگر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، تمہیں جلدی فارغ ہونا پڑے گا۔ ہم اِدھر ہی ٹھیک ہیں۔‘‘

وہاں دو لکڑی کی اسٹول نما کرسیاں تھیں۔ میں اور اول خیر اس پر بیٹھ گئے۔ جاں ورکھنا تھوڑی دیر بعد فارغ ہو کے اندرونی گوشے میں آ گیا۔ جس کا ایک دروازہ گھر کے

اندر بھی کھلتا تھا۔

اس نے ہمیں دو سلور کے گلاسوں میں خوش ذائقہ شربت پینے کو دیا جس کی اجزائے ترکیبی پر ہمیں مطب کے مرکبات کی شمولیت کا احساس ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر شربت پی کر مجھے اپنے دکھے اور تھکے ہوئے وجود میں توانائی بھرتی محسوس ہوئی اور میں خود کو تازہ دم سا محسوس کرنے لگا۔ اول خیر کی بھی یہی حالت تھی بلکہ اس نے تو میرے کان میں سرگوشی بھی کر ڈالی تھی۔

''او خیر... کاکے، لگتا ہے آب حیات پی لیا۔''

نیلی کی حالت قدرے بہتر تھی، چھت پر پنکھا تھا۔ دیواریں کچی اور گارے مٹی کی ہونے کے باعث ماحول خنک خنک سا محسوس ہوتا تھا۔ جاں ورکھنا ہم سے اب کھل کر گفتگو پر آمادہ تھا۔ اس کی زبان پر بار بار یہی رٹ لگی ہوئی تھی کہ اس کی ''نیلو'' کی حالت ایسی کس نے بنائی تھی، اول خیر نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

''کھنا جی! پہلے آپ بتاؤ، آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

جاں ورکھنا نے ایک گہری سانس لی پھر ایک نظرِ الم سی تختہ نما بستر پر دراز نیلی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اے میری منگ سی... (یہ میری منگیتر تھی) پر جی نیلو کا مزاج بھی وکھرا ہی تھا۔ چاچا خوشی محمد دی ہک ہی دھی سی... پیو دے پیار نے سرتے چاڑ دیا۔ اوچے خواباں دیکھدی سی۔ میں چاچا خوشی محمد کا شاگرد تھا۔ پتا نہیں نیلو مجھے پسند کرتی تھی یا نہیں، پر مجھ سے ہنس ہنس کر بات ضرور کرتی تھی، چاچا نے زبانی کلامی اپڑیں کڑی میرے ناں کر دی... پر جی... نیلو اس زندگی سے مطمئن نہیں تھی، اسے چودھرائن بن دا شوق سی... حسین بھی تو اتنی ہی تھی، بنی بنائی چودھرائن ہی لگتی تھی۔ یہ علاقہ کوٹ سلطان کھلاں والی دے چودھری زبیر خان عرف خان جی کا ووٹ بینک سی... ایک دن جلسہ کرنے آیا۔ پتا نہیں مرن جوگی نیلو نے کوئی چکر چلایا یا... خان جی نے... کہ نیلو نے اپنے باپ کی عمر والے آدمی خان جی سے شادی کرلی... بس اتنی کہانی ہے۔ چاچا خوشی محمد دکھ سے مر گیا۔ اب میں ہی لوکاں دی خدمت کرن واسطے رہ گیا ساں... کلاں رعیدا اں سی... گھر وچ میرے علاوہ ہور کوئی نہیں۔ ھن تسی دسو، اے سارا کی معاملہ ہے؟''

وہ اپنی اور نیلو یا نیلی کی داستانِ الم بیان کر کے چپ ہو رہا۔ تو اول خیر نے ہی مختصر الفظوں میں... غیر ضروری ''کاٹ چھانٹ'' سے پوری بات اسے بتا دی۔ جسے سن کر جاں ورکھنا کا چہرہ تاریک پڑ گیا اور وہ عورتوں کی طرح اپنی پیشانی ہتھیلی پر مار کر بولا۔

ہائے... نیلو! کن چکروں میں پڑ گئی۔ خان جی تو اب اس کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ پر سمجھ میں نہیں آتا... یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا نیلو... خان جی کے خلاف درپردہ کوئی چکر چلا رہی تھی؟''

''یہ تو اب ہوش میں آنے کے بعد نیلی خود ہی بتائے گی۔'' اس بار میں نے ایک گہری سانس اور قدرے بیزار کن ہمکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

مجھے ان کی یا نیلی کی کہانی سے یا ایسے کسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مجھے وزیر جان کی بیوی سعیدہ کے عین اس وقت مر جانے پر شدید قلق محسوس ہو رہا تھا جب وہ مجھے میرے ماضی سے متعلق ایک اہم ترین راز سے آگاہ کرنے والی تھی۔

اول خیر کے چہرے پر ایکا ایکی تشویش کے آثار طاری ہو گئے تھے جس پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اس وقت مطب کی طرف سے ''حکیم جی'' کہہ کر کسی نے جاں ور کو پکارا تو وہ اٹھ کر مطب میں چلا گیا۔ تب اول خیر نے اپنے اندر اچانک ابھرنے والی تشویش سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی... کاکے! بقول اس نوجوان کھنا کے یہ سارا علاقہ خان جی کا ووٹ بینک کہلاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کسی نے نیلی کو اس کی بیوی کی حیثیت سے پہچان لیا ہو اور ایک بار پھر اتنے سارے دشمنوں میں خان جی کا نام بھی شامل ہو جائے۔''

''میرا نہیں خیال کسی نے پہچانا ہوگا.....'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اتنا ضرور ہے کہ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد... کوئی پہچان لے۔ اگر نیلی نے یہاں اپنے پرانے عاشقِ نامراد کھنا کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔''

''خطرے کی تلوار تو پھر بھی ہمارے سروں پر لٹکی ہی رہے گی، شہزی کاکے۔''

''میرا خیال ہے نیلی کے ہوش میں آنے اور اس کا آئندہ کا پروگرام جاننے کے بعد ہمیں فوراً یہاں سے کوچ کر

جانا چاہیے۔'' میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ۔۔ کسی مریض کو نمٹا کے دوبارہ اس حصے میں آ گیا۔ مطب میں علاج معالجے کے علاوہ چھوٹا موٹا جراحی کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ ایسے جراح شہر میں بھی موجود تھے۔ نہ جانے ان کا کیا طریقہ کار تھا مگر یہ بہرحال ایک باقاعدہ ڈگری یافتہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر فزیشن اینڈ سرجن کے معیار کو نہیں پہنچ سکتے تھے، جن کا طریقہ ہمیشہ پرو پر ہوتا ہے۔

بہرحال تھکنا نے ایک بار پھر نیلی کا بہ غور معائنہ کیا پھر تسلی بخش انداز میں سر ہلایا اور ہمارے قریب آن بیٹھا۔

''کیا تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ، بہن بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا اجی دنیا میں چاچا خوشی محمد کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں، اِدھر ہی مطب میں رہتا تھا اور سوتا بھی تھا۔'' اس نے بتایا۔

''تو اس کا مطلب ہے، یہ سارا کچھ چاچا خوشی محمد کا تھا، جو ایک طرح سے تمہارا ہونے یا نہ ہونے والا سسر بھی تھا؟'' اس بار اول خیر نے پوچھا۔ میں نے اس کے سوال پر مشکل سے اپنی ہنسی روکی تھی۔

''ہاں جی، ظاہر ہے ان کا دنیا میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مجھے انہوں نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔'' تھکنا نے جواب دیا۔

''کیوں؟ اس کی بیٹی نیلی جو تھی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بڑے مغموم سے لہجے میں بولا۔

''وہ جی... چاچا خوشی محمد نے تو اس وقت ہی اپنی بیٹی سے تعلق توڑ لیا تھا جب اس نے اپنی مرضی سے اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کر لی تھی۔''

''ہوں۔'' اول خیر نے ایک گہری سانس لی پھر نیلی کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ ''یہ کب تک ہوش میں آئے گی؟ اب ٹھیک تو ہے ناں یہ؟''

''ہاں جی، بالکل ٹھیک ہے، بس ہوش میں آنے والی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے جاں ورتھکنا اٹھا اور نیلی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ اسے ہوش آنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیلی اپنے مکمل حواسوں میں آ چکی تھی مگر وہ ابھی اٹھ کر بیٹھنے سے قاصر تھی، اس نے جاں ورتھکنا سے کچھ پوچھا تھا پھر سر ذرا گھما کے ہماری طرف دیکھا، اس کے نقاہت زدہ چہرے پر ہمیں دیکھ کر کچھ طمانیت سی نمودار ہوئی۔ جاں ورتھکنا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اسے تشفی وغیرہ دے رہا تھا پھر شاید نیلی نے اسے تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے جانے کا کہا جس پر جاں ورتھکنا نے بلاچون و چرا عمل کیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد... نیلی نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔ وہ کمزور سی ہلکی آواز میں مجھ سے بولی۔

''شہزی! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی... تم نے میری جان بچائی۔''

میں نے متانت سے کہا۔ ''میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ انسانیت کے ناتے... میرا ضمیر یہ گوارا ہی نہیں کرتا کہ کسی مجبور اور بے بس انسان کی مدد سے نظریں چرا جاؤں... رہی بات جان بچانے کی تو، زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوتی ہے اور اس کے ہی حکم سے ہم محض اتنا ذریعہ ضرور بنے تھے کہ تمہیں یہاں لے آئے۔''

''میں تمہیں بہت سی باتیں بتانا چاہتی ہوں۔'' وہ اس قدر بول سکی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں! بہت سے سوالات میرے ذہن میں بھی ابھرتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا معاملہ تھا؟''

''مجھے تمہاری ایک چھوٹی سی مدد کی ضرورت ہے، شہزی۔'' اس نے تفصیل بتانے کے بجائے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں نے سنجیدگی سے اور دوٹوک لہجے میں کہا۔

''دیکھیے محترمہ! میں خود اس وقت ایسے حالات سے دوچار ہوں کہ مجھے اپنی مدد کی ضرورت زیادہ ہے۔ میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں اور اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ ہم نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہاری مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا۔'' میری صاف گوئی پر نیلی نے برا نہیں منایا۔ تاہم اس نے پہلے سعیدہ وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا اور میں نے بتا دیا کہ وہ نہیں بچ سکی۔ اس کے بعد وہ بولی۔

''شہزی! مجھے تمہاری سعیدہ وغیرہ سے کی ہوئی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ وزیر جان سے تمہاری کیا نسل ہے۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ میں تمہیں وزیر جان کے آئندہ کے عزائم کے بارے میں آگاہ کروں؟ میں سمجھتی ہوں کم از کم اس معاملے میں تو ہم دونوں تقریباً ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔''

نیلی نے بڑی ذہانت آمیز چالاکی سے میری دکھتی رگ کو محسوس کر کے اس پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مجھے کہنا پڑا۔

''ہاں، شاید... مگر تم وزیر جان کے بارے میں مجھے

کیا بتانا چاہتی ہو؟''

یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں وہ بات بھی بار بار کھٹکنے لگی کہ سعیدہ سے باتیں کرنے کے دوران میں نیلی مجھے آنکھوں سے خفیہ اشارے بھی کرتی رہی تھی۔

''شہزی! میرے قریب آ کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہیں مختصراً لفظوں میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' ناچار میں نے ساتھ کھڑے اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی اشارے سے اس کی بات سن لینے کے لیے کہا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر لکڑی کی اسٹول نما کرسیاں کھینچ کر اس کے قریب آن بیٹھے۔ نیلی نے بتانا شروع کیا۔

''شہزی! شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ... جب میں نے تمہیں اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وہاں دیکھا تو مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی، درحقیقت میں اپنے لالچ کی وجہ سے ایک بڑے چکر میں پھنس گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ میں تمہیں باتوں کے دوران میں آنکھ کے ہلکے ہلکے مخصوص اشارے بھی کیے جا رہی تھی کہ تم کہیں میری جھوٹ سچ باتوں کی سعیدہ کے سامنے نفی نہ کرنے لگو۔ میں درحقیقت اسے ایک ڈاج دے کر تمہارے ساتھ نکلنا چاہتی تھی اور بعد میں تمہیں اصل حقیقت بتانا چاہتی تھی۔ تمہاری سعیدہ سے گفتگو کے دوران میں مجھے بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ تم اس کا تعاقب کرتے ہوئے... ماسی رحیمے کے گھر تک پہنچے تھے، ماسی رحیمے، میری دور کی رشتے دار تھیں۔ غریب تھیں، اکیلی تھیں۔ میں خفیہ طور پر اس کی مالی مدد کرتی رہتی تھی۔ سعیدہ سے رازدارانہ قسم کی میٹنگز اکثر و بیشتر وہیں ہوا کرتی تھیں۔'' وہ ذرا سانس لے کر دوبارہ کہنا شروع ہوئی۔

''یہ حقیقت ہے کہ میں نے دولت اور عیش و آرام کی خاطر ہی اپنے سے دگنی... عمر کے آدمی... یعنی زبیر خان سے شادی کی تھی اور بہت حد تک میری یہ خواہش پوری بھی ہو چکی تھی مگر جلد ہی مجھے تلخ حقیقت کا احساس ہونے لگا کہ میں ایک سونے کے پنجرے میں قید کر دی گئی ہوں اور میں اب خان جی (زبیر خان) سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ یہ تو میری عقل مندی تھی کہ میں نے اس سے شادی کرنے سے پہلے ایک شرط رکھی تھی جو اس بڈھے گدھ نے فوراً مان بھی لی تھی۔ اپنے تحفظ کی خاطر میں نے خان جی کی کھلاں والی جاگیر... کا نصف حصہ اپنے نام لکھوا لیا تھا۔

''خان کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اس سے کوئی اولاد نہ تھی، دوسری سے صرف شفقت راجا تھا اب وہ مجھ سے اولاد کا متمنی تھا۔ شفقت راجا کی موت کے بعد... اب اس کی دوسری بیوی قمر النسا... جس کے بطن سے شفقت راجا نے جنم لیا تھا۔ اس نے میرے خلاف محاذ رکھا تھا اور بالآخر مجھے وہ کھلاں والی حویلی سے دور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ خان جی نے مجھے ملتان ہی کے مضافات میں ایک کوٹھی بنا دی۔ وہ بھی میرے نام ہے لیکن میں، قمرو کی سوکنی سازش سے اچھی طرح واقف تھی کیونکہ اسے بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ کھلاں والی جاگیر کا نصف حصہ میرے نام بھی ہے۔ میں تو اکیلی تھی، میرا آگا پیچھا کون تھا؟ مگر قمرو... ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، ماں باپ تو خیر اس کے بھی مر چکے تھے مگر اس کے دو جوان شادی شدہ بھائی تھے وقت گزرنے کے ساتھ میں محسوس کر رہی تھی کہ خان جی قمرو اور اس کے دونوں بھائیوں کے دباؤ میں آنے لگے ہیں۔ مجھے اپنا تحفظ خطرے میں نظر آنے لگا۔

''جوان اور اکلوتے بیٹے کی ہلاکت کے بعد خان جی کی طبیعت گری گری رہنے لگی مگر جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی تھی، وہ اپنے بیٹے کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاص ذرائع سے پتا چلا لیا تھا کہ اس کے بیٹے شفقت راجا کے بہیمانہ قتل میں وزیر جان اینڈ کمپنی کا ہاتھ ہے۔ جو ممتاز خان کے باپ چودھری الف خان کا دیرینہ حلیف بھی رہ چکا تھا۔ اس سلسلے میں خان جی کی تمہاری طرف سے غلط فہمی دور ہو گئی اور انہوں نے تم سے مدد لینے کی ٹھانی، مگر پھر نیلی کوٹھی میں اچانک اور غیر متوقع قسم کے کچھ ایسے حالات ظہور پذیر ہوئے تھے کہ انہیں تم سے اس گمبھیر سلسلے میں تفصیلی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہی دنوں ایک ہائی سوسائٹی پارٹی کلب میں میری میڈم فرح نامی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ عورتوں کی... آپس میں کچھ ذاتیات سے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح میڈم فرح سے دوستی ہو گئی۔ وہ ایک طرح سے میری رازداں بھی بن گئی۔ اس نے ایک دن میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھ سے بولی کہ جب تک یہ بڈھا (خان جی) زندہ ہے، تو مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا مگر کب تک...؟ تم جوان ہو ابھی تم نے دنیا میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ کل کلاں کو... یہ بڈھا مر گیا تو کون ہے اس کے بعد تمہارا؟ جبکہ تمہارے مقابلے میں تمہاری سوکن قمر النسا کی خاندان میں حیثیت مضبوط ہے۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ذریعے تمہیں دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکے گی۔ لہٰذا ابھی سے اپنے بارے میں سوچ لو، اور جو تمہارے نام ہے۔

وہ مکمل طور پر اپنے تصرف میں کرلو۔ اس پر اس نے مجھے بڑی رازداری کا وعدہ کرتے ہوئے وزیر جان کی بیوی سعیدہ سے ملوادیا۔ میڈم فرح نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے نام کی ہوئی، کھلاں والی کی نصف جاگیر سعیدہ کے ہاتھ فروخت کردوں۔ جب میں نے اسے یہ کہا کہ... خان جی کی زندگی میں بھلا یہ میں کیسے کرسکتی ہوں، تو سعیدہ نے مجھے ایک دن اپنی کوٹھی میں بلایا اور اپنے شوہر وزیر جان سے ملاقات کروائی، دونوں میاں بیوی نے میرے سامنے ایک بھیانک منصوبہ رکھا کہ اگر میں پچاس کروڑ میں کھلاں والی کی نصف جاگیر اسے فروخت کردوں تو، وہ اگلے دن ہی... خان جی کو مروا ڈالیں گے۔

''وزیر جان اور سعیدہ کو میڈم فرح کے ذریعے میری خواہشات اور اس سے متعلق تحفظات کا پہلے ہی علم تھا۔ لہٰذا سعیدہ اور وزیر جان نے میری اس دکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے، مجھے یہ ترغیب دی تھی، کیونکہ خود میں نے بھی ظاہر ہے، لالچ کی خاطر ہی ایک بڈھے سے شادی کی تھی اور اب خود بھی میں ایک بڑا ہاتھ مار کر نکل جانا چاہتی تھی اور یہ سنہری موقع مجھے یہ دونوں میاں بیوی دے رہے تھے۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت تو کیا مگر میں نے ہامی بھرلی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ نصف جاگیر خریدنے میں ان کا بھلا کیا فائدہ ہوگا اس پر وزیر جان نے بڑی اسرار بھری مسکراہٹ سے کہا تھا کہ مجھے صرف ایک بار کھلاں والی میں پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے اس کے بعد سب کچھ میرا ہوگا۔ مجھے وہ ایک بڑے گینگسٹر کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ مجھے دولت کے لالچ نے اندھا کررکھا تھا۔ میں نے ہامی بھرلی۔ کیونکہ خان جی کو میں اب ہر معاملے میں ہی نہیں بلکہ اپنی سوکن قمرو اور اس کے بھائیوں کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگی تھی جس کے پیش نظر خان جی نے مجھے بھی ایک قیدی ہی بنا ڈالا تھا۔ ابھی یہ سازباز چل رہی تھی، کہ ان دونوں میاں بیوی میں (سعیدہ اور وزیر جان) نے میرے آگے ایک اور پتا پھینکا۔ انہوں نے مجھے خان جی کو سلو پوائزنگ کرنے کی ترغیب دے ڈالی، اس ضمن میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ خان جی کو مقتول بنا کر مجھے کسی بڑے قانونی چکر میں پھنسنے سے بچانا چاہتے تھے۔ مجھے بھی ان کی یہ بات اچھی لگی کہ یہ لوگ میرا بھی خیال رکھ رہے تھے اور منظم طریقے سے اس خطرناک مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن بالکل اتفاقاً مجھ پر ایک دن اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ ایک طرف میرے ذریعے خان جی کو بظاہر ''طبعی موت'' سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف میری موت کا پروانہ بھی جاری کیے ہوئے تھے۔ اس روز میں نے میڈم فرح کے ہاں ہی سوئے اتفاق سعیدہ اور میڈم فرح کی گفتگو سن لی تھی، جو میڈم فرح کو مجھ سے ملانے اور سازباز کرنے کے انعام کے طور پر بھاری رقم کا چیک دے رہی تھی، سعیدہ نے ہی میڈم فرح کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر وزیر جان بظاہر قانونی طور پر خان جی کے مرنے کے بعد میرے ذریعے سے کھلاں والی کی جاگیر پر قابض ہوجائے گا اور پھر وہاں اپنے دیگر مخالفوں کو راستے سے ہٹانے کے بعد مجھے بھی خاموشی سے موت کی نیند سلادے گا۔

''میں نے تب تک خان جی کو سعیدہ کی دی ہوئی زہر کی تھوڑی تھوڑی مقدار دودھ میں ملا کر دینی شروع کردی تھی، اب انہیں آخری خوراک دینا تھی جس سے انہیں دل کا ایک آخری اور خطرناک دورہ پڑتا مگر اب سعیدہ اور وزیر جان کی گھناؤنی سازش اور ان کے اصل عزائم جاننے کے بعد کہ یہ تو مجھے بھی ہلاک کرنے کے درپے تھے، میں اس دن سے پریشان رہنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ کبھی دل میں خیال آتا کہ اپنے شوہر خان جی کے قدموں میں گرکر ان سے معافی مانگ لوں اور ساری حقیقت بتادوں، مگر اس کی مجھ میں ہمت نہ پڑسکی، اس سلسلے میں آج میری سعیدہ سے خاص میٹنگ تھی کہ تم آگئے میں تمہاری اور سعیدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندر ہی اندر خوشی سے نہال ہوگئی کہ تم ہی میرے نجات دہندہ ثابت ہوسکتے ہو اور اس مشکل سے مجھے نکال سکتے ہو لیکن پھر تارڑ اور اس کے مسلح ساتھیوں کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر سب کچھ درہم برہم ہوگیا۔ خود میں بھی خوف زدہ ہوگئی اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یقیناً خان جی کو میری بعض مشکوک حرکات سے کسی قسم کا شبہ ہوا ہوگا اور اپنے آدمی تارڑ کو میرے پیچھے لگا رکھا ہوگا مگر اب تو جیسے سب کچھ ختم ہوتا ہی نظر آرہا ہے مجھے...''

نیلی کی یہ ساری رام کتھا میں نے اور اول خیر نے بڑی یکسوئی اور غور سے سنی تھی اور حیران سے رہ گئے تھے، میرے جی میں تو آئی کہ نیلی پر لعنت بھیج کر اول خیر کو لے کر یہاں سے اسی وقت کوچ کر جاؤں مگر وزیر جان کے معاملے نے مجھے وہاں رکے رہنے پر مجبور رکھا۔ تاہم میں نے مزید اس بارے میں کچھ پوچھنے سے پہلے نیلی کو ناصحانہ انداز میں اتنا ضرور کہا۔

''تمہیں کم از کم ایک انسان ہونے کے ناتے اور

بیوی کے مرتبے پر ہوتے ہوئے، بہرحال اپنے شوہر کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے شک خان جی کی اور تمہاری عمروں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن بہرحال تم سے شادی کرنے کے سلسلے میں خان جی نے کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں کی تھی بلکہ تم نے خود راضی خوشی ان کی بیوی بننا پسند کیا تھا کیونکہ تمہارے پیش نظر صرف لالچ تھا۔ تم مجھے یہ بتاسکتی ہو کہ آخر وزیر جان کو کھلاں والی جاگیر پر قابض ہونے کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ خان جی ایک عام جاگیردار نہیں بلکہ سیاسی شخصیت بھی ہے۔ مقامی لوگ اس کی جگہ وزیر جان کو کیسے پسند کرتے؟''

نیلی نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''شاید تم نہیں جانتے کہ خان جی کی اپنی ذاتی اور سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے میں ان کے اپنے ہی جوان اکلوتے بیٹے شفقت راجا کا ہی دخل تھا۔ اس نے وہاں ظلم و جبر کا بازار گرم کررکھا تھا۔ کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لوگ اس کی شکایت بھی خان جی سے کرتے ہوئے ڈرتے تھے، تاہم پھر خان جی کے کانوں تک اس کے بیٹے کے سیاہ کرتوتوں کی داستانیں پہنچتی رہتی تھیں۔ وہ بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے مگر بیٹا لاڈلا اور سرکش تھا۔ باپ کے کسی حکم کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ یوں رفتہ رفتہ لوگوں کا دل خراب ہونے لگا۔ کئی لوگ تو وہاں سے کوچ کرکے جا بھی چکے تھے۔ بہرحال، بیٹے کے قتل کے بعد... خان جی کا بھی سیاسی کیریئر ختم ہوکر رہ گیا۔ خود ان کی دلچسپی بھی جاتی رہی۔ وہ اب صرف جاگیردار تھے... ایک بیمار جاگیردار...''

نیلی کی اس بات سے میں سو فیصد ہی متفق تھا کیونکہ خود مجھے بھی معلوم تھا کہ شفقت راجا کس قماش کا آدمی تھا۔ نیلی نے میرے سوال کے جواب میں آگے بتایا۔

''کھلاں والی کی جاگیر پر اپنا مکمل تصرف حاصل کرنے کے بعد... وزیر جان سیاسی سپورٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ سیاست کے میدان میں اترنے والا تھا مگر اس سے پہلے وہ کھلاں والی کے لوگوں کے دل جیتنا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ کھلاں والی کو جدید خطوط پر ترقی سے ہمکنار کرے گا وغیرہ۔''

میں اس کی بات پر اندر سے کھٹک گیا۔ یقیناً وزیر جان ایک علاقے میں اپنا خاص قسم کا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا جس کے پیچھے بلاشبہ ''اسپیکٹرم'' کی ماسٹر اتھارٹی کی ''ڈکٹیشن'' کا دخل رہا ہوگا اور وہ یہ سب انہی کے ایما پر انہی کے وسیع تر مفادات کی خاطر کرنا چاہتا تھا۔

''اسپیکٹرم'' کے اسٹیشن چیف وزیر جان کا ایک اور گھناؤنا منصوبہ میرے علم میں آیا تو میری رگوں میں دوڑتے خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ نیلی کو اب بھی وزیر جان کی حقیقت اور خفیہ عزائم کے بارے میں کچھ علم نہ تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ لہٰذا اب میں اس ضرورت کو شدت سے محسوس کررہا تھا کہ میرا خود بھی زبیر خان المعروف خان جی سے ملنا از بس ضروری ہے۔ میں وزیر جان کی سازش اور گھناؤنے منصوبے کو روکنا اپنے لیے ہی نہیں بلکہ ملکی مفادات میں بھی اشد ضروری اور اپنا فرض سمجھتا تھا۔ میں نے نیلی سے یونہی دریافت کرنا چاہا جبکہ اسی تناظر میں میرے ذہن نے پہلے ہی اپنے تئیں ایک لائحہ عمل کی جزئیات پر غور کرنا شروع کردیا تھا۔

''اب تک جو ہوا سو ہوا، اب تمہارا آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے؟''

نیلی نے لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا پھر بمشکل ایک گہری سانس حلق سے خارج کرکے بولی۔ ''شہزی! میں سمجھتی ہوں کہ شاید میں خود ایک بھنور میں پھنس چکی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں، اسی وقت خان جی کے قدموں میں گرکر معافی مانگ لوں اور وہ جو میری سزا مقرر کریں اُف تک نہ کروں یا پھر خاموشی سے کہیں چلی جاؤں اور گمنامی کی زندگی بسر کردوں۔''

''میں تمہاری پہلی بات سے اتفاق کروں گا جبکہ تمہاری دوسری بات سے مجھے اختلاف ہے۔'' میں نے بلاتامل کہا۔ ''کیونکہ تم بہرحال ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہو۔ گمنامی کی زندگی تمہیں گمراہی کی طرف لے جاسکتی ہے جبکہ اگر تم اپنے شوہر سے معافی کی درخواست کرو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

میری مدد والی بات پر بے اختیار نیلی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور وہ رندھے لہجے میں بولی۔

''شہزی! تم ایک عظیم انسان ہو، کسی انسان کو مشکل میں دیکھ کر تمہارا دل بے اختیار اس کی مدد کرنے کو تڑپ اٹھتا ہے لیکن شہزی! کیا خان جی یہ ساری حقیقت جان لینے کے بعد مجھے معاف کردیں گے؟''

میں نے جواب میں کہا۔ ''ابھی تو مجھے بھی اس امر کا اندازہ نہیں مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر وہ تمہیں معاف نہ بھی کریں تو کم از کم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے، البتہ اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیں۔ یعنی

تمہیں طلاق دے دیں۔ خالی ہاتھ تمہیں وہ بھی نہیں کریں گے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی جس کا مجھے کچھ کچھ یقین ہے تو پھر تم کیا کرو گی؟''

نیلی سے کوئی جواب نہ بن پڑا، تو میں نے اسے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ ''تو پھر تمہیں... ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے جاں درکھنا جیسے انسان ہی کو اپنا جیون ساتھی بنانا ہوگا، وہ تم سے محبت بھی کرتا ہے بلکہ تم تو اس کی منگیتر بھی رہ چکی ہو، بے شک یہ رشتہ تمہارے مرحوم باپ خوشی محمد نے ہی اپنے ہونہار فرماں بردار شاگرد... جاں درکھنا کے ساتھ جوڑا تھا۔ میرا خیال ہے یہی بہتر بھی رہے گا اور تمہارے ناراض باپ کی روح بھی خوش ہوجائے گی۔''

''مجھے قبول ہے... یہ سب... مجھے قبول ہے...''

نیلی فرطِ جذبات تلے بے اختیار سسک کر بول پڑی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ ہولے سے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اوخیر، کاکے! مارا ماری کے ساتھ تو راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو بھی سدھارتا ہے۔ مجھے تو شروع ہی سے تیری اسی ادا نے گرویدہ بنا رکھا ہے۔''

میں ہنس پڑا اور بولا۔ ''یار! میں تو خود گناہ گار ہوں... بھلا کسی کو کیا سیدھی راہ دکھاؤں گا، بس میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اگر کوئی نیکی نہ کروں تو یار! مجھ سے گناہ بھی نہ ہونے پائے۔ پتا نہیں.... اللہ تبارک وتعالیٰ کو بندے کی کون سی ادا کب بھا جائے۔''

''اوخیر، جیو کاکا... جیو۔'' وہ بولا۔ ''اب جلدی سے آگے کی سوچ... کرنا کیا ہے؟''

میرا اپنا ذاتی مشن تو سرِدست ناکام ہی رہا تھا۔ جسے پورا کرنے کی میں سرتوڑ کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ تاہم یہ کام بھی کسی حد تک میرے مشن سے ہی تعلق رکھتا تھا اس لیے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اول خیر سے مشورہ طلب انداز میں بولا۔

''یار! اس خون خرابے کا... خان جی کو کیا بتائیں گے؟ ان کے آدمی تارڑ ہی نہیں تین مزید آدمی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔'' اول خیر کے جواب دینے سے پہلے ہی نیلی بولی۔ وہ اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔

''کسی کو بھی تم پر شبہ نہ ہوگا۔ نہ خان جی کو، نہ ہی وزیر جان کو۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے غور کرنے والے انداز میں فوراً نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہاں ہمارے سوا اور کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''البتہ یہ ممکن ہے کہ وہاں موجود لاشوں سے، بعد میں خبر خان جی اور وزیر جان تک پہنچے گی تو وزیر جان یہی سمجھے گا کہ یہ سب خان جی کے ساتھیوں کی جارحانہ مداخلت سے ہوا ہوگا جبکہ خان جی سمجھیں گے وزیر جان کے ساتھیوں کا شاخسانہ ہوسکتا ہے۔''

مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ ''لیکن بعد کی پولیس تفتیش بہت کچھ ثابت کرسکتی ہے کہ یہ کسی تیسرے مسلح گروہ کی حرکت تھی۔''

''بے شک۔'' نیلی کا لہجہ اب بھی پُراعتماد تھا۔ ''تیسرا گروہ کون ہے؟ یا کون تھا؟ کسے معلوم؟ یہ سب گمنامی کے اندھیروں میں ہوا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ خان جی کو بھی نہ بتانا۔''

میں نے اول خیر کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میری مستفسرانہ نظروں کا مطلب سمجھ کر پُرخیال انداز میں ہولے ہولے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''کسی حد تک نیلی کی بات ٹھیک بھی لگتی ہے لیکن شہزی کاکا! تم جو خان جی سے ملاقات کا ارادہ کیے بیٹھے ہوا سے کس طرح اس سارے معاملے کا چکر دو گے؟''

''یہ بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔'' میرے بجائے نیلی بول پڑی۔ ہم دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تم بتا دینا کہ مجھ سے تمہاری اتفاقیہ مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ کچھ ہتھیار بند لوگ یہ خون خرابا کر کے مجھے اس حالت میں چھوڑ کے فرار ہوئے جبکہ تم نے مجھے خان جی کی بیوی کی حیثیت سے پہچان لیا کیونکہ نیلی کوٹھی میں تم مجھے دیکھ ہی چکے تھے۔''

اس کی بات پر ہم دونوں نے صاد کیا۔ نیلی نے بھی غضب کا ذہن پایا تھا۔ کیونکہ نیلی سے اس سلسلے میں گفتگو کے دوران میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن رسا میں بھی کم وبیش یہی کچھ پلان طے پا رہا تھا اور ابھی میں اندر ہی اندر اس لائحہ عمل کی جزئیات سمیت ہی رہا تھا کہ نیلی نے ہم سے یہ کہہ ڈالا۔

''مگر اب کیا کیا جائے؟ تمہاری ایسی حالت تو نہیں کہ تمہیں اسی وقت خان جی کے ہاں لے جایا جائے اور پھر پتا نہیں وہ اپنی ملتان والی رہائش گاہ نیلی کوٹھی میں ہو یا کھلاں والی حویلی میں؟'' میں نے الجھی نظروں سے نیلی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''تم لوگ مجھے کار میں ڈال کر شدید زخمی حالت میں بھی تو یہاں لائے تھے؟ اب تو میری حالت پہلے سے کافی بہتر ہے۔ مجھے اسی طرح کار میں دوبارہ ڈال کر خان جی کے پاس لے چلو... رہی بات ان کی موجودگی، غیر موجودگی کی، تو ہم سیل فون پر خان جی سے رابطہ کر کے پوچھ سکتے ہیں۔''

''ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، یہ سیل فون زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں ٹکتے... سیل فون آئے گا کہاں سے؟''

اول خیر نے کہا تو نیلی بولی۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں، جاں درکھنا اس کا بندوبست کرسکتا ہے۔ سیل فون تو آج کل اس قدر عام ہوگیا ہے کہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں پہنچ گیا ہے لیکن جب میں نیلی کوٹھی سے نکلی تھی تو خان جی کھلاں والی گئے ہوئے تھے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا تو اول خیر مجھ سے پُراندیش لہجے میں بولا۔

''سوچ لے کاکے! مسئلہ یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا ہے۔ یوں سمجھو... اپنے ہاتھ سے ہاتھی کو ہندوستان دکھانے والی بات ہوگی۔''

''یہ تو کرنا پڑے گا ہی نہیں اول خیر۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔'' میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

''اس طرح ہم شبہے کی نظر میں پڑ سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔ وہ کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیلی بھی خاموش تھی۔ میں بھی سوچ میں پڑ گیا تاہم بولا۔

''میری زبیر خان سے اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہے۔ کیا تم بھول گئے اول خیر؟ خان جی خود مجھ سے اپنے بیٹے شفقت راجا کے سلسلے میں مدد کا خواہاں تھا اب اسے حقیقت کا علم ہوگا کہ وزیر جان ہم دونوں کا ہی مشترکہ دشمن ہے، تو وہ پوری طرح ہم سے نہ صرف تعاون پر آمادہ بھی ہو جائے گا بلکہ خوش بھی ہوگا کہ ہم نے اسے بروقت اس کے اکلوتے جوان بیٹے کے قاتل کے گھناؤنے منصوبے سے بھی خبردار کر دیا پھر ہم اس سے رازداری کی بھی درخواست کر سکتے ہیں جو اس کے مفاد میں بھی ہوگی۔ اس طرح وزیر جان ساری عمر ٹامک ٹوئیاں ہی مارتا رہے گا کہ آخر یہ سب ہوا کیا تھا اور کس نے کیا تھا؟''

''بات تو تیری بھی ٹھیک ہی لگتی ہے کاکے۔'' اول خیر کچھ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن پھر بھی میرا مشورہ یہ ہوگا کہ خان جی سے اس کی جاگیر کھلاں والی میں ملاقات

کرنے کے بجائے ملتان والی نیلی کوٹھی میں ملاقات کی جائے۔''

''ہاں، یہ تمہارا مشورہ درست ہے۔'' میں نے کہا۔ نیلی بھی متفق تھی پھر تھوڑی دیر بعد ہم نے... کھنا کو آواز دی۔ وہ اس دوران مطب والے گوشے میں بیٹھا مریض بھگتا رہا تھا، ہماری آواز پر فوراً دوڑا چلا آیا۔

''تمہارے پاس سیل فون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل ہے جی۔'' وہ بولا اور فوراً اپنے جھولتے ہوئے لمبے کرتے کی سائڈ جیب سے ایک سستا والا سیٹ نکال لیا۔

''بیلنس تو ہے ناں اس میں؟''

''آہو جی۔''

''ہمیں ایک ضروری کال کرنی ہے۔ بات لمبی بھی ہو سکتی ہے۔''

''کوئی گل نہیں جی۔ بے فکر ہو کے کرو... اس میں پیکیج ہے۔''

''ٹھیک ہے، شکریہ۔ اب تم جاؤ پھر تمہیں آواز دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس نے نیلی کی طرف کچھ محبت بھری اور کچھ حسرت زدہ نظروں سے دیکھا پھر مجھ سے بولا۔

''سب خیر تو ہے ناجی؟''

''ہاں، ہاں... سب خیر ہے ہم آگے کی بھی خیر منانے والے ہیں۔ بس ایک بات کرنی ہے کسی سے بہت ضروری۔''

''اچھا، اچھا... اللہ سب خیر کرے۔'' وہ یہ کہتا اور سر دھنتا ہوا چلا گیا۔ مجھے اس بے چارے پر ترس بھی آرہا تھا۔ میں خود راہِ وفا کا راہی تھا، جس کی منزل قریب ہوتے ہوئے بھی دور تھی اور کم و بیش یہی حال اس غریب اور سادہ لوح جاں ورکھنا کا بھی تھا۔ نیلی کی خاطر وہ ہمارا ہر حکم مانے جا رہا تھا اور درحقیقت اس میں اس کا فائدہ بھی تھا۔ میں خود بھی درحقیقت یہی چاہ رہا تھا کہ نیلی، خان جی کی طرف سے آزاد ہو جائے اور اس کو اپنا لے۔ اس میں دونوں کے لیے راحت و خوشی تھی۔

میں نے سیل ہاتھ میں لے کر ایک نظر اول خیر کے چہرے پر ڈالی۔ اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ اس کے بعد میں دھڑکتے دل سے خان جی کے سیل کا نمبر پنچ کرنے لگا، کچھ ضروری نمبرز مجھے ازبر تھے۔

رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے کھرکھراتی آواز ابھری۔ ''ہیلو۔''

آواز پہچان کر میں نے پہلے سلام کیا پھر بولا۔ ''خان صاحب! میں شہزاد احمد خان بول رہا ہوں۔''

یکلخت دوسری سمت جیسے سناٹا طاری ہو گیا پھر زبیر خان کی بھاری آواز ابھری۔ ''شہزا... تم؟ یہ... یہ تم ہی بات کر رہے ہو ناں... شہزی؟'' ان کے لہجے میں غیر یقینی عیاں ہو رہی تھی، میں نے کہا۔

''جی خان صاحب! میں ہی مخاطب ہوں آپ سے... شہزی! آپ اس وقت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟''

''میں اپنی جاگیر والی حویلی میں ہوں تم بتاؤ تم کدھر ہو؟ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اب تمہیں کیا خطرہ ہے قانون نے تمہیں تو آزاد کر دیا ہے پھر... یہ دوری کیوں؟'' وہ جیسے چھوٹتے ہی بولے چلا گیا۔ میں نے کہا۔

''قانون نے تو میرا پیچھا چھوڑ ہی دیا ہے مگر دشمن بھی تو کم نہیں میرے... وہ تو ہر وقت سائے کی طرح میرے تعاقب میں لگے رہتے ہیں۔ آپ سنائیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں... آپ سے ایک معذرت کرنا تھی... اس روز والے واقعے کی۔'' میں نے دانستہ ایسا کہا۔ ابھی تک شاید اسے کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی جبکہ اس روز والے واقعے سے میری مراد اس روز میرا ایڈووکیٹ خانم کو زخمی حالت میں لے کر نیلی کوٹھی سے نکلنا اور اسپتال پہنچانا تھا اور اس دوران میری خان جی سے بھی تھوڑی بہت تلخ کلامی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بولا۔

''تم نے اس وقت جو کیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا اور ایک طرح سے تمہارے حق میں بھی بہتر ہوا۔ اب تم کہاں ہو، میں تو تمہارا بے چینی سے منتظر ہوں۔''

''خان جی! پہلے آپ دل سے کہیں، آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے ناکوئی ناراضگی تو نہیں مجھ سے۔''

میری بات پر دوسری جانب سے خان جی نے پہلے ایک دوستانہ انداز کا قہقہہ بلند کیا، اس کے بعد بولا۔ ''تم اگر اس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں تمہارے کان تو ضرور کھینچتا... نالائق کہیں کے... ابھی تک تم مجھے نہیں پہچان سکے ہو، فوراً میرے پاس پہنچو یا پھر مجھے بتاؤ کہاں سے بات کر رہے ہو، میں گاڑی اور اپنے مسلح محافظ بھجوا دیتا ہوں۔''

''آپ کی بڑی مہربانی خان جی۔'' اس کا خلوص دیکھ کر میرا اپنا دل رقیق سا ہونے لگا۔ یہی تو شہزاد احمد خان عرف شہزی کی فطرت کا خاصہ تھا' پیار سے قتل بھی کر دو تو اُف نہیں کروں گا لیکن نفرت اور مخاصمت سے مجھے کوئی زیر

نہیں کر سکتا...''آپ کی محبت اور شفقت ہے خان جی! معاملہ تھوڑا گمبھیر ہے خان جی... مکمل رازداری کا متقاضی بھی... چاہتا ہوں گھر کی بات گھر میں ہی رہے۔ آپ کو تھوڑی زحمت دوں گا، اگر آپ نیلی کوٹھی آسکتے ہیں تو پھر میں بھی اُدھر آجاتا ہوں۔ کھلاں والی تو میں بالکل نہیں آسکتا۔''

''میں ابھی تمہارا فون آنے سے پہلے خود نیلی کوٹھی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو وہیں آجاؤ، مجھے وہاں پہنچنے میں بمشکل ایک گھنٹا لگے گا۔''

''بہت بہتر خان جی... میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔''

''خیریت تو ہے ناں؟''

''جی ہاں، وہیں آکر آپ سے بات ہو گی، خدا حافظ۔''

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے سرمد بابا کا نمبر ملانا چاہا تو کال ڈراپ ہونے لگی۔ دیکھا تو سگنل نہیں آرہے تھے، میں نے اول خیر اور نیلی کو اپنی اور خان جی کی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ سن تو وہ رہے تھے، اس کے بعد میں نے کہا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟''

اول خیر نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، پھر بولا۔ ''ہم بھی نکلتے ہیں۔ کم و بیش ہمیں بھی اتنا وقت تو لگ ہی جائے گا۔ گاڑی میں فیول بھی بھروانا ہو گا اور نیلی کی حالت کے پیشِ نظر ہمیں گاڑی بھی نارمل رفتار سے چلانا ہو گی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر جاں ورکھنا کو آواز دی۔ وہ بوتل کے جن کی طرح دوبارہ حاضر ہو گیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اسے اس کا موبائل تھمایا پھر بولا۔ ''دیکھو کھنا صاحب! ایک بات غور سے سنو، ہم اسی وقت نکلیں گے، نیلی بھی ہمارے ساتھ جائے گی، ہم خان جی کے پاس جا رہے ہیں، معاملہ رفع دفع کرنا چاہتے ہیں۔''

''لل... لیکن جی...'' وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا تو نیلی نے کہا۔ ''مکھنے! یہ ضروری ہے۔ شہزی بھائی، مجھے ایک مصیبت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ کے لیے یہاں تمہارے پاس آجاؤں۔'' نیلی کی بات پر اس کے چہرے پر کھلتے رنگ طلوع ہونے کی جھلک سی ابھری... اس کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم نے کھنا سے کہا کہ وہ اپنے مطب کے مریضوں کو فارغ کر دے، کیونکہ ہم یہاں سے رازداری کے ساتھ نکلنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا کہ مطب میں اس وقت کوئی مریض نہیں۔

اگلے چند منٹوں بعد ہم کار میں روانہ ہو رہے تھے۔ جاں ورکھنا نے روٹی وغیرہ کا پوچھا بھی تھا مگر اب کھانے پینے کا کسے ہوش تھا۔ بہرحال اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کر کے ہم روانہ ہو گئے۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ نیلی کار کی عقبی سیٹ پر دراز تھی، کھنا نے روانہ ہوتے وقت کچھ دوائیں نیلی کے ساتھ کر دی تھیں۔ کار اول خیر چلا رہا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ایک روڈ سائڈ گیس اسٹیشن سے ہم نے فیول ڈلوایا اور پھر روانہ ہو گئے۔ معاملہ پولیس کیس کا بھی تھا اس لیے ہماری کوشش تھی کہ راستے میں کسی پولیس چیکنگ پارٹی سے ہمارے مڈبھیڑ نہ ہونے پائے۔ ملتان روڈ مین ہائی وے تھی اور جگہ جگہ چیک پوسٹیں قائم تھیں، کہیں کہیں تو ہمیں بچ کے ہو کے گزرنا پڑا تھا۔

بالآخر سرِ شام ہم نیلی کوٹھی پر بہ خیر و عافیت پہنچ گئے۔ براؤن رنگ کی اسٹرکوٹر کو کھڑے دیکھ کر میں سمجھ گیا... خان جی کب کے پہنچ چکے تھے۔ ایک بات کا میں نے دھیان رکھا تھا کہ جاں ورکھنا کے سیل نمبر پر خان جی دوبارہ رابطہ کر سکتے تھے اس لیے میں نے روانہ ہوتے وقت جاں ورکھنا کو اس کے وسیع تر مفادات کے تحفظات کا کہہ کر اسے مجبور کر دیا تھا کہ اگر خان جی یا اور کسی کا فون اس کے سیل پر آئے اور وہ ہمارے بارے میں پوچھیں تو وہ یہی کہے گا... وہ ہمیں نہیں جانتا... نیز جاں ورکھنا اپنا اصل نام بھی نہیں بتائے گا بلکہ خود کو کوئی پی سی او والا ہی ظاہر کرے گا۔ گاؤں کے بارے میں نہیں بتائے گا، وغیرہ۔

نیلی کوٹھی میں خان جی موجود تھے۔ اپنی جوان سال بیوی نیلی کو اس حالت میں دیکھ کر... وہ بری طرح چونکے اور سراپا سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔

خان جی سے ہم نے وہی کہا جس کی منصوبہ بندی ہم کر چکے تھے۔ یعنی نیلی کا ہم سے زخمی حالت میں سامنا ہوا تھا اور نیلی نے بھی یہی بتایا کہ وزیر جان کے آدمی تھے وغیرہ... اس کے بعد نیلی زخمی ہونے کے باوجود خان جی کے قدموں میں جا گری اور رو پڑی۔ اس کی حیثیت کنواری اسی تھی، اٹھ بیٹھ نہیں سکتی تھی مگر شدید جذبات کی رو اور ضمیر کی کسک نے نہ جانے اس کے زخمی وجود میں کیسے اتنی ہمت بھر دی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ جاں ورکھنا نے اس کی مرہم پٹی اچھی کی تھی پھر بھی ہلنے جلنے کے باعث نیلی کے زخموں کا منہ کھلنے لگا تھا۔

ساری کتھا سننے کے بعد تو جیسے خان جی کی ٹھنیوں تک

گم صم ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنے قدموں میں پڑی روتی بلکتی زخمی نیلی کو چھونے تک کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کی گھنی بھوؤں سے ڈھکی آنکھوں میں نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں ..... پہرہ مارے طیش کے سرخ ہونے لگا، ان کی جلتی سلگتی حالت کو محسوس کر کے میں نے اور اول خیر نے نیلی کو سہارا دے کر صوفے پر نیم دراز کر دیا اور پھر میں خان جی کے قریب بیٹھ کر بولا۔

''خان جی! بے شک نیلی نے جو کچھ اب تک کیا وہ بہت برا کیا مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنی بڑی سازش بے نقاب ہو گئی اور آپ کی جان بھی بچ گئی۔ میں آپ سے گزارش کروں گا نیلی کو معاف کر دیں۔''

جواباً خان جی بولے۔ ''اگر یہ بدذات، حرافہ تمہارے ساتھ نہ ہوتی تو میں اسی وقت اسے گولی مار دیتا لیکن اب میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا... میں اسے اس کی اصل اوقات میں پہنچا دوں گا۔ یہ اس شان اور مرتبے کے لائق ہی نہ تھی، کمی کمین کو میں نے فرش سے عرش پر لا بٹھایا تھا۔ اب میں اسے دوبارہ فرش پر بٹھا دوں گا۔''

''میرا خیال ہے خان جی! یہی اس کے لیے سزا کافی ہوگی۔'' میں نے ہولے سے کہا تو خان جی نے اسی وقت نیلی کو تین بار طلاق دے ڈالی۔ اور اس کے نام جو کچھ بھی کر رکھا تھا وہ سارا واپس چھین لیا۔ نیلی اب... ایک بار پھر چودھرائن سے ایک غریب مزارع خوشی محمد کی بیٹی کے روپ میں آ گئی۔ خان جی نے یہ نیلی کوٹھی بھی اسی کے لیے بنوائی تھی۔ اسے بھی وہ اب فوراً فروخت کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ آخر میں انہوں نے میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میری وجہ سے یہ ساری گھناؤنی سازش بے نقاب ہوئی اور ان کی جان بھی بچ گئی۔

سارے معاملات تیزی سے نمٹانے کے متقاضی تھے۔ میں نے اسی وقت گھنا کو فون کر دیا کہ وہ آ کر نیلی کو بلکہ... ''نیلو'' کو اپنے ساتھ لے جائے۔ نیلی نے بھی میرے مشورے کو رد نہ کیا تھا۔ لیکن خان جی اب نیلی کو ایک لمحہ کے لیے بھی وہاں برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور ان کے خطرناک چڑھے ہوئے تیوروں سے یہی لگتا تھا کہ وہ نیلی کو کہیں گولی ہی نہ مار دیں اس لیے انہوں نے خود ہی جاں ور گھنا کا کام آسان کر دیا کہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ایک گاڑی میں نیلی کو روانہ کر دیا۔

یہ گمبھیر معاملہ بالکل ویسے ہی نمٹا تھا جس کی مجھے پہلے سے توقع تھی۔ اول خیر میری ذہانت کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا تھا۔ ورنہ تو وہ بے چارہ گھبرایا ہوا تھا، بہرحال وہ خان جی کو نہیں جانتا تھا جبکہ مجھے خان جی سے مزاج آشنائی تھی۔ اس لیے یہ معاملہ خوش اسلوبی سے اور میری توقع کے عین مطابق طے پا چکا تھا۔ اس دوران اول خیر نے ہولے سے میرے کان میں کہا۔

''او خیر کا کے! اب تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ تیرے صرف ہاتھ پیر چلتے ہیں، پر یار کا کے! تیرا تو دماغ بھی خوب چلتا ہے۔ نیلی والا معاملہ تو ''جتھاں دی کھوتی اوتے آن کھلوتی'' والا ثابت ہوا۔''

''ہاں، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔'' میں نے بھی مسکرا کر محاوراتی زبان کا سہارا لیا۔

اس دوران خان جی کے سیل فون پر کسی کی کال موصول ہوئی، ان سارے چکروں میں ہمیں ابھی آئندہ کا لائحہ عمل بنانے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ ایک پولیس افسر کی کال خان جی کو آ چکی تھی۔ میرا دل انجانے اندیشوں سے دھڑکنے لگا۔

''ہاں جی... بات کر رہا ہوں انسپکٹر صاحب! کیا؟ اچھا۔ مجھے تو نہیں معلوم... اور نہ ہی تارڑ اور اس کے تین مقتول ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق بھی ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔'' کہتے ہوئے خان جی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔ خان جی نے بروقت اور بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا اپنے آدمیوں سے لاتعلقی کا... پھر انہوں نے اسی وقت اپنے کسی اعلیٰ پولیس افسر سے بات کی اور یہ معاملہ رفع دفع کرنے کو کہا۔

''خان جی! کیا یہ سب کچھ اتنا آسان ہوگا؟'' ان کے فارغ ہونے کے بعد میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر معنی خیز اسرار بھری مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں بولے۔ ''پیسے کے آگے سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ اب تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ہم سے کسی قسم کا تعلق نہیں توڑو گے۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں خان جی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کب آپ سے تعلق توڑا ہے اگر ایسا ہوتا تو آج میں آپ کے خلاف ہونے والی اتنی بڑی اور گھناؤنی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے اِدھر کیوں آتا؟''

''ہاں، یہ بھی تم نے ٹھیک کہا۔'' پھر بولے۔ ''کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب تم اِدھر رہو۔ کھانے کے بعد مزید تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔'' کھانا اکٹھے کھایا گیا جو بڑا

پُرتکلف تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور گفتگو کی ایک نشست جمی جس کا لبِ لباب وزیر جان ہی رہا۔ اب خان جی کی وزیر جان کے ساتھ اچھی طرح ٹھن چکی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اب میرے اور خان جی کے مفادات مشترکہ نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ خان جی کو ابھی تک اپنے ازلی دشمن وزیر جان کی اصل حقیقت کا علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ وہ ابھی تک اسے ایک کاروباری آدمی اور صنعت کار سمجھے ہوئے تھے، انہیں کیا پتا تھا کہ وزیر جان کتنی ''اونچی چیز'' بن چکا تھا۔ ایک بین الاقوامی سطح کا گینگسٹر... ایک ''ڈون'' تھا وہ۔

خان جی کو جب میں نے وزیر جان کی اصل حقیقت کے بارے میں بتایا تو ایک لمحے کو نہیں بلکہ کئی ثانیوں تک کے لیے وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئے۔

''یہ... یہ... سب تم بالکل یقین سے کہہ رہے ہو شہزی؟''

''جی ہاں... پورے سولہ آنے یقین سے۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم غلط نہیں کہہ سکتے شہزی! مجھے تمہاری بات تسلیم کرنا پڑے گی مگر یہ اور چودھری ممتاز خان آخر یہاں کس کے ایما پر اور کیا گل کھلانا چاہتے ہیں؟''

''اسی بات کا تو ہمیں کھوج لگانا ہے خان جی!'' میں نے پُرجوش ہو کر کہا۔ ''یہ ایک لمبی چین ہے جس کے سرے کسی دور دراز غیر ملک میں جا کر ملتے ہیں۔ یہود و ہنود کی مخفی سازشیں ہیں امتِ مسلمہ اور بالخصوص پاکستان کے خلاف جس کا ماسٹر مائنڈ کوئی تو ہوگا جبکہ مجھے بھی یہ لولوڈش ایک کٹھ پتلی ہی لگتا ہے اس کی پشت پناہی کر رکھی ہے جو بظاہر انٹرنیشنل کروک کا خود کو ایک بڑا بزنس ٹائیکون کہتا ہے۔ گر پر پردہ وہ خود ایک انڈرورلڈ کا بڑا ڈون ہے۔ اس کے اپنے بھی کچھ ذاتی مفادات ہیں۔ اب تک کی میری ایک ادارے سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق لولوڈش ایک برازیلین نژاد آدمی ہے اور ایک جزیرے میں اس کا بڑا عالیشان محل ہے... جہاں وہ رہتا ہے۔ امریکا کی ایک بڑی بزنس کمیونٹی ''جیوش بزنس کمیونٹی'' یعنی جے بی سی جو خالصتاً یہودیوں کی ہے، اس کے صدارتی بورڈ کا ممبر بھی ہے۔ را کی ذیلی شاخ ''بلیو ٹمپسی'' کی بھی لولوڈش کو سپورٹ حاصل ہے اور اب وہ... ''اسپیکٹرم'' کی صورت میں ایک ادارے کو اپنے مخفی گھناؤنے مقاصد میں استعمال کر رہا ہے۔ جس کا بظاہر سلوگن یہی ہے کہ وہ گمشدہ نوادرات کو تلاش کر کے ان کے حقیقی مالک یعنی ممالک کو فراہم کرتا ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ خان جی! آپ چکرا کر رہ جائیں گے لیکن آپ کو حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وزیر جان یا بالفاظ دیگر ''اسپیکٹرم'' اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے آپ کے علاقے کی زمین استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اپنے ایک مہرے... وزیر جان کو اسٹیشن چیف بنا کر آگے سرکایا ہوا ہے۔ اس بساط پر چودھری ممتاز بھی فعال ہے۔''

''میں واقعی یہ سب سن کر چکرا گیا ہوں... شہزی!'' خان جی پریشان اور متحیر سے لہجے میں بولے۔ ایک الجھی الجھی سی جھلاہٹ.... ان کے لب و لہجے پہ غالب تھی۔

''اسی لیے میں آپ کو بار بار... محتاط رہنے کی تلقین بھی کر رہا ہوں اور آپ نے یہ بھی اچھا قدم اٹھایا کہ سردست نیلی کو خود سے دور کر دیا مگر معذرت کے ساتھ کہوں گا خان جی! کہ خدارا آپ اپنے گھر پر بھی نظر رکھیں۔ دشمن مہرے کے طور پر اگر آپ کی بیوی نیلی کو استعمال کر سکتے ہیں تو وہ کسی اور کو بھی اپنا بنا سکتے ہیں۔''

خان جی میری بات کا اشارہ سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر کی پُرغور خاموشی کے بعد بولے۔ ''شہزی! اس کا مطلب ہے صورتِ حال بہت گمبھیر ہے۔''

''بالکل خان جی۔'' میں نے یک دم کہا۔ ''ہماری اور آپ کی سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر اور خطرناک...''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی... اتنا کچھ ہو رہا ہے اور ہمارے خفیہ اداروں کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑی اب تک...؟''

''بھنک پڑی ہے تو اتنا کچھ معلوم ہوا ہے ناں خان جی!'' میں نے کہا اور انہیں ایک خفیہ عسکری ادارے کی ذیلی خفیہ سروس ''پاور سیکرٹ سروس'' کے بارے میں بتانے کے بجائے اشارۃً بتاتے ہوئے کہا۔

''یہود و ہنود بہت صبر، استقامت مگر نہایت مکاری، عیاری اور دغابازی کے ساتھ اپنے خفیہ مذموم مقاصد کو پوری منظم پلاننگ کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔'' میں نے میجر ریاض باجوہ کی باتوں کی روشنی میں کہا۔

''یہ پہلے خود کو مقامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بظاہر سماج سدھار اور خدمتِ انسانیت کے پرچار کا روپ ڈھالتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض ادارے ان پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اگر ایسا کرتے ہیں تو

عوامی حلقوں میں انہیں بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انٹر سروسز نے بھی لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے ایسا ہی عمل اختیار کیا ہے۔ اگرچہ انہیں ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن وہ ناامید بھی نہیں ہیں۔ اصل مشکل اپنے بعض سربرآوردہ اور مقتدرہ شخصیات کی طرف سے ہے جو اپنے بعض ذاتی مفادات کی خاطر ان کے اشاروں پر چل رہے ہیں... ان میں وزیر جان اور ممتاز خان کے نام قابلِ ذکر ہیں اور بھی کئی کالے چہرے ہوں گے، جنہیں تلاشا ہو گا۔'' میں اتنا بتا کر چپ ہوا تو خان جی میری گفتگو اور میری سیر حاصل معلومات سے متاثر ہو کر بولے۔

''شہزی! آج میں تمہیں پہلی بار ایک گمنام سپاہی کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ وطنِ عزیز کے ایسے گمنام سپاہی جو خاموشی سے ملک کی خدمت میں لگے ہوتے ہیں اور خاموشی سے مر جاتے ہیں۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے... اور تم اپنے اعلیٰ وارفع اور نیک مقاصد میں کامیاب ہوتے رہو، میں جتنا برا سہی... لیکن شہزی! اس بات کی تم بھی گواہی دو گے، میں کبھی ملک کے خلاف ایسی قبیح حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو سیاست کو صرف سیاست تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ اسے اپنی ذاتی انا نہیں بنایا کبھی، مگر ایسا ہوا ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور مجھے شرمندگی بھی ہوئی، یہی سبب ہے کہ میں نے اب سیاست سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے، ان کی باتوں کے تناظر میں مجھے میجر ریاض باجوہ کی وہ بات یاد آنے لگی۔

''نوجوان! رازداری سے ملک کی خدمت کرو اور رازداری سے مر جاؤ۔ اب ہمارے ملک میں کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ ہم کس پر بھروسا کریں اور کس پر نہیں۔''

میں نے خان جی کو اس سلسلے میں محتاط تو کر ہی دیا تھا لہٰذا اب ان سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے ہمیں اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا اور بولے۔ ''رات بہت ہو گئی ہے، صبح نکل جانا... آج رک جاؤ ادھر ہی۔''

''ضرور رکتا خان جی! مگر میرا جانا ضروری ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے معاملات سے بھی میں ہر پل باخبر رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ بولے۔

''تم ملتان میں کہاں اور کس کے پاس رہتے ہو؟''

''سیٹھ منظور روڈ انچ کے ہاں۔''

''او ٹھیک ہے... لیکن تم نے آج مجھ سے جو باتیں کہی ہیں ان پر پوری طرح متوجہ رہنا چاہتا ہوں لیکن یار شہزی! میں اب خود کو بہت اکیلا اکیلا بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو گیا ہوں میں۔ مجھے ڈر ہے کہیں میری اس کمزوری کا فائدہ میرا ازلی دشمن وزیر جان فائدہ نہ اٹھا لے۔ دنیا میں میرا اپنا ایسا کوئی نہیں جس پر میں بھروسا کر سکوں۔ لیکن تمہارے نیک عزائم، تمہارے سچے جذبات اور تمہاری جوانمردی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور تم ہی وہ واحد انسان ہو جس پر میں بھروسا کر سکتا ہوں... دراصل میں چاہتا تھا اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہمیشہ کے لیے میرے پاس کھلاں والی آ جاؤ... میں جانتا ہوں تم ایک خوددار نوجوان ہو ...... میں تمہیں اپنی زمینوں اور جاگیر سے متعلق بہت سی اہم ذمے داریاں سونپنا چاہتا ہوں۔ تمہیں رہنے کو اچھی رہائش گاہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا، نوکر چاکر آرام... جو تم چاہو گے تمہیں حاصل ہوگا۔''

''میں اس اعتماد کے لیے آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں خان جی۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''لیکن میری فطرت میں کسی کا آدمی یا غلام بن کے رہنا نہیں، میں آزاد پیدا ہوا ہوں، آزاد رہنا پسند کرتا ہوں، جسے شرفا کی زبان میں ''آوارہ گرد'' کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے کاندھوں پر کچھ ذمے داریاں ہیں کچھ میری اپنی ذات سے متعلق فرائض جنہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے تمہیں غلامی کا کب کہا ہے نوجوان شہزی!'' خان جی مسکرا کر بولے۔ ''میں تو تمہارے باعزت روزگار کی بات کر رہا ہوں۔ آخر کب تک تم یہ بھاگ دوڑ والی زندگی میں غرق رہو گے، کب تک؟''

''جب تک میں اپنی منزل نہ پا لوں خان جی! مگر مجھے یقین ہے کہ میری یہ بھاگ دوڑ رائگاں نہیں جائے گی۔'' کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اول خیر بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے خان جی سے جانے کی اجازت چاہی، انہوں نے چاروناچار ہمیں جانے کی اجازت دے ہی دی۔

نیلی کوٹھی سے روانگی سے قبل میری درخواست پر اس کے نوکروں نے کار کی اچھی طرح سے صفائی ستھرائی، بالالفاظ دیگر ''سروس'' کر ڈالی تھی کیونکہ اس کی اندرونی سیٹ پر خون وغیرہ جما ہوا تھا۔

ملتان روڈ پر آنے سے قبل ہم نے اپنے میگا رو بھی اچھی طرح پونچھ کر کسی اندھی کھائی میں پھینک دیے تھے۔ ہماری انگلیوں کے نشان صاف ہو چکے تھے۔ اب ہم مطمئن ہو کر ملتان روڈ پر گامزن تھے۔

☆☆☆

رات بہت زیادہ بیت چکی تھی۔

وزیر جان پر ابھی ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں رہا تھا۔ نیلی والا معاملہ بہ خیر و خوبی نمٹا کر میں سمجھتا تھا ہم نے کارِ خیر ہی انجام دیا تھا..... اس مہم میں سعیدہ یعنی وزیر جان کی بیوی، تارڑ کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ میں سمجھتا تھا، وزیر جان کو اس پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا، اگرچہ اس میں میرا واقعی کوئی قصور نہ تھا۔

ہم رات گئے ملتان پہنچ گئے تھے۔ کوٹھی میں سیٹھ منظور وڑائچ... یعنی سرمد بابا ہمارے ہی منتظر تھے، اور خاصے پُرجوش نظر آ رہے تھے، ہم نے انہیں زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی انہوں نے ہمیں زیادہ کریدنے کی کوشش کی، شکیلہ بھی وہاں تھی، سرمد بابا نے بتایا۔

''شہزی بیٹا! میں نے امریکا فون کیا تھا۔'' ان کی بات پر میرا دل یکلخت عابدہ کے تصور سے دھڑکنے لگا۔

''عارفہ اور عابدہ بیٹی سے بات ہوئی ہے، وہ دونوں خیریت سے ہیں۔'' ان کی بات پر میں نے سکون کا سانس لیا مگر نہ جانے کیوں عابدہ کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں انجانے اندیشناک وسوسے کھٹکتے ہی رہتے تھے، میرے اندر عابدہ کی طرف سے ایک نامعلوم سی بے چینی سرائیت کرنے لگی تھی۔

''عارفہ بیٹی سے میں نے سیٹھ نوید احمد سانچے والا کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی تھی۔'' وہ بتانے لگے۔

''اچھا۔'' میں نے بے دلی سے کہا، مجھے عابدہ سے بات کرنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ اس سے فون پر باتیں کرنے کا ادھر ہی زیادہ موقع ملتا تھا حالانکہ سرمد بابا نے مجھے ان کی خیریت کی اطلاع دی تھی مگر میں خود بھی فون پر عابدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ بابا آگے بتانے لگے۔ ''عارفہ کو یہ سب علم تھا... مذکورہ کمپنی کے اصل کاغذات اسی کے پاس ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سیٹھ نوید سانچے والا سے خود آ کر بات کرے گی اس سلسلے میں بلکہ وہ یہاں پاکستان آ کر ایک لیگل ایڈوائزر کی بھی خدمات لے گی۔ وہ اڑیسہ کمپنی کی نصف ملکیت ملنے پر بے حد خوش ہے اور شہزی بیٹا! شاید مجھے اس سلسلے میں بہت جلد رنگون (برما) جانا پڑے۔'' میں نے متفکر ہو کے کہا۔

''عارفہ اور عابدہ امریکا سے کب واپس آ رہی ہیں پھر؟ اور آپ کی روانگی کا کیا بنا؟''

''میں نے اسلام آباد بات کی تھی۔ دو ایک روز میں میرا ویزا آ جائے گا۔ یہ پندرہ دنوں کا خالصتاً وزٹ ویزا ہو گا۔ ویزہ آتے ہی میں امریکا روانہ ہو جاؤں گا مگر سوچ رہا ہوں پہلے رنگون کا ایک چکر لگا لوں اور وہاں سے امریکا نکل جاؤں۔''

''میرا تو خیال ہے بابا! آپ پہلے اللہ کا نام لے کر امریکا ہی روانہ ہو جائیں پھر خیریت سے پاکستان لوٹنے کے بعد آپ اطمینان سے رنگون کا سفر کیجیے گا۔'' میں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو وہ میری جانب معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھ کر بولے۔

''میں تمہاری بے چینی سمجھ رہا ہوں، شہزی بیٹا! تم بالکل فکر نہ کرو۔ عارفہ اب بالکل صحت یاب ہو چکی ہے۔ وہ خود وہاں سے روانہ ہونے کے لیے بے قرار بیٹھی ہے۔ اس کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے، ابھی وہ انڈر میڈیکل آبزرویشن میں ہے۔ عابدہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ شاید عابدہ سے متعلق میری بے چینی سمجھ رہے تھے۔

''میں عابدہ سے بات کر سکتا ہوں؟'' بالآخر میں نے کہا اور سرمد بابا نے فوراً اپنے بیش قیمت فون پر نمبر ملا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عابدہ سے بات کی۔ وہ میری اور میں اس کی آواز سن کر ایک یک گونہ مسرت سے نہال ہو اٹھے تھے مگر بدقسمتی سے بات تفصیل سے نہ ہو سکی۔ بہرحال جتنی بھی بات ہو سکی، میری تسلی کے لیے کافی تھی کہ عابدہ خیریت سے تھی۔

ہم ٹی وی دیکھتے رہے۔ بیک وقت کئی اہم واقعات ہماری وجہ سے رونما ہو چکے تھے، اس میں ڈپٹی روشن کی موت، ہمارے ساتھی ارشد اور شکیلہ کے بھائی شوکت حسین عرف شوکی کی موت، اس کے بعد آرک کو ہم نے جہنم واصل کیا اور زیرو ہاؤس میں اسپیکٹرم کے آرک سمیت دو بہترین ٹیکنیکل مجرمانہ دماغ رکھنے والے ڈاکٹر گلمٹ اور کمپیوٹر ایکسپرٹ اینڈ ڈیوائس ماسٹر حامد کو بھی نیست و نابود کر دیا اور اب تازہ ترین حادثاتی خون ریز واقعے میں وزیر جان کی چہیتی بیوی (جسے میں اپنی سوتیلی ماں سمجھتا تھا) سعیدہ کا تارڑ کے ہاتھوں قتل اور تارڑ کا اپنا میرے ہاتھوں قتل، جس میں اس کے تین ساتھی بھی شامل تھے۔ اس کے بعد نیلی والا قضیہ بھی نمٹایا گیا۔

ٹی وی پر ان سب کی خبریں وقتاً فوقتاً آتی رہی تھیں اور پھر جس طرح بہت سی ایسی خبریں دیگر آنے والی تازہ خبروں کے ڈھیر میں گم ہو جاتی ہیں یہ خبریں بھی اس قبر میں دفن ہو گئی تھیں۔ میں نے یا اول خیر نے ایسا کوئی سراغ نہیں

چھوڑا تھا کہ ہم کسی قسم کی قانونی پکڑ میں آتے۔

دیگر امور سے متعلق باتوں کے دوران سرمد بابا نے مجھے میجر ریاض کے بارے میں بھی بتایا کہ میری عدم موجودگی میں ان کا دو بار فون آچکا تھا۔ میں ٹی وی لاؤنج میں اول خیر، شکیلہ اور سرمد بابا کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرائنگ روم میں آگیا۔ جہاں ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے باجوہ صاحب سے ڈائریکٹ اُن کے ہاٹ لائن نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے انہوں نے ہی فون اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بُردبار... انداز میں بولے۔ ''شہزی! میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں تھے اور تمہارے چند روز غیاب کے کہاں بیتے ؟ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وقت اور حالات نے تمہیں ایسی روش پر دانستہ نادانستہ طور پر ڈال دیا ہے کہ اس میں تمہیں اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ مگر اتنا مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے روز و شب یقیناً ایک نیک مقصد تلے بیت رہے ہوں گے، بہر حال مجھے تمہاری خیریت وغیرہ سے متعلق فکر رہتی ہے۔ اب بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا؟''

''میں اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک اور خیریت سے ہی ہوں، باجوہ صاحب۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' دوسری جانب سے ان کی پُرطمانیت آواز ابھری۔ ''میرے پاس آجاتے تو اچھا تھا لیکن نہیں شاید مجھے ہی تمہارے پاس آنا پڑے۔ کچھ اہم اور ضروری باتیں کرنا تھیں تم سے۔ تم جہاں سے بات کر رہے ہو وہاں تمہاری کیا پوزیشن ہے؟'' ان کے محتاط انداز و لہجے کی گفتگو سن کر میں نے کہا۔ ''جی جناب... جیسے آپ چاہیں، میں یہاں مستحکم پوزیشن میں ہوں۔ آپ اور میں یہاں پوری رازداری کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔''

''گڈ۔'' وہ یک دم بولے۔ ''میں صرف اکیلا آرہا ہوں۔ اس بات کا خیال رہے کہ میں تم سے صرف ون ٹو ون ملاقات کا متمنی ہوں۔''

''جی... جی سر! آپ بے فکر رہیں۔ آپ جہاں تشریف لا رہے ہیں، وہ مکمل طور پر محفوظ اور مناسب جگہ ہے۔ ہم رازداری کے ساتھ یہاں گفتگو کر سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد میجر ریاض باجوہ نے مطمئن ہو کر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ باجوہ صاحب بہ نفسِ نفیس خود میرے پاس چل کر تشریف لا رہے تھے۔ یقیناً جو بھی معاملہ تھا وہ غیر اہم نہیں ہو سکتا تھا۔ بے شک میرے باجوہ صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے بلکہ وہ تو مجھے اپنا محسن بھی سمجھتے تھے لیکن آج تک ایسا ہوا نہ تھا کہ وہ اس طرح مجھ سے ون ٹو ون ملاقات کے سلسلے میں ملنے آرہے ہوں۔ مجھے وہیں کھڑے کھڑے گہری اور گمبھیر تا سوچ سی لگ گئی۔

بہر حال میں نے سرمد بابا وغیرہ کو باجوہ صاحب کی آمد کے بارے میں بتا دیا۔ رات کافی گزر چکی تھی، اس لیے میں نے سب کو سونے کا کہہ دیا تھا۔ سرمد بابا تو اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے جبکہ شکیلہ اور اول خیر میرے ساتھ اپنے کمرے میں آگئے، یہاں سرمد بابا کی کوٹھی میں میرا اور اول خیر کا کمرا ایک ہی تھا جبکہ شکیلہ کا الگ کمرا تھا مگر اس وقت ہم شکیلہ کے ہی کمرے میں موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد باجوہ صاحب آگئے۔ چوکیدار کے ساتھ باہر جا کر میں نے ان سے ملاقات کی، میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ ایک تو عام سول ڈریس میں تھے جبکہ گاڑی بھی ان کی ذاتی تھی، یعنی سرکاری گاڑی نہیں تھی، وہ تھے بھی اکیلے۔

میں انہیں اندر لے آیا۔ ایک الگ تھلگ سی نشست گاہ کا پہلے ہی سے انتخاب کر چکا تھا۔

میں نے چائے وغیرہ کا پوچھا باجوہ صاحب سے لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ نیز وہ خاصے عجلت میں نظر آرہے تھے اور ان کے چہرے پر گہری تشویش کے تاثرات تھے۔ جانے کیوں میرے دل و دماغ کو بار بار دھچکا سا لگ رہا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ وہ جیسے چھوٹتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔

''شہزی! کیا ہم یہاں مکمل رازداری کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں؟''

''شیور، سر!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''یہاں ہماری گفتگو کوئی نہیں سنے گا۔ بے شک دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں مگر باوصف اس کے ہماری گفتگو کی کوئی بھی بات لیک آؤٹ ہو گی بھی تو یوں سمجھیے یہاں ایک شہزی نہیں کئی شہزی ہیں جو ملک و قوم کی خاطر ایسی کوئی حرکت کرنے کا تصور بھی نہیں کریں گے جو ہمارے وسیع تر مفادات کے خلاف ہو۔''

میری بات پر وہ مطمئن ہونے کے بعد تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع ہوئے۔

''شہزی بیٹا! ہمیں دشمنوں کی مار کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا اپنوں کی کج روی ہمیں، ہمارے مشن کو اور ہمارے

کاز کو متاثر کرتی ہے۔ ہمارا ایک اصول ہے، اور اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ یعنی رازداری سے ملک و قوم کی خدمت کرو اور رازداری سے مر جاؤ، ہماری کوشش تھی کہ ہم .... موجودہ ملکی حالات اور کچھ ابن الوقت قسم کے سیاست دانوں کی وطن دشمن خفیہ سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں ان کی بیخ کنی کے لیے ہمیں ملکی وسیع تر مفادات کے لیے پی ایس ایس کا خفیہ قیام عمل میں لانا پڑا تھا تاہم پی ایس ایس یعنی پاور سیکرٹ سروس کے قیام کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں تھا اس کے قیام کی اصل وجہ وطنِ عزیز میں خفیہ طور پر سرگرم ''تیسری قوت'' پر بھی نگاہ رکھنا تھا۔ جو یہاں موجود چند کالی بھیڑوں کے ساتھ ان کے ذاتی مفادات کا ان کے ضمیر سمیت سودا کر کے انہیں اپنا آلہ کار بنا لیتی ہیں۔ میں تمہیں پہلے اشارۃً اور بعد میں واضح لفظوں میں بتا چکا ہوں کہ...''

میجر ریاض باجوہ لحہ بھر کو رک کے پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

''بلیو ٹکسی کو انہی لوگوں نے جدید خطوط پر استوار کیا ہے... وطنِ عزیز پاکستان میں یہ خاطر خواہ طریقے سے اپنے اہداف کے وہ نتائج ہنوز حاصل نہ کر سکے ہیں جو اُن کی ازلی مذموم سازشوں کا شروع ہی سے جزو لاینفک رہی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ موساد اور را کی توپوں کا رخ کسی نہ کسی طریقے یا حوالے سے ہماری طرف ہی رہا ہے۔

''اس بار بلیو ٹکسی نے پہلے سے زیادہ مضبوط گٹھ جوڑ اور منظم طریقے سے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا آغاز کیا اور خود کو سات پردوں میں رکھتے ہوئے کٹھ پتلیوں کو میدان میں اتارا ہے اور خود ان کی ڈوریاں سنبھال لی ہیں۔ ''اسپیکٹرم'' اس کی واضح مثال ہے۔ اور اس کا سربراہ... لولووش ان کی وہ کٹھ پتلی ہے جسے خصوصی طور پر یہ مشن سونپا ہوا ہے کہ وہ مقامی سطح پر اپنے جیسی مزید کٹھ پتلیوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرے، جو یہاں اس کا ایک خاص کارندہ... مسز آرک لوچن کر رہا ہے۔''

باجوہ صاحب کے منہ سے آرک کا نام سن کر میں چونکا۔ شاید ابھی انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ میں اسے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں مگر ابھی میں بہ غور ان کی پوری بات سن لینا چاہتا تھا۔ وہ آگے بتا رہے تھے۔ ''وزیر جان اور چودھری ممتاز ان کی واضح مثال ہیں۔ ایسے ہی اور لوگ بھی جو ابھی ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ ان سب کو ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل کا لالچ دے کر ان کے ضمیروں کا سودا کر چکے ہیں۔ مذکورہ شخصیات کسی نہ کسی حوالے سے بعض عوامی حلقوں میں اپنی مقبولیت بہر حال

اوہ گاڈ! میرے یہ ایکسرے کتنے حسین ہیں۔ ڈاکٹر! اس کے دس پرنٹ بنوا دو۔ میں اپنی سہیلیوں کو بھجواؤں گی

رکھتے تھے اور رکھے ہوئے بھی ہیں۔ اس بات کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے ہمیں بھی لوہے کو لوہے سے اور زہر کو زہر سے کاٹنے کے لیے پاور سیکرٹ سروس کو خفیہ طور پر میدان میں لانا پڑا۔ اس کی بنیاد ونان پروفیشنل رضا کاروں کو ساتھ ملانے پر رکھی جن کی کمانڈ بہر حال پروفیشنل افراد کے ہاتھ میں رکھی گئی۔ بہت سے ملے بھی، ان میں سرِفہرست تم بھی تھے، اس کی بڑی وجہ تمہاری چودھری ممتاز اور بعد وزیر جان کے ساتھ پرانی نسل تھی اور تم بھی نادانستہ سہی... ایک طرح سے پی ایس ایس کے کاز میں شامل کر لیے گئے۔ مگر ہماری اس سروس کو چند عاقبت نااندیش غیر فعال کرنے کی مذموم کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

''نوجوان شہزی! تم نے بعض نامساعد حالات کی بھٹی میں خود کو بغیر استاد کی شاگردی میں رکھتے ہوئے جو کچھ سیکھا ہے، اب تک تم اسے ہی بروئے کار لائے ہوئے ہو، یہ تمہاری غیر معمولی یا ودیعت کی ہوئی ذہنی فراست اور خود اعتمادی سے پُر صلاحیتیں ہی ہیں جن کے بل بوتے پر تم اب تک بڑی کامیابی سے جو مکھی لڑ رہے ہو، لیکن نوجوان! ہو سکتا ہے تمہیں اس بات کا احساس نہ ہوا ہو کہ تمہاری یہ جنگ اب تمہارے ذاتی مفادات سے ہٹ کر ملک و قوم کے وسیع تر مفادات تک پہنچ ہوتی نظر آرہی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پیچھے ہٹنے والے تم بھی نہیں ہو مگر شہزی! بے شک تم نے اب تک حالات سے جو سیکھا، اسے ہی بروئے کار لاتے رہے

اور کچھ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باعث... پر اب تمہیں خود کو تیار کرنا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کو جدید تقاضوں میں ڈھالنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہم اپنی تیسری آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ عنقریب بین الاقوامی سطح کے پروفیشنل مجرموں کے ساتھ تمہارا ٹاکرا ہونے والا ہے۔ میں تمہارا عندیہ لینے آیا ہوں۔ اس کے بعد تمہاری پروفیشنل تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا جاسکے۔'' وہ شاید میرے بار بار ٹریننگ سے کترانے پر آج دن ٹو دن ملاقات پر مجبور ہوئے تھے۔

میجر ریاض باجوہ اس قدر تفصیل بتانے کے بعد خاموش ہو گئے۔ نشست گاہ کا ماحول دھڑکتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے پورے دھیان اور غور سے ان کی گفتگو سنی تھی۔ بڑی توجہ سے ان کی بات کا ایک ایک لفظ سنا اور سمجھا تھا اور اس ضرورت کو میں خود بھی محسوس کرتا آرہا تھا کہ میرے دشمنوں کا جال اور گھیراؤ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ذاتی مقاصد کے علاوہ اور نیک مقاصد بھی میرے آگے پیچھے جارہے ہیں۔ اب تک میں اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے باعث ان کا مقابلہ بھی کرتا آیا تھا۔ اس میں اول خیر کا بھی کردار شامل تھا جس نے میری ہمت، کوشش اور تربیت بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے خود بھی اب وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھلنا ہوگا جس کی طرف باجوہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سر! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ اس ضمن میں، میں بھی آپ کو کچھ بتانا چاہوں گا لیکن مجھے بہرحال یہ سن کر دھچکا پہنچا ہے کہ پی ایس ایس کو اپنے ہی بعض عاقبت نااندیش اور کالی بھیڑوں کی وجہ سے غیر فعال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن خوشی بھی ہے کہ بہرحال اس کے مقاصد کو کوئی دھچکا نہیں پہنچا مگر مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی قسم کا انتشار نہ پھیلے۔''

''تم کچھ بتانا چاہ رہے تھے مجھے نوجوان؟'' باجوہ صاحب نے ہولے سے کھنکھار کر مجھے یاد دلایا تو میں نے اسٹیشن فور سے لے کر اسپیکٹرم کے بیس کوارٹرز یروہاؤس سے لے کر آرک کی ہلاکت تک سب انہیں آگاہ کردیا جسے سن کے ان کے چہرے پر جوش و مسرت کے ملے جلے تاثرات عیاں ہوئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔

''شہزی! یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے مگر اب تمہیں حد سے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اب بین الاقوامی مجرموں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف ہو جائے گا۔''

''میں پوری طرح سے محتاط رہنے کی کوشش کروں گا سر۔'' میں نے پختہ لہجے میں کہا تو وہ آخر میں بولے۔

''میرا خیال ہے تمہاری ٹریننگ ناگزیر ہوچکی ہے تمہیں رضاکار سپاہی کی حیثیت سے اپنے خفیہ تربیتی کیمپ میں ٹریننگ لینا ہوگی شہزی۔''

''کتنے دنوں تک ہوگی یہ ٹریننگ؟'' میں نے بالآخر پوچھ لیا تو وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولے۔

''اس کے لیے کم از کم سال سے چھ ماہ درکار تھے لیکن شاید تم اتنا عرصہ اس کے متحمل نہیں ہوسکو گے لیکن اگر تم اپنی پوری اور بھرپور توجہ سے صرف ایک مہینہ بھی ٹریننگ کیمپ کو وقت دے دو، تو تمہیں بنیادی اکائیوں میں مہارت دی جاسکتی ہے۔ چونکہ ایسے تجربات سے تو تم یوں بھی گزر رہی رہے ہو۔ یہ تجربات تمہاری مختصر عرصے کی تربیت کو جلا بخش دیں گے اور تم جلد ہی مہارت بھی حاصل کرلو گے۔''

میں ان کی بات پر کچھ سوچتا ہوا سا بن گیا۔ میرے آگے وزیر جان سے کچھ اگلوانے کا مشن درکار تھا۔ جسے مجھے سردست مؤخر کرنا پڑ رہا تھا لہٰذا بولا۔ ''مجھے منظور ہے۔ کیا کل سے مناسب رہے گا؟''

''آف کورس۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔ ''مگر اب یہ ٹریننگ خود میں تمہیں دوں گا۔ اپنے وسائل سے اور اپنی ذاتی دلچسپی سے۔ وقتاً فوقتاً پی ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں بھی ٹریننگ ہوگی۔ کل صبح تم میرے پاس آجاؤ۔''

''لگاتار تو حالات اس بات کی اجازت نہ دیں مگر میں کوشش کروں گا۔ مجھے کچھ ویسے بھی فوری طور پر مشن درپیش ہیں، ان میں اسپیکٹرم کے اسٹیشن چیف وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ازبس ضروری ہے۔''

''وہ سب ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ تم ایسا کرو کل میری رہائش گاہ پر آجاؤ۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے وہ بولے۔ اب ان کا مقصد رخصت ہونا تھا۔ ''اب وہ بات تو نہیں ہوگی مگر جو اس سے پہلے ہمارے خاص ٹریننگ سینٹر میں ہوتی، مگر میں اپنی ذاتی دلچسپی اور توجہ تو تمہیں دے سکتا ہوں۔'' کہتے ہوئے انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے اپنی شرٹ کی جیب سے نکال کر تھما دیا۔

''سوری سر! میں آپ کو کچھ کھانے پینے کا ہی نہیں کہہ سکا۔'' وہ مسکرا کر میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ تم سے کام کی باتیں ہوگئیں یہی بہت ہے۔ چلتا ہوں اور ہاں کل میں تمہارا انتظار کروں

گا اور میں تمہیں اپنے ایک انسٹرکٹر سے بھی ملواؤں گا۔ تمہیں اس کے سپرد کرنا ہے، بائی۔''

وہ چلے گئے۔ میں نے کمرے میں آکر اول خیر اور شکیلہ کو میجر باجوہ صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ کچھ حیران بھی ہوئے مگر اول خیر کی حیرانی وقتی ثابت ہوئی کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے بشرے پر تفکر آمیز پریشانی کے تاثرات آگئے، بولا۔ ''کاکے! باجوہ صاحب تجھے کس راہ کا راہی بنا رہے ہیں؟ یہ کیا گھن چکر ہے؟''

میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔ ''یہ تو پرانا معاملہ ہے۔ تجھے پتا ہی ہے مگر اب ذرا گمبھیر ہوگیا ہے لیکن باجوہ صاحب تو میری راہنمائی کرنا چاہ رہے ہیں کیونکہ انہیں اندازہ ہو رہا ہے کہ میرے دشمنوں کی نوعیت اور تعداد بدلتی اور پھیلتی جارہی ہے۔ وہ سب تربیت یافتہ ہیں۔ میں ان سے مار بھی کھا سکتا ہوں۔''

''نہ نہ کاکے... نہ نہ... تجھے اپنی دشمنی صرف چودھری ممتاز تک ہی محدود رکھنی چاہیے بلکہ اس معاملے کو بھی ٹھک ٹھکا کر دے۔ وزیر جان سے ایک دوستانہ معاہدہ کرتے ہیں اور چاچا چاچی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کے بعد خیر سے عابدہ بھابی امریکا سے لوٹ آئے، اور بس۔''

اول خیر کی بات سن کر میرے چہرے پر ایکا ایکی سنجیدگی طاری ہوگئی۔ چاہتا تو میں بھی سب کچھ یہی تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میری تقدیر مجھے خود ہی حالات کے ایسے دھارے پر ڈال دیتی ہے کہ پھر میری فطرت میرا مزاج اس بات سے یارا نہیں کھاتا کہ میں ان سے چشم پوشی کروں۔ میجر باجوہ کی باتیں ہنوز میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''اول خیر! یہ تو اب تقدیر جانے کہ آئندہ میری اور عابدہ کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حالات، رفتہ رفتہ مجھے کسی ایسے بامقصد دھارے پر خود ہی ڈال رہے ہیں کہ میں ان سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ خیر، باجوہ صاحب کی بات بھی صحیح ہے۔ مجھے کل صبح ان کے ہاں جانا چاہیے۔ پھر دیکھتے ہیں آگے۔'' اول خیر میری بات پر ہولے سے مسکرا کر بولا۔

''او خیر... کاکے، کیا میرے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود تجھے کسی ٹریننگ کی ضرورت ہے؟ تو تو بنا بنایا فائٹر ہے۔ میں نے جواباً سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں اول خیر، تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ بلاشبہ تم سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ابھی تک سیکھ ہی رہا ہوں لیکن یار! باجوہ صاحب کا مشورہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ مجھے کچھ خاص اور سائنٹیفک قسم کی تربیت کی ضرورت ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اسپیکٹرم کے جب بھی کسی خاص آدمی سے میرا پالا پڑا تو مجھے اس نے بہ آسانی زیر کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب یہ میری تقدیر تھی کہ مجھے کچھ ایسے سہل مواقع بھی محض اتفاقاً ہی حاصل ہوئے تھے کہ میں نے اپنے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیے، مگر اول خیر! اب ہر بار تو ایسا نہیں ہوسکتا نا؟ تقدیر ہر بار تو مہربان نہیں ہوسکتی نا مجھ پر... اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل باجوہ صاحب کے ہاں ضرور جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے کاکے! جیسی تیری مرضی، میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو تیرے ساتھ ہی ہوں۔''

''یہی میرے لیے بڑی بات ہے میرے یار کہ تو میرے ساتھ ہے۔''

شکیلہ قریب بیٹھی ہم دونوں کی باتیں بہت غور اور دھیان سے سن رہی تھی۔ پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ میجر صاحب کی بات ٹھیک ہی ہے۔ شہزی! تم واقعی ممتاز خان وغیرہ کی دشمنی میں بہت آگے نکل چکے ہو اور یہ اتفاق ہے یا پھر خدا کی مرضی کہ تم اپنے ذاتی مقاصد کے علاوہ ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کے لیے بھی چن لیے گئے ہو تو تمہیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ پتا نہیں آگے اور کیا تمہاری زندگی میں لکھا ہے؟ اور کتنے ہنگامے مقصود ہیں تمہاری قسمت میں... تمہیں میجر صاحب کا ہمنوا بن کر ان کی مدد کرنی چاہیے لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ جنگ طول پکڑے۔ کیونکہ تم نے بہرحال آرک کو ختم کر دیا... اسپیکٹرم کو کافی دھچکا پہنچایا ہے۔''

شکیلہ نے اب تک مجھ پر بیتے ہوئے حالات سے زبانی کلامی اور کچھ تجرباتی طور پر آگاہی حاصل کرنے کے بعد بالکل صحیح بات کہی تھی۔

اگلے دن علی الصبح میں میجر باجوہ صاحب کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے وہاں ان کے ساتھ صرف ایک کپ چائے پی تھی، اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک خاص گھریلو ملازم سے ملوایا اس کا نام قدیر تھا۔ وہ اچھا خاصا لمبا چوڑا اور گورے رنگ و روپ کا حامل شخص تھا اور سرحدی علاقے کا نظر آتا تھا۔ یہی وہ انسٹرکٹر تھا جس کا ذکر کل رات کو باجوہ صاحب نے کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ پر ہم زیادہ دیر نہیں رکے اور تینوں ایک

جیپ میں روانہ ہوگئے۔

باجوہ صاحب راستے میں مجھے بریف کرتے رہے کہ انہوں نے رینجرز کے ایک خاص ٹریننگ سینٹر میں بھی میری وقتاً فوقتاً حاضری کا بندوبست کیا ہے اور مجھے کچھ سائنٹیفک قسم کی چیزیں، حربے اور معلومات وہیں سے ہی زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوسکتی ہیں۔

سینٹر میں کچھ اہلکار آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سفید اور نیلے رنگ کی عمارت تھی، جس کے آگے وسیع و عریض احاطہ تھا اور بیک یارڈ میں خاصا بڑا میدان تھا۔ کچھ مٹی کے تودے نما چبوترے، مورچے، خندقیں نظر آرہی تھیں۔ جسمانی ورزشوں اور مخصوص سیلف ڈیفنس میں استعمال ہونے والے سامان اور چوبی چوکھٹے نصب تھے۔

ہم ایک ہال میں آگئے۔ وہاں ایک دراز قامت افسر ٹائپ آدمی سے باجوہ صاحب نے مجھے ملوایا۔ وہ بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ ان کا نام کیپٹن افتخار خان جنجوعہ تھا۔ ہم نے وہاں کھلے دوستانہ ماحول میں چند رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد اصل موضوع پر آئے، جس کا لب لباب، اسپیکٹرم ہی تھا۔ کیپٹن افتخار جنجوعہ بھی اسپیکٹرم کے سلسلے میں خاصے ''اپ ڈیٹ'' دکھائی دیتے تھے، آرک کی میرے ہاتھوں ہلاکت پر انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ نیز انہوں نے آرک لوچن سے متعلق یہ بھی ایک اہم انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ درحقیقت اسپیکٹرم کا زونل چیف، ایک ہینڈلر ایجنٹ کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔ ''آرک لوچن کے مرنے کی وجہ سے یہاں پاکستان میں اسپیکٹرم کے مذموم خفیہ مقاصد کو زبردست دھچکا پہنچا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا ہمیں کہ اب اسپیکٹرم کا اصل سربراہ... یعنی ماسٹر اتھارٹیز بگ باس لولوڈش شاید اب خود میدان میں اترے گا۔ کیپٹن جنجوعہ کی بات پر مجھے اپنے اندر ایک سنسنی خیز قسم کے جوش کا احساس ہونے لگا۔

''لولوڈش... ہمارا اہم ٹارگٹ ہے۔'' کیپٹن جنجوعہ آگے بولے۔ ''مگر وہ بہت مکار اور عیار آدمی ہے۔ بہت اثر و رسوخ کا مالک آدمی... انٹرپول کو بھی کسی زمانے میں وہ مطلوب تھا مگر اب نہیں رہا۔ اس کی پشت پر کئی سپر پاورز کی مقتدر سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کا ہاتھ ہے۔ سب سے بڑا ہاتھ تو جیوش بزنس کیمونٹی (جے بی سی) کا ہے۔ اور پھر موساد کا۔''

''نوجوان اب تم ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔'' میجر باجوہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''ہم جس پی ایس ایس پر پوری توجہ دے کر اسے خفیہ طور پر فعال کررہے تھے اب یہی ہم تمہارے ساتھ کریں گے، تم مکمل طور پر ایک ''پاور ایجنٹ'' کہلاؤ گے، ایک گمنام سرفروش، گمنام سپاہی کی حیثیت سے بظاہر ہمارے مشن کو آگے بڑھاؤ گے، اور تمہیں تھری اسٹارز پاور حاصل ہوں گے۔ میں نے تمہیں ایک کارڈ دے رکھا ہے۔ اس کی ''چپ'' میں سارا تمہارا بائیوڈیٹا درج ہے۔ تمہیں ملکی اور قومی مفادات میں دوقتل کرنے کے بھی اختیارات حاصل ہیں۔ کوئی تم سے پوچھ تاچھ نہیں کرسکتا۔ سویلین قانونی ادارے، بھی تم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کا اختیار نہیں رکھ سکتے لیکن بات وہی ہے کہ تمہیں یہ سب خفیہ رکھنا ہوگا جبکہ درپردہ ہماری مدد تمہارے ساتھ شامل رہے گی۔''

''میرا خیال ہے اب پروجیکشن روم میں چلنا چاہیے۔'' کیپٹن جنجوعہ نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند منٹوں بعد ہم ایک ہال کمرے میں تھے۔ یہاں سادہ فرنیچر تھا۔ ہم صوفوں پر براجمان ہوگئے۔ سامنے بڑی سی اسکرین تھی۔ کیپٹن جنجوعہ نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے ہال کمرے کی لائٹ گل کردی۔ اس کے بعد اسکرین روشن ہوگئی۔ اب ان کے ہاتھ میں ریڈ ڈاٹ لائٹ تھی جس سے وہ اسکرین پر موجود ایک نقشے پر نشاندہی کرتے ہوئے متعلقہ معلومات سے اپ ڈیٹ کرتے رہے۔ لولوڈش کی بھی تصویر دکھائی گئی۔ اسپیکٹرم کے نیویارک والے ہیڈ آفس کے علاوہ برما میں اس کے ذیلی آفس کا بھی محل وقوع دکھایا جانے لگا۔ بلیو ٹکسی کے مخصوص مونوگرام اور ان سے متعلق معلومات بھی جنجوعہ صاحب مجھے دیتے رہے۔

نصف گھنٹے بعد لائٹ آن کردی گئی اور چائے کا دور چلا۔ گفتگو کے دوران، میری مخصوص ٹریننگ کے سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میجر باجوہ صاحب مجھے اور قدیر کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

☆☆☆

تھوڑا وقت مزید بیت گیا۔ اس عرصے میں، سرمد بابا کا ویزا آچکا تھا مگر انہوں نے میری مرضی کے خلاف اپنے بزنس ٹرپ پلان کو ہی زیادہ اہمیت دی تھی۔ یعنی پہلے وہ برما کا قصد کرنا چاہتے تھے، اس کے کاغذات کے لیے بھی انہوں نے اپلائی کر رکھا تھا پھر سارے سفری کاغذات مکمل ہوتے ہی وہ برما روانہ ہوگئے۔ بخوبی ڈیلسہ کمپنی آفس میں

ان کی کیا باتیں اور کیا میٹنگز ہوئیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ برما سے امریکا پہنچ جائیں اور عارفہ اور عابدہ کو خیریت کے ساتھ واپس پاکستان لے آئیں۔

شکر تھا کہ سرمد بابا تیسرے روز امریکا روانہ ہوگئے اور اب میں عابدہ کی واپسی کا بے چینی سے منتظر تھا۔

ادھر ٹریننگ سینٹر میں مجھے دس، پندرہ روز بیت چکے تھے۔ وہاں کیپٹن جنجوعہ اور قدیر میری کمانڈو سطح کی تربیت میں بڑی تندہی کے ساتھ مصروف تھے۔ میری تربیت کا پہلا مرحلہ عمومی طور پر سیلف ڈیفنس تک محدود تھا۔ دوسرے مرحلے میں مجھے ''ایکشن اینڈ اسالٹ'' کی تربیت دی گئی جبکہ تیسرا مرحلہ ابھی جاری تھا، اس میں شوٹنگ پاور اور مختلف ایمونیشن وغیرہ سے آگاہی کے علاوہ بنیادی سطح کی کمانڈو ٹریننگ شامل تھی، تربیت کے اس آخری مرحلے میں میرا جوش زیادہ نمایاں رہا تھا۔

اس دوران میں نے وزیر جان کو ٹریپ کرنے کی کوشش بھی کی تھی جبکہ آرک لوچن وغیرہ کی موت کے بعد اسپیکٹرم مکمل طور پر انڈر گراؤنڈ ہوچکی تھی۔ اسٹیشن فوروالی عمارت میں مستقل تالا پڑ چکا تھا جبکہ ان کے بیس کوارٹرز زیرو ہاؤس میں مقامی مزدور لگا کر دنیا دکھاوے کے لیے وہاں سالونٹ پلانٹ کا کام باقاعدہ شروع کیا جاچکا تھا اور یہ کام چودھری ممتاز کے سپرد کر رکھا تھا۔

اسپیکٹرم والوں کی چالاکی اور مستعدی پر میں خود بھی دانت پیس کر رہ گیا۔ اصل چہرے گویا سات پردوں میں چھپ چکے تھے۔ مقامی مزدور ٹائپ لوگوں کو سامنے کردیا گیا تھا۔ یقیناً ان میں اسپیکٹرم کے آدمی بھی شامل ہوں گے۔

زبیر خان المعروف خان جی سے بھی میرا ٹیلی فونک رابطہ ہوتا رہا تھا۔

میری ٹریننگ آخری مراحل میں تھی جب مجھے سرمد بابا کی امریکا سے کال موصول ہوئی جو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وصول کی۔

''شہزی بیٹا! یہاں ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔'' انہوں نے کہا تو میرے چشم تصور میں عابدہ کا چہرہ رقصاں ہوگیا۔ مجھے تشویش ہوئی، میں نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ہے بابا؟ عابدہ اور عارفہ تو ٹھیک ہیں نا؟ آپ لوگ کب تک لوٹ رہے ہو؟''

''عابدہ تو ٹھیک ہے شہزی بیٹا۔'' سرمد بابا نے بتایا تو میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ''لیکن... عارفہ بیٹی کے ساتھ عین آخری لمحات میں پیچیدگی ہوگئی ہے۔''

''کیسی پیچیدگی؟'' میں پھر پریشان سا ہوگیا، وہ بولے۔

''عارفہ یوں تو بالکل ٹھیک تھی جگر کی پیوندکاری کا آپریشن بھی کامیاب ہوگیا تھا اور وہ ابھی انڈر آبزرویشن تھی کہ عین آخری دنوں میں جب اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا تھا تو اسے اچانک High grade Fever نے آن لیا۔ اس کے علاوہ آپریشن والی جگہ پر بھی پیچیدگی پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ اسے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اب اس کی طبیعت اللہ کا شکر ہے کہ کافی بہتر ہوگئی ہے مگر اسے اب مزید کچھ دن انڈر آبزرویشن رکھا گیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے ویزے کی مدت ختم ہونے والی ہے اگرچہ میں نے ایکسٹینشن کی درخواست بھی دی ہوئی ہے مگر تاحال کوئی جواب نہیں آیا۔''

میں سرمد بابا کی یہ بات سن کر پریشان ہوگیا۔ فوری طور پر تو میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ میں کیا کہوں؟ تاہم کچھ سوچ کر بولا۔ ''اللہ عارفہ بہن کو مکمل شفا عطا فرمائے بابا، ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ویزے کی مدت میں اضافے کا آپ کے پاس ٹھوس جواز ہے۔ آپ کوشش کریں کہ عارفہ بہن کی مکمل صحت یابی تک وہیں ان کے پاس رکے رہیں۔ اور دونوں کو اپنے ساتھ ہی لے کر پاکستان خیریت کے ساتھ لوٹ آئیں۔'' میری بات پر دوسری جانب سے سرمد بابا کی گہری ہنکاری بھرنے کی آواز ابھری، پھر بولے۔

''شہزی بیٹا! خود میں بھی یہی چاہتا تھا مگر اب ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا۔ بہرحال دو تین روز میں صورت حال واضح ہوجائے گی۔ تم دعا کرنا، پھر تفصیل سے بات ہوگی۔''

اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں ہونٹ بھینچ کر سوچوں میں گم ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب ہوگا کیا؟ سرمد بابا کی باتوں سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی جلد پاکستان لوٹنے کی فکر میں تھے۔ اب پتا نہیں اس میں ان کے ویزے کی مدت کے خاتمے کی وجہ تھی یا پھر یہاں ان کی کوئی کاروباری مجبوری...

☆☆☆

میجر باجوہ صاحب کی خصوصی دلچسپی اور ذاتی کوششوں سے میں اب تک جس قدر ٹریننگ حاصل کرسکتا تھا، وہ کررہا تھا۔ کچھ حالات نے مجھے سکھایا تھا۔ اول خیر جیسے جی دار جنگجو آدمی کی سنگت بھی مجھے میسر تھی اور اب ٹیکنیکل

طرز کی ٹریننگ نے مجھے دو آتشہ بنا دیا تھا لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ میرے نزدیک یہ سب ثانوی باتیں تھیں۔ پیشِ نظر میرے اصل بات تھی جذبے اور جنون کی... میرے نزدیک یہی دو ہتھیار محبوب تھے، اور اب تک میں انہی کو ہی بروئے کار لاتا رہا تھا۔

مجھے وزیر جان کو ٹریپ کرنا تھا۔ یہ میری زندگی کا گویا ایک اہم مشن تھا۔ وزیر جان نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی تھی جس نے میرے اندر دھواں بھر رکھا تھا اور دھوئیں سے کبھی یکلخت چنگاری بھڑک اٹھتی تھی تو کبھی شعلہ فشانی ہونے لگتی۔

یہ اسی روز کی شام کا ذکر تھا۔ ہم تینوں ایک کمرے میں بیٹھے اپنے تازہ اور متوقع مشن کی جزئیات پر غور اور تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ شریفاں کے شوہر ملوک نے آ کے مجھے کارڈلیس تھما دیا۔

''کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کہا، میں چونکا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے کارڈلیس اپنے کان سے لگا لیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے ایک شناسا آواز پر میرے وجود کی تمام حسیات پورے غیظ جوش کے سات یکدم بیدار ہو گئیں۔

''شہزاد! اتنا اونچا مت اُڑو کہ تمہیں نیچے گرنے کے لیے زمین بھی نہ ملے۔''

''اونچا وہی لوگ اُڑتے ہیں جنہیں اُڑنا آتا ہے اور زمین پر اترنا بھی... وزیر جان!'' اس کی آواز پہچان کر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تو دوسری جانب سے وزیر جان کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

''زمین پر تو تمہیں ہم اتاریں گے، مگر ایک زندہ لاش کی صورت۔''

''کیا یہی گیدڑ بھبکیاں سنانے کے لیے تم نے اپنا اور میرا قیمتی وقت برباد کیا ہے؟'' میں نے اسے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا مگر میرے اندر ایک پریشان کن سی کھٹک پیدا ہونے لگی تھی کہ اس رذیل انسان نے ضرور کوئی اہم انکشاف کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے۔ ایک کھٹک اس کی بیوی کے حوالے سے بھی تھی کہ کہیں وہ مجھے ہی اپنی بیوی سعیدہ کا قاتل تو نہیں سمجھے ہوئے یا وہ سب جو ہوا، اس کی ذمے داری مجھ پر ڈالنے کی بھی کوشش کرے۔

''وقت تو اب آنے والا تمہارے لیے جو بربادیاں لائے گا شہزی۔'' اس کی دوبارہ پُرغیظ سی آواز ابھری۔

''جب تمہیں پتا چلے گا کہ یہاں سے ہزاروں میل دور تمہاری معشوقہ عابدہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ضعیف ماں باپ کا میں کیا حشر کرنے والا ہوں مگر میری یہ بڑی دیرینہ خواہش بن چکی ہے کہ جب وہ دونوں بڈھے میرے قبضے میں ہوں اور تم میرے آگے ان کی زندگی کے لیے ہاتھ جوڑتے، میرے پیروں پر گرتے نظر آؤ۔''

عابدہ اور اپنے ماں باپ کے ذکر پر میرے اندر کا جوار بھاٹا رفتہ رفتہ آتش فشانی لاوے کی شکل باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''وزیر جان! پھر تم بھی یاد رکھنا۔ میں تمہیں موت سے بھی بدتر سزا دوں گا۔''

''یہ وقت بتائے گا اور بتانے والا ہے شہزی۔'' وہ زہریلی آواز میں بولا۔

''تمہارا باپ تو خیر جہاں ہے اسے وہیں اپنے دردناک انجام سے دوچار کیا جانے والا ہے جس کی ویڈیو کلپ میں خود تمہیں اپنے پاس بلا کر دکھاؤں گا۔ مگر ابھی تو تم اپنی ماں... کی خیر منا لو۔ وہ اس وقت میرے رحم و کرم پر ہے۔''

میری توقعات کے عین مطابق اس نے ایک ایسا انکشاف کیا تھا جس نے واقعی مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے اندر کے طوفان پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ایسی بزدلی کی توقع پہلے ہی سے رکھے ہوئے تھا۔ وزیر جان! مگر یاد رکھو یہ حقیقت تم بھی جانتے ہو کہ میری زندگی کا مقصد اور تلاش کا محور میرے ماں باپ ہی ہیں۔ اگر تم نے ان کا ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش چاہی تو یاد رکھنا وزیر جان پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''ختم تو اب تمہارا سب کچھ ہونے ہی والا ہے۔ شہزی!'' وزیر جان نے دانت پیسنے والے انداز میں اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''تم نے ہم سے ٹکر لے کر خود اپنے ساتھ بہت برا کیا ہے۔''

''میں نے تم سے کوئی ٹکر نہیں لی ہے۔ نہ ہی تم سے میری کوئی دشمنی تھی، میں تو خود تم سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا اور بس...'' میں نے مصلحتاً مفاہمانہ لہجے میں عیاری سے کہا تو وہ بولا۔

''یہ پینترے بازیاں اب بہت ہو چکیں شہزی! کام کی بات کرو... اب...''

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''تم یقیناً اپنی ماں سے ملنا چاہو گے؟'' اس کے لہجے میں میری بے بسی سے حظ اٹھانے والے انداز کی بو آ رہی تھی۔ وہ ایک بزدلانہ قدم اٹھانے کے بعد اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مسرت محسوس کر رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے بے بس کرنے والا ہے۔

''کون ایسا بیٹا ہوگا جو اپنے بچھڑے ہوئے ماں باپ سے نہیں ملنا چاہتا ہوگا؟'' میں نے اپنے حلق میں اترتی رقت پر بمشکل قابو پایا۔

''ہاہاہا... یہ تو بات تم نے بھی ٹھیک ہی کہی شہزی... مگر اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے تمہیں ایک قیمت چکانا ہوگی۔ خود کو ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔ بالکل بے دست و پا حالت میں۔'' اس نے ہذیانی اور فتح کے زعم میں قہقہہ بلند کیا۔

''میں جانتا ہوں... تم جیسے گیدڑ ایک شیر کو پنجرے میں ہی دیکھنا پسند کریں گے۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھولتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ ہنسا۔

''ایک پاگل جنونی شیر کو پنجرے میں ہی رکھا جاتا ہے یا گولی مار کے ختم کر دیا جاتا ہے۔''

''میرا باپ بھی تمہارے قبضے میں ہے؟'' میں نے اس کی ہرزہ سرائی پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر پوچھا۔

''اس وقت صرف تمہاری ماں ہی میرے قبضے میں ہے۔'' وہ بولا۔ ''فکر نہ کرو تمہارا باپ بھی ہماری پہنچ سے دور نہیں۔ پہلے اپنی ماں سے تو مل لو۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے بے چاری۔''

اس رذیل آدمی کی بات پر میرا جگر تک اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ میں نے اپنے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''میرا باپ کدھر ہے... کہاں ہے؟''

''وہ بہت دور ہے... اس ملک کی سرحدوں سے بھی دور۔ ایک اندھیری کوٹھری میں اپنی بچی کھچی زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔'' اس نے میرے سامنے ایک اور اعصاب چٹخا دینے والا تکلیف دہ انکشاف کیا اور میرے رگ و وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اپنے اندر کی درد انگیزی پر قابو پانا مشکل ہونے لگا۔

''وہ ہے کہاں؟ اور کس جرم میں... کیوں اور کہاں قید ہے؟''

''سب کچھ فون پر ہی پوچھ لو گے؟ مجھ سے ملو گے نہیں؟'' وہ میری دلی و ذہنی ہیجانی اور کرب ناک کیفیات کو گویا اپنے چشم تصور میں دیکھ کر اندازہ لگاتے ہوئے مکارانہ انداز میں بولا تو میں نے فوراً کہا۔

''میں تیار ہوں۔ کہاں ملو گے؟'' اسے کیا معلوم تھا کہ میں تو خود اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں، وہ بولا۔

''میں نہیں... تم ملو گے... کہاں؟ یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم اسی نمبر پر کب تک موجود ملو گے؟'' اس نے آخر میں دریافت کیا۔ میری متوحش سی بے چینی پھر فزوں تر ہونے لگی۔ میں اس سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا، بولا۔ ''میرا کچھ پتا نہیں ہوتا... تم ابھی بتا دو مجھے کہ تم سے کہاں ملنا ہے؟''

''دھیرج... شہزی! اتنی جلدی نہ کرو۔ میں جانتا ہوں تم اس بڈھے بزنس مین سیٹھ منظور وڑائچ کے پاس ہی رہتے ہو اور تمہارا مستقل ٹھکانا بھی وہی ہے۔ میں چاہوں تو کسی وقت بھی اس کی کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں مگر غیر متعلقہ باتوں میں خود کو الجھانے کا قائل نہیں اس لیے ابھی تم اُدھر ہی آرام سے بیٹھو... بہت جلد میں تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں گنگ ہو کے صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ کارڈلیس والا ہاتھ اس طرح میرا گرا تھا جیسے میرے پہاڑ سے وجود کی ساری طاقت یکلخت ہی ختم ہو گئی ہو۔ سامنے والے صوفے پر اول خیر اور شکیلہ غور سے میری فون پر وزیر جان کے ساتھ گفتگو سن رہے تھے۔ میرا کارڈلیس والا ہاتھ نیچے گرتے ہی اول خیر یکدم تشویش زدہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب صوفے پر آن بیٹھا۔ شکیلہ کی کشادہ سیاہ آنکھوں میں بھی میرے لیے تشویش و تفکر کے سائے ہلکورے لینے لگے تھے۔

''خیر ہے کاکے! کیا کہہ رہا تھا یہ بدبخت؟'' اول خیر نے میرے شانے کو ہولے سے سہلا کے کہا تو میں نے اسے وزیر جان کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر اول خیر اور شکیلہ دونوں ہی ایک لمحے کے لیے ہک دک رہ گئے۔

میں یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا چہرہ جوش سے سرخ اور وجود مرتعش ہو رہا تھا۔

''میں وزیر جان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں پُرغیظ لہجے میں دانت بھینچ کر بڑبڑایا۔

''شہزی کاکے! وہ ویسے بھی ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔'' اول خیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پر دیکھ! معاملہ نازک ہی نہیں سنگین بھی ہے۔ ماں جی اس کے قبضے میں ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ بزدل دشمن خطرناک بھی ہوتا ہے۔''

''اول خیر، ماں جی اس حرام زادے کے قبضے میں ہے۔ میرے باپ کے بارے میں بھی وہ جانتا ہے۔ بہت کچھ اگلوانا ہوگا اس کے منہ سے۔'' میں نے کہا۔

شکیلہ نے اس بار لب کشائی کی۔ ''شہزی! یہ سب تبھی ممکن ہوگا جب وزیر جان ہمارے جوتے تلے ہو۔ ہمیں اس کی کال کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ خود ہی اپنی موت کو دعوت دے گا۔''

اول خیر نے کہا۔ ''ہمیں نمبر چیک کرنا چاہیے پہلے۔''

تھوڑی دیر بعد سیٹ کی اسکرین پر نمبر چیک کیا گیا۔ وہ نمبر جس سے وزیر جان نے مجھے کال کی تھی، کسی لینڈ لائن کا نہیں تھا۔ وہ سیل نمبر تھا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم وزیر جان کی دوسری کال کا انتظار کرتے۔ اس نے مجھے اس نمبر پر موجود رہنے کی خاص تلقین اور تنبیہ کی تھی۔ گویا وہ مجھے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد میں اِدھر ہی محدود رہ کر اس کی اگلی کال کا انتظار کرتا ہوں یا پھر اس کی ''بیخ کنی'' کے لیے فوراً نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس کی دوسری کال کا ہمیں مجبوراً انتظار کرنا نہیں پڑتا تو میں اور اول خیر اسی وقت اس کی رہائش گاہ کا رخ کرتے۔

وزیر جان کی دوسری کال کا مجھ سے انتظار نہیں ہو پا رہا تھا، یہ انتظار میرے اعصاب چٹخانے کا باعث بن رہا تھا۔ میں وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

میں تھکے تھکے اور خاصے جھلائے ہوئے انداز میں دوبارہ صوفے پر گر گیا۔ اول خیر اور شکیلہ میری کیفیات کو محسوس کر رہے تھے کہ میں کس قدر بے چین اور کربناک گھڑیوں سے گزر رہا تھا۔

''مزید سنا کاکے! وزیر جان نے تجھ سے اپنی بیوی سعیدہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟'' چند ثانیوں کی پُرسوچ اور اعصاب شکن خاموشی کے بعد اول خیر نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ بھی میرے قریب صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تو ابھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں پوچھی۔''

''ہوں۔'' اول خیر نے پُرخیال ہنکاری لی۔ ''ابھی اسے ہم پر ایسا کوئی شبہ نہیں ہوا ہے یا پھر ممکن ہے اس نے یہی سمجھا ہو کہ یہ سب زبیر خان کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یقیناً پولیس کو وقوعے والی جگہ پر اس کے آدمیوں کی لاشیں ملی ہوں گی۔''

''ہاں، خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن ایسے میں اگر پولیس نے زبیر خان یعنی خان جی سے تفتیش وغیرہ کی تو... یہ معاملہ دوسرا رخ اختیار کرے گا یعنی پرانی دشمنی کہ خان جی نے اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لیا یا... نیلی کو ورغلانے کے جرم میں یہ سب ہنگامہ ہوا۔'' میں نے کہا تو شکیلہ بولی۔

''اس خونریز واقعے میں نیلی کا کردار وزیر جان سے چھپا نہیں رہے گا کیونکہ اس کے دماغ میں یہ خیال ضرور ابھرے گا کہ آخر نیلی کدھر گئی؟''

میں شکیلہ کے اس سوال کے جواب کا بہت پہلے تجزیہ کر چکا تھا لہٰذا بولا۔ ''وزیر جان کبھی خیال و خواب میں بھی ہمارے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ وہ خود اپنی بیوی کے ذریعے خان جی کی بیوی کے ساتھ ایک خفیہ گیم کھیل رہا تھا۔ خان جی کے آدمیوں کی لاشیں ملنے کی صورت میں لامحالہ وزیر جان کے ذہن میں بعین وہی خیال ابھرے گا جس کا اندیشہ اس کے ذہن میں بھی متوقع ہوگا کہ نیلی پر کسی قسم کا خان جی کو شبہ ہو گیا اور اس نے اپنے آدمی اس کی رکھی پر لگا دیے۔ اگرچہ ہوا بھی ایسا ہی ہے... یہ سارے اندازے اندیشوں کی صورت پہلے ہی وزیر جان کے دل و دماغ میں کلبلاتے رہے ہوں گے۔ رہی بات نیلی کی یا وقوعے والی جگہ اس کے غیاب کی تو یہ عام سمجھ میں آنے والی بات ہوگی کہ نیلی خوش قسمتی سے بچ گئی ہوگی اور فرار ہو کے روپوش ہو گئی۔''

''لیکن پھر بھی شہزی کاکے! نیلی کی صورت میں ہمارے سروں پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ وزیر جان اس بات پر کھٹک ضرور جائے گا کہ آخر نیلی کدھر گئی؟ شوہر سے غداری پر خان جی نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ وہ اپنے تئیں ان ساری باتوں کا کھوج تو لگانے کی کوشش کرے گا ضرور۔'' اول خیر نے خیال آرائی کی تو میں نے کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ نیلی اب وزیر جان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل ہوگی۔ سازش ناکام ہونے کے بعد نیلی اب اس کے مفاد میں نہیں رہی ہوگی، یوں بھی ساری صورتِ حال و حالات... واضح ہیں۔''

''ایک خیال اور میرے ذہن میں آ رہا ہے۔'' معاً شکیلہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو میں اور اول خیر مستفسرانہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں شکیلہ کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ ایک ذہین اور بہادر لڑکی تھی۔ اب تک اس نے بھی حالات کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ وہ بھی ایک مضبوط اعصاب کی مالک

تھی، وہ بولی۔ ”پولیس کی تفتیش یا وزیر جان سے کسی قسم کی مزید جنگ سے بچنے کی خاطر ممکن ہے خان جی (زبیر خان) سرے سے اس بات سے ہی مکر جائے کہ تارڑ وغیرہ اس کے ساتھی ہیں۔“

شکیلہ نے بلاشبہ ایک اہم نکتے کی طرف ہماری توجہ دلائی تھی جس پر میں نے اور اول خیر نے ابھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

”ہاں، تمہاری بات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔“ میں نے کہا۔

”چلو اب اس معاملے پر مٹی پاؤ۔“ اول خیر اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولا۔

ہمارے سامنے ٹی وی آن تھا اور مختلف نجی چینلز کی چوبیس گھنٹے نشریات جاری تھیں۔ صرف چند علاقائی چینلز پر اس واقعے کی لائیو رپورٹنگ آ رہی تھی۔ کچھ بریکنگ نیوز کے طور پر بھی نشر ہو رہی تھیں۔

اس دن کال نہیں آئی، اگلے روز شام کے لگ بھگ پانچ بجے وزیر جان نے کال کی۔ نمبر دیکھا تو یہ پہلے والا نمبر نہیں تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال وصول کی اور ہیلو کہا۔

”خود کو ہمارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ شہزی۔“ دوسری جانب سے وزیر جان کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”مگر یاد رکھنا کسی قسم کی چالاکی کی گنجائش نہیں ہو گی۔ دوسری صورت میں بھیانک نتائج کے ذمے دار تم خود ہی ہو گے۔“

”میں صرف اپنی ماں کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں... وزیر جان۔ اور اس سلسلے میں تمہاری طرف سے کسی قسم کی دغابازی یا دھوکے کو برداشت نہیں کروں گا۔“

”خاطر جمع رکھو... ایسا کچھ نہیں ہو گا اور یہ سب کان کھول کے سن لو۔ تم صرف تنہا آؤ گے، یاد رکھنا تم جیسے ہی باہر نکلو گے مجھ تک یہ اطلاع پہلے ہی پہنچا دی جائے گی کہ تم تنہا ہو یا نہیں۔ میرے پاس پہنچنے تک تمہاری مکمل ریکی ہوتی رہے گی۔“

”مجھے تمہاری اس بات سے اختلاف ہے۔“ میں نے اس کی بات کی نفی کر دی۔ ”میں تم تک پہنچنے سے پہلے... اپنی ماں کو کسی کے ساتھ محفوظ مقام پر دیکھنا چاہوں گا اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ میرے ساتھ میرا کوئی ساتھی بھی ہو۔“

”میں اس کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں دوں گا۔“ وزیر جان نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم جیسے ہی میرے پاس پہنچو گے، تمہیں تمہاری ماں سے ملوانے کے بعد .... تم جہاں کہو گے، میرے آدمی اسے وہاں پہنچا دیں گے۔“

”مجھے تمہارے لہجے سے منافقت اور دغابازی کی بو آ رہی ہے وزیر جان۔“ میں پُرطیش لہجے میں دانت پیس کر بولا تو دوسری جانب سے وزیر جان کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔

”زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں شہزی! تمہیں وہی کچھ کرنا ہو گا جو میں چاہوں گا مت بھولو کہ اس وقت بال میرے کورٹ میں ہے۔“

اس کی بات پر میرا دماغ گرم ہونے لگا، کچھ سیکنڈوں کی خاموشی کے بعد میں سرد لہجے میں بولا۔ ”مجھے کہاں آنا ہو گا؟“

”بیگم ولا۔“ دوسری طرف سے وزیر جان نے جیسے ایک دھماکا کر ڈالا۔

”بیگم ولا؟“ بے اختیار میرے منہ سے سوالیہ نکلا۔

”ہاں... کیوں... دھری رہ گئیں تمہاری ساری سوچی ہوئی چالاکیاں؟“ وزیر جان نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”لل... لیکن... بیگم ولا... وہ تو...“ مجھ سے آگے بولا نہیں گیا۔ میرے دل و دماغ میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی، پتا نہیں یہ وزیر جان میرے ساتھ کون سا گیم کھیل رہا تھا۔

”بیگم ولا سے تمہارا بھلا کیا تعلق بنتا ہے؟“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں خود اس کی بات پر چکرا کر رہ گیا تھا۔ دوسری جانب سے وزیر جان کا شیطانی قہقہہ برآمد ہوا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”کیوں شہزی؟ بڑی حیرت ہوئی تمہیں؟“

مجھے حیرت ہی نہیں بلکہ ذہنی جھٹکا بھی لگا تھا، تاہم بولا۔ ”کچھ خاص نہیں، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بیگم ولا میں میری تم سے ملاقات... کیا معنی رکھتی ہے؟“

”تم وہاں مجھ سے نہیں، زہرہ بانو... المعروف مختاری بیگم سے ملو گے اور اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرو گے، باہر کسی مقام پر خود ہی میرے آدمی تم سے ٹکرائیں گے اور تم دونوں بلا چون و چرا ان کا حکم مانو گے، وہ تم دونوں کو گاڑی میں بٹھا کر میرے پاس پہنچا دیں گے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔“ میں نے پُرقطعیت لہجے میں کہا۔ میری کنپٹیاں سنسنانے لگی تھیں۔

”سب کچھ ممکن ہے تمہارے آگے... شہزاد احمد خان۔“ وزیر جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”مت بھولو کہ ہمیں تمہارے بارے میں سب علم ہے۔ زہرہ بانو تمہارے ساتھ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئے گی۔“

”مگر اس سلسلے میں تمہاری معلومات بالکل صفر ہیں وزیر جان! کیونکہ میرا زہرہ بانو سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہو گا بھی کیوں؟ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ میں اب دھیرے دھیرے اپنے آپے میں آنے لگا تھا کیونکہ معاملہ شاید میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہو رہا تھا۔ وزیر جان عام آدمی نہ تھا، ایک بین الاقوامی سطح کی مجرم زمانہ تنظیم اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف تھا پھر میرا اور بیگم صاحبہ کا مشترکہ دشمن چودھری ممتاز خان تھا جو KATSA ایجنٹ کہلاتا تھا۔ بقول ثریا کے... اسپیکٹرم میں اس عہدے کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ ممتاز خان نے ہی میرے سلسلے میں ساری معلومات ایک بریفنگ کی صورت میں وزیر جان کو دی ہوں گی۔

تاہم میں نے وزیر جان کو جُل دینے کی کوشش کی تھی، وہ بولا۔

”شہزاد خان! فضول باتیں کر کے وقت ضائع ہی کرو گے تم... مت بھولو کہ ہمارے پاس اور بھی آپشنز ہیں مگر ہم معاملے کو زیادہ الجھانا نہیں چاہتے۔“

”دیکھو وزیر جان! جہاں تک میری ذات سے تعلق ہے، اس سلسلے میں تمہارے ساتھ تعاون کر سکتا ہوں مگر دوسرے کے بارے میں، میں مجبور ہوں۔“ میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ وہ بولا۔

”میں نے تم سے جو کہا، وہ تم نے یقیناً اچھی طرح سن اور سمجھ لیا۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ اب تم سے میرے ساتھی ملاقات کریں گے جن کے بارے میں تمہیں میں نے بتا دیا ہے۔ یہ آج اور ابھی کرنا ہو گا۔ اگر تمہیں اپنے سوالوں کے جوابات چاہئیں تو یہ سب کرنا ہو گا بصورت دیگر جہاں تمہارا باپ اندھیری کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے، تمہاری ماں کو بھی وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ آخری بات غور سے سن لو۔ تمہاری کسی قسم کی مہم جوئی کی بھنک پڑتے ہی یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا اس ڈیل کو غنیمت سمجھتے ہو تو آج میں اپنے ٹھکانے پر تمہارا اور زہرہ بانو کا منتظر ہوں۔“

”تم کہاں ہو اس وقت؟“ میرے منہ سے بے اختیار بے وقوفانہ سوال نکلا۔

”فضول سوال ہے یہ۔“ کہتے ہوئے وزیر جان نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا۔

شکیلہ اور اول خیر کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے ہک دک تھے۔ اس لیے کہ میں نے اس بار وزیر جان کی کال آتے ہی فون کا اسپیکر وائیڈ کر دیا تھا اور وزیر جان کی طرف سے ہونے والی گفتگو انہوں نے بھی سن لی تھی۔

”اوخیر کاکے! اسے تو لمبی کھیڈ پے گئی ہے۔“ اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

”یہ ناممکن ہے... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں خود اس رذیل کو تلاش کر کے رہوں گا۔“ میں بپھرے ہوئے لہجے میں بولا تو اول خیر نے کہا۔

”شہزی کاکے! اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ وزیر جان نے گھات لگائی ہے۔ تم نے اس کی بات پر غور نہیں کیا کہ اس کے آدمی تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں جو اسے تمہارے ایک ایک پل سے آگاہ کریں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم وزیر جان کی تلاش میں ٹاک ٹائیاں مارتے رہیں اور وہ کہیں ماں جی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“

”تو پھر کیا کروں میں؟ بیگم صاحبہ کو خود اپنے ہاتھوں سے اغوا کر کے اس خبیث کے حوالے کر دوں؟“ میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اوخیر... کاکے! میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اول خیر خفیف سا ہو کے بولا۔ میں نے بے اختیار ایک سرد سی آہ بھری۔

”پتا نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اپنی جس پیاری اور عزیز ہستی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ اتنا ہی دور ہونے لگتی ہے۔ اتنے عرصے بعد ماں جی اور باپ کا پتا چلا تو ان سے ملنا میرے لیے مشکل بنایا جا رہا ہے۔“ میری آواز بھرانے لگی۔ اول خیر نے میرا شانہ تھپتھپایا، بولا۔

”اوخیر... کاکے! تو ابھی سے دل چھوٹا کرنے لگ گیا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ حوصلہ کر میرے یار۔“ مجھے مغموم اور آزردہ خاطر دیکھ کر شکیلہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آن بیٹھی اور اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے بازو پر دھیرے سے رکھتے ہوئے ملائمت آمیزی سے بولی۔

”شہزی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم تو بڑے حوصلے والے تھے، یہ ایک دم کبھی کبھی تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ کبھی عزم و حوصلے کی چٹان نظر آتے ہو تو کبھی یکدم ریت کی دیوار۔“

"میرے یار شہزی کاکے کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے شکیلہ بہن۔" اول خیر نے ہلکی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔ "جب یہ جوش غیظ سے بھرا ہوتا ہے تو میں خود کان دبا کر سائڈ میں ہو جاتا ہوں... اور پھر یہ دشمنوں پر اس تیزی سے غلبہ پاتا چلا جاتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے تو میں خود ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔ خود میری اپنی زندگی بھی دشمنوں کے ساتھ مارا ماری میں گزری ہے۔ پر میں نے شہزی کاکے جیسا جوان مرد پہلی بار دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ مایوسی کا غلبہ عارضی اور فطری ہوتا ہے اس کا... کیوں کاکے؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟" وہ آخر میں مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے بولا تو بے اختیار میں ہنس پڑا۔

"او جیو میرے یار، زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہیں ان کو دل پر نہیں لینا چاہیے، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ ہم بیچ کا راستہ سوچ لیتے ہیں۔" مجھے اول خیر کی باتوں سے کچھ حوصلہ ملا، کچھ طمانیت بھی ہوئی، تاہم میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم کچھ بھی سوچو... مگر میں بیگم صاحبہ والی بات قطعی طور پر نہیں مان سکتا... نہ ہی میں ان سے ایسی کوئی بھیک مانگ سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرے چشم تصور میں کبیل دادا کا کینہ پرور چہرہ ابھر آیا اور اس کی تیر جیسی چبھتی ہوئی باتیں میری سماعتوں میں گونجنے لگیں۔

اول خیر نے مجھے پُرسکون رہنے کا مشورہ دیا اور شکیلہ سے چائے کا کہا۔ جب وہ چلی گئی تو اول خیر بھی اٹھا اور ذرا دیر میں لوٹنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا دونوں مجھے تنہائی کا موقع دے کر پھر مجھے پُرسکون کرنا چاہتے تھے مگر تنہائی میں تو ایک بار پھر میرے دل و دماغ میں پریشان کن سوچوں نے حملہ کر دیا تھا۔

کچھ دیر مزید اسی طرح گزری۔ پھر اول خیر آیا اور شکیلہ بھی چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ ہم تینوں چائے پینے لگے کہ فون کی بیل گنگنائی، کارڈلیس قریب ہی رکھا تھا میں نے ہی اٹھایا اور جب کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک شناسا نسوانی آواز ابھری تھی جسے سن کر میں ساکت ہو کے رہ گیا تھا۔

"شہزی! بڑے بے مروت نکلے تم... ایسے گئے کہ دوبارہ ہماری خبر بھی نہ لی تم نے؟"

یہ بیگم صاحبہ تھیں۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب مجھے بیگم صاحبہ کی مدد کی ضرورت تھی مگر میں ان سے کترا رہا تھا۔ خود ان کا ہی فون آ گیا... میں بری طرح الجھ کر رہ گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

"ایسی بات نہیں بیگم صاحبہ! بس کچھ حالات ایسے تھے کہ آپ سے بات کرنے کا بھی یارا نہ رہا۔" پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد ان کی خیریت پوچھی۔ "آپ کیسی ہیں بیگم صاحبہ؟"

"ویسی ہی ہوں جیسی چھوڑ کر گئے تھے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔ ان کے لہجے کی زماہٹ میں شکوہ تھا۔

"میں نے آپ کو کب چھوڑا تھا بیگم صاحبہ؟ آپ ہی نے ہمیں بے دخل کر دیا تھا۔" میں نے بھی شکوہ کر ڈالا۔

"میں نے صرف اول خیر کے بارے میں ایسا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے بارے میں تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"اول خیر کا مطلب میں ہی تھا بیگم صاحبہ! یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اول خیر تمہارے لیے ہم سے زیادہ حیثیت اختیار کر گیا ہے مگر ہم بھی مجبور تھے، بعض تنظیمی معاملات میں ہمیں اس سے بھی زیادہ تلخ فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ تو صرف دوری کا معاملہ تھا اور تم نے دل پر لے لیا۔"

"آپ نے کیسے فون کیا، خیریت؟" میں نے اس خشک موضوع سے درگزر کرتے ہوئے پوچھا تو دوسری جانب سے مجھے بیگم صاحبہ کی ایک آہ سے مشابہ گہری سانس بھرنے کی آواز سنائی دی پھر بولیں۔

"شہزی! تم ابھی میرے پاس آ سکتے ہو؟" میں ان کے سوال پر چونک گیا۔ یہ کیا بھید تھا؟ کیا تقدیر مجھے پھر ایسی راہ پر ڈالنے والی تھی جس سے منہ موڑ چکا تھا؟ اور ایک ایسی راہ جو میرے ذاتی مفاد سے تعلق رکھتی تھی کہ ایسے میں خود مجھے ان کے پاس جانے کی ضرورت تھی۔

"کوئی خاص وجہ بیگم صاحبہ؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔" وہ دھیرے سے بولیں۔ ان کی بات سن کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا اور میرے اندر اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ تاہم میں نے ذرا محتاط لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں شاید آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں بیگم صاحبہ کہ آپ کو مجھ سے ایسی کون سی مدد کی ضرورت پیش آ گئی جبکہ خود آپ کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں، پھر کبیل دادا جیسا آدمی آپ کا جاں نثار اور وفادار دستِ راست ہے۔"

"طنز کر رہے ہو مجھ پر؟" بیگم صاحبہ نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے فوراً نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! میں طنز نہیں کر رہا... قطعاً نہیں، کیا میری بات غلط ہے؟"

"غلط نہیں ہے لیکن شاید قسمت ہماری کچھ ایسی ہے کہ جس نے ہر بار ہم دونوں کو مشترکہ دشمنوں کے سامنے کھڑا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کیا چودھری ممتاز خان نے پھر کوئی نیا گل کھلایا ہے؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا تو چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد مختصراً بولیں۔

"ہاں۔"

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ "ایسا کیا کر دیا اس خبیث نے دوبارہ؟"

"ہمارا ایک اہم ترین آدمی یرغمال بنا لیا ہے اس نے... ہم نے اپنے ذرائع سے پتا چلا لیا ہے کہ ہمارا آدمی وزیر جان نامی ایک بڑے آدمی کے ٹھکانے پر موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے لاکھ کوشش کے باوجود ہم وزیر جان نامی اس آدمی کے خفیہ ٹھکانے کا پتا نہیں چلا سکے ہیں جہاں ہمارے آدمی کو یرغمال بنا کے رکھا گیا ہے۔"

میرے ذہن میں لاتعداد جھماکے ہونے لگے۔ یہ کیا اتفاق تھا کہ ایک بار پھر تقدیر میری یاوری اس طرح کر رہی تھی کہ میرے سوال کرنے سے پہلے بیگم صاحبہ نے مجھ سے وہ سوال کر ڈالا تھا جس کے آڑے میری خودداری مانع ہو رہی تھی۔ میرے اندر کوئی بولا۔ "اس کو تقدیر کا طرفہ تماشا کہتے ہیں شہزی کہ تمہاری مشکل خود ہی آسان ہو رہی ہے۔ یہ سنہری موقع خود ہی تمہارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے تم بیگم صاحبہ کی مدد کرو اور وہ تمہاری... مگر باوجود اس کے جانے کیا بات تھی کہ تقدیر کے اس اتفاق سے میرا دل "متفق" نہیں ہو رہا تھا۔ ایک کھٹک سی ہو رہی تھی مگر کیا؟

"شہزی! میں تم سے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ ایسے نازک وقت میں ہمیشہ تم ہی میرے کام آتے رہے ہو، کبیل دادا اور میرے کچھ خاص آدمی اس شہر میں نہیں ہیں۔ وہ میرے ہی ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہیں۔ انہیں اس کا علم ہی نہیں۔ اب تم ہی ایک میرے ایسے خیر خواہ ہو جو مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔ تم جانتے ہو اچھی طرح شہزی کہ میں اپنے آدمیوں کے معاملے میں کس قدر حساس اور ذمے دار ہوں۔ انہوں نے مجھ سے وفاداری کا دم بھرا ہے اور عملی طور پر اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اب میرے ایک آدمی کی جان پر بنی ہوئی ہے تو میں پیچھے کیسے ہٹوں، پلیز... شہزی! انکار مت کرنا۔" بیگم صاحبہ کا لہجہ ملتجی ہو رہا تھا۔ میرے دل میں... آئی کہ میں اپنا مسئلہ بھی بیان کر دوں اور یہ ضروری بھی تھا تاہم کچھ سوچ کر میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! میں آ رہا ہوں۔ آپ بیگم ولا میں ہی ہیں ناں اس وقت؟"

"ہاں، میں وہیں ہوں اور تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں آ رہے ہو ناں تم؟" وہ بڑے امید بھرے لہجے میں بولیں تو میں نے اثبات میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔

شکیلہ اور اول خیر بھی اس اتفاق پر خوش نظر آنے لگے مگر جانے کیوں مجھے خوشی سے زیادہ ایک بے نام سی بے چینی ہونے لگی۔ پتا نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔ چودھری ممتاز اور وزیر جان میرے ساتھ کون سی نئی چال چل رہے تھے یا پھر بیگم صاحبہ کی باتوں میں کوئی گہرا رمز تھا؟ بہرحال جو کچھ بھی ہو رہا تھا میری چھٹی حس کسی قسم کی طمانیت کا اظہار کرنے سے قاصر تھی۔ معاملہ پُراسرار اور گمبھیر تھا۔

میں اسی وقت کار میں سوار ہو کر کوٹھی سے روانہ ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ کوٹھی میں ہی تھے۔ یہ وزیر جان کی شرط تھی کہ میں اکیلا ہی سرمد بابا کی کوٹھی سے نکلوں اور اس کے آدمی لمحہ بہ لمحہ مجھے ٹریس کرتے رہیں گے۔ شکیلہ اور اول خیر نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہ تھی۔ کوٹھی سے نکلتے ہی میں مین ہائی وے پر آیا تو میری عقابی نظروں نے تیزی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ متوقع تعاقب کا علم مجھے پہلے سے تھا جو کہ بقول وزیر جان کے اس کا ایک طے شدہ عمل تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے جلد اپنے تعاقب میں آتی ہوئی ایک گاڑی دکھائی دے گئی، تصدیق کی خاطر میں نے اپنی کار بے مقصد دو تین جگہوں پر موڑی بھی تھی، وہ ایک نئے ماڈل کی بڑی بھاری بھرکم کار تھی اور اس کے اندر تین چار آدمیوں کی جھلک مجھے صاف نظر آئی تھی۔

گویا ان لوگوں نے وزیر جان کو، بقول اس کے اسے یہ رپورٹ بھی دے دی ہو گی کہ میں اس کے مطالبے کے عین مطابق کوٹھی سے نکل پڑا ہوں اور اب بیگم ولا کا رخ کیے ہوئے ہوں۔

بیگم ولا پہنچا تو وہاں مجھے پہچانتے ہی محافظ نے بڑا سا گیٹ کھول دیا۔ شاید اسے پہلے سے ہی میرے بارے میں ہدایات مل چکی ہوں گی۔ یہی سبب تھا کہ ولا کے کار پورچ میں رکتے ہی مجھے فوراً دو مسلح آدمیوں نے نہایت احترام کے ساتھ اندر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ نشست گاہ کا کمرا

بہ سال نہ تھا۔ جہاں اکثر ہم سب بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے بلکہ یہ کوئی اور کمرا تھا جو اوپری منزل پر نسبتاً الگ تھلگ گوشے میں بنا ہوا تھا۔ یہاں فرنیچر مختصر مگر نفیس تھا۔ کمرا بھی سادہ مگر دیدہ زیب دکھائی دیتا تھا۔ میں ایک صوفے پر براجمان ہوگیا۔ کمرے کا ماحول ہی نہیں بلکہ پورے ولا کی فضا پر عجیب سی خاموشی گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر گزری۔ پردہ ہٹا اور ایک دوسرے اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے سے بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ نہ جانے کیوں اتنے روز بعد انہیں دیکھ کر میرا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ مگر ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں چونکے بنا بھی نہ رہ سکا۔

ان چند دنوں کی میری بیگم صاحبہ سے دوری نے انہیں بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی کمزور نظر آرہی تھیں۔ کشادہ اور قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھوں کے گرد بھی سیاہ ہلکے پڑ گئے تھے۔ ان کی شہابی رنگت جو ہر سے مجھے اجلی اجلی سی نظر آتی تھی، اب اس میں زردی سی گھلی نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے ہلکے گلابی رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور دوپٹے کو بڑی نفاست سے آگے ڈالا ہوا تھا۔۔۔۔ میں احترام میں اٹھ کھڑا ہوا اور ہولے سے انہیں سلام کیا۔ وہ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے اور گہری نگاہوں سے میرے چہرے اور سراپا کو تکتے ہوئے میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئیں، ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیسے ہو شہزی؟'' انہوں نے مترنم سی آواز میں بدستور میری طرف تکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے ان کی آواز میں بھی ہلکا سا... بہت عجیب سا ارتعاش محسوس ہوا تھا۔۔

''میں ٹھیک ہوں مگر آپ پہلے سے کچھ کمزور نظر آرہی ہیں۔''

''ہاں، پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہی تھی مگر اب قدرے بہتر ہوں۔ تم تو ماشاء اللہ بالکل فٹ فاٹ نظر آرہے ہو؟'' وہ ہولے سے آخر میں یہ کہتے ہوئے مسکرائیں، ان کی ہلکی مسکراہٹ میں بھی لگاوٹ، محبت اور انسیت کی دیرینہ چمک نظر آئی۔ میں نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ ڈالی۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیا ہے؟''

ان کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹی ٹرے تھی۔ اس میں جوس کے دو گلاس رکھے تھے، وہ خاموشی سے قریب رکھی ہوئی پورنیبل پر ٹرے رکھ کے خاموشی سے پلٹ گئی۔ میری مستفسرانہ نظریں بیگم صاحبہ کے گہری سوچ میں مستغرق چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ابھی تو میرے ذہن میں ایسا کوئی لائحہ عمل نہیں، تمہاری مشکور ہوں کہ تم آج بھی میری کسی بھی مدد کرنے کی خاطر تیار رہتے ہو۔ میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ تم آؤ گے تو کوئی لائحہ عمل سوچیں گے۔''

بیگم صاحبہ کی بات پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ خود ایک بڑے گینگ کی سربراہ تھیں۔ بے شک اس وقت گبیل دادا سمیت اس کے کچھ خاص آدمی بقول ان کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان کی ہدایت کے مطابق دوسرے شہر میں تھے، مگر پھر بھی بیگم صاحبہ نے ابھی تک اپنے کسی خاص آدمی کو ممتاز خان یا وزیر جان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کوئی پیشگی منصوبہ بندی ہی نہیں کی تھی؟

اب میں اپنے بارے میں سوچنے لگا کہ کیا مجھے اپنا وہ مشترکہ لائحہ عمل بیگم صاحبہ کے گوش گزار کر دینا چاہیے جو سرمد بابا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میرے اور اول خیر کے بیچ طے پا چکا تھا؟ کیونکہ اول خیر نے مجھے بیگم ولا روانہ ہوتے وقت اس بات کی خصوصی تاکید کی تھی کہ میں بیگم صاحبہ سے تازہ صورتِ حال کے سلسلے میں کچھ نہ چھپاؤں اور انہیں آگاہ کردوں، یوں بھی خود میری اپنی بھی یہی مرضی تھی کہ بیگم صاحبہ کو کسی دھوکے میں نہ رکھوں لہٰذا پھر میں نے انہیں بھی اپنے تازہ ترین مسئلے اور وزیر جان کی گفتگو اور مطالبے کے متعلق سب بتا ڈالا۔

میرے ماں باپ کا سن کر بیگم صاحبہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا تاہم ان کے چہرے سے فکر و تشویش بھی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ اس بات سے اپنا دل برا نہ کیجیے گا کہ میں اپنے مفاد کی خاطر آپ کو کسی مشکل میں ڈالوں گا۔ یقین کریں جب اس خبیث وزیر جان نے میرے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ میں آپ خود نہیں بلکہ آپ کو بھی لے کر... ماں جی کے بدلے آپ کو ان کے حوالے کردوں تو نہ صرف ماں جی کو چھوڑ دے گا بلکہ مجھے میرے باپ کے متعلق بھی سب بتا دے گا تو یقین جانیے بیگم صاحبہ! میں نے اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا تھا۔ کیونکہ میرا ضمیر یہ کبھی گوارا نہ کرتا کہ میں آپ کو اپنی ذاتی غرض کی خاطر قربانی کا بکرا بناؤں۔''

''میں خود بھی جانتی ہوں شہزی کہ تم ایسا میرے ساتھ

تو کیا کسی غیر کے ساتھ بھی نہیں کرو گے۔'' میری بات کے اختتام پر بیگم صاحبہ نے فوراً کہا۔ ''تمہاری فطرت اور خودداری سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن شاید یہ ہونا بھی ضروری تھا اب دیکھو یہ اتفاق ہی تو ہے کہ عین اس وقت... مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت پیش آگئی اور اپنے ایک آدمی کے سلسلے میں میرا ٹکراؤ بھی وزیر جان سے لازمی ٹھہرا ہے۔ میرا خیال ہے قسمت نے ہم دونوں کو یہ ایک موقع دیا ہے کہ ہم آپس کی منصوبہ بندی طے کر کے مشترکہ طور پر دشمن کو زیر کریں۔ پھر میں یہی کہوں گی کہ تم ابھی بظاہر ویسا ہی کرو جیسا تمہیں وزیر جان نے کہا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد... اس سے نمٹ لیں گے۔''

''مگر بیگم صاحبہ! اس میں آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوگا؟ اور ماں جی کی بھی...'' بیگم صاحبہ رمزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''دیکھو شہزی! زندگی میں انسان کو بسا اوقات اپنی بقا کے لیے بڑے بڑے رسک اور خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ پھر ہم دونوں کی زندگی بھی کچھ ایسے ہی مخدوش اور نامساعد حالات سے گزری ہے، ویسے وزیر جان یا ممتاز خان کے لیے ہم اتنے تر نوالہ بھی ثابت نہیں ہوں گے کبھی کبھی دشمن کی چال میں آکر بھی اس کی چال اس پر ہی الٹ کر مات دینا پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں سے نکلتے ہی میرے آدمی خفیہ طور پر ہماری نگرانی کرتے رہیں گے اور اس کار کا تعاقب کریں گے جس میں ہم دونوں کو وزیر جان کے ٹھکانے پر لے جایا جائے گا۔''

''وزیر جان اتنا بے وقوف نہیں کہ اس کے ذہن میں یہ سب باتیں شبہات کی صورت میں پیدا نہ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ پہلے ہی ان عوامل سے واقف ہوگا اور اس کا تدارک بھی سوچ چکا ہوگا اس صورت میں اسے ذرا بھی ایسا کوئی شبہ ہوا تو صورتِ حال سنگین تر ہو جائے گی۔''

''تم نے پھر اس معاملے کو کس طرح سے حل کرنے کا سوچا ہے؟'' بیگم صاحبہ نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے تو یہی سوچا تھا بیگم صاحبہ کہ آپ کو اس خطرناک مشن میں شامل ہی نہ کروں لیکن آپ کے ساتھی کو بھی اس کی قید سے چھڑانے کا مسئلہ درپیش ہے کم و بیش میرا بھی یہی معاملہ ہے۔ ایسے میں وزیر جان نے مطالبہ بھی ایسا کر ڈالا کہ آپ کو لانے کی شرط میرے آگے ڈال دی۔ جو

انصاف

حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ فلاں شخص نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ پستہ قد تھا۔ امیر المومنینؓ نے از راہِ تفنن فرمایا کہ رسول خدا کا فرمان ہے کہ چھوٹے قد کے لوگ کسی سے دھوکا نہیں کھاتے ہیں اس لیے تو جھوٹ بول رہا ہے۔

''نبی کریمؐ کا فرمان برحق یا امیر المومنین! لیکن جس شخص نے مجھے دھوکا دیا ہے، اس کا قد مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

امیر المومنینؓ بے اختیار مسکرا دیے اور مدعا علیہ کو بلوا بھیجا۔

ایک سرمایہ دار اپنی سیکریٹری کو اس وعدے پر اپنے ساتھ اپنی بیوی کی حیثیت سے کاروباری دورے پر لے گیا کہ وہ واپس آکر اسے زیورات کا سیٹ خرید دے گا۔

واپسی پر جب کئی روز تک سرمایہ دار نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو سیکریٹری نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

''مجھے افسوس ہے ریشم بانو، میں کسی حسین ہمسفر کے بغیر کوئی کاروباری دورہ نہیں کرسکتا مگر میرے ساتھ مصیبت یہ ہے...'' اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور دوسرا سر پر اور بولا۔ ''جب میرا دل نرم پڑتا ہے تو دماغ سختی پر اُتر آتا ہے اور جب دماغ نرم ہوتا ہے تو دل کسی پتھر کی طرح سخت پڑ جاتا ہے۔''

سنگ دل خان کی سنگ دلی سنگا خیل سے

☆☆☆

کلاس ٹیچر نے پوچھا۔ ''بچو کیا تم بتا سکتے ہو کہ سانتا کلاز کہاں کا باشندہ ہے؟''

ایک آئرش طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''میرے خیال میں سانتا کلاز جرمنی کا رہنے والا ہے کیونکہ وہ کرسمس پر جتنے بھی کھلونے میرے لیے لے کر آتا ہے، ان سب پر ''میڈ ان ہانگ کانگ'' لکھا ہوتا ہے۔''

جارج کیچ کی خامہ فرسائی گجرات سے

اگرچہ مجھے ہرگز قبول نہ تھی۔ مگر اس دوران آپ کے اچانک فون نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اب وزیر جان کے ساتھ ایسی کوئی ''ٹرک'' کھیلنی چاہیے کہ بظاہر تو اسے سب کچھ ویسا ہی ہوتا نظر آئے مگر موقع ملتے ہی میں اسے جل دینے کی کوشش کروں۔''

''میں تمہارے اس لائحہ عمل سے سو فیصد متفق ہوں شہزی۔'' بیگم صاحبہ یک دم پورے جوش سے بولیں۔ ''تقدیر نے شاید ہمیں ایک سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک مشترکہ مفاد کے حصول کی خاطر پھر یکجا کردیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اب دیر نہیں کرو، مجھے اللہ پر بھروسا ہے اور تمہارے زورِ بازو پر بھی... سر پر تو ہم پہلے ہی اپنے کفن باندھے ہوئے ہیں پھر ڈرنا کیسا؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک عجیب سے جوش تلے میرا رُواں رُواں مرتعش تھا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے مزید کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دیا اور ایک نفیس سی شال نما چادر اوڑھ کر میرے ساتھ کار میں سوار ہوکر ولا سے نکل پڑیں۔

اب اصل اور خطرناک کھیل شروع ہونے والا ہے۔ آر یا پار... ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اس بھاری بھرکم نئے ماڈل کی کار نے ہماری کار کا راستہ روک لیا۔ یہ ڈبل روڈ ہائی وے کی نسبتاً ویران سی جگہ تھی۔ کار میں سے تین افراد بڑی سرعت کے ساتھ اترے۔ بظاہر اُن کے ہاتھ خالی تھے مگر اندر سے یقیناً مسلح تھے، معاملہ چونکہ طے شدہ ''حوالگی'' کا تھا اس لیے انہوں نے سرِدست ہتھیاروں کی نمائش کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایک کھردرے چہرے والے نے تحکمانہ درشتی کے ساتھ ہمیں کار سے اترنے کا کہا۔ میں اور بیگم صاحبہ خاموشی کے ساتھ کار سے نیچے اتر گئے۔ ایک نے بیگم صاحبہ کے بازو کو بیدردی سے دبوچنے کی کوشش چاہی تو میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''خبردار! کوئی زبردستی یا بدتمیزی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ سب رضاکارانہ طور پر ہو رہا ہے۔''

اس کے ساتھی نے پہلے والے سے کہا۔ ''ٹیک اِٹ ایزی، کوئی زبردستی نہ کرو۔''

اس کے بعد اس نے بیگم صاحبہ کا بازو چھوڑ دیا پھر ہمیں عقبی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ میرے ساتھ ایک کارندہ بیٹھا تھا۔ دو ڈرائیور سمیت اگلی نشستوں پر تھے۔ چوتھے نے میری کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوگئیں۔

☆☆☆

زندگی کیا ہوتی ہے، کس ڈھب پر چلاتی ہے، اس کا فیصلہ آنے والے وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نہ زیردست کو اس کا اندازہ ہوتا ہے، نہ ہی زبردست اپنی طاقت کے زعم میں اس کا ادراک کر پاتا ہے مگر پیش آئندہ... حالات اور وقت کا ایک اصول اپنی جگہ اٹل رہتا ہے۔ یعنی وقت کی کوکھ میں جلاد بھی پرورش پاتا ہے اور نجات دہندہ بھی... اب یہ حالات زدگان پر منحصر ہے کہ وہ کب اور کس وقت اپنی تیسری آنکھ سے اس کی پہچان کرتے ہیں۔

مجھے خود پر زعم نہ تھا اور بے شک گوناگوں حالات کی ہلچل نے ایک استاد کی حیثیت سے مجھے اپنی شاگردی میں قبول کیا بھی تھا مگر باوصف اس کے کسی نہ کسی انسان کے اندر قدرت کی طرف سے کچھ غیر معمولی صلاحیت ودیعت بھی کی ہوتی ہیں، وہ کیا ہوتی ہیں؟ اسے پہچاننا اسے بروئے کار لانا ایک لازمی شرط ہے۔ میرا تیزی سے سوچتا، کام کرتا ذہن تیسری آنکھ سے ہی اس امر فہم کو تلاش رہا تھا جو پی ایس ایس کے سابقہ ٹریننگ سینٹر کے آئی کیو لیول کا حصہ تھی کہ کب دشمن کی گرفت کو جانچ کر راہِ مفر پایا جاسکتا ہے؟ اور کب پزل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے کو درست مقام پر رکھنا ہے۔

میری کار میں ایک دشمن موجود تھا اور اکیلا ڈرائیو کررہا تھا۔ جس گاڑی میں مجھے اور بیگم صاحبہ کو سوار کرایا گیا تھا، اس میں ڈرائیور سمیت تین دشمن براجمان تھے جو یقیناً جدید ہتھیاروں سے لیس بھی تھے۔

سفر دھڑکتی پُراندیش خاموشی میں کٹ رہا تھا۔

گاڑیاں شہر کی حدود میں ہی تھیں۔ تاہم قدرے مضافات میں ایک مقام پر رک گئیں۔ میں نے کھڑکی سے گرد و پیش کا طائرانہ جائزہ لیا۔ سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ کیوں رکے تھے۔

''اب ان دونوں کے ہاتھ پشت کی سمت باندھ دو اور آنکھوں پر پٹی چڑھا دو۔'' دفعتاً اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ براجمان ایک دشمن نے اپنے ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ غالباً وہ اپنے تینوں ساتھیوں کو کمانڈ کررہا تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''ہم قیدی کی حیثیت سے وزیر جان کے پاس نہیں لے جائے جارہے ہیں، ہمارے بیچ ایک باضابطہ معاملہ طے ہوا ہے۔'' میرا لہجہ یکایک بپھر گیا۔ میں کسی صورت میں رسن بستہ اور ''اندھا'' ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میری بات پر

یکلخت اس آدمی نے پھرتی کے ساتھ ایک لمبی نال والا پستول نکال کر پیچھے ہاتھ اور گردن گھماتے ہوئے رخ میری پیشانی کی طرف کردیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''فضول بکواس نہیں چلے گی، ورنہ مجھے تمہیں ادھر ہی گولی ماردینے کا حکم ملا ہوا ہے۔'' اس کی حرکت اور جارحانہ عزائم رکھنے والی گفتگو نے میرا دماغ الٹ دیا اور پھر جیسے سب پتھ الٹ گیا۔ زانو پر رکھا پہلے میرا دایاں ہاتھ برق کی طرح گھونسے کی صورت میں اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ یقیناً اسے میری جانب سے ایسی جوابی کارروائی کی توقع نہ تھی۔ نتیجتاً لمبی نال والا سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ سے نکلا اور کار کی چھت سے ٹکرا کر میرے پیروں میں کہیں گرا۔ دائیں گھونسے کی حرکت کے گویا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے بائیں بازو کی کہنی بھی حرکت میں آئی تھی اور اپنے ساتھ براجمان کسمساتے دشمن کی ٹھوڑی پر اس کی بھرپور ضرب لگاتے ہوئے میں نے دو باتوں کا خیال رکھا تھا۔ نمبر ایک ضرب زوردار ہو۔ نمبر دو ضرب ایسی ہو کہ نہ صرف اس کی ٹھوڑی پر پڑے بلکہ اس کی گردن کو بھی جھٹکا لگے اور ایسا ہوا بھی۔ وہ اوغ کی آواز کے ساتھ ڈھیلا پڑ گیا جبکہ ڈرائیور نے بھی پلٹنے کی کوشش چاہی۔ میں تب تک قدرے جھک کر پائیدان سے پستول اٹھا چکا تھا۔

پستول ہاتھ میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے لیڈ کرنے والے کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ خاموش پستول کی دھڑکتی گولی نے اس کی کھوپڑی وحشیانہ حد تک چٹخا کر رکھ دی۔ ڈرائیور اپنا پستول نکال چکا تھا مگر اسے مڑ کر مجھ پر فائر کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میرے پستول کی خون ریز خاموشی ایک بار پھر ''زٹ'' کی آواز سے دھڑکی اور ڈرائیور کا دل آخری بار دھڑک کر بے حرکت ہوگیا۔ گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کردیا تھا۔ میرے برابر میں بیٹھا دشمن پہلے ہی میری کہنی کی تباہ کن اور ''دو عملی'' ضرب سے تقریباً ڈھے چکا تھا۔ میں نے بڑے آرام سے اس کے پہلو سے نال لگا کر اسے بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

بیگم صاحبہ کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے عقب میں مڑ کر بیک اسکرین کے پار دیکھا۔ چوتھا دشمن جسے اگلی گاڑی کے اندر ہونے والی ہلچل کی شاید ہلکی جھلک کا احساس ہوگیا تھا۔ پستول سنبھالے دروازہ کھولے میری کار سے اتر کر اسی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے شوٹنگ پاور کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے بیک اسکرین سے ہی نشانہ تاڑ کر لبلبی دبا دی۔ میرا خیال تھا چونکہ گولی ہدف پر پہنچنے سے پہلے کار کی بیک اسکرین کے شیشے سے ٹکرانے کی تو گولی میں تھرتھراہٹ پیدا ہونے کے باعث اس کے نشانے پر فرق پڑے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کا ہی نشانہ لیا تھا جو اس کے ہاتھ کو زخمی کرکے نکل چکا تھا پھر میں نہیں رکا اور بہ سرعت دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکا۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ کو دبوچے کراہ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دوڑتے پاکر اس نے گرے ہوئے پستول کو تلاش کرنا چاہا مگر تب تک میں اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

بیگم صاحبہ بھی دشمنوں کی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ میں نے آخری دشمن کی گردن دبوچ لی۔ وہ ڈیل ڈول میں مجھ سے کم ہی تھا۔ میرے غلبہ پانے پر وہ ذرا خوف آمیز تشویش کا شکار بھی ہوگیا تھا۔

''تم لوگوں کا کھیل ختم ہوچکا۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بتایا۔ ''تمہارے تینوں ساتھیوں کی خون آلود لاشیں گاڑی میں موجود ہیں۔ اب تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے خوفناک غراہٹ سے کہا۔

''تت... تم نقصان اٹھاؤ گے۔ ہم چیف کے رابطے میں ہیں۔'' اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں مجھے دھمکانا چاہا۔

''غلطی تمہارے ساتھیوں کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ معاہدے کی خلاف ورزی کررہے تھے۔ ہم تو اب بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتے ہیں مگر تمہارے ساتھی ہمیں اناغفیل کرنے کے چکر میں تھے۔'' میری چالاکی بروقت تھی جس نے اسے الجھا کے رکھ دیا۔

''آؤ، ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں تم ہمیں لے جانا چاہ رہے تھے۔'' میں نے پستول اپنا شرٹ کے اندر پینٹ کی بیلٹ میں اڑستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرگئی۔ میں نے اسے کار کی جانب بڑھنے کا کہا۔

''میں پہلے چیف سے بات کروں گا تازہ صورتِ حال کی رپورٹ دینا لازمی ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے بے پروا انداز میں کاندھے اچکا کر کہا۔ ''بے شک دو رپورٹ... میں تمہیں نہیں روکتا لیکن تمہیں کہنا وہی ہوگا اس سے جس کا میں تمہیں حکم دوں گا۔'' میں نے آخر میں سرسراتے لہجے میں کہا۔

''کک... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلایا۔ ''پہلے کار میں بیٹھو اور نکلو یہاں سے۔'' میں نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ناچار وہ کار کی طرف بڑھا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی جامہ تلاشی کے دوران میں نے اس کی جیب

سے برآمد ہونے والے رومال سے اس کے ہاتھ کا زخم باندھ دیا تا کہ کم از کم خون کا اخراج کسی حد تک کم ہو۔

بیگم صاحبہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی جبکہ میں دشمن ہرکارے کے ساتھ عقبی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

بیگم صاحبہ نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو میں نے دشمن ہرکارے سے کہا۔ ’’اب چیف کو فون کر کے بتاؤ کہ کسی نامعلوم افراد نے ہم پر فائرنگ کر دی تھی جس کے نتیجے میں تمہارے تینوں ساتھی ختم ہوگئے اور اب تم ہمیں رن بستہ حالت میں لے کر روانہ ہوگئے ہو۔‘‘

’’میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔‘‘ ہرکارے نے انکار کر دیا۔ ’’چیف کو شبہ ہو جائے گا پھر میری خیر نہیں ہوگی۔‘‘

’’خیر تو اب بھی تمہاری نہیں ہے۔ میں تمہاری موت تک کو مشکل بنا دوں گا اور اس ویرانے میں اذیتیں دے کر تمہیں جہنم واصل کر ڈالوں گا، سمجھے تم۔‘‘ میں نے خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں اسے تہدید کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر چیف اس کے علاوہ اپنے کسی ساتھی نے رابطہ کرے اور جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ کسی شبہے میں مبتلا ہو کر قبل از وقت اپنے کسی سفاکانہ عزائم پر عمل نہ کر بیٹھے، لہٰذا اس کے اپنے ہی ایک ساتھی کے ذریعے یہ جھوٹ بلوانا لازمی تھا۔

’’ہنھ... ٹھیک ہے مگر تم... وہاں پہنچ کر کیا خود کو چیف کے حوالے کر دو گے؟‘‘ اس نے کہا۔

’’ہاں، کیونکہ ہمارے درمیان خونریزی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ صرف اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ چلو اب وہی کرو جیسا میں نے کہا ہے۔‘‘

میں نے چالاکی سے کام لیا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کو چہرے کے قریب کر کے اپنے چیف وزیر جان سے رابطہ کیا۔ اس کی رسٹ واچ میں ٹرانسمیٹر تھا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے وزیر جان سے وہی کچھ کہہ ڈالا جس کا میں نے اسے حکم دیا تھا۔ میں دوسری طرف سے وزیر جان کی آواز کو نہیں سن پا رہا تھا لیکن ہرکارے کے بتانے اور جواب دینے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وزیر جان سخت طیش میں آگیا تھا۔ میرا دل ایک بار پھر کسی اندیشناک وسوسوں تلے دھڑکنے لگا۔ یہاں صورتِ حال نازک بھی ہو سکتی تھی۔ وہ خبیث صفت ابلیس... ماں جی کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ تاہم اتنا مجھے یقین تھا کہ اس بات کی اسے تسلی ہوگی کہ اس کے دونوں شکار یعنی میں اور بیگم صاحبہ اب بھی اس کے ایک ہرکارے کے قبضے میں ہیں۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی ہرکارے نے کہا۔ ’’وہی ہوا۔ چیف یہی سمجھ رہا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ تم نے مجھ پر قابو پا کے مجھے اس کے ساتھ خفیہ ٹھکانے پر چلنے کے لیے مجبور کیا ہوا ہے۔‘‘

اس کی بات سن کر میں غصے اور بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا پھر بولا۔ ’’دیکھا جائے گا۔ تم مطلوبہ راستے کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتے چلو ہم اُدھر ہی جانا چاہتے ہیں۔‘‘ پھر بیگم صاحبہ کو کار کی رفتار بڑھانے کا بھی کہہ ڈالا۔

ہرکارہ میرے حکم پر بلا چون و چرا عمل کر رہا تھا۔ شاید اس کے لیے یہی بہت تھا کہ ہماری منزل اب بھی وہی تھی جو اس کی تھی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہرکارے کو دوبارہ چیف کی کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف سے شاید وزیر جان نے اپنے ہرکارے سے مختصراً کچھ کہا تھا اور فوراً رابطہ منقطع بھی کر دیا تھا۔ میں چونکا۔ ہرکارے کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی، بولا۔ ’’چیف سمجھ چکا ہے کہ تم کون سی چال چل رہے ہو انہوں نے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا پیغام دیا ہے۔‘‘

’’کیسا پیغام؟‘‘ بے اختیار میرے منہ سے دھڑکتے الفاظ برآمد ہوئے۔

’’تمہاری کار میں ریڈیو ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’اسے آن کرو... ایک بڑی اہم خبر نشر ہو رہی ہے۔‘‘ ہرکارے نے کہا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ چہرہ تشویش سے سیاہ پڑ گیا۔ بیگم صاحبہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے فوراً ڈیش بورڈ میں نصب ریڈیو آن کر دیا۔

ملک بھر میں ایک چیختی چلاتی خبر دھواں دھار انداز میں نشر ہو رہی تھی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ بے اختیار بیگم صاحبہ نے کار کے بریک لگا دیے تھے۔ اور کار کے ٹائر سخ خراش آواز سے چرچرائے تھے۔ پھر کار ایک جھٹکے سے رک گئی تھی مگر مجھے کہاں ہوش تھا۔ خبریں جاری تھیں۔ مختلف تبصرے تجزیے بھی ہو رہے تھے۔ اس اہم ترین خبر سے دنیائے میڈیا میں بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے وجود سے جان ہی نہیں روح تک نکلی جا رہی ہو۔ دشمنوں نے ترپ کا آخری پتا بالآخر پھینک دیا تھا۔ بالکل اسی طرح... جیسے ایٹم بم پھینک دیا ہو۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

بے خطا

آصف ملک

ادھورے کاموں کی تکمیل از حد ضروری ہوتی ہے... خصوصاً ان لوگوں کے نزدیک جو وقت اور کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں... وہ ماہرِ فن تھا... کام کی نوعیت اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے پہلی ترجیح دیتا تھا... لیکن اس بار اس کے ساتھ وہ کچھ ہو رہا تھا... جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا...

کام ادھورا نہ چھوڑنے والے تجربہ کار ہنرمند کی کارگزاری...

الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ اگرچہ اس کا سر گھوم رہا تھا اور زبان کا ذائقہ بے حد خراب تھا کیونکہ وہ رات دو بجے تک ایک بار میں تھا اور چار بجے تک ایک کال گرل کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہا۔ فلیٹ میں وہ وسکی کی بوتل سے شغل کرتا رہا جو وہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ پانچ بجے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں آ کر بستر پر گرا تو آٹھ بجے الارم نے اسے اٹھا دیا۔ اس کا دل چاہا کہ پھر لیٹ جائے مگر وہ عادت سے مجبور تھا اس لیے ڈولتے سر کے ساتھ وہ واش
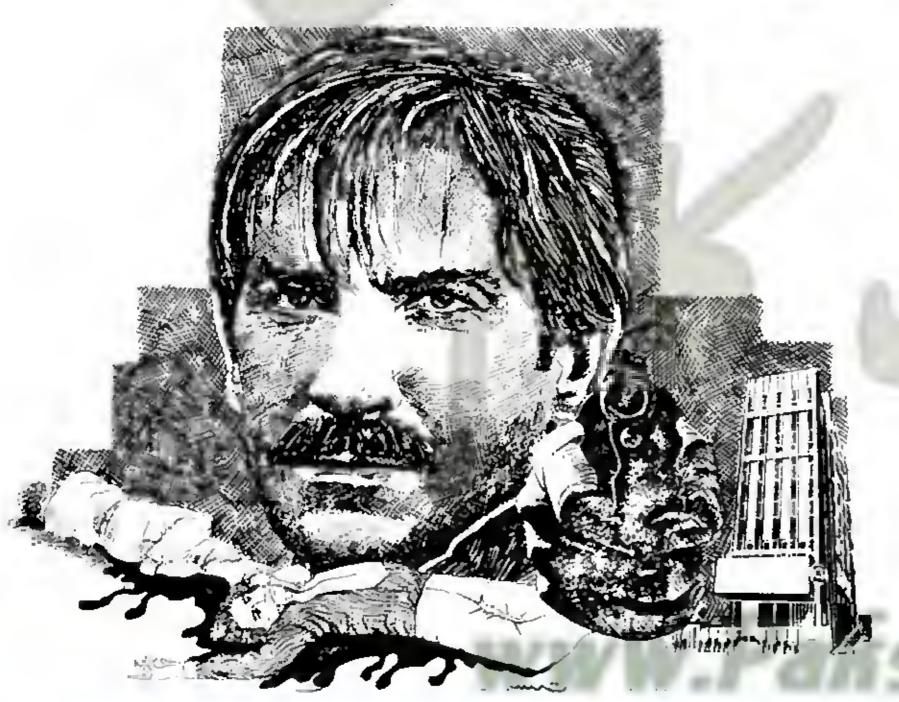
روم میں آیا اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ سرد پانی نے اسے ہوشیار کیا اور پھر گرم پانی نے اس کے سر کا درد خاصی حد تک کم کر دیا۔ وہ واش روم سے نکلا تو اس کی حالت خاصی بہتر تھی۔ وہ ایکسر سائز والے کمرے میں آیا۔ یہاں شیشے کی دیوار سے شکاگو اور اس کے پارکس کا منظر بہت واضح تھا۔ اس کمرے میں ایکسر سائز کی تمام مشینیں تھیں۔ اس نے رننگ مشین سے آغاز کیا اور ایک گھنٹے بعد وہ یہاں سے نکلا تو اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

دوسری بار شاور لے کر وہ کچن میں آیا اور اس نے انڈے ابلنے کے لیے رکھ دیے۔ فریج سے اورنج جوس نکالا۔ جب تک اس نے جوس ختم کیا، انڈے بوائل ہو گئے۔ اس نے ان کے چھلکے کیے اور کالی مرچ اور ہلکا سا نمک چھڑک کر کھانے لگا۔ بین ہلکی تراشی ہوئی داڑھی اور کسی قدر کھردرے نقوش والا عام سا شخص تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا مگر جب وہ پورے کپڑوں میں ہوتا تو اس کی جسامت بھی عام سی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ذاتی خواہش اور کوشش بھی یہی تھی کہ وہ عام سا آدمی نظر آئے۔ جب وہ کام پر جاتا تو اوور آل قسم کا لباس پہن لیتا جیسا کہ عام طور سے الیکٹریشن یا پلمبر پہنتے ہیں۔ تاثر پورا رکھنے کے لیے وہ بیگ بھی ساتھ رکھتا جس میں عام طور سے اوزار ہوتے ہیں۔

بین کے بیگ میں یہ اوزار ذرا دوسری قسم کے ہوتے تھے۔ جیسے سائلنسر لگا ہوا پستول، خوفناک فوجی خنجر اور اُسترے کی طرح تیز چھوٹا چاقو وغیرہ۔ بین پیشہ ور قاتل تھا اور اس کی شہرت اچھی تھی۔ عام طور سے زیرِ زمین دنیا میں اسے بے خطا کہا جاتا تھا کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کا کوئی شکار بچ نکلا ہو۔ ہر پیشہ ور قاتل کی طرح اس کا ایک ایجنٹ تھا جو فرنٹ پر ہوتا تھا وہی اس کے لیے گاہک تلاش کرتا اور معاملات طے کرتا تھا۔ بین کا معاوضہ کم سے کم ایک لاکھ ڈالرز تھا مگر اس نے شکار کی مناسبت سے دو لاکھ ڈالرز بھی لیے ہوئے تھے۔ معاملہ اس طرح سے طے ہوتا تھا کہ اس کا ایجنٹ گارمین فری اسے معاوضے کی پوری رقم اور شکار کے بارے میں تمام تفصیلات بذریعہ کوریئر بھیجتا تھا۔ اگر بین راضی ہوتا تو یہ چیزیں رکھ لیتا ورنہ گارمین کو واپس بھیج دیتا۔

مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا جب وہ کسی کام پر راضی نہ ہو۔ اس نے اپنے کچھ اصول وضع کیے ہوئے تھے۔ اول وہ نابالغ کو قتل نہیں کرتا تھا۔ کسی کنواری لڑکی کو بھی قتل نہیں کرتا تھا اسی طرح وہ ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر کی عورت کو بھی قتل نہیں کرتا تھا۔ مردوں کے لیے کوئی تخصیص نہیں تھی۔ سولہ سال سے لے کر سو سال تک کی عمر کے مردوں کو قتل کرنے میں اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے اس سے بھی غرض نہیں ہوتی تھی کہ قتل کرانے والا کیوں قتل کرا رہا ہوتا تھا۔ اسی طرح اسے مرنے والے کے گناہ یا بے گناہی سے بھی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ ایک وقت میں وہ ایک ہی کیس لیتا تھا۔ کیس لینے کے بعد وہ اپنے شکار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتا اور پھر پورا پلان بنا کر اسے ٹھکانے لگا دیتا۔

ناشتا کر کے وہ تیار ہو کر اپارٹمنٹ سے باہر آیا۔ اسے کچھ خریداری کرنی تھی۔ پھر اسے کوریئر سینٹر.... بھی جانا تھا۔ گارمین نے اسے ای میل کی تھی کہ اس نے پارسل بھیج دیا ہے۔ گارمین کی طرف سے آنے والا پارسل اس کے اپارٹمنٹ پر نہیں آتا تھا۔ اس کے پتے سے گارمین بھی ناواقف تھا۔ وہ پہلے کوریئر سینٹر آیا اور اپنا نام بتا کر اس نے پارسل طلب کیا۔ کاؤنٹر گرل اسے جانتی تھی۔ یہ بڑی پیاری سی اور گول مٹول لڑکی تھی۔ جب وہ ہنستی تو اس کا پورا جسم ہلتا تھا اور وہ اکثر ہنستی تھی۔ اس نے ایک دس بارہ انچ کا لفافہ اس کے سامنے رکھا اور بے تکلفی سے بولی۔ ”مسٹر شیلڈ (پارسل اسی نام سے آتا تھا) اس بار تم بہت دن بعد آئے۔“

”کیونکہ پارسل نہیں آیا تھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب پارسل آیا ہے تو میں لینے آیا ہوں۔“

”یہاں سائن کر دو۔“ لڑکی نے لفافے پر لگی رسید میں ایک طرف اشارہ کیا اور جب بین نے سائن کر دیے تو اس نے رسید پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لی۔ بین نے دس ڈالرز کا ایک نوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور لفافہ لے کر باہر آیا۔ اس نے نزدیکی اسٹور سے کچھ خریداری کی اور واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ اگرچہ اسے نصف کلو میٹر دور آنا پڑا تھا مگر اس نے گاڑی نہیں لی۔ وہ کبھی پارسل لینے کے لیے گاڑی میں نہیں آتا تھا۔ اس کام میں برسوں گزرنے کے بعد بھی وہ روزِ اول کی طرح محتاط تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کم بختی اچانک آتی ہے اور بتا کر نہیں آتی ہے اس لیے آدمی کو خود ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ ہمیشہ آتے جاتے ہوئے آس پاس نظر رکھتا تھا اور ذرا سا شک ہونے پر وہ اس وقت تک آگے نہیں بڑھتا تھا جب تک اس کا شک رفع نہ ہو جائے۔ ویسے آج تک اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس وقت بھی وہ

محتاط تھا۔ اپنے علاقے میں اس کی لوگوں سے ہیلو ہائے تھی کیونکہ وہ سب سے خوش مزاجی سے ملتا تھا مگر ایک حد میں رہ کر۔ یہی وجہ تھی کہ سب اسے جانتے تھے مگر کوئی اس کے گھر نہیں آتا تھا۔

اپارٹمنٹ آ کر اس نے پہلے سامان ترتیب سے اپنی اپنی جگہ رکھا اور پھر فریج سے بیئر کی بوتل نکال کر سٹنگ روم میں آیا۔ اس نے پیپر نائف سے لفافہ کھولا۔ اندر سے سیلوفین میں لپٹی ہوئی دس ہزار ڈالرز والی بارہ گڈیاں نکلی تھیں۔ سیلوفین نے انہیں ایک ترتیب میں کر دیا تھا جیسے ڈاک ٹکٹ کا سیٹ ہوتا ہے۔ اس نے سیلوفین ایک طرف رکھا اور لفافے سے نکلی بڑے سائز کی تصویر اٹھائی۔ یہ آٹھ بائی دس کی تصویر تھی اور یقیناً بہت اچھے ایچ ڈی کیمرے سے لی گئی تھی۔ تصویر میں گول چہرے، کسی قدر بڑھے گھنگھریالے بالوں اور فرنچ کٹ کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے۔ اس نے نیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر سرخ تھا اور اندر سفید قمیص تھی۔ اس کے ہاتھ میں قیمتی گولڈ واچ تھی اور بائیں ہاتھ کی چوتھی انگلی میں خاصے بڑے سائز کے ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں تیز چمک تھی۔

اپنے لباس اور انداز سے وہ متمول لگ رہا تھا۔ بین نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تصویر پلٹ کر دیکھی تو اس کے پیچھے اس شخص کا نام ایڈم لیفلک لکھا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے کیمسٹ تھا اور اس کا کیمیکلز کا بزنس تھا مگر گارمین نے چھوٹے سے بریکٹ میں (منشیات فروش) لکھا تھا۔ اس کا پتا شکاگو کے بزنس سینٹر کی ایک عمارت کا تھا۔ وہ اس کی چوتھی منزل کے تقریباً پورے فلور پر مشتمل اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اکیلا تھا مگر عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے اس کے آس پاس ہمہ وقت دو تین حسین عورتیں پائی جاتی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ اکیلا نہیں تھا۔ مگر بین کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ کوئی بچہ یا گھریلو عورت اس کے آس پاس نہیں تھی۔ ایڈم کے چار عدد ذاتی باڈی گارڈز تھے جو ہمہ وقت اس کے ساتھ ہوتے تھے اور اس کے اپارٹمنٹ میں ہی رہتے تھے۔ صرف بیڈ روم میں داخل نہیں ہوتے تھے ورنہ اپارٹمنٹ کے کسی اور حصے میں یا باہر جانے کی صورت میں وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔

بین کے خیال میں ایسے شخص کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار ڈالرز کا معاوضہ کم تھا۔ وہ خطرناک شخص تھا اور اسے قتل کرنا یقیناً آسان نہیں تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے بین نے راضی نہ ہونے کی صورت میں لفافہ واپس کرنے کے بجائے ایک نیا طریقہ نکالا تھا کیونکہ لفافہ واپس کرنے کی صورت میں بھی وہ اضافی معاوضے کے ساتھ واپس آ جاتا اور وہ لفافے کی زیادہ آمد و رفت نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے معاوضہ کم ہونے کی صورت میں وہ گارمین کو اضافی معاوضے کی ای میل کرتا تھا اور گارمین ای میل سے ہی اسے کنفرم کر دیتا تھا۔ گارمین دس فیصد کمیشن لیتا تھا اور معاوضہ بھیجنے سے پہلے وہ اپنا کمیشن پہلے ہی کاٹ لیتا تھا اگر کیس واپس کیا جاتا تو وہ کمیشن بھی واپس کر دیتا تھا۔ اس نے گارمین کو ای میل کی اور معاوضہ پونے دو لاکھ ڈالرز کرنے کو کہا۔ اس کا لیپ ٹاپ اور اس میں ای میل اکاؤنٹس مستقل آن رہتا تھا اس لیے جیسے ہی گارمین کا جواب آتا، اسے علم ہو جاتا۔

ابھی وقت تھا بین نے اپنے لیے لنچ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ زیادہ تر گھر میں کھاتا پیتا تھا۔ برسوں سے خود ہی کھانا بناتے ہوئے اب وہ ماہر کک ہو گیا تھا اور اس کی بعض ڈشز ایسی ہوتی تھیں جو کسی مقابلے میں رکھی جا سکتی تھیں۔ مگر اس نے آج تک کھانا بنانے کے کسی مقابلے میں شرکت کا سوچا نہیں تھا کہ یہ بلاوجہ مشہور ہونے والی بات ہو جاتی۔ اس کے پیشے میں شہرت سے زیادہ مہلک چیز اور کوئی نہیں تھی۔ کسی کیس کے دوران وہ کوشش کرتا کہ کم سے کم لوگوں سے سامنا ہو اور کوئی اس کا چہرہ یاد رکھنے نہ پائے۔ عام طور سے وہ سر پر جھکی ہوئی پی کیپ لیتا تھا جس سے اس کا ماتھا اور آنکھیں چھپ جاتی تھیں۔ اس کے گلے میں بندھا ہوا رومال ہوتا تھا اور ضرورت پڑنے پر وہ اسے کھینچ کر ناک تک کر لیتا تھا۔ اس کا لباس ہلکا نیلگوں ہوتا تھا اور پیروں میں عام قسم کے کریپ سول والے جوتے ہوتے تھے۔ یہ اسے مدد دیتے تھے۔ وہ دستانے پہن کر رکھتا کہ کہیں غلطی سے بھی فنگر پرنٹ نہ رہ جائے۔

حسبِ توقع گارمین نے ہاں کر دی اور باقی معاوضہ اسے چوبیس گھنٹے میں پہنچانے کا کہا تھا مگر ساتھ ہی اس نے بتایا کہ کام آنے والے چار دن میں ہو جانا چاہیے۔ ایک طرح سے یہ ارجنٹ کام تھا۔ بین کے ماتھے پر شکن آ گئی۔ اس نے نارمل معاوضہ طلب کیا تھا مگر اس کے ساتھ ارجنٹ کام بھی شامل کر دیا۔ اس نے گارمین کو پھر ای میل کی کہ اس

صورت میں معاوضہ دولاکھ ڈالرز ہوگا۔ ورنہ ارجنٹ کی شرط ہٹادی جائے۔ اس کا جواب ایک گھنٹے بعد آیا کہ ارجنٹ کی شرط نہیں ہٹ سکتی البتہ پارٹی دولاکھ ڈالرز دینے کو تیار ہے۔ ای میل پڑھتے ہوئے بین کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ اب وہ ارجنٹ کام کے لیے بھی تیار تھا۔

سب سے پہلے اس نے جائے وقوع کا جائزہ لیا۔ یہ تیس منزلہ عمارت پرانی تھی مگر اس کی مضبوطی اور خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ شکاگو کی ان چند اولین عمارتوں میں سے تھی جنہیں چکنی ٹائلوں سے ڈھکا گیا تھا اور جہاں ٹائلیں نہیں تھیں وہاں شیشے لگے تھے۔ اس کے نچلے دو فلور پارکنگ کے لیے مخصوص تھے اور کیونکہ یہاں رہنے والے تمام ہی افراد بہت دولت منداور اوپری طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے عمارت کی سیکیورٹی سخت تھی۔

اسی دن شام کے وقت وہ شکاگو بزنس سینٹر کی ایک سرکاری عمارت میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں ملازمین چھٹی کرکے رخصت ہورہے تھے۔ بین نے چھپنے کی ایک جگہ تلاش کرلی اور اس وقت تک چھپا رہا جب تک تمام ملازمین کے جانے کے بعد گارڈز نے عمارت کو رسمی طور پر دیکھ کر اسے بند نہیں کردیا۔ وہ اپنی جگہ سے نکلا اور اس شعبے میں آیا جہاں بزنس سینٹر کی عمارتوں کا ریکارڈ تھا۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور چند منٹ میں مذکورہ عمارت کا تھری ڈی نقشہ نکالیا۔ اس نے یہ نقشہ اپنی یو ایس بی میں منتقل کیا اور کمپیوٹر بند کرکے وہاں سے اپنی آمد کے نشان مٹا کر باہر آگیا۔ اس نے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والے زینوں سے نکل کر برابر والی گندی گلی کا رخ کیا اور وہاں سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگیا۔ عمارت کا تھری ڈی نقشہ ایک مخصوص سافٹ ویئر میں چلا کر دیکھا اور چند منٹ میں اس نے طے کرلیا کہ اسے ایڈم کے اپارٹمنٹ تک کیسے رسائی حاصل کرنی ہے۔ یہی نہیں اس نے یہ بھی طے کرلیا کہ اسے کہاں نکلنا ہوگا۔

عمارت کے تھری ڈی نقشے نے کام بہت آسان کردیا تھا۔ اب وہ باقی منصوبے پر عمل درآمد کرنے لگا۔ اس نے نیٹ سے جے اینڈ جے کلینرز کا لوگو ڈاؤن لوڈ کیا اور اسے پرنٹر کی مدد سے چپکنے والے پلاسٹک پیپر پر پرنٹ کیا۔ یہ لوگو وہ اپنے خاص کام کے لیے مخصوص سفید پک اپ وین کی سائڈ پر لگا سکتا تھا۔ اس قسم کی وین کام والے استعمال کرتے تھے۔ اگلے دن بھی اس نے عمارت کی نگرانی کی اور اندر صفائی کرنے والے ایک بوڑھے سیاہ فام ہانگو سے دوستی کرلی۔ اس کام میں اسے خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ بوڑھا ہانگو چھٹی کرکے جب واپس جارہا تھا تو بین نے اسے لفٹ دی اور پھر گپ شپ کے دوران میں اسے بار چلنے کی دعوت دی۔ ہانگو باتوں کا شوقین تھا۔ خالص وہسکی کے دو پیگ حلق سے اترنے کے بعد وہ چہکنے لگا اور بنا پوچھے ہی اس نے عمارت کے مکینوں کے قصے سنانا شروع کردیے۔ اس کا زیادہ زور وہاں رہنے والی حسین عورتوں اور ان سے متعلق مشہور قصوں پر تھا۔

بہ مشکل بین اسے ایڈم ایفلک پر لایا اور ہانگو نے اس کی برائیاں شروع کردیں۔ اس کے مطابق ایڈم جتنا دولت مند تھا اتنا ہی کنجوس اور اس سے کہیں زیادہ نسل پرست تھا۔ وہ سیاہ فاموں کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے اور عمارت میں کام کرنے والے دوسرے سیاہ فاموں کو نوکری سے نکلوا دیتا۔ وہ درشت اور سخت تھا۔ اس کے آدمی اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ اگرچہ وہ کھل کر بدمعاشی نہیں کرسکتے تھے مگر بدمعاشی کا اشتہار ضرور بنے رہتے تھے۔ غیر ضروری طور پر اسلحے کی نمائش کرتے اور آس پاس رہنے والوں کو ہراساں کرتے مگر جب کوئی پولیس کو شکایت کرتا اور وہ انکوائری کے لیے آتی تو ایڈم اور اس کے آدمی یوں شریف بن جاتے جیسے کبھی بدمعاشی کے پاس بھی نہ پھٹکے ہوں۔ ایڈم کے اپارٹمنٹ میں آئے دن پارٹیاں ہوتی تھیں جن میں آنے والی عورتیں اپنے اطوار سے پیشہ ور لگتی تھیں اور ان کے ساتھ آنے والے مرد چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔

ان پارٹیوں میں بے تحاشا شراب پی جاتی اور عیاشی کے دوسرے لوازمات کھل کر استعمال ہوتے تھے کیونکہ اگلے دن ہانگو اور اس کے ساتھ کچرا سمیٹتے تو اس میں شراب کی درجنوں خالی بوتلیں اور دوسری اشیا ہول سیل میں ہوتی تھیں۔ ہانگو نے بین کو بتایا کہ وہاں آنے والے انسان سے زیادہ جانور لگتے تھے۔ وہ بے تحاشا کھاتے، بے تحاشا پیتے اور بے تحاشا عیاشی کرتے تھے۔ کیونکہ اگلی صبح ایڈم کے اپارٹمنٹ سے ان کی الٹیوں اور گندگیوں سے بھرے ہوئے شاپر نکلتے تھے۔ ان میں سے اکثر جب روانہ ہوتے تو انہیں اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہانگو اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف آگیا تھا اور بین صبر کے ساتھ اسے اپنے کام کی باتوں کی طرف لا رہا تھا۔ بالآخر اس نے کام کی بات معلوم کرلی کہ عمارت میں کسی قسم کی پارٹی سے دو دن پہلے عمارت کے منیجر کو بتانا پڑتا تھا تاکہ وہ صفائی، سیکیورٹی اور پارکنگ کے انتظامات کرلے۔ یوں آنے والے مہمانوں کو سیکیورٹی اور پارکنگ کے لیے الگ سے اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پارکنگ میں ایک جگہ ایسے مہمانوں کے لیے ریزرو تھی۔

”اگر منیجر کو دو دن پہلے اطلاع ملتی ہے تو وہ اپنے عملے کو بھی پہلے بتاتا ہوگا۔“

ہانگو نے سر ہلایا۔ ”وہ ایک دن پہلے خبردار کرتا ہے۔“

”یعنی اگر کل پارٹی ہو تو آج تمہیں پتا چل جائے گا۔“

”بالکل ورنہ اگر ہمیں چھٹی چاہیے ہو تو ہم ایک دن پہلے بتاتے ہیں، پارٹی کی صورت میں کسی کو چھٹی نہیں ملتی ہے۔“

ہانگو کی بات سے واضح تھا کہ کل ایڈم کے اپارٹمنٹ میں کوئی پارٹی نہیں تھی۔ یعنی وہ کل اپنا کام مکمل کرسکتا تھا۔ گارمین کی طرف سے اسے اضافی اسی ہزار ڈالرز مل گئے تھے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ آنے والے سرما سے پہلے فلوریڈا کی طرف روانہ ہوجائے گا اور کوشش کرے گا کہ سارا سرما وہیں گزارے۔ اگر درمیان میں کوئی کام آگیا تو وہ واپس آکر کام کرے گا اور پھر دوبارہ فلوریڈا چلا جائے۔ وہاں اس نے ساحل کے ساتھ ایک خوب صورت ہٹ خرید رکھا تھا اور جب فلوریڈا جاتا تو وہیں قیام کرتا تھا۔ ہٹ کی وجہ سے اس کے ہوٹلوں کے بے پناہ اخراجات بچ جاتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہتا تھا۔ ہوٹل میں خود کو لوگوں سے دور رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، کم سے کم عملے سے واسطہ پڑتا ہے۔

بین مزے سے ہٹ میں رہتا تھا۔ سامنے خوب صورت سفید ریت والا ساحل تھا جس کے آگے نیلگوں سمندر تھا اور وہاں آنے والے کسی نہ کسی آزاد خیال خاتون یا لڑکی سے بین کی دوستی ہوجاتی تھی اور وہ بنا کسی خاص خرچ کے نسوانی قربت بھی حاصل کرلیتا تھا۔ وہاں شب و روز اپنی مرضی سے گزارتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو وہ میامی کے کسی نائٹ کلب میں چلا جاتا یا کسی کال گرل کو ہائر کرلیتا تھا۔ شکاگو میں وہ مجبور تھا، ایک حد سے زیادہ کھل کر عیاشی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہاں اپنی رہائشی عمارت میں اس نے ساکھ بنائی ہوئی تھی۔ وہ آج تک کسی لڑکی کو یہاں نہیں لایا تھا۔

بین نے کبھی شادی نہیں کی۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ شادی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے خیال میں انسان شیطان سے بھی کچھ چھپا سکتا ہے لیکن بیوی ایسی ہستی ہے جس سے وہ کوئی راز کی بات نہیں چھپا سکتا اور ایک بار اس کی بیوی جان جاتی تو دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہتا۔ اس لیے اس نے شادی نہیں کی۔ ہاں اس نے یہ سوچا تھا کہ چالیس سال کی عمر تک اگر اس نے اتنی رقم جمع کرلی کہ اپنا کاروبار کرسکے تب وہ یہ دھندا چھوڑ دے گا اور ممکن ہے اس وقت وہ شادی بھی کرلے۔ مگر ابھی وہ اڑتیس برس کا تھا اور چالیس کا ہونے میں دو سال باقی تھے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر اس نے پیشہ چھوڑا تو وہ اپنا حلیہ بدل لے گا۔ جیسے کلین شیو ہوجائے گا اور ممکن ہے کوئی ہلکی پھلکی سرجری بھی کرالے۔ اس کا کھردرا چہرہ درست ہونے کے بعد اس کے لیے کسی معقول عورت سے شادی کرنا بھی آسان ہوجائے گا مگر اس میں ابھی وقت تھا۔

☆☆☆

بین سوکر اٹھا تو اس کا سر درد کررہا تھا کیونکہ اس نے گزشتہ صبح سے الکوحل نہیں لی تھی اور اس وقت اسے شدت سے شراب کی طلب ہورہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھا تو شاور کے ارادے سے ہی تھا مگر اس نے خود کو فریج کے سامنے پایا۔ اس نے اندر سے بیئر کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کردیا تھا۔ ایک بوتل خالی کرکے اسے ذرا سکون محسوس ہوا اور اس کے سر کے درد میں کمی آئی۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ بیئر میں الکوحل معمولی مقدار میں ہوتی ہے۔ اسے نشہ نہیں ہوگا اور وہ خود پر قابو رکھے گا۔ بین کی عادت تھی کہ کام سے چوبیس گھنٹے پہلے الکوحل نہیں لیتا تھا مگر آج اس نے یہ معمول بدل ڈالا تھا۔ پولیس بھی تو اسی صورت میں روکے گی جب اسے شبہ ہو کہ ڈرائیو کرنے والا نشے میں ہے۔ جب وہ نشے میں ہوگا ہی نہیں تو پولیس بھلا اسے کیوں روکے گی۔ ان ہی سوچوں کے دوران میں اس نے دوسری بوتل خالی کی اور اس سے اس کی حالت اتنی بہتر ہوگئی کہ اس نے گرم پانی کے بجائے سرد پانی سے غسل کیا اور جب واش روم سے باہر آیا تو خود کو بہت تازہ دم محسوس کررہا تھا۔

اسے تعجب ہوا کہ اس نے بلا وجہ کا احمقانہ اصول بنا رکھا تھا کہ کام سے پہلے الکوحل سے گریز کرنا ہے۔ اس نے خود کو کبھی کام پر جانے سے پہلے اتنا اچھا محسوس نہیں کیا تھا جتنا

کہ اس وقت کر رہا تھا۔ اسے ناشتے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے ناشتا ملتوی کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ مشن سے کامیاب واپسی پر وہ ڈٹ کر لنچ کرے گا۔ اس نے گنگناتے ہوئے اپنا بیگ چیک کیا اور اس دوران میں اس نے بیئر کی مزید ایک بوتل اور وہسکی کا ایک پیگ لیا تھا۔ یہ اچھی خاصی شراب تھی مگر اسے یقین تھا کہ وہ نشے میں نہیں ہے۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا اور بیگ وین کے عقبی حصے میں رکھ کر روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک ویران جگہ رک کر اس نے جے اینڈ جے کا لوگو وین پر لگایا اور پھر اس کی نمبر پلیٹس تبدیل کیں۔ یہ کام نمٹا کر وہ آگے روانہ ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ عمارت کی پارکنگ کے دروازے پر تھا۔ گیٹ کیپر نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اس نے جے اینڈ جے کا لوگو دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ وہ یقیناً بیریئر ہٹانے والا بٹن دبانے جا رہا تھا کہ اس نے وین کے آگے کوئی چیز دیکھی اور اس کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے بین کو وین واپس لے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ وین سے اتر کر کیبن کی طرف بڑھا۔ اس نے گیٹ کیپر سے کہا۔

”میں کمپنی سے آیا ہوں، مجھے اندر جانے دو۔“

”تمہیں اجازت نہیں ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ بین کا جو ہاتھ اس کی پتلون کی جیب میں تھا، وہ سرعت سے باہر آیا اور اس سے پہلے گیٹ کیپر فون پر کسی سے کچھ کہتا، بین کے ہاتھ میں دبا ہوا چھوٹے پھل والا استرے جیسا تیز چاقو گیٹ کیپر کی گردن میں اُتر گیا۔ وہ بات کرنے کے بجائے خرخرانے لگا۔ بین نے دوسرے ہاتھ سے ریسیور لے کر اسے واپس فون پر رکھ دیا اور ایک جھٹکے سے چاقو اس کی گردن سے نکال لیا۔ گیٹ کیپر نیچے گر کر لرزنے لگا۔ بین نے جھک کر اسے دیکھا اور ساتھ رکھی میز کھینچ کر اس کے اوپر کر دی۔ اب کوئی کیبن کی کھڑکی سے اسے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر اس نے بیریئر ہٹانے والا بٹن دبایا اور وین ذرا اندر لے گیا اور واپس آ کر بٹن دبا کر بیریئر دوبارہ بند کیا۔ آخر میں اس نے کیبن کی لائٹ بھی بند کر دی۔

وہ واپس وین میں بیٹھ رہا تھا کہ اسے خیال آیا۔ گیٹ کیپر نے کیا دیکھ کر ارادہ بدلا تھا۔ اس نے وین پر لوگو کا جائزہ لیا مگر وہ بالکل درست تھا۔ پھر کیا وجہ تھی؟ وہ آگے آیا اور وین کا جائزہ لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس نے جعلی نمبر پلیٹ الٹی لگا دی ہے۔ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے بارہا یہ کام کیا تھا مگر اس سے آج تک ایسی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اگر راستے میں کوئی پولیس والا اسے نوٹ کر لیتا تو اس کا مشن شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا۔ وہ عجلت میں اوپری پارکنگ میں آیا اور اس نے اوزار نکال کر نمبر پلیٹ کھولنا شروع کی۔ ابھی اس نے نمبر پلیٹ کھولی تھی اور اسے دوبارہ لگا رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

بین نے مڑ کر دیکھا تو سیکیورٹی افسر کی وردی میں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کی کمر سے پستول بندھا ہوا تھا۔ بین ذرا بھی گھبرائے بغیر بولا۔ ”یہ نمبر پلیٹ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس کے اسکرو خراب ہو گئے ہیں، میں دوسرے اسکرو لگا رہا ہوں۔“

مگر سیکیورٹی افسر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ آگے آیا۔ ”خراب اسکرو کہاں ہیں؟“

”وہ تو نیچے پھینک دیے تھے۔“ بین نے فرش پر دیکھنے کی اداکاری کی اور اس کا ہاتھ دوبارہ چاقو والی جیب کی طرف گیا۔ ”یہ رہے وین کے نیچے۔“

مگر سیکیورٹی افسر دیکھنے کے لیے نیچے نہیں جھکا تھا۔ وہ غالباً بین کے جواب سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”تم اس سے پہلے یہاں نظر نہیں آئے؟“

”مجھے پہلی بار بھیجا گیا ہے۔“ بین نے جواب دیا۔

”کس کام سے؟“

”نیچے پارکنگ میں مرمت کا مسئلہ ہے۔“

”اوہ ہاں اسی حصے میں آگے ایک جگہ فرش سے ٹائلیں نکل آئی ہیں۔“ سیکیورٹی افسر اب بالکل مطمئن تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی کو چھوا اور وہاں سے چلا گیا مگر بین کا اطمینان غارت ہو گیا تھا۔ اب اسے فکر تھی کہ کہیں یہ سیکیورٹی افسر گیٹ کیپر کی طرف نہ چلا جائے اور اسے پتا چل جائے کہ وہاں اس کی لاش پڑی ہے۔ اب اسے جو کرنا تھا، بہت تیزی سے کرنا تھا۔ اس نے وین سے اپنا بیگ نکالا اور تیز قدموں سے لفٹ تک آیا اور ابھی اندر داخل ہو رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ اسے بجلی کے باکس میں بم لگانا ہے۔ وہ اپنی بھول کو کوستا ہوا اس حصے میں آیا جہاں بجلی کے باکس تھے مگر وہاں بجلی کے باکس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ اس کا خیال تھا کہ وہاں بجلی کے باکس بنے ہوں گے اور ہر باکس پر اپارٹمنٹ کا نمبر بھی لکھا ہو گا۔ ایک دیوار پر بے شمار سوئچ اور سرکٹ بریکر تھے۔ ان میں بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون سا سوئچ اور بریکر ایڈم کے اپارٹمنٹ کا ہے۔

وہاں بم لگانے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس نے تلاش کیا کہ مین وائر کہاں سے آرہی ہے مگر اسے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ مرکزی تار کہاں سے آرہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بم لگا دیتا۔ وہ کچا کام کرنے کا قائل نہیں تھا اس لیے اس نے بم لگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ لفٹ میں آیا۔ یہاں اس نے لاک کرنے والا ہینڈل کھینچا مگر وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ لفٹ لاک نہیں ہوئی تھی۔ یہاں بھی اسے ایسے ہی اپنا کام چلانا تھا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا وہ اس کے اندازے سے زیادہ اونچی تھی۔ اس نے اچھل کر اس کے تختے پر ہاتھ مارا اور کراہ کر رہ گیا کیونکہ تختہ اپنی جگہ فکس تھا۔ غور کرنے پر وہ اسکروز سے بند نظر آیا۔ یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ اب اسے کسی طرح اسے کھولنا تھا کیونکہ ایڈم کے اپارٹمنٹ جانے کا راستہ اسی جگہ سے گزرتا تھا۔ وہ لفٹ سے باہر آیا اور اس نے تلاش کیا تو اسے پارکنگ میں ایک طرف رکھی پرانی راکنگ چیئر مل گئی۔

یہ زیادہ اونچی نہیں تھی اور ہلتی بھی تھی مگر وہ اسے لے آیا۔ کیونکہ اس کے علاوہ اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس پر وہ کھڑا ہو سکتا۔ موجودہ حالت میں، میں یہ بھی غنیمت تھی۔ اس پر کھڑے ہو کر اس نے اپنا بیلنس رکھتے ہوئے اسکرو کھولنا شروع کیے۔ مگر اسکرو بھی نہ جانے کب سے بند تھے اور بہت مشکل سے کھل رہے تھے۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ وہاں کوئی آنہ جائے اور وہ پکڑا جائے۔ راکنگ چیئر ہل رہی تھی کہ وہ اسی لیے بنائی گئی تھی۔ نتیجے میں ایک بار وہ نیچے گرا اور ایک بار اسکروڈرائیور پھسل کر اس کے انگوٹھے پر لگا اور اس سے خون نکل آیا۔ بین نے گالی دے کر ہاتھ جھٹکا۔ خون کے قطرے نیچے گرنے لگے تھے۔ اسکروڈرائیور ٹھیک سے استعمال کرنے کے لیے اس نے دستانے اتار دیے تھے۔ بہ مشکل اس نے تختے کے اسکرو کھولے اور اسے اوپر کی طرف دھکیلا۔ برسوں سے جام ہونے کی وجہ سے وہ بہ مشکل اوپر گیا تھا۔

اب اوپر چڑھنا تھا مگر وہ کرسی پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کرسی لفٹ سے باہر لے جا کر رکھی اور واپس آیا پہلے اس نے اپنا بیگ پھینکا اور تیسری کوشش میں بیگ خانے کے اندر چلا گیا۔ اب اسے جانا تھا اور اس نے اچھل کر کنارہ پکڑنے کی کوشش کی اور واپس نیچے گرا۔ اس کے پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ کراہتے ہوئے اٹھ کر اس نے دوسری کوشش کی اور بہ مشکل اس کے ہاتھ کنارے پر تھے۔ ہاتھ نہیں صرف انگلیاں تھیں اور اسے خود کو اوپر اٹھانے کے لیے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ یہاں پاؤں جمانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا اور اس نے حد سے زیادہ زور لگایا تو اس کے سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں تکلیف کی شدید لہر اٹھی۔ اس دوران میں وہ اوپر ہو کر ہاتھ جما چکا تھا۔ پھر دوسرا ہاتھ بھی اوپر جمایا اور کہنیوں سے زور لگا کر خود کو اوپر کھینچا۔ اسی ہاتھ کے انگوٹھے میں پہلے ہی زخم تھا اور اب درمیانی انگلی بھی اتر گئی تھی۔ ایسا اس کے ساتھ آج تک کسی مہم میں نہیں ہوا تھا۔

اس کا درمیانی جوڑ سوج رہا تھا۔ بین نے اسے ہلایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ تکلیف میں یک دم ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ کراہتے ہوئے اس نے بیگ سے ٹیپ نکالا اور اسے انگلی پر لپیٹ لیا مگر اس سے تکلیف کم نہیں ہوئی بس اس کی انگلی ہلنے سے رک گئی تھی۔ اس سے نمٹ کر اس نے اوپر دیکھا۔ ابھی اسے سیڑھیاں چڑھ کر ڈکٹ تک جانا تھا۔ اس نے پہلے لفٹ کی چھت کا تختہ درست کیا اور پھر بہ مشکل بیگ پشت پر باندھا۔ وہ رائٹ ہینڈ تھا اس لیے ہر کام سیدھے ہاتھ سے کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ پستول کا ٹریگر ٹھیک طرح سے دبا سکے گا۔ کسی قدر ہمت کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اور جب اس کی اتر جانے والی انگلی پر زور آتا تو اس پر ایک قیامت سی گزر جاتی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی سا جوڑ اتر جانے پر اتنی اذیت دیتا ہے۔

وہ ڈکٹ میں گھسا تو اسے کچھ سکون ملا۔ اب ہاتھ پر زور نہیں آرہا تھا۔ اگرچہ وہ پشت پر بندھے بیگ کی وجہ سے مشکل سے بیٹھا تھا، اس کے باوجود سکون میں تھا۔ چند گہرے سانس لینے کے بعد اس نے آگے جانے کا قصد کیا اور ڈکٹ کو پہلی بار دیکھا تو وہ اس کے اندازے کے بر خلاف بالکل بھی صاف نہیں تھا۔ اس کی دیواروں پر جگہ جگہ زنگ اور گندگی لگی ہوئی تھی۔ چکناہٹ آمیز دھواں جم گیا تھا اور فرش پر بھی گندگی کا خاصا ڈھیر تھا۔ یہ وہ گندگی تھی جو چوہے یہاں لاتے تھے اور پھر چھوڑ جاتے تھے۔ بدبو بھی اچھی خاصی تھی۔ بین کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی لگژری اور عالی شان اپارٹمنٹ بلڈنگ کا ائر ڈکٹ اتنا گندہ ہوگا۔ اس سے کہیں صاف ستھرا ڈکٹ تو اس کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے تھے۔ وہ چاروں ہاتھوں پیروں کے بل ہوا اور چیزیں ہٹاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ پشت کے بیگ کی وجہ سے وہ ٹھیک سے چل نہیں پا رہا تھا۔ وہ ڈکٹ کی چھت سے ٹکرا رہا تھا اور اس کے لیے مشکل

پیدا کر رہا تھا۔

مگر وہ بیگ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس میں کئی ایسی چیزیں تھیں جن کی اسے ضرورت پڑ سکتی تھی اور وہ انہیں ایسے ہی لے کر آگے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک جگہ بیگ کہیں پھنس گیا۔ اس نے زور دے کر نکالا اور زور میں بے ساختہ آگے گیا۔ اس نے توازن رکھنے کے لیے فرش پر تیزی سے ہاتھ رکھا اور بدقسمتی سے جہاں ہاتھ رکھا وہاں باہر کی طرف سے ایک لمبی کیل کئی انچ تک باہر نکل آئی تھی۔ وہ اس کے بائیں ہاتھ میں اتر گئی۔ بین کے منہ سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچنا چاہا مگر زنگ آلود کیل بری طرح اس کی ہتھیلی کے آر پار ہوئی تھی۔ وہ زور لگا کر اسے کھینچ رہا تھا اور اپنی آواز بھی دبا رہا تھا مگر جب کیل سے ہاتھ آزاد ہوا اس کے حلق سے ایک چیخ بھی آزاد ہوئی تھی۔ ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ بین نے سسکیاں لیتے ہوئے اس زخم پر بھی ٹیپ لپیٹا اور ٹیپ نکالنے کے لیے اسے جن دردناک مراحل سے گزرنا پڑا وہ ایک الگ داستان تھی۔

[illegible]

گئی تھی اور اندر سے سرخ گوشت جھانک رہا تھا۔ تکلیف ایسی تھی کہ وہ ہاتھوں کی تکلیف بھول گیا۔ شاید اس جگہ سے گیزر کی لائنیں گزر رہی تھیں جنہوں نے ڈکٹ کے اس حصے کو گرم کر دیا تھا۔ یہاں فرش بھی گرم تھا مگر ٹیپ کی وجہ سے اسے احساس نہیں ہوا اور اب احساس ہوا تو وہ جلدی جلدی یہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ کام اتنا دشوار اور مشکل ثابت ہوگا۔ مگر تکلیف کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ضد ابھر رہی تھی کہ اسے آج ہی ایڈم کا کام تمام کرنا ہے۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ سارے زخم معمولی ہیں اور وہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اس لیے اصل اہمیت اس کے مشن کی ہے۔ وہ چلتا ہوا کچن کے پاس والی جالی تک پہنچا جہاں نیچے سے بے تحاشا دھواں آرہا تھا۔

ایڈم کا چینی باورچی کوئی چینی ڈش تیار کر رہا تھا جس میں بہت سارے مسالوں کے ساتھ ایسا تیل استعمال کیا گیا تھا جو دھواں بن کر اڑ رہا تھا اور یہ دھواں ڈکٹ میں آرہا تھا۔ بین کا سانس رکنے لگا اور اس کا دھیان جالی کے دوسری طرف باورچی اور ایڈم کی داشتہ کی طرف [illegible]

[illegible]

گھڑی کی گواہی

سلیم انور

قرض لینا اور پھر نہ دینا ایک عذاب کی صورت اعصاب پر سوار رہتا ہے... کچھ لوگ اس ذمے داری کو محسوس کرتے ہیں... اور وقت پر ادائیگی اپنا فرض سمجھتے ہیں... اور کچھ بے حس و لالچی اسے اپنا حق سمجھ کر نہ دینے کی ٹھان لیتے ہیں... ایسی ہی صورت حال سے نبرد آزما کہانی... وہ بازی جیتنے گیا تھا... مگر مات اس کے مقدر میں لکھی تھی...

[illegible] قتل کی [illegible] وارداتیں... جس کا کوئی سرا پکڑ میں نہیں آرہا تھا...

"اوہ بوائے، کسی نے اس شخص کا چہرہ تک مسخ کر دیا ہے۔ ہمیں اس کی شناخت میں دشواری پیش آسکتی ہے۔ ہے نا؟" سراغ رساں جیمسن نے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"یہ لاش کس نے دریافت کی ہے؟"

"اس بے گھر شخص نے جو وہاں رکھے ہوئے کوڑے دان کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ بچا کھچا کھانا ڈھونڈ رہا تھا تب اس کی نگاہ ڈمپسٹر کے پیچھے اس لاش پر

سے پستول نکالنے کی کوشش شروع کی۔ پستول نیچے تھا وہ ایک ہاتھ سے پستول اوپر کر رہا تھا اور دوسرا ہاتھ کندھے سے گھما کر پستول نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے جیسے مشکل ہو رہی تھی اس کا انداز جنونی ہو رہا تھا اور وہ اب پستول نکالنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔

اچانک شیشے کی آواز آئی اور بین کو لگا کہ اس کے سر کے عقبی حصے میں دہکتا ہوا انگارہ اتر گیا ہو۔ اس کا دل رک گیا۔ کیا اس نے خود کو ہی گولی مار لی تھی۔ اس نے سوچا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ سر کی طرف گیا اور وہ خون سے بھر گیا۔ اسے چکر آیا تو وہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ چند لمحے بعد اسے ہوش آیا تو وہ حیران رہ گیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے قطعی علم نہیں ہوا کہ اس نے پستول کیسے نکالا اور کب نکالا۔ ڈکٹ کے فرش پر اس کے سر سے بہنے والا خون جمع تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی مگر اس سے پہلے وہ اپنا مشن مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے پستول پکڑا اور کوشش کر کے خود کو آگے گھسیٹنے لگا۔ اسی دوران میں اسے شور سنائی دیا۔ اس میں ایک مردانہ آواز نمایاں تھی جو غصے میں چیخ چلا رہا تھا۔ آواز ڈکٹ کے آخر میں جالی کے پیچھے سے آرہی تھی۔ بین کو رہ رہ کر چکر آرہے تھے۔ جب چکر آتے تو وہ رک جاتا اور جب اس کے حواس درست ہوتے تو وہ آگے بڑھنے لگتا۔

اسی دوران میں وہ ڈکٹ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ اسے چکر آیا اور اس کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو جالی سے لگے پایا۔ وہ بے خودی کے عالم میں پھسلتا ہوا یہاں تک آگیا تھا۔ اس نے جالی کے پار دیکھا جہاں ایڈم اپنے آدمیوں پر گرج برس رہا تھا۔ اس نے نائٹ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس اور دوسرے میں سگار تھا۔ دو لڑکیاں جن میں سے ایک تقریباً عریاں تھی۔ بار کاؤنٹر کے پاس کھڑی آپس میں گپ شپ کر رہی تھیں۔ انہیں ایڈم کے غصے اور چیخنے چلانے سے سروکار نہیں تھا۔ عجیب بات تھی ایڈم جو کہہ رہا تھا، وہ بین سن رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گولی نے اس کے دماغ یا حواس کو متاثر کیا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پستول کا رخ ایڈم کی طرف کیا جو بات کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ بین نے ٹریگر پر زور دیا تھا اور ٹریگر نصف دب گیا۔

☆☆☆

ایڈم لنڈلک بدستور غصے میں تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے اس کے اپارٹمنٹ میں عجیب واقعات پیش آرہے تھے۔ عمارت کا گیٹ کیپر قتل کر دیا گیا تھا اور پارکنگ میں جے اینڈ جے کلینرز کے لوگو والی گاڑی پائی گئی تھی۔ مگر کمپنی کا کہنا تھا کہ گاڑی ان کی نہیں تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ قاتل کی گاڑی تھی اور قتل کے بعد وہ پیدل فرار ہو گیا تھا مگر اس پر لگی نمبر پلیٹ جعلی ثابت ہوئی تھی۔ اصل نمبر پلیٹ گاڑی کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ جو بین اسپوک کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔ پولیس اس شخص بین اسپوک کو تلاش کر رہی تھی مگر وہ اپنے رہائشی پتے پر موجود نہیں تھا۔ پولیس مشکوک تھی کہ ان کا مطلوبہ فرد بین ہی تھا یا وہ بھی قاتل کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ پولیس کا مسئلہ تھا۔ ایڈم کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے اپارٹمنٹ کی بجلی بار بار مسئلہ کر رہی تھی۔

اس کے گیزر میں مسئلہ تھا اور وہ بہت تیز گرم پانی دے رہا تھا۔ باورچی خانے کے ائر ڈکٹ میں مسئلہ تھا۔ اس کی وجہ سے باورچی خانے کا دھواں اپارٹمنٹ میں پھیل رہا تھا اور یہ سارے مسئلے اس کے ملازم حل نہیں کر پا رہے تھے۔ اب دو دن سے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تفریح کے کمرے میں ائر ڈکٹ سے ایسی بو آرہی تھی جیسے اس میں کوئی لاش سڑ رہی ہو۔ اس نے اپنے آدمیوں کو وارننگ دے دی تھی کہ وہ مسئلے حل کریں یا پھر نوکری سے فارغ ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس نے انہیں حرام خوری کے لیے نہیں رکھا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک معروف ڈکٹ صاف کرنے والی کمپنی کے آدمی وہاں موجود تھے اور ان میں سے ایک ڈکٹ کی جالی کھول رہا تھا جس کے پیچھے سے سخت بو آرہی تھی۔ جیسے ہی اس نے جالی کھولی، اس کے پیچھے موجود بین کی لاش ترچھی ڈھلان کی وجہ سے باہر نکلی اور آدمی کو لیتی ہوئی فرش پر گری۔ ایڈم چونک کر مڑا اور اسی لمحے بین کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول کا ٹریگر جو اس کی موت کی وجہ سے ادھورا دبا ہوا تھا مکمل دب گیا۔ گولی چلی اور ایڈم کے عین حلق میں اتر گئی۔ ایڈم اپنے حلق سے ابلنے والا خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور حسین عورت حلق کے بل چلا رہی تھی۔ ڈکٹ کی صفائی کے لیے آنے والا دم بخود نظروں سے بین کی لاش دیکھ رہا تھا جس نے مرنے کے بعد بھی اپنا کام کر دیا تھا۔ اس کا آخری نشانہ بھی خطا نہیں گیا تھا۔

پڑی۔ ”فورنسک کے ٹم جاروس نے جواب دیا۔
”کچھ آئیڈیا کہ یہ واقعہ کب پیش آیا ہوگا؟“ جیمسن نے پوچھا۔
”اس بارے میں ہمیں ایک اچھا کلیو ہاتھ آ گیا ہے۔ لاش کی دستی گھڑی کو دیکھو۔ اب یہ جھلس چکی ہے اور رکی ہوئی ہے۔ یہ رات دس بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ تاریخ بھی ساکت ہے۔“
”اس کے پاس سے کوئی شناخت کی نشانی ملی؟“
”نہیں، اگر ہوگی تو وہ اب جا چکی ہے۔ مجھے بس اس کی عینک کا کیس ملا ہے جو اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ بظاہر لگتا ہے کہ یہ کشمکش کے دوران نیچے گر گیا تھا۔“
جیمسن عینک کے کیس کا جائزہ لینے لگا۔ ”ویل، اس سے ہمیں مدد مل سکتی ہے۔ اس پر ڈاکٹر کا نام ابھرے حروف میں موجود ہے۔“
”میں اس کے چند عمدہ پرنٹس لینے کی کوشش کروں گا اگر یہ سسٹم میں موجود ہوئے۔“
سراغ رساں جیمسن ٹہلتا ہوا اس شخص کے پاس چلا گیا جو کوڑے دان کے پاس ایک بیرل پر بیٹھا ہوا تھا۔
”ہائے، میں سراغ رساں جیمسن ہوں اور تم؟“
”روڈی۔“
”روڈی! تمہارا اور کوئی نام بھی ہے؟“
”بٹر فیلڈ نام تھا لیکن میں نے اسے برسوں سے استعمال نہیں کیا۔“ بے گھر شخص نے بتایا۔
”یہاں پر اس لاش کے علاوہ کسی اور شخص کو تو نہیں دیکھا، روڈی؟“ جیمسن نے پوچھا۔
”نہیں۔“
”جب تم اس گلی میں اندر آئے تھے تو یہاں کوئی اور شخص تو موجود نہیں تھا؟“
”نہیں، صرف میں ہی تھا، کچھ بچا کھچا کھانا تلاش کر رہا تھا۔ یہاں پر ایک عمدہ ریسٹورنٹ کا ڈمپسٹر بھی رکھا رہتا ہے۔“
”تو تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟“
”تقریباً روز ہی آتا ہوں۔“
”اور یہ شخص کل یہاں نہیں تھا؟“
”نہیں۔ میرا خیال ہے اگر موجود ہوتا تو میں نے اسے ضرور دیکھا ہوتا۔“ روڈی نے جواب دیا۔
سراغ رساں جیمسن نے اسے اپنا کارڈ تھماتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں کوئی اور بات یاد آ جائے تو برائے مہربانی مجھے فون کر لینا۔ اس پر آٹھ سو کا نمبر لکھا ہے جس پر تم کسی بھی پے فون سے مفت میں کال کر سکتے ہو۔“
”بس یا اور کچھ؟“
”بس یہی کہنا تھا۔“
روڈی بیرل سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا اور مزید کچھ کہے بغیر پرے چل دیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح جیمسن پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں اسپرنگ فیلڈ میڈیکل ایگزامنز کے دفتر پر رک گیا۔
”تم نے پتا لگا لیا کہ وہ لاش کس شخص کی ہے؟“
”ابھی تو کچھ پتا نہیں چلا۔ ہم نے اس کے عمدہ پرنٹس تو حاصل کر لیے ہیں لیکن ابھی تک کسی سے میچ نہیں ہو رہے۔ ہم اب بھی انہی کو کھنگال رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس شخص کا تمام لباس عام قسم کے کپڑوں پر مشتمل ہے۔ کوئی خاص چیز قطعی نہیں ہے۔“
”دانتوں کا ریکارڈ؟“
”ہم اس کی بتیسی کی نقل سانچے میں ڈھال کر حاصل کر سکتے ہیں لیکن وہ اس شخص کی یقینی شناخت کی صورت ہی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ بغیر شناخت کے اسے کسی سے میچ نہیں کیا جا سکتا۔“
”اور ہتھیار کے بارے میں کوئی آئیڈیا؟“
”غالباً ٹائر آئرن ہو سکتا ہے یا پھر لوہے کا کوئی پائپ۔ کوئی نہایت مضبوط اور گول شے تھی جس سے اس شخص کو مارا گیا تھا۔“
”میں آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔“ سراغ رساں جیمسن نے کہا اور میڈیکل ایگزامنز کے دفتر سے نکل آیا۔
آنکھوں کے ڈاکٹر ہولمین کی ریسپشنسٹ جیمسن کی توقع سے کہیں زیادہ دلکش اور کم عمر تھی۔
”میں اپنی مشین میں چیک کر لوں کہ یہ عینک ہم نے کس کے لیے تجویز کی تھیں۔ اس کے بعد ہی میں اس بارے میں مزید کچھ بتانے کے قابل ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کلینک میں چلی گئی۔
جیمسن نے وقت گزاری کے لیے ایک پرانے میگزین کے صفحات الٹنے شروع کر دیے اور انتظار کرنے لگا۔
ریسپشنسٹ، جیمسن کے اندازے سے بہت پہلے ہی

واپس پلٹ آئی۔ اپنی میز پر بیٹھنے کے بعد وہ اپنے کمپیوٹر پر کچھ ٹائپ کرنے لگی۔ ''میں نے جو سوچا تھا اس کے مقابلے میں یہ کام کہیں زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ یہ فریم کے اندر جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ دیکھ رہے ہیں؟ یہ سیفٹی گلاسز ہیں جن کے بارے میں آپ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''سب سے پہلی بات یہ کہ ہمیں ان کے لیے اسپیشل آرڈر دینا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں ان کے لیے بہت زیادہ آرڈر نہیں دینا پڑتے۔ تیسرا یہ کہ ہم یہ عینکیں صرف ان لوگوں کو فروخت کرتے ہیں جن کا کام اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ جس میں کوئی شے اُڑ کر آنکھوں میں چلے جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر ریسپشنسٹ نے قدرے توقف کیا اور دوبارہ اپنے کمپیوٹر اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

سراغ رساں جیمسن خاموش بیٹھا اسے کمپیوٹر پر کام کرتا دیکھ رہا تھا۔

پھر ریسپشنسٹ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''درحقیقت گزشتہ دو برسوں کے دوران ہم اسی نسخے کی تین جوڑی عینکیں فروخت کر چکے ہیں۔ یہ نسخے عام نوعیت کے ہیں لیکن فریم عام قسم کے نہیں ہیں۔''

''کیا تمہارے پاس ان تینوں افراد کے نام ہیں؟'' جیمسن نے جاننا چاہا۔

''نام ہی نہیں ان کے پتے بھی موجود ہیں۔'' ریسپشنسٹ نے بتایا۔

اتنے میں اس ریسپشنسٹ کے پرنٹر کی بھن بھن شروع ہو گئی۔ اس نے پرنٹر سے نکلنے والا ایک کاغذ جیمسن کی جانب بڑھا دیا اور بولی۔ ''اس سے مدد مل جائے گی؟''

جیمسن نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ''تم نے مجھے بامراد کر دیا، ڈارلنگ۔''

''تم اس شخص کو کیوں تلاش کر رہے ہو جس کی یہ اسپیشل عینک ہے؟'' ریسپشنسٹ نے پوچھا۔

''درحقیقت وہ ہمارے پاس ہے۔ ہم یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کون ہے؟''

''اور وہ بتا نہیں رہا ہے؟''

''وہ بتا نہیں سکتا۔''

''اوہ گاڈ! کیا وہ مر چکا ہے؟''

''ہاں، سوری۔ اس فہرست میں درج ان تین افراد میں سے کوئی ایک اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔''

جیمسن نے جواب دیا۔

جب جیمسن اپنے دفتر پہنچا تو اس کا پارٹنر ہینک روبنس وہاں موجود تھا۔ ہینک اپنی بیماری کی وجہ سے ایک دن پہلے دفتر نہیں آیا تھا۔ لیکن اس وقت اپنی میز پر بیٹھا کاغذات کے پلندے کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

''کوئی دلچسپی کی بات؟'' جیمسن نے اس سے پوچھا۔

''یہ بس وہی کچھ ہے جو موقع واردات سے متعلقہ عملے نے اکٹھا کیا تھا۔ کوئی بھی حوصلہ افزا چیز نہیں ہے۔'' ہینک نے جواب دیا۔

''ویسے، میرے پاس ان تینوں ممکنہ لوگوں کے نام، پتے اور ٹیلی فون نمبرز موجود ہیں جنہوں نے وہ عینک خریدی تھی۔'' جیمسن نے وہ کاغذ دکھاتے ہوئے کہا جو اسے آنکھوں کے ڈاکٹر ہولین کی ریسپشنسٹ نے دیا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم آغاز باری باری ان تینوں کو فون کر کے کرتے ہیں۔ یقیناً ان تینوں میں سے کوئی ایک غائب ہو گا۔''

☆☆☆

''اوہ، شٹ۔'' جیمسن نے تیسری کال کے بعد فون پٹختے ہوئے کہا۔ ''تینوں جگہوں پر پیغام ریکارڈ کرنے والی مشین لگی ہوئی ہے۔''

اس بات پر ہینک نے بے ساختہ قہقہہ لگایا..... ''لگتا ہے کہ آج تمہیں رات تک کام کرنا پڑے گا۔''

''کیوں؟ تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں ان سب سے دوبدو بات کرنے کے لیے جانا چاہیے؟'' جیمسن نے کہا۔

''اگر ہمیں کسی کو بُری خبر سنانی ہے تو بہتر یہی ہو گا۔'' ہینک نے جواب دیا۔

جیمسن نے اپنا پین میز پر اچھال دیا۔ ''ہاں، میرے خیال سے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

☆☆☆

ان کی فہرست میں پہلا نام رونالڈ بیک کا تھا۔

جب وہ اس کے پتے پر پہنچے تو دروازہ ایک عورت نے کھولا۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو اس عورت نے پوچھا۔ ''اس مرتبہ اس فضول احمق شخص نے کیا، کیا ہے؟''

''ہمارے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے میڈم۔ ہم تو صرف رونالڈ بیک کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا وہ یہاں موجود ہے؟''

''وہ اپنے کام پر گیا ہوا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ سلور ڈالرسٹی میں دوسری شفٹ میں کام کرتا ہے۔'' عورت نے بتایا۔

''کیا وہ آج سویرے یہاں موجود تھا؟''

''ہاں، کام پر جانے سے پہلے یہیں پر تھا۔ وہ گھر سے تین بجے جاتا ہے۔''

''ہم نے پہلے بھی اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔''

''وہ فون بند کر دیتا ہے اور پیغام ریکارڈ کرنے والی مشین آن کر دیتا ہے تاکہ آرام کی نیند سو سکے۔'' عورت نے جواب دیا۔

''تو اس وقت تم بھی یہاں موجود نہیں تھیں؟''

''میں پانچ بجے سے پہلے گھر نہیں پہنچتی۔''

''تو تم دونوں کی حقیقت میں ایک دوسرے سے کم ہی ملاقات ہوتی ہو گی؟''

یہ سن کر وہ عورت ہنس پڑی۔ ''اس طرح شادی کا جواز برقرار رہتا ہے۔''

''کیا آج بھی تم نے اُسے دیکھا تھا؟''

''یقیناً جب وہ گھر آیا تھا تو اسے دیکھا تھا۔ میں اس وقت تک جاگ رہی تھی اور ایک اچھی سی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔''

''اوکے، تھینک یو۔ بس ہم یہی جاننا چاہتے تھے۔''

''تم لوگ اس سے بات کرنا نہیں چاہو گے؟''

''نہیں میڈم۔ ہم بس یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ وہ خیریت سے تو ہے نا۔'' جیمسن نے کہا۔

''پھر تو بات دوسری ہے۔'' یہ کہہ کر اس عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

ایمٹ لنکاسٹر کے گھر کا دروازہ ایک مرد نے کھولا۔ اس مرتبہ بھی جیمسن اور ہینک نے اپنا تعارف بطور پولیس افسران کرایا۔

''کیا تم ایمٹ لنکاسٹر ہو؟''

''ہاں، کیوں؟ کیا کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہے؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''نہیں سر! اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہم بس یہ تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ تم خیریت سے ہو نا۔''

وہاں سے رخصت ہو کر وہ اسی معمول کے مطابق مارک رگز کے گھر پہنچ گئے۔ لیکن وہاں سے بھی کوئی حوصلہ افزا بات معلوم نہ ہو سکی۔

وہ مایوس واپس چل پڑے۔ ہینک کے گھر کے نزدیک پہنچنے تک انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔

یہ خاموشی جیمسن نے توڑی..... ''کوئی تازہ آئیڈیا؟'' اس نے اپنے پارٹنر ہینک سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ ہم حقیقت میں غلط سمت میں جا رہے ہوں۔'' ہینک نے کہا۔

''کیا اس بات کی وضاحت کرنا چاہو گے؟''

''ہاں، ایسا نہ ہو کہ یہ سیفٹی گلاسز مقتول کے نہ ہوں؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ عینک قاتل کی ہو اور دھینگا مشتی کے دوران اس کی جیب سے گر پڑی ہو؟''

''اگر یہ سچ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم آج رات جرم کا ارتکاب کرنے والے سے بات چیت کر چکے ہیں۔''

''درست۔ میرے خیال میں ہم گھوم کر واپس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ تینوں شخص دو رات قبل رات آٹھ بجے کے وقت کہاں پر تھے۔'' ہینک نے کہا۔

جیمسن نے تیزی سے ایک غیر قانونی یوٹرن لیا۔ ''سب سے پہلے رونالڈ بیک کو چیک کرنا آسان ہو گا۔ وہ غالباً اپنے کام پر رہا ہو گا۔''

''غالباً یہاں سب سے اہم لفظ ہے۔''

جب وہ واپس ایمٹ لنکاسٹر کے گھر کی جانب رواں

وہ ایک کروڑ پتی تھا اور دلچسپ مشغلے کے طور پر وہ اپنے ذاتی چڑیا گھر میں نئے نئے جانور جمع کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے سوچا کہ میرا چڑیا گھر اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں شیر نہ ہو۔ چنانچہ وہ جانور فروخت کرنے والی ایک دکان پر گیا اور کہا کہ مجھے ایک شیر کی ضرورت ہے۔

دکاندار نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا آپ کو بھارت کا شیر چاہیے یا افریقہ کا؟''

کروڑ پتی نے کہا۔ ''افریقہ اور بھارت کے شیر میں کیا فرق ہے؟''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''تقریباً تین ہزار میل کا۔''

ڈھاکا سے بابو عبدالرحیم کا تعاون

دے دیں۔
وہ دونوں ان جوڑیوں کا جائزہ لینے لگے۔ دونوں جوڑیاں ہوبہو ایک جیسی تھیں۔ انہوں نے عینکیں مارک رگز کو واپس کر دیں۔
جیمسن نے ایک بار پھر اپنی کار کا رخ اپنے پارٹنر ہینک کے گھر کی جانب کر دیا...... ''لگتا ہے کہ ہم واپس وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔''
''میں ذرا جلدی سے ایک فون کر لوں۔'' ہینک نے کہا۔
پھر ایک منٹ سے زیادہ فون کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ ''اس لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ ایمٹ لنکاسٹر کے ساتھ ڈیٹ پر گئی تھی۔ اس نے لگ بھگ سات بجے کے قریب اسے گھر سے لیا تھا اور تقریباً ساڑھے نو بجے اسے واپس گھر پر ڈراپ کر دیا تھا۔ انہوں نے برلینسن کے علاقے میں بوکس کارولیز پر کھانا کھایا تھا۔'' ہینک نے بتایا۔
''اچھا؟ جب ایمٹ لنکاسٹر نے اپنے اس کریڈٹ کارڈ کی رسید مجھے دکھائی تھی تو میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ ریسٹورنٹ کہاں ہے۔ میرا ابھی بھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔'' جیمسن نے کہا۔
''لگتا ہے جیسے ایک اور بند گلی آگئی ہے۔''
''ہاں، ماسوائے اس مردہ شخص کے ہمیں کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کسی نے تو اسے قتل کیا ہے۔ ہم کوئی چیز نظر انداز کر رہے ہیں۔'' جیمسن نے کہا۔
''ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان تینوں افراد میں سے دو کے پاس ان کے سیفٹی گلاسز موجود ہیں اور تیسرے کے پاس موجود نہیں ہے۔ ان سب کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کے خاصے ٹھوس شواہد بھی ہیں۔ سو یوں دکھائی دیتا ہے کہ اس شخص پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے جس کے پاس اس کے سیفٹی گلاسز موجود نہیں ہیں لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ کس طرح کیا جائے۔''
انہوں نے ایمٹ لنکاسٹر کے دوست ٹونی فرڈلے کو فون کیا۔ اس نے گزشتہ ویک اینڈ پر مچھلی کے شکار پر جانے کی ایمٹ لنکاسٹر کی بیان کردہ کہانی کی تصدیق کی۔ لیکن اس بات کی تصدیق کرنے سے قاصر رہا کہ شکار کے دوران ایمٹ لنکاسٹر کے سیفٹی گلاسز جھیل میں گر گئے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ شاید ایسا ہوا ہو۔ مزید یہ کہ ایمٹ لنکاسٹر نے اس بات کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا یا پھر اسے گلاسز کے پانی میں گرنے کا احساس اس وقت تک نہ ہوا ہو جب تک ان کی ضرورت نہ پڑی ہو۔
اگلے روز صبح جیمسن کو فارنسک کے ٹم جاروس کی فون کال موصول ہوئی۔ ''تمہیں گزشتہ شب کی رپورٹیں چیک کرنے کا موقع ملا؟''
''ابھی تک تو موقع نہیں مل سکا ہے۔'' جیمسن نے جواب دیا۔ ''کیوں؟''
''گزشتہ شب ٹوٹرک ایک کار لے کر آئے تھے جسے ضبط کیا گیا ہے۔ یہ کار گزشتہ دو راتوں سے ایک ہی مقام پر پارک کھڑی تھی۔ مسٹر میڈ نے اس پر جرمانے کے دو ٹکٹ بھی جاری کیے تھے۔ جب اس نے تیسری شب بھی کار کو اسی مقام پر موجود پایا تو اس نے فون کر کے ٹو کرنے والی گاڑی طلب کر لی۔ کار اب یہاں موجود ہے۔''
''یہ سب باتیں کس جانب راہنمائی کر رہی ہیں؟'' جیمسن نے پوچھا۔
''کار اس گلی کے عین باہر کھڑی پائی گئی تھی جہاں اس شخص کو مار مار کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کار اس شخص کی نہ ہو لیکن اس کے نشانات پوری کار پر موجود ہیں۔ کار کی نمبر پلیٹ ڈیلاویئر کی ہے اور کار وین وولف کے نام رجسٹرڈ ہے۔ یہ شخص تمہارا مقتول ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔'' ٹم جاروس نے بتایا۔
جیمسن نے یہ معلومات اپنے پارٹنر سراغ رساں ہینک کو ارسال کر دیں۔
''سب سے پہلے فون ریکارڈز سے اسٹارٹ کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان تینوں میں سے کون وین وولف نامی شخص کو جانتا ہے۔''
فون ریکارڈز چیک کرنے سے صرف ایک بات سامنے آسکی۔
ڈیلاویئر کے ایریا کوڈ تین سو دو سے ایمٹ لنکاسٹر کو متعدد کالیں کی گئی تھیں۔
پھر انہوں نے وین وولف کی جانب سے کی جانے والی کالز کو بیک ٹریک کے طریقے سے چیک کیا۔ اس نے گزشتہ دو ہفتوں کے دوران سترہ مرتبہ ایمٹ لنکاسٹر کو فون کالز کی تھیں۔
ہینک نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ''اوکے پارٹنر، اب ہمیں کیا پتا چلتا ہے؟''
''صرف ایک رابطے کا۔ لیکن اگر وہ رات آٹھ بجے

اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ تھا تو اس شخص کو قتل نہیں کرسکتا۔''
''اوکے، فرض کیے لیتے ہیں کہ وہ وہاں ریسٹورنٹ میں موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنی گرل فرینڈ سے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ کسی اور شخص کے ہمراہ اس ریسٹورنٹ میں چلی جائے گی۔ کیا کریڈٹ کارڈ رسید پر موجود اس کے دستخط آسانی سے پڑھے جاسکتے ہیں؟''
''دستخط بھی گھسیٹے گئے تھے۔''
''تو پھر اس کی تصویر حاصل کرتے ہیں اور آج رات اس ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کیا وہاں اسے کوئی شناخت کرتا ہے؟'' ہنک نے کہا۔
''گڈ آئیڈیا۔'' جیمسن نے اتفاق کیا۔
اس شام جب ایمٹ لنکاسٹر اپنے کام سے چھٹی ہونے پر باہر نکلا تو انہوں نے اس کی چند عمدہ تصویریں اتار لیں۔ وہ ڈیجیٹل تصویریں تھیں جن کے پرنٹ انہوں نے اپنے دفتر میں بنا لیے۔
رات کو جب ریسٹورنٹ میں انہوں نے وہ تصویریں دکھائیں تو نہ صرف ہر کسی نے اسے پہچان لیا بلکہ اس کے نام سے بھی واقف تھے۔ سب نے اس بات کی تصدیق کی کہ ایمٹ لنکاسٹر مذکورہ شب حقیقت میں ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کا بندھا ہوا گاہک تھا۔
وہ ایک بار پھر بند گلی میں آگئے تھے۔
اگلے روز صبح جیمسن کو ڈیلا ویئر پولیس کی جانب سے وین وولف کے بارے میں ایک فیکس موصول ہوا۔ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ البتہ اسے گروہ کی جانب سے قوت کے زور پر وصولیابی کرنے والا تصور کیا جاتا ہے۔ اسے کبھی بھی حراست میں نہیں لیا گیا کیونکہ اس کے خلاف کبھی خاصا ثبوت نہیں مل سکا ہے۔
جیمسن نے ایک سرسری نگاہ ہنک پر ڈالی۔ ''قوت کے زور پر وصولیابی کرنے والا؟ شاید قمار بازی کا قرض ہو جو کہ ادا نہ کیا جارہا ہو؟'' اس نے خیال ظاہر کیا۔
''ایمٹ لنکاسٹر کے بینک میں کھاتے کی تفصیل حاصل کرنا ہوگی۔'' ہنک نے مشورہ دیا۔
بینک کے کھاتے کی تفصیل سے انہیں پتا چلا کہ ایمٹ لنکاسٹر مالی طور سے تباہ ہوچکا تھا۔ بینک میں اس کے کھاتے میں نہ کوئی رقم تھی اور نہ ہی کوئی سرمایہ کاری۔ اس کے پاس پانچ کریڈٹ کارڈ تھے جنہیں وہ مہینے میں ایک مرتبہ شعبدہ گری سے کام لیتے ہوئے ان میں سے ایک کو کارآمد بنائے رکھتا تھا۔ اس کے مالک مکان نے گزشتہ ماہ اس کے خلاف مکان خالی کرنے کا نوٹس بھی جاری کیا ہوا تھا۔
''خوب، یہ شخص اتنی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ اس قسم کے وحشیانہ قتل کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ لیکن اس نے یہ قتل کس طرح کیا؟'' جیمسن نے ہنک سے پوچھا۔
''اب بھی کوئی آئیڈیا نہیں۔'' ''آؤ چل کر وین وولف کی کار کو دیکھتے ہیں۔'' ہنک نے کہا۔
انہیں کار کا جائزہ لینے میں لگ بھگ دو گھنٹے لگ گئے لیکن کسی قسم کا کوئی کلیو سامنے نہیں آیا۔ کوئی کارآمد بات پتا نہ چل سکی۔
باہر گرمی بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا ہنک نے کار اسٹارٹ کر دی اور اس کا ائرکنڈیشنر آن کردیا۔
''ذرا یہ تو دیکھو۔'' اس نے جیمسن کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص نے کار کی گھڑی کو پیسیفک ٹائم پر سیٹ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ یہ اب بھی ایسٹرن ٹائم پر سیٹ ہے۔''
وہ دونوں حیرت سے گھڑی کو تکنے لگے۔
تب جیمسن پہلے گویا ہوا۔ ''فرض کرو کہ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کا وقت بھی سیٹ نہیں کیا؟'' ڈیلا ویئر اور کیلی فورنیا کے درمیان چار ہزار چھ سو اکیاون کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور وقت کے درمیان تین گھنٹے کا فرق ہے۔ اگر اس نے اپنی گھڑی سیٹ نہیں کی تھی تو قتل کا وقت رات آٹھ بجے کا نہیں بلکہ پانچ بجے کا تھا۔ ایمٹ لنکاسٹر کا چھٹی کے فوراً بعد اس شخص سے گلی میں ملنے کا بالکل یہی وقت رہا ہوگا۔''
چند گھنٹے کی سخت پوچھ گچھ کے بعد ایمٹ لنکاسٹر نے اس شخص کو قتل کرنے کا اعتراف کرلیا جو ڈیلا ویئر سے اسے مار ڈالنے کے لیے کیلی فورنیا آیا تھا کیونکہ وہ اپنے قمار بازی کے قرض کی ادائی میں ناکام رہا تھا۔ قرض خواہ کی دھمکیوں کے باوجود اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ بالآخر قرض خواہ نے اپنے قوت کے زور پر قرض وصول کرنے والے کو اسے قتل کرنے کے لیے ڈیلا ویئر سے کیلی فورنیا بھیجا تھا۔
لیکن ایمٹ لنکاسٹر کو قتل کرنے کے ارادے سے یہاں آنے والا خود ایمٹ لنکاسٹر کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔
سراغ رساں جیمسن نے اس پیچیدہ کیس کے حل ہونے پر اطمینان کا سانس لیا اور اپنی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف ہوگیا۔

اشارہ

ایس انور

سراغرسی بچوں کا کھیل نہیں... باریک بینی اور مشاہدہ اس کی بنیادی شرط ہے... اپنے طور پر وہ کیس حل کرچکے تھے... واپسی کے راستے پر گامزن تھے کہ ایک چیز نے ان کے بڑھتے قدموں کو روک دیا...

چونکا دینے والے اختتام سے مزین ایک مختصر مگر پُرلطف کہانی...

پولیس دروازے پر آچکی تھی۔ سلوانیا نے اپنے بیڈروم کے فرش پر پڑی ہوئی لاش پر آخری بار ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر تیزی سے داخلی دروازے کی جانب چل دی تاکہ پولیس کو اندر آنے دے۔
''میں اپنے بیڈ پر تھی اور تقریباً سو چکی تھی جب مجھے اپنی کھڑکی کی جانب سے کوئی آواز سنائی دی۔'' اس نے ان دونوں سادہ لباس افسران کو بتایا۔ جنہیں وہ اپنے ہمراہ ہال میں لے کر آئی تھی اور اپنے بیڈروم کی جانب لے جارہی تھی

جہاں وہ لاش پڑی ہوئی تھی۔

''اس نے کھڑکی کی جالی کاٹ دی تھی اور پھر وہ پیچھے پر سے میری جانب لپکا تھا اگر میرے نائٹ اسٹینڈ میں پستول موجود نہ ہوتا تو...''

سراغ رساں ڈاوسن نے پینسل کی نوک سے بیڈ پر پڑا ہوا ہتھیار اٹھالیا اور سلوانیا سے پوچھا۔ ''کیا تم بھرا ہوا پستول ہمیشہ اپنے بیڈروم میں رکھتی ہو؟''

''یہ میں نے حال ہی میں رکھنا شروع کیا تھا جب وہ دھمکی آمیز فون کالز آنا شروع ہوئی تھیں۔''

''دھمکی آمیز فون کالز؟'' سراغ رساں طرائے نے نظریں اٹھاتے ہوئے دہرایا جو فرش پر پڑی لاش کا جائزہ لے رہا تھا۔

''یقیناً ہاں... میں نے تمہیں... میرا مطلب ہے پولیس کو اطلاع کردی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' سلوانیا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''اور تمہیں یقین ہے کہ اس دراندازکا کوئی نہ کوئی تعلق ان فون کالز سے ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم...'' سلوانیا نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے جواب دیا۔ تب اس کی نگاہ اپنے ایک ہاتھ کی چھنگلی پر پڑی، لعنت ہو، وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ اس کے نئے ناخنوں میں سے ایک ٹوٹ چکا تھا۔

پھر اس نے ایک اچٹتی نگاہ لاش کی بدوضع بکھری داڑھی پر ڈالی اور کانپ گئی۔ ''میں نے اس سے پہلے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔ ابتدا میں تو ان دھمکی آمیز فون کالز کا الزام اپنے سابقہ بوائے فرینڈ پر لگا رہی تھی۔ کئی ہفتوں قبل ہمارے درمیان علیحدگی ہوچکی تھی، میں نے اسے کسی دوسری عورت کے ساتھ کئی بار رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ پھر میں نے اسے لات مار کر باہر نکال دیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی اور پھر اس کے چند دنوں کے بعد سے وہ فون کالز آنا شروع ہوگئی تھیں۔''

سراغ رساں ڈاوسن نے کھڑکی کا جائزہ لینے کے بعد اپنی فلیش لائٹ کا رخ باہر گھاس کی جانب کردیا اور غور سے معائنہ کرنے لگا۔ پھر سلوانیا کی جانب پلٹ گیا۔ ''کیا تم رات کے وقت عام طور پر اپنی کھڑکی کھلی رکھتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن آج رات بڑی شاندار ہوا چل رہی تھی... اس لیے میں نے کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔'' سلوانیا نے جواب دیا۔

''اوہ ہو...!'' سراغ رساں طرائے جو اَب بھی لاش پر جھکا ہوا تھا، اچانک اس کا جسم تن گیا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ تم اس مردہ شخص کو نہیں جانتیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، یہ جھاڑ جھنکار داڑھی اور یہ بدوضع بال... میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں...'' سلوانیا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ سراغ رساں طرائے نے لاش کا سر اوپر اٹھایا تو اس کے بے ترتیب سے بال ایک جانب پھسل گئے۔

''یہ ایک وگ ہے۔'' سراغ رساں طرائے نے کہا۔ ''اور...'' یہ کہہ کر اس نے لاش کی داڑھی کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ مصنوعی داڑھی تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''داڑھی بھی مصنوعی ہے، کیا اب تم اس لاش کو پہچانتی ہو؟''

سلوانیا نے آگے بڑھ کر لاش کے چہرے کو نزدیک سے دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا... ''اوہ، نو! یہ... یہ تو ڈینی ہے... میرا سابقہ بوائے فرینڈ...'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

☆☆☆

سلوانیا آنکھیں بند کیے لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھی خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ پولیس کے

اہلکار اپنے، اپنے کام سرانجام دینے میں اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔

سلوانیا سوچ رہی تھی کہ انہیں ڈینی کی موت کے بارے میں کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوا؟ کہ وہ کھڑکی کے راستے اندر نہیں آیا تھا۔ یہ کہ سب خود سلوانیا نے کیا تھا تاکہ پولیس کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ اسی راستے سے اندر آیا تھا؟

جب سے ڈینی نے اسے دھتکارا تھا، وہ اس سے اپنا انتقام لینے کی منصوبہ بندی کررہی تھی۔

سب سے پہلے دھمکی آمیز فون کالز کی کہانی... ہاں، اس کے لینڈ لائن فون پر حقیقت میں ایسی دھمکی آمیز کئی کال آچکی تھیں۔ لیکن یہ تمام فون کالز اس نے خود اپنے استعمال کے بعد پھینک دینے والے سیل فون سے کی تھیں۔

اور آج کی رات اب اس کے منصوبے کا فائنل ایکٹ ہوگیا تھا... یعنی ڈینی کا قتل...!

سلوانیا نے جھٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں تو دیکھا کہ سراغ رساں طرائے دروازے میں کھڑا تھا، اس کی نظریں سلوانیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں بلکہ وہ سلوانیا کو گھور رہا تھا۔

''کیا تم لوگوں کا کام ابھی ختم نہیں ہوا؟'' سلوانیا نے اس کی نظروں کی چبھن سے گریز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''بس ختم ہونے ہی والا ہے۔'' سراغ رساں نے اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

سلوانیا نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیرلیا۔

بھلا یہ سراغ رساں افسر اسے اس انداز سے کیوں گھورے جارہا ہے؟ کیا اسے کسی قسم کا شبہ ہوگیا ہے؟ سلوانیا نے یہ سوچتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور نظریں دوبارہ دروازے کی سمت گھما دیں لیکن سراغ رساں طرائے اب وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ جاچکا تھا۔

'اوکے' سلوانیا نے اپنے آپ سے کہا۔ 'پُرسکون رہو،

سرورق کی پہلی کہانی

اشکِ سنگ

عبدالرب بھٹی

کئی دن اور راتیں ناقابلِ فراموش بن جاتی ہیں... مسافت کی وہ رات بھی عجیب تھی... ہر طرف بے تحاشا اندھیروں کا راج تھا... اور سنگلاخ چٹانوں اور گھاٹیوں سے پُر راستوں کو عبور کرنا پڑ رہا تھا... ہر سو گھور اندھیرا تھا... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ شور مچاتے... بل کھاتے... بے چین دریاؤں کی شوریدہ سری اپنے عروج پر تھی... ان کا غیظ و غضب دلوں کو دہلا رہا تھا... مگر وہ سب اپنی اپنی جگہ ہنوز سفر میں تھے... تلاش و کھوج کا سلسلہ تھا جو جاری و ساری تھا۔ ایک طرف بیوی کو شوہر کی تلاش تھی... دوسری طرف بھائی بھیانک اور خوفناک راستوں کی نذر ہو چکا تھا... واقعات و نت نئے حادثات کے ساتھ متواتر آگے بڑھتی کہانی کے نشیب و فراز... جرم کی نئی راہ اختیار کرنے والے سفاک مجرموں کا آغاز و انجام...

پیچیدہ لمحات میں پل پل ایک نئی صورتِ حال سے دوچار پُرتجسس داستان...

تیز بارش کے سبب لکڑی کا وہ پُل ٹوٹ گیا تھا، جو دو پہاڑیوں کے بیچ تقریباً تین سو فٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا۔ نیچے شور مچاتا پہاڑی نالا بہہ رہا تھا۔

"پُل یقیناً ایسے ہی نہیں ٹوٹا ہوگا، ضرور اس پر کوئی گاڑی گزری ہوگی۔ یہ پُل پہلے ہی تیز طوفانی بارشوں اور ہواؤں کے باعث کمزور پڑ چکا تھا، لہٰذا وزن نہ سہار سکا اور بدنصیب سوار، گاڑی سمیت نیچے تین سو فٹ کی سنگلاخ گہرائیوں میں جا گرے ہوں گے۔"

قسمت ابھی بھی تمہارے ساتھ ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہی تو تھی کہ اس کے بُلانے پر ڈینی آج رات اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے ڈینی کو اس کی چند ڈی وی ڈی واپس کرنے کے لیے بلایا تھا جو وہ سلوانیا کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ وہ لالچی احمق انہیں لینے کے لیے آ گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے پیچھے بیڈروم کے اندر بھی آ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اسے اگر کوئی شبہ بھی ہوا ہوگا تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ سلوانیا نے یکے بعد دیگرے اس پر دو فائر کر دیے تھے۔

اب پولیس کو یہ باور کرانا تھا کہ معاملہ کچھ اور نہیں بلکہ ذاتی تحفظ کا تھا۔ اس نے فائر سیلف ڈیفنس میں کیے تھے۔ انہیں اس واردات کو اسی نظریے سے دیکھنا ہوگا۔

سلوانیا نے وِگ اور داڑھی ایک ہفتہ قبل ایک سستی شے کی دکان سے خریدی تھیں۔ پھر آج اس نے داڑھی اور وِگ ڈینی کے ساکت جسم پر اس طرح منڈھ دی تھی جیسے کہ وہ کوئی آوارہ، مجہول الحواس شخص ہو، ایسا جنونی جو کہ دھمکی آمیز فون کالز کر سکتا ہو۔

"مس سلوانیا!"

او و! پھر وہی سراغ رساں!

سلوانیا نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے سراغ رساں کی جانب دیکھا اور بولی۔ "آج کی...

سلوانیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس پر دہشت کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کی یہ دہشت بڑھتی جا رہی تھی اور یہ دہشت اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب اس نے ڈینی کی لاش کو بدستور بیڈروم میں موجود پایا۔

"میں براہِ راست مطلب کی بات پر آتا ہوں مس سلوانیا۔" سراغ رساں طرازے نے کہا۔ "تم نے ہم سے جھوٹ بولا ہے، واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا جس طرح تم نے بیان کیا ہے۔ تمہارا سابقہ بوائے فرینڈ کھڑکی کے راستے اندر نہیں آیا تھا اور نہ ہی تم نے اپنے ذاتی تحفظ میں اس پر فائر کیے تھے۔"

"تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو؟ کس طرح...؟"

"اوہ، تم نے ایک اچھے سین کا سیٹ اپ کیا تھا لیکن یہ زیادہ اچھا سیٹ اپ نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس پر دو فائر کیے گئے تھے۔"

"تو پھر؟ وہ مجھ پر جھپٹنے والا تھا اور میں یقینی بنانا چاہتی تھی کہ اسے لازمی روک دوں۔" سلوانیا نے کہا۔

یہ وہ ہولناک تصور تھا جس نے فوزیہ کو نہ صرف لرزا کر رکھ دیا تھا بلکہ وہ تو بے چاری رو بھی پڑی تھی۔ جبکہ اس کا شوہر توقیر شاہ بھی کم تشویش زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہ رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ تیز موسلادھار بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ سرد اور کاٹ دار ہواؤں کا زور اس برستی یلغار کے شور... میں مدغم ہو کر وادی میں طوفانی قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔

ایک جانب بل کھاتے پہاڑی راستے... جہاں سے ٹوٹے ہوئے پل کی حد شروع ہوتی تھی، وہاں توقیر شاہ کی فور ڈبل جیپ کھڑی تھی۔ اس کی طاقت ور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں، لکڑی کے پل کی جگہ اب ایک ہولناک خلا نظر آ رہا تھا۔

ونڈ اسکرین پر وائپرز متحرک تھے اور بارش کے موٹے موٹے قطرے تواتر اور تیزی کے ساتھ ونڈ اسکرین پر یوں گر رہے تھے کہ جیسے اسے توڑ کر ہی دم لیں گے۔

ان کے عقب میں ذرا دور ''مانکیال'' کی چوٹیاں آسیبی ہیولوں کی طرح ایستادہ نظر آ رہی تھیں۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر پینتیس سالہ سرخ و سفید رنگت کا حامل خوبرو توقیر شاہ، پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر تیس سالہ اس کی نو بیاہتا بیوی زہرہ جمال، فوزیہ براجمان تھی، جو اب ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی، مگر تیز بارش کی طرح اس کے آنسوؤں کا سلسلہ بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

توقیر شاہ اسے بدستور تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''فوزیہ...! اللہ پر بھروسا رکھو، اور اس سے اچھی امید رکھو، ضروری نہیں کہ بھائی جان والوں کی گاڑی اسی پل پر سے اسی وقت ہی گزری ہو جب یہ ٹوٹنے والا تھا۔ ممکن ہے وہ بہ خیریت اس پل پر سے گزر چکے ہوں اور بعد میں آنے والی کوئی اور بدنصیب گاڑی...''

''مجھے ایسے یقین نہیں آئے گا... توقیر...!'' فوزیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ توقیر کو فوزیہ سے بہت محبت تھی۔ اس کے کرب اور دکھ پر وہ خود بھی پریشان تھا۔ ریاض خان، فوزیہ کا بڑا اور ایک ہی بھائی تھا۔ ان دونوں بھائی بہنوں کا اس دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ ریاض نے ہی ماں اور باپ بن کر فوزیہ کو پالا تھا اور اس کی اچھی تربیت کی تھی...

ریاض کی عمر چالیس برس تھی۔ اپنی بہن فوزیہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، ریاض نے اس کا ایک اچھے خاندان میں رشتہ طے کر دیا تھا۔ توقیر شاہ ایک شریف اور پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ اس کا ٹمبر مرچنٹ کا کاروبار تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا چنانچہ دونوں کی شادی کر دی گئی۔

بہن کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد فوزیہ کو اپنے بھائی کی شادی کی فکر ہوئی، کیونکہ اس وقت وہ غیر شادی شدہ تھا مگر وہ شاید نہیں جانتی تھی کہ یہ ''مسئلہ'' پہلے ہی حل کیا جا چکا تھا۔ فوزیہ کی شادی کی دیر تھی کہ ریاض نے اس لڑکی سے شادی کر لی جسے وہ پسند کرتا تھا، اس کا نام ثمینہ تھا۔

ریاض خان کا ''مانکیال'' کے گنجان آباد شہر میں اپنا خوب صورت ''لاج'' تھا۔ جبکہ اس کی بہن فوزیہ کا سسرال مانکیال کے مضافات میں، شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر خوب صورت پہاڑیوں کے دامن میں واقع ایک گاؤں نور پور میں آباد تھا۔

نور پور ایک خوشحال قصبہ تھا۔ یہ ہری پور ہزارہ ڈویژن میں تھا۔ وہاں توقیر شاہ کے باپ کی زمینیں تھیں اور خشک میوہ جات کے باغات تھے۔ توقیر شاہ اپنے باپ مکرم شاہ کے ساتھ زمینوں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا...

درحقیقت اس روز ہوا یوں تھا کہ ریاض خان اپنی بیوی ثمینہ کے ساتھ اسی روز بہن اور بہنوئی سے ملنے آیا تھا اور سرِشام ہی لوٹ گیا تھا۔ حالانکہ فوزیہ اور اس کے شوہر نے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ ان دونوں میاں بیوی کو رات ٹھہر جانے پر اصرار بھی کیا تھا، مگر ریاض نہیں مانا۔ اس وقت موسم کے تیور بھی کچھ بگڑنے لگے تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں اپنی جیپ میں روانہ ہوئے تو تھوڑی دیر بعد ہی بڑا زبردست طوفان آ گیا۔

پوری وادی اس طوفانی بارش میں جل تھل ہو کر رہ گئی تھی۔

تبھی سے فوزیہ کو اپنے بھائی اور بھابی کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ توقیر اسے تسلیاں دیتا رہا تھا کہ ریاض بھائی کی گاڑی نئی اور طاقت ور انجن والی ہے وہ بالکل خیریت سے اب تک اپنے گھر پہنچ چکے ہوں گے مگر فوزیہ کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھائی اور بھابی کے خیریت سے گھر پہنچ جانے کی دعائیں مانگتی رہی، اس کے دل کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ وہ انہیں فون بھی کرتی رہی تھی مگر شاید موسم کی خرابی کے باعث رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ فوزیہ کو مزید وسوسوں اور اندیشوں نے آن گھیرا۔

بہرحال جب دو تین گھنٹوں بعد فون پر رابطہ ہو سکا تو ریاض خان کے ملازم نے فون اٹھایا، اس نے یہ بتا کر فوزیہ کو مزید پریشان و متفکر کر ڈالا...

''صاحب اور بیگم صاحبہ (ریاض اور ثمینہ) ابھی تک

''لاج'' نہیں پہنچے۔''

یہ سن کر تو فوزیہ کی حالت ہی غیر ہونے لگی۔ توقیر شاہ بھی پریشان ہو گیا۔ اس کی اپنے سالے کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ پہلے تو اس نے اکیلے ان کی تلاش میں نکلنے کا قصد کیا مگر فوزیہ نے اسے اکیلے نہیں جانے دیا اور یوں اس کے بہ صد اصرار پر توقیر شاہ کو اسے بھی ساتھ لے جانا پڑا۔

یوں آبادی سے تقریباً بیس، پچیس کلومیٹر دور جا کر ان پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مانکیال اور نور پور کے قصبوں کو ساتھ ملانے والا لکڑی کا پل ٹوٹ چکا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر خضر حیات کے پاس گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے کے لیے آنے والا وہ تیسرا شخص تھا۔ اس کا نام ہزار خان تھا۔ وہ ایک غریب مزارع تھا۔ عمر تیس سال تھی، وہ اپنے چھوٹے بھائی زوار خان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔

مانکیال کے اس چھوٹے سے قصبے میں ایک ہفتے کے اندر، گمشدگی کی یہ تیسری واردات تھی جو معمولی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے ایک جوان شادی شدہ عورت اچانک پُراسرار طور پر گم ہو گئی تھی۔ اس کے صرف دو دن بعد ایک جوان شخص غائب ہوا اور اب تین دن بہ مشکل گزرے ہوں گے کہ یہ زوار خان نامی آدمی کی گمشدگی کی خبر آ گئی۔

پہلے تو وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ اغوا برائے تاوان کا کھیل لگتا ہے۔ دوسری ہونے والی واردات کو اس نے پرانی دشمنی کے شاخسانے پر محمول کیا تھا مگر اب یہ تیسری واردات نے اسے صحیح معنوں میں چکرا کر رکھ دیا تھا۔

اغوا کنندگان کی طرف سے مذکورہ مغویوں کے وارثوں سے تاوان کے مطالبے کے لیے کوئی رابطہ بھی اب تک نہیں کیا گیا تھا۔

انسپکٹر خضر حیات کے نزدیک اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ مغوی کہاں غائب ہو گئے تھے؟ انہیں آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی؟ اور کیا وہ زندہ بھی تھے؟

انسپکٹر خضر..... نے اپنی سی سر توڑ کوشش کر لی تھی مگر مذکورہ افراد کو تلاش کرنے میں... بری طرح ناکام رہا تھا۔

اس کے اندازے کے مطابق یہ کوئی بڑا اور منظم گروہ تھا جو بڑے پیمانے پر نہایت ہوشیاری اور خفیہ طریقے سے گھناؤنا کاروبار کر رہا تھا۔ ایسی ہی اطلاع دور نزدیک کے قصبات سے بھی آتی رہی تھیں اور ان گمشدہ لوگوں کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ پھر یوں ہوتا کہ اچانک ایک قصبے سے ایسی وارداتیں ختم ہو جاتیں مگر پھر دوسرے قصبے میں ایسا ہونا شروع ہو جاتا تھا۔

اس بار نشانہ مانکیال کا یہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔

انسپکٹر خضر حیات نے ہزار خان کی رپورٹ درج کرنے کے بعد اسے حسبِ معمول طفل تسلیاں دے کر رخصت کر دیا اور خود سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

خضر حیات یوں تو ایک توانا، فرض شناس، ذہین اور دلیر پولیس آفیسر تھا مگر یہ وارداتیں اس کے لیے دردِ سر ثابت ہو رہی تھیں...

اس نے کافی سوچ بچار کے بعد نئے سرے سے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا اور نئے عزم کے ساتھ دوبارہ سے گمشدہ افراد کی تلاش و تفتیش کا کام شروع کر دیا۔

سب سے پہلے اس نے زوار خان کے اغوا یا گمشدگی والے واقعے سے ابتدا کی جو بالکل ایک تازہ کیس تھا... (اگرچہ اسی نوعیت کے سابقہ کیس بھی اتنے زیادہ پرانے نہیں ہوئے تھے)۔ مذکورہ تازہ کیس تو آج صبح ہی پیش آیا تھا۔

انسپکٹر خضر اپنی جیپ پر سیدھا، مغوی کے بڑے بھائی ہزار خان کے گھر پہنچا۔ اس کے ہمراہ اے، ایس، آئی دلبر شاہ بھی تھا۔

ہزار خان کا گھر ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک غریب مزارعے کا ہونا چاہیے۔ وہ گھر پر ہی تھا جہاں اس کی بیوی اور دو چھوٹے بچے بھی رہتے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی زوار خان بھی انہی کے ساتھ رہتا تھا۔

ہزار خان سے مل کر خضر حیات نے پوچھا کہ اس کا بھائی زوار خان جس مقام سے اغوا یا غائب ہوا تھا، اسے وہاں لے چلے... مگر اس نے کہا کہ وثوق سے وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اس کے ساتھ دیگر کام کرنے والوں کو پتا تھا کہ وہ اکثر زمین میں ہل چلانے کے بعد چند گھڑی کے لیے پرانی باؤلی کی طرف نکل جاتا تھا، جہاں ایک پہاڑی جھرنا بہتا تھا اور وہاں قریب بیٹھ کر وہ اپنے چھوٹے سے ماؤتھ... آرگن پر جسے عرفِ عام میں ''بینجو'' کہا جاتا تھا ''یا قربان'' گنگنایا کرتا تھا۔

گمشدگی والے روز اسے پرانی باؤلی والے پہاڑی جھرنے سے واپس آتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

ہزار خان نے اپنے بھائی زوار خان کی تصویر بھی انسپکٹر خضر حیات کو دے رکھی تھی۔ خضر حیات اپنے معاون کار اے ایس آئی دلبر شاہ کے ساتھ ہزار خان کے گھر سے

اسی وقت روانہ ہو گیا اور مقررہ مقام پر جا پہنچا۔
موسم اس وقت خوشگوار تھا۔ کھلے آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ دن چمک رہا تھا۔ ان کے گرد پہاڑی ڈھلوانوں میں لپٹا گھنا جنگل تھا۔ جہاں بھانت بھانت کے خوش رنگ پرندوں کی مدھر گونج سنائی دیتی تھی۔ پتھریلی زمین پر کہیں کہیں گھاس بھی اگی ہوئی تھی اور ہری ہری دوب کا دلکش منظر پیش کرتی تھی۔ سامنے ایک پہاڑی جھرنا گر رہا تھا اور نیچے ٹھنڈے پانی کا تالاب سا بن گیا تھا۔ قریب پہنچ کر وہ بہ غور اطراف کا جائزہ لینے لگا تو اسے وہ ''بینجو'' نظر آ گیا جو پتھریلی زمین پر پڑا ملا۔ اس کے بارے میں خضر حیات کو بتایا تھا کہ یہ... زوار خان کا تھا۔
اسے دیکھ کر خضر کو پورا یقین ہو گیا کہ زوار خان کو ادھر ہی سے غائب یا اغوا کیا گیا ہوگا...

''سر...! کوئی اس طرف آ رہا ہے...'' معاً اسے اپنے اسسٹنٹ دلبر شاہ کی آواز آئی۔
وہ ایک نوجوان شخص تھا۔ جسم کا بھاری، قد درمیانہ اور رنگت سرخ و سفید تھی، وہ مقامی معلوم ہوتا تھا۔
وہ ان کے قریب آ کر رک گیا۔ انسپکٹر خضر نے اخلاقاً اسے پہلے سلام کیا پھر پوچھا۔
''کیا نام ہے تمہارا...؟''
''ارشد علی...''
''کیا کرتے ہو؟''
''صیب...! ادھر ہی مکرم شاہ کی نوکری کرتا ہوں... اس کے باغ کا مالی ہوں۔''
''زوار خان کو جانتے ہو؟ ہزار خان کا چھوٹا بھائی؟''
''بالکل صیب جی...! کیسے نہیں جانتا، وہ میرا بہت اچھا دوست ہے، پر آج ادھر نہیں آیا۔''
''کیا تم دونوں ادھر ہی ملتے تھے؟''
''ہاں صیب...! ہم دونوں ادھر ہی تقریباً روزانہ ملتے تھے۔ وہ بینجو بہت اچھا بجاتا ہے۔ مجھے اس پر وہ گیت سناتا تھا...'' اس کی بات سن کر انسپکٹر خضر حیات نے وہ بینجو اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔
''یہی اس کا بینجو تھا...؟''
ارشد علی نے بینجو اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا پھر واپس لوٹاتے ہوئے، اثبات میں سر ہلا کر جواباً بولا۔ ''ہاں صیب! یہ اسی کا ہی ہے... خیریت تو ہے صیب...؟ وہ خود کدھر ہے...؟'' اس نے آخر میں الجھی ہوئی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا تو انسپکٹر خضر حیات نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے اسے ساری بات بتا دی۔ ارشد علی بھی اپنے دوست کی گمشدگی پر فکرمند سا نظر آنے لگا۔
''تمہارا کیا خیال ہے، ارشد علی، اسے کون اغوا کر سکتا ہے؟ کیا اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟'' خضر حیات نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سوال کیا... وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔
''نہیں صیب جی...! وہ بے چارہ تو ایسی طبیعت کا آدمی ہی نہیں تھا... بھلا اس بے چارے کو کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے...؟''
''ہاں...! یہی بات ہم بھی سوچ رہے تھے کیونکہ ابھی ہم اس کے بھائی ہزار خان سے بھی مل کر آ رہے ہیں۔'' انسپکٹر خضر نے بے اختیار کہا... اور آگے بولا۔
''لیکن ایک بات ہے جو مجھے کھٹک رہی ہے، اس کے دوستوں کے مطابق زوار خان آج خلافِ معمول ادھر آن نکلا تھا، یہ اس کے آنے کا وقت نہ تھا۔ وہ تین چار گھنٹے متواتر کام کرنے کے بعد ہی یہاں آ کر بیٹھتا تھا، یا پھر شاید اسے آج زیادہ کام نہیں تھا؟ تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''
اس کی بات سن کر ارشد علی کچھ سوچ میں پڑ گیا... خضر حیات خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔ ارشد کچھ سوچنے کے بعد بولا۔
''یاد آیا صیب...! آج مجھے میرے ایک چوکیدار دوست نے بتایا تھا کہ زوار خان کو اس نے آج صبح غیر متوقع طور پر اس جھرنے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا اور اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا...''
''کون تھا وہ شخص...؟'' انسپکٹر خضر نے فوراً پوچھا۔
''پتا نہیں صیب...! کون تھا وہ لیکن ہو سکتا ہے کہ احمد علی اس آدمی کو جانتا ہو جس کے ساتھ اس نے آخری بار زوار خان کو دیکھا تھا آج...''
''احمد علی کون...؟''
''میرا دوست چوکیدار جو آج صبح سویرے مجھے ملا تھا۔''
''وہ ہمیں اس وقت کہاں ملے گا؟''
''میں آپ کو لے چلتا ہوں۔''
''چلو، ہم تیار ہیں۔'' خضر حیات نے کہا پھر تینوں جیپ میں سوار ہوئے اور وہاں پہنچے جہاں احمد علی رہتا تھا۔ وہ جگہ زیادہ دور نہ تھی۔
احمد علی پکی عمر کا دبلا پتلا شخص تھا۔ مزاجاً وہ بھی خوش اخلاق تھا۔ انسپکٹر خضر اسے ایک طرف لے گیا جہاں ایک چھتنار پیڑ تلے بان کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

''تم نے آج صبح سویرے زوار خان کو آخری بار کس آدمی کے ساتھ دیکھا تھا...؟'' یہ پوچھتے ہوئے خضر حیات نے مکرم شاہ کے مالی ارشد علی کی بات کا حوالہ بھی اسے دینا ضروری سمجھا تھا، تاکہ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے کے بجائے درست جواب دے سکے۔
''ہاں صیب...! زوار خان کو آج صبح میں نے ایک ایسے آدمی کے ساتھ دیکھا تھا جو ادھر کا نہیں لگتا تھا، کوئی شہری بابو لگتا تھا وہ...'' اس نے بتایا۔ تو خضر اپنی نظریں اس کے بشرے پہ مرتکز رکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔
''کیا وہ کوئی، سوٹڈ بوٹڈ آدمی تھا...؟ حلیہ کیسا تھا اس کا...؟''
''جی صیب...! اس نے شہری بابو جیسا ہی پتلون پہن رکھا تھا۔ رنگ گورا تھا، قد درمیانہ، عمر کا اندازہ چالیس تک تو ہوتا تھا۔ ایک اونچے ٹائروں والی جیپ بھی وہاں کھڑی تھی، یقیناً وہ اسی آدمی کی ہوگی، سفید رنگ تھا جیپ کا۔''
''تم وہاں رکے تھے؟ میرا مطلب ہے ان سے تم نے کوئی بات وغیرہ تو کی ہوگی؟''
''نہیں صیب...! میں دونوں پر ذرا دور سے نظر ڈالتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے حیرت تو ہوئی تھی کہ آخر زوار خان آج سویرے ہی اپنی من پسند جگہ پر کیسے آ کر بیٹھا ہے؟ اور یہ آدمی کون تھا؟ میں نے سوچا بعد میں پوچھ لوں گا۔''
احمد علی نے اپنی بات ختم کی، تو انسپکٹر خضر حیات نے فوراً اس سے سوال کیا۔ ''تو کیا تم تھوڑی سی بھی ان کی گفتگو نہیں سن سکے تھے؟''
''نہیں صیب...! ہم بولا نا... ایک نظر ڈال کر آگے نکل گیا تھا۔''
خضر حیات نے ایک بار پھر اس سے آدمی کا حلیہ پوچھ کر ذہن نشین کیا پھر اس کا اور ارشد کا شکریہ ادا کر کے اپنی جیپ میں سوار ہو کر دوبارہ اسی مقام پر آ گیا اور اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ نیچے اتر آیا۔
دونوں اب جھک کر بہ غور زمین کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں جیپ کے ٹائروں کے نشان دکھائی دے گئے۔ بارشوں کی وجہ سے اگرچہ وہ اتنے واضح نہیں تھے، بارانی علاقوں کے باعث یہاں بارشوں کا تناسب نسبتاً زیادہ رہتا تھا۔ اس وقت بھی آسمان پر سیاہ بادل گھرنے لگے تھے، جیسے کسی بھی دم برسنے لگیں گے... پھر بھی بالخصوص دلبر شاہ نے نشان تاڑ لیے تھے۔
''دلبر شاہ...! تمہیں کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ٹائروں کے نشان کس طرف کو جاتے ہیں؟'' بالآخر خضر حیات نے اس سے پوچھا تو وہ جلدی سے جواباً بولا۔
''جی ہاں سر...! یہ پہاڑی نالے کے کنارے کنارے جنوب مشرق کی سمت کو جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں...''
''گڈ... آؤ پھر، ہمیں اسی کی راہنمائی میں آگے بڑھنا ہے۔'' خضر حیات قدرے پُرجوش ہو کے بولا۔ دونوں جیپ میں سوار ہوئے اور آگے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔ آسمانی گھن گرج میں بھی کمی ہو رہی تھی۔ طوفانِ باد و باراں کے شور و شغب کے تھمتے ہی یک بیک سناٹا اور بھی بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔
فوزیہ نے بہ مشکل اپنی ادھ موئی کیفیات پر قابو پا رکھا تھا۔ شاید وہ سمجھنے لگی تھی کہ اس طرح رونے سے توقیر کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوگا۔ شاید وہ کچھ کر نہ پائے، ایسی مشکل گھڑی میں انہیں حوصلہ مند رہنے کی ضرورت تھی۔
وادی میں سناٹا طاری تھا۔ بھادوں مینا برسانے کے بعد اب آسمان صاف ہوا تو چاند کا سنہرا جلوہ بھی مانکیال کی چوٹیوں پر ضوفشانی بکھیرنے لگا۔
''شکر ہے بارش تو رکی، اب ہم اپنا کام زیادہ آسانی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔'' توقیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ پھر جیپ اسٹارٹ کر دی اور ریورس گیئر ڈالا۔ رات کے پُرہول سناٹے میں جیپ کا طاقت ور انجن غرایا اور وہ بیک ہونے لگی۔
''توقیر...! اب کیا کرنے والے ہیں؟ آگے تو راستہ، پل ٹوٹنے کے باعث بند ہو چکا ہے؟'' فوزیہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ جواباً توقیر بولا۔
''میں کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، ممکن ہے ریاض بھائی کی گاڑی اس پل پر سے اسی لیے نہ گزری ہو۔ اور یہ پہلے ہی ٹوٹ کر گر چکا ہو۔ بعد میں انہوں نے کوئی متبادل راستہ تلاش کر لیا ہو۔''
''اگر انہیں کوئی متبادل راستہ مل چکا ہوتا تو اب تک انہیں اپنے گھر تک پہنچ جانا چاہیے تھا'' فوزیہ بولی۔
''ممکن ہے ان کی گاڑی پھر آگے جا کر پھنس گئی ہو...؟'' توقیر نے کہا اور فوزیہ پُرخیال انداز میں اپنے سر کو تفہیمی جنبش دے کر چپ ہو رہی۔

جیپ ریورس ہو رہی تھی۔ پھر ایک موڑ پر توقیر نے
بریک لگائے۔ ایک لمحے کو اطراف کا جائزہ لیا۔ اب سامنے
ایک تنگ درّہ تھا، اس کے پار کھائی تھی۔ اس نے جیپ کا
گیئر بدلا، سناٹے میں انجن پھر غرایا، جیپ کو ایک جھٹکا لگا،
وہ آگے بڑھی، مگر اگلے ہی لمحے توقیر کو بریک لگانا پڑے...
آگے راستہ نہ تھا۔ تاریک کھائی تھی۔ اس نے پھر جیپ کو
ریورس کیا، بالآخر اسے ایک بہت ہی تنگ سا متبادل راستہ
دکھائی دے گیا، جو اس نالے کے قریب سے ہو کر ہی گزرتا
تھا، جس پر لکڑی کا مذکورہ پل بنا ہوا تھا۔

''مل گیا راستہ''۔ توقیر شاد پُرجوش ہو کے بولا۔
''فوزیہ...! اب حوصلہ رکھو، یقیناً ریاض بھائی اور ثمینہ
بھابی والوں نے یہی راستہ اختیار کیا ہوگا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر وہ ابھی تک اپنے گھر کیوں
نہیں پہنچے؟'' فوزیہ کے لہجے میں ہنوز تشویش تھی۔ توقیر
خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔

یہ دوسرا راستہ زیادہ نتیجہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ توقیر بڑی
احتیاط اور دھیان کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ کیونکہ
ذرا بھی اندازے کی غلطی یا غلط موڑ کاٹنے کے باعث جیپ
بے قابو ہو کر دائیں بائیں ابھری ہوئی ہلکی چٹانی دیواروں
کے درمیان پھنس سکتی تھی اور ٹکرا کر الٹ بھی جاتی۔

یہ تنگ گلی نما راستہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کہیں کہیں
جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ ناہموار زمین، بارش اور سیلے
سیلے پتوں اور پودوں کے باعث پھسلواں ہو گئی تھی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ بریک لگانے کی وجہ سے جیپ
کے ٹائر جام ہوئے، مگر جیپ رکی نہیں بلکہ جامد ٹائر، اپنے ہی
زور پر جیپ کو لہراتے ہوئے نیچے کی طرف گھسیٹتے لے
جاتے۔ مگر توقیر بھی ایسے آڑے ترچھے سنگلاخ اور پُرخطر
راستوں پر گاڑی چلانے کا خاصا تجربہ رکھتا تھا۔ وہ بڑی
مہارت سے اسٹیئرنگ اور جیپ پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

''میرا خیال ہے یہ راستہ نیچے گہرائی میں نالے کے
کنارے کنارے جا کر دوسری طرف نکلتا ہوگا؟''

توقیر نے خود کلامیہ کہا۔ فوزیہ خاموش تھی۔ بالآخر
نصف گھنٹے کی ''مشقت طلب'' ڈرائیونگ کے بعد جیپ شور
مچاتے سبک روی سے بہتے ایک کافی چوڑے پاٹ والے
نالے کے کنارے پر آتر آئی۔

توقیر نے ایک گہری اور تھکی تھکی سی سانس لے کر
جیپ روک دی اور نیچے اتر آیا۔

وہ تاریکی میں آس پاس کا گہری نظروں سے جائزہ
لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک طاقت ور بیٹری ٹارچ
تھی۔ فوزیہ بھی جیپ سے اتر آئی اور اس کے ساتھ کھڑی
تھی۔ اس نے گرم شال لپیٹ رکھی تھی۔ توقیر بھی گرم لباس
میں تھا۔ سردی کی کاٹ میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔

توقیر کے پاس ہمیشہ ایک بتیس بور والا بھرا ہوا
پستول ہوتا تھا۔ یہ لائسنس شدہ تھا۔ اب یہ دونوں دو بلند
پہاڑیوں کے نیچے نالے کے قریب کھڑے تھے۔ دو
چٹانیں عمودی تھیں۔ ان کے پار دیودار اور صنوبر کے
درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ماحول پر ٹھٹکا دینے والی
خاموشی طاری تھی جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔

توقیر نالے کے آس پاس کی زمین کا جائزہ لینے کی
کوشش کر رہا تھا۔ اسے کہیں بھی دور نزدیک کسی گاڑی کا تباہ
شدہ ملبا نظر نہ آیا۔ یہ بات دونوں کے لیے، بالخصوص فوزیہ
کے لیے اطمینان بخش تھی۔ تاہم توقیر کو گاڑی کے ٹائروں
کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

وہ اکڑوں بیٹھ کر اب ٹارچ کی روشنی میں بہ غور
ٹائروں کے نشانات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سمت کا
اندازہ کرنے لگا، پھر کھڑے ہو کر ایک گہری سانس لیتے
ہوئے بولا۔

''کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تو نظر آتے ہیں
اور زیادہ پرانے بھی نہیں لگتے، میرا خیال ہے، ریاض بھائی
کی جیپ ادھر ہی سے گزری ہوگی۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔'' فوزیہ کے منہ سے بے
اختیار دعائیہ کلمہ برآمد ہوا۔ ''توقیر...! ہمیں پھر ان
نشانات کی مدد سے انہیں ڈھونڈنا چاہیے...''

''ہاں...! میں نے ان نشانات کی سمت کا اندازہ
کرلیا ہے۔ آؤ، بیٹھو گاڑی میں۔''

توقیر نے قدرے پُرجوش ہو کے کہا۔ دونوں جیپ
میں سوار ہوئے، اور جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ
اب نالے کے کنارے ہلکی رفتار سے ہچکولے کھاتی آگے
بڑھ رہی تھی۔ توقیر سوچ رہا تھا کہ اگر ریاض بھائی کی جیپ
اس راستے پر گامزن رہی ہے تو ضرور کہیں نہ کہیں آگے جا کر
ان کا سراغ مل جائے گا...۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود بھی کسی
کی مدد کے منتظر ہوں۔

''توقیر...! یہ ضروری تو نہیں کہ نالے کے کنارے
زمین پر جس گاڑی کے ٹائروں کے نشانات کی راہنمائی میں
آگے بڑھ رہے ہیں، وہ ریاض بھائی کے جیپ کے ہی
ہوں...؟'' معاً فوزیہ نے کچھ سوچ کے کہا تو توقیر بولا۔

''ٹائروں کے نشانات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تازہ ہیں۔۔۔اور صرف چند گھنٹے پہلے کے ہی ہیں۔۔۔'' کہنے کو تو توقیر نے یہ کہہ دیا تھا مگر حقیقت تھی کہ خود اسے بھی اپنی اس بات پر کچھ خاص وزن محسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ محض طفل تسلی تھی۔ فوزیہ کچھ سوچ کے خاموش ہو رہی۔۔۔ سفر جاری ہی تھا۔

توقیر کے دائیں جانب شور مچاتا جھاگ اڑاتا نالا بہہ رہا تھا۔ بائیں طرف سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ بلندیوں پر طباق جاند روشن تھا۔ ماحول پر ہولناک خاموشی طاری تھی۔ ذرا آگے جا کر نالا دائیں جانب کو مڑ رہا تھا۔ توقیر نے جیسے ہی اسٹیئرنگ موڑا تو بری طرح چونک پڑا اور اسے یک دم بریک لگانا پڑے۔

اسے سامنے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ ایک گاڑی تھی۔ جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ جیسے الٹتے الٹتے رہ گئی ہو۔۔۔ اب بھی وہ الٹنے کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس ایک طرف کے دونوں ٹائر برسٹ تھے۔

یہ سفید رنگ کی چھوٹی سوزد کی جیپ تھی۔ توقیر نے اپنی گاڑی بڑھائی اور اس جیپ کے بالکل قریب لے جا کر روک دی اور پھر جلدی سے نیچے اتر آیا۔ نیچے اترتے وقت اسے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ جیپ بہرحال۔۔۔ ریاض خان کی نہیں تھی۔ فوزیہ بھی اتر آئی تھی، اب دونوں الجھی الجھی نظروں سے جیپ کو بہ غور تکنے اور اس کا جائزہ لینے میں محو تھے۔ اندر کوئی نہ تھا۔ نہ ہی کوئی آس پاس نظر آیا تھا۔

البتہ اسے اگلی سیٹ پر ایک تصویر گری ہوئی دکھائی دی تھی۔ جو ایک خوبرو مرد کی تھی۔

توقیر نے فوراً اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر ٹوٹے شیشے سے کھڑکی کے اندر ڈال کر وہ تصویر اٹھالی۔

اس نے ایک نظر خود بھی اور پھر فوزیہ کو بھی یہ تصویر دکھائی پھر نجانے کیا سوچ کر اس نے اسی طرح دوبارہ وہ تصویر اندر سیٹ پر پھینک دی۔

''یہ کن لوگوں کی گاڑی ہو سکتی ہے؟'' فوزیہ گومگو سے انداز میں بولی۔

''کوئی مسافر ہی ہو سکتے ہیں۔۔۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ۔۔۔ وہ اس وقت کہاں ہیں؟'' توقیر بولا۔ اور پھر دونوں دائیں بائیں ٹارچ کی روشنی میں دیکھنے لگے کہ کوئی ذی نفس دکھائی دے جائے۔۔۔

توقیر نے فوزیہ کو وہیں کھڑا رہنے کا کہا اور پھر خود آگے بڑھا۔ ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی میں گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اتنے میں عقب سے فوزیہ نے سراسیمہ انداز میں اسے پکار کے کہا۔

''توقیر۔۔۔! لوٹ آؤ۔۔۔ آگے چلتے ہیں، پتا نہیں کیوں یہاں میرا دل گھبرا رہا ہے۔۔۔''

اس کی بات پر توقیر پلٹا۔ پھر دونوں اپنی جیپ میں سوار ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

جیپ اب دھیمی رفتار کے ساتھ نالے کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہی تھی۔ چاند کی طلسماتی روشنی میں نالے کا بہتا شور مچاتا پانی عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ بلندیوں میں گھور تاریکی مسلط تھی۔ سردی کی شدت میں بھی بتدریج اضافہ ہونے لگا تھا۔ فضا میں جنگلی جڑی بوٹیوں اور خود رو پودوں کی باس رچی ہوئی تھی۔ کوئی چند سو فٹ چلنے کے بعد انہیں نالے پر ایک پل بنا نظر آیا۔ پل کیا تھا۔ چیڑھ اور دیودار کے تنوں کو گرا کے دو کناروں پر ٹکا دیا گیا تھا اور اس پر بہرحال کوئی گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔ پیدل البتہ ضرور چلا جا سکتا تھا۔ لہٰذا عارضی پل کو دیکھ کر یہ سوچنا ہی عبث تھا کہ ریاض خان اپنی گاڑی لے کر اس پل پر سے گزرا ہوگا۔

''روکو۔۔۔ روکو۔۔۔ گاڑی۔۔۔ توقیر۔۔۔!'' معاً فوزیہ نے چلا کر کہا اور توقیر نے پریشان ہو کے جیپ روک دی۔

''کیا ہوا۔۔۔؟ فوزیہ! خیریت۔۔۔؟'' اس نے قدرے چونک کر اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھو۔'' فوزیہ نے ایک جانب سامنے اشارہ کیا۔ توقیر نے اس سمت دیکھا تو وہ خود بھی بری طرح چونکا۔ وہاں ایک اور جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا مگر چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں اس جیپ کو پہچان چکے تھے۔ یہ نیلے رنگ کی ٹویوٹا جیپ تھی جو ریاض خان کی تھی۔

فوزیہ اور توقیر اس جیپ کو پہچانتے ہی اپنی گاڑی سے اترے اور اس طرف کو لپکے جہاں ریاض خان کی جیپ کھڑی تھی۔

جیپ خالی تھی۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ فوزیہ اور توقیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے جیپ کو تکے جا رہے تھے۔

☆☆☆

ایک مقام پر انسپکٹر خضر حیات نے جیپ ایک جھٹکے سے روک دی۔

''کیا ہوا سر! خیریت؟'' اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے دلبر خان نے قدرے چونک کر کہا۔ انسپکٹر خضر نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ پھر کوئی جواب دیے بغیر وہ جیپ سے اترا تو دلبر شاہ بھی اس کے ساتھ ہی اتر آیا۔

خضر حیات اب زمین پر اکڑوں بیٹھا، بہ غور زمین کا جائزہ لینے لگا۔ پھر سیدھا کھڑے ہو کر خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''اس جگہ سے آگے گاڑی کے نشانات معدوم ہو رہے ہیں، اس کی وجہ طوفانی بارش ہے۔''

''لیکن سر۔۔۔! ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔۔۔'' دلبر شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو۔'' خضر نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''سر۔۔۔! جہاں گاڑی کے ٹائروں کے نشانات مٹ رہے ہیں۔ یہاں سے اس مشکوک شخص کی گاڑی یقیناً آگے ہی بڑھی ہوگی، مطلب یہ کہ رکی نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہاں دائیں بائیں کوئی موڑ نہیں نظر آتا۔ دائیں جانب نالا ہے اور بائیں جانب گہری گھاٹیاں اور سنگلاخ چٹانیں۔۔۔''

''گڈ۔۔۔! تم نے یہ اچھا نکتہ نکالا۔۔۔'' خضر نے اس کی توصیف کی اور آگے بولا۔

''لیکن۔۔۔ میرا خیال ہے یہ نکتہ، زیادہ دور تک ہماری۔۔۔ راہنمائی نہیں کر سکے گا۔۔۔''

''سر۔۔۔! ہو سکتا ہے، کہ ہمیں آگے چل کر کچھ مزید نشان مل جائیں۔۔۔ یا پھر۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔۔۔ آؤ جلدی، ہمیں فوراً آگے بڑھنا ہے، وقت کم ہے ہمارے پاس۔۔۔'' انسپکٹر خضر اس کی بات کاٹ کر بہ عجلت بولا، پھر دونوں جیپ میں سوار ہو کے آگے بڑھ گئے۔

اے ایس آئی دلبر شاہ کی بات درست ثابت ہوئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد کچھ ایسے نشانات ملنے لگے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیپ کس طرف کو گئی تھی۔ کیونکہ کافی۔۔۔ دور جا کے نالے پر پلیا آ گئی تھی۔۔۔ یہاں ٹائروں کے نشانات کچھ واضح تھے۔ جس سے اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا تھا کہ اس مشکوک شخص کی گاڑی، پلیا پار کر کے دوسری طرف قدرے نشیب میں بل کھاتے ناپختہ راستے پر ہولی تھی جو آگے چیڑھ اور صنوبر کے جنگل میں گم ہو رہا تھا۔

خضر حیات کی جیپ نے تیزی سے نالے پر بنی پلیا پار کی اور مذکورہ راستے پر ڈال دی۔ جیپ اب جنگل میں داخل ہو گئی تھی۔ گھنا جنگل ہونے کے باعث شام سے پہلے شام اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

یہ راستہ خاصا طویل ثابت ہوا، حتیٰ کہ تقریباً نصف گھنٹا انہیں اسی راستے پر سفر کرتے ہوئے بیت گیا۔۔۔ اس دوران دائیں بائیں کوئی اور دوسرا راستہ بھی نظر نہیں آیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ وہ۔۔۔ صحیح سمت پر گامزن تھے۔

مزید بیس منٹ بعد سامنے صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا ایک ریسٹ ہاؤس نما کاٹیج نظر آ گیا۔۔۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ سفید رنگ کی پوٹھوہاری جیپ بھی احاطے میں کھڑی نظر آ گئی تھی۔ جس کے بارے میں احمد علی نے انہیں بتایا تھا۔

اس کامیابی نے انسپکٹر خضر کی رگوں میں جوش بھر دیا۔ اس نے ٹھک سے جیپ کاٹیج کے سامنے لے جا کر روک دی اور انجن بند کر کے جیپ سے اتر آیا۔

''آؤ میرے ساتھ دلبر شاہ۔۔۔! مگر ذرا محتاط رہنا، شاید ہم مجرم تک پہنچ گئے ہیں۔''

انسپکٹر خضر حیات نے عجیب سے جوش سے کہا اور پھر دونوں کاٹیج کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

خضر کے اشارے پر دلبر شاہ نے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں دروازہ فوراً کھلا تھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت سامنے کھڑی تھی۔ اپنی وضع قطع سے وہ گھریلو ملازمہ لگتی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ مقامی بہرحال نہیں لگتی تھی۔

''کس سے ملنا ہے جی آپ کو۔۔۔؟'' اس نے ان کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں پوچھا مگر اس کے سپاٹ لہجے کی تہ میں چھپی تندی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ دو وردی پوش پولیس والوں کو دروازے پر دیکھ کر بھی بالکل مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

''یہاں کون کون رہتا ہے؟ اور تم کون ہو۔۔۔؟ اس قصبے کی تو تم دکھائی نہیں دیتی ہو۔۔۔؟'' انسپکٹر خضر نے بھی اس کی طرف گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں کہا۔

وہ خرانٹ سی عورت اس پر بھی مرعوب ہوئے بغیر بولی

''میں یہاں ملازمہ ہوں۔ نسیم نام ہے میرا۔۔۔ صاحب کے ساتھ ہی شہر سے آئی ہوں، میرا میاں بھی یہاں رہتا ہے۔ وہ اس وقت صاحب کے ساتھ شکار پر گیا ہے۔''

''شکار پر اس وقت۔۔۔؟'' اس بار دلبر شاہ نے عورت کو گھور کے قدرے حیرت سے کہا۔

''تمہارے صاحب کا نام کیا ہے۔۔۔؟'' انسپکٹر خضر نے اشارے سے پہلے دلبر شاہ کو خاموش رہنے کا کہا اور نسیم نامی ملازمہ سے پوچھا تو وہ جیسے بدک کر بولی۔

''آخر آپ پولیس والے کیوں مجھ عورت کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔؟ چاہتے کیا ہو آپ لوگ؟''

اس کی چالاکی پر انسپکٹر خضر نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ بھی ایک گھاگ اور تجربے کار پولیس آفیسر تھا۔ جانتا تھا جو عورت

یہ الفاظ بول رہی ہے... اس کے درپردہ اس کی کیا ہوشیاری تھی۔ خضر نے تحکمانہ کہا۔

''دیکھو بائی...! میں اس قصبے شکر وال کا تھانہ انچارج ہوں، ضروری تفتیش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ ہم اندر بیٹھ کر تمہارے صاحب کا انتظار کرنا چاہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے آگے قدم بڑھایا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دے گی مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، تنک کر بولی۔

''آپ لوگ اندر نہیں آسکتے، میں کیا جانوں کہ آپ دونوں پولیس کی وردی میں کون ہو...؟'' اس کی بات پر انسپکٹر خضر کا بھی دماغ گھوم گیا۔ ادھر دلبر خان بھی اس چالاک ملازمہ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

خضر نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا، وہ جیسے حکم کا منتظر تھا فوراً حرکت میں آیا۔

''چل مائی...! اب آگے لگ، بہت چالاکی کرلی تم نے... اب تو ہمارا شک اور بھی تم پر پختہ ہوگیا ہے...'' دلبر شاہ نے اسے گھور کے غصیلے لہجے میں کہا اور اسے ایک ہاتھ سے پرے ہٹا دیا۔ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ ملازمہ نسیم نے واویلا شروع کردیا۔

دلبر شاہ نے ہتھکڑی نکال کر اس کے چہرے کے سامنے لہرا کر کہا۔ ''او چالاک بیگم! تم نے اگر اپنا منہ بند نہ کیا تو ہتھکڑی ڈال کر باہر جیپ میں بٹھادوں گا، اور وہاں سے تم سیدھی جاؤ گی جیل، سمجھی تم؟ اب اپنا یہ بھاڑ سا منہ بند رکھو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو...''

عورت بھی ایک ہٹیلی تھی۔ دلبر شاہ کی دھمکی نے اسے مزید چراغ پا کردیا۔ وہ بھی دھمکیوں پر اتر آئی اور تڑ سے بولی

''میں ابھی بڑے خان جی کی حویلی میں جاکر فریاد کرتی ہوں کہ کس طرح اس کے معزز مہمانوں کو یہاں کی پولیس ہراساں اور بے عزت کرتی ہے۔''

''سر...! اس کو ایک ہاتھ دکھانا پڑے گا...'' دلبر شاہ نے گویا انسپکٹر خضر حیات سے اجازت طلب کی، مگر وہ اس کی بات صرفِ نظر کرتا ہوا اس عورت سے بولا۔

''یہاں کے بڑے خان جی سے ہمارے بھی بڑے اچھے مراسم ہیں... تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم سے تعاون کرو، بات تھانے تک پہنچ گئی تو...''

ابھی خضر حیات نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سب قدرے چونک کر دروازے کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایک درمیانے قدوقامت اور بارعب سا سوٹ پوش آدمی اندر داخل ہورہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک پکی عمر کا شخص بھی تھا۔ انسپکٹر خضر حیات نے بہ غور اس شخص کا جائزہ لیا جو بلاشبہ مکرم شاہ کے باغات کے مالی احمد علی کے بتائے ہوئے حلیے پر پورا اترتا تھا۔

☆☆☆

توقیر کی پیشانی پر پُرسوچ شکنوں کا جال نمایاں تھا۔ وہ بولا۔

''ہاں...! یہ جیپ بلاشبہ ریاض بھائی کی ہے۔ چلو، یہ تو تسلی ہوگئی کہ انہیں کوئی خطرناک حادثہ پیش نہیں آیا ہے۔ جیپ کی کنڈیشن بھی درست ہی معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیپ یہاں آکر کسی خرابی سے دوچار ہوگئی ہوگی۔'' اس نے آخر میں فوزیہ کی تسلی کی غرض سے کہا۔

''مگر توقیر...! سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے، بھیا اور بھابی پھر کہاں چلے گئے...؟ جیپ خالی کھڑی ہے... ؟''

فوزیہ نے ابھی نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے اب ایک نئی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ توقیر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔

''ظاہر سی بات ہے، گاڑی کی خرابی درست نہ ہوسکی ہو اور وہ دونوں مقامی طور پر مدد لینے کے لیے پیدل ہی آگے بڑھ گئے ہوں...'' پھر قدرے متوقف ہونے کے بعد جیسے کچھ سوچ کے بولا۔

''ٹھہرو، میں ذرا جیپ اسٹارٹ کر کے دیکھتا ہوں...''

وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی نہیں تھی۔ توقیر --- اسٹیئرنگ کے نیچے تاروں کے ایک گچھے کو نکال کر تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ پھر ایک سرخ اور نیلی تار کو آپس میں ٹکرایا، اسپارک ہوا اور دوسرے ہی لمحے جیپ کا انجن غرایا مگر پھر خاموش ہوگیا۔ اس نے یہی عمل دو تین بار دہرایا، پھر جیسے جیپ کی خرابی کی تصدیق ہونے کے بعد وہ نیچے اتر آیا۔

اس کے بعد وہ ٹارچ کی روشنی چاروں طرف پھینکنے لگا۔ کوئی ذی نفس نظر نہ آیا تھا۔

''نجانے دونوں پیدل اس ویران اور گھنے جنگل میں کدھر نکل گئے...؟'' فوزیہ گوموگو سے انداز میں بڑبڑائی، اس کا چہرہ امید وبیم کی غمازی کرتا تھا۔ توقیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ دونوں

یقیناً نالے پر بنی اس پلیا پر سے گزر کر آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ وہاں کچھ قدموں کے نشانات نظر آئے تھے توقیر کو... یوں بھی یہاں سے بڑھنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ توقیر بھی پلیا پار کر کے ذرا آگے تک جا کر دیکھنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے فوزیہ سے کہا۔

''تم اندر گاڑی میں بیٹھی رہو، میں ذرا پلیا پار کر کے آگے جا کر دیکھتا ہوں۔''

اس کی بات پر فوزیہ یکدم ہراساں ہو کے بولی۔

''نابابا...! مجھے اکیلے یہاں برستے تاریک جنگل میں ڈر لگے گا...''

''میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا، یوں بھی تم یہ پل پار نہیں کرسکو گی، تم خود دیکھ سکتی ہو، پل کے نام پر محض درخت کا تنا لگایا ہوا ہے...'' توقیر نے سمجھایا۔ اس مختصر سے پل کو دیکھ کر فوزیہ کو اس پر پل صراط کا گماں ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے بھی چپ سادھ لی۔

بہرحال توقیر اسے تسلی تشفی دے کر آگے بڑھ گیا۔

وہ ٹارچ کی روشنی ڈالتا ہوا درخت کے تنے پر آیا، جو پل کے طور پر استعمال تھا، اپنا ایک پاؤں تنے پر رکھ دیا۔ وہ تنا پھسلواں ہورہا تھا پوری یکسوئی اور توازن قائم رکھتے ہوئے اس پر سے وہ گزرنے لگا۔ اگر اس کا پاؤں ذرا بھی پھسل جاتا تو وہ نیچے بہتے چوڑے پاٹ والے نالے میں جاگرتا۔

اللہ کا نام لے کر توقیر تنے پر اپنا پہلا قدم رکھ کے دھیرے دھیرے چلنا شروع ہوا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی تنے والے پل پر پڑرہی تھی، اور اندر بیٹھی فوزیہ ونڈ اسکرین سے پار توقیر کو پل پر سنبھل سنبھل کے چلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ تب ہی فوزیہ اچانک بری طرح ٹھٹکی کہ اس کا دل اچھل کے حلق میں آن اٹکا۔

اس کی یک ٹک نگاہوں نے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں، پل پر چلتے ہوئے توقیر کو ڈگمگاتے دیکھا، اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا، نجانے کیسے توقیر کا توازن بگڑا تھا، اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش چاہی مگر نہ سنبھل سکا اور ایک زوردار چھپاکے کی آواز سے وہ نیچے بہتے نالے میں جاگرا۔

ادھر جیپ کے اندر بیٹھی متوحش سی فوزیہ کے حلق سے بے اختیار خوف بھری چیخ خارج ہوگئی اور پھر وہ دروازہ کھول کے اتر آئی، اور... ''توقیر... توقیر...'' پکارتی ہوئی پل کی طرف دوڑی۔ توقیر، بہتے شور مچاتے نالے میں غوطے کھا رہا تھا۔ مگر پھر جلد ہی اس نے تیراکی شروع کردی۔

بہاؤ کی مخالف سمت تیرنا ناممکن حد تک مشکل تھا، مگر توقیر اس مشکل کو ہمت، حوصلے اور اپنے زورِ بازو کی مدد سے آسان بنانے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔ پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا۔ اس پر غضب کی سردی بھی، توقیر کو اپنا پورا وجود برفاب بنا محسوس ہورہا تھا۔

نالے کا تیز بہاؤ توقیر کو اپنے ساتھ بہا لے جانے پر تلا ہوا تھا۔ ادھر ہراساں اور متوحش سی فوزیہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ توقیر کو اس کی مدد کی ضرورت ہے اور ایسے میں حواس باختہ ہو کے ہمت چھوڑ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ شوہر کو بچانے کے جوش اور عزم نے اس کے اندر ایک عجیب سی طاقت بھر دی تھی۔ اس نے فوراً اپنے پیروں سے سینڈل اتارے اور دوڑتی ہوئی پل پر آگئی۔

ادھر توقیر بدستور نالے کے بہاؤ سے برسرِ پیکار تھا۔ جو اسے پل سے دور لے جانا چاہتا تھا، مگر توقیر کی کوشش تھی کہ وہ پل کے زیادہ سے زیادہ قریب رہے۔ کیونکہ اس نے بھی شاید فوزیہ کو درانہ وار اس کی مدد کے لیے پل پر آتے دیکھ لیا تھا۔ جبکہ فوزیہ حیرت انگیز طور پر اپنا توازن برابر رکھتی ہوئی پل پر آچکی تھی۔ اور اب دھیرے دھیرے اس کے قریب بڑھ رہی تھی۔ توقیر نے بھی پل کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کے لیے اپنی جدوجہد تیز کردی تھی۔ فوزیہ ایک جوش عزم تلے، خطرناک، تنگ اور پھسلواں پل پر آتو گئی تھی، مگر اب اسے چکر سے آنے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے نیچے شور مچاتا ہوا نالا بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔

فوزیہ کسی نہ کسی طرح اپنی قوتِ ارادی اور اپنے سرتاج کو بچانے کے ایک پُرجوش عزم کے ساتھ، پل کے اس حصے کے قریب جا پہنچی، جہاں توقیر ڈبکیاں لے رہا تھا... وہ وہاں پہنچ کر تھوڑا جھکی، اپنا ایک ہاتھ توقیر کی طرف بڑھایا، توقیر نے بہ مشکل اس کا ہاتھ پکڑا، پانی کے تیز بہاؤ سے لمحہ بھر کو توقیر نے جنگ ہاری تو پانی کے رحم وکرم پہ اس کے وجود کا دباؤ یکدم بڑھ گیا، نتیجے میں فوزیہ کو توقیر کے وزن کے ساتھ اضافی وزن سہارنا پڑ گیا جبکہ وہ خود تنے والے پھسلواں پل پر اپنا توازن... بہ مشکل قائم کیے ہوئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی پانی میں جاگری...

نالے کے یخ بستہ پانی کی برودت نے فوزیہ کو جیسے منجمد کر کے رکھ دیا، اس پر مستزاد کہ وہ تیرنے سے بھی ناواقف تھی۔ توقیر کو الٹا اسے سنبھالنا پڑ گیا اور اس کشمکش میں

وہ دونوں ہی نالے کے تیز بہاؤ کے رحم و کرم پہ آگے بہتے چلے گئے۔

☆☆☆

دو عدد پولیس والوں کو اپنے کاٹیج میں دیکھ کر اس سوٹ پوش شخص کے چہرے پہ لمحاتی تفکر کی پرچھائیں ابھری تھی جو انسپکٹر خضر حیات کی عقابی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی، جبکہ اس کے عقب میں موجود پکی عمر والا شخص تو باقاعدہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ قریب کھڑی ادھیڑ عمر ملازمہ نسیم نے فوراً اپنا منہ پھاڑ دیا۔

''صاحب جی... ! یہ دونوں پولیس والے بدمعاشی دکھاتے ہوئے زبردستی اندر داخل ہوئے ہیں، میں نے ان سے کہا بھی کہ''..... اس کی آواز درمیان میں دب... گئی... سوٹ پوش والے ''صاحب جی'' نے اسے فوراً خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا، اور پھر وہ اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے، چند قدم چلتا ہوا انسپکٹر خضر... کے قریب آیا اور اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے اس نے خضر حیات کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے آصف علی خان کہتے ہیں، کیا میں آپ لوگوں کے آنے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں؟'' اس کا لہجہ صاف اور شائستہ تھا۔

''تھینکس... میں انسپکٹر خضر حیات ہوں، یہ میرا اسسٹنٹ سب انسپکٹر دلبر شاہ ہے۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں پوچھنا تھیں...'' خضر حیات نے بھی مصافحہ کرتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ پھر اس کی منہ پھٹ ملازمہ کی شکایت بھی کر ڈالی۔ اس پر آصف..... نامی شخص نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''میں اس کی معذرت چاہتا ہوں، یہ ذرا منہ پھٹ ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی میرے پرانے نمک خوار ہیں۔ آیئے تشریف لے آئیں...''

وہ آمنے سامنے نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ خضر حیات کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پکی عمر والا آدمی نسیم نامی منہ پھٹ ملازمہ کا شوہر تھا جس کا بعد میں، رفیق نام معلوم ہوا تھا۔

''جی فرمائیے... انسپکٹر صاحب! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' جواباً خضر نے ہولے سے کھنکھار کر پوچھا۔

''آپ آج صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان مکرم شاہ کی زمینوں پر آئے تھے؟''

''میں تو اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا؟ البتہ آج صبح میں اپنی گاڑی پہ ضرور نکلا تھا باہر...'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''آپ کو ایک پرانے کنوئیں کے قریب زوار خان نامی کوئی نوجوان ملا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے خضر نے اپنی... چھانتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پہ مرکوز کر دیں۔ آصف سوچ میں پڑ گیا پھر جواباً بولا۔

''ہاں! ایک نوجوان مجھے وہاں ملا تو تھا۔ نام بھی اس نے اپنا شاید یہی بتایا تھا مجھے، تو کیا اس نے مجھ پر کوئی الزام لگایا ہے...؟''

''اس نے الزام تو نہیں لگایا مگر وہ اس وقت سے ہی غائب ہے۔ اس کے بڑے بھائی ہزار خان نے آج صبح ہی تھانے آ کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی۔''

انسپکٹر خضر نے بتایا اور اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کی غرض سے، کہ وہ کسی قسم کی غلط بیانی یا چالاکی کرنے کی کوشش نہ کر پائے، مزید بولا۔

''وہ ٹھیک اسی وقت ہی غائب ہوا ہے، جب آپ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس کے ایک ساتھی احمد علی نے آپ کو اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور آپ کی سفید جیپ بھی وہاں کھڑی تھی۔''

''آئی سی... اب سمجھا، تو آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں کہ زوار خان کی گمشدگی میں میرا ہاتھ ہے...؟'' اس بار آصف خان نامی اس شخص نے خضر حیات کی طرف دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تو گویا کسی کے ساتھ چند گھڑی کچھ پوچھ لینا مصیبت ہو گئی میرے لیے، دیکھیں جناب انسپکٹر صاحب! میں ایک شریف آدمی ہوں، ایبٹ آباد کے ایک بینک میں اے، وی، پی رہ چکا ہوں، وہاں میرا گاڑیوں کا شوروم بھی ہے۔ اس کے علاوہ شکار میرا پرانا شوق ہے۔ اس وقت بھی میں صبح شکار پر ہی نکلا تھا، علاقے میں نووارد ہونے کی وجہ سے میں نے ذرا رک کر اس نوجوان سے لکڑ پوری جنگل کے بارے میں پوچھا تھا، جہاں سفید بھیڑیے بہ کثرت پائے جاتے ہیں، میں ان کا شکار کرنا چاہتا تھا...''

اس کی بات سن کر خضر نے بہ دستور اپنا درمیانہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں آصف صاحب...! بسا اوقات صورت حال ایسی ہو جاتی ہے کہ عام حالات میں اگر کوئی جرم واقع ہو جائے تو پولیس فوراً اسی طرف پہلے متوجہ ہوتی ہے...''

''ممکن ہے، وہ کہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا ہو؟ وہ کوئی عورت یا بچہ تو نہ تھا کہ اس کے بھائی نے چند گھنٹے بعد ہی جھٹ سے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دی...''

جواباً خضر اس کے چہرے پہ نظریں رکھتے ہوئے گہری متانت سے بولا... ''عام حالات میں آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے... لیکن اول تو یہ کہ اس کے بھائی ہزار خان نے چند گھنٹوں بعد نہیں بلکہ بعد دوپہر قریباً نو گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد ہی اپنے بھائی زوار خان کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی تھانے میں... مگر سب سے اہم اور خاص بات یہ کہ پچھلے چند روز میں ایسی گمشدگی کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھا جائے تو اس کے بھائی ہزار خان کو فوراً اپنے بھائی کی گمشدگی کی اطلاع درج کروانی چاہیے تھی، جبکہ ہمارے حساب سے تو آٹھ، نو گھنٹے بھی بہت ہیں...''

''ٹھیک ہے، آپ کی بات صحیح ہے... اب میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں...؟''

آصف نے اس بار گویا جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو خضر حیات بولا۔ ''آپ نے زوار خان سے لکڑ پوری جنگل کے بارے میں دریافت کیا تھا، تو کیا اس نے آپ کو بتا دیا تھا اس مقام کے بارے میں...؟''

''ہاں... !'' آصف نے مختصراً جواب دیا۔

''آپ نے ابھی بتایا کہ آپ مذکورہ جنگل میں سفید بھیڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتے تھے۔ تو کیا آپ وہاں گئے تھے؟''

''نہیں، مگر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں...''

''تو پھر آج صبح سات بجے سے لے کر اب تک آپ کی کیا مصروفیات رہیں...؟''

''میں بھوربن دیلی کی طرف نکل گیا تھا۔ برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے...''

''اس وقت آپ کہاں سے آ رہے ہیں...؟''

''وہیں سے ہی آ رہا ہوں...'' وہ بُرے بُرے سے منہ بنانے لگا تھا۔

''کوئی شکار ہاتھ لگا آپ کے...؟''

''نہیں...''

''میرے لیے یہ حیرت کی بات ہے...''

''میرے لیے بھی یہ حیرت کی بات تھی، جب میں خالی ہاتھ ہی بھوربن دیلی سے لوٹا تھا۔ اس لیے کہ سفید بھیڑیوں کی طرح اب برفانی لومڑیوں کی نسل بھی نایاب و کمیاب ہے۔''

''کیا آپ خالی ہاتھ برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے گئے تھے؟ میرا مطلب ہے آپ کے پاس کوئی شکاری طرز کا ہتھیار نظر نہیں آ رہا؟''

''میرے پاس دس قسم کے شکاری ہتھیار ہیں اور سب کے سب لائسنس شدہ ہیں...''

''میں صرف وہ قسم دیکھنا چاہتا ہوں، جو اس وقت آپ کے ساتھ ہے...؟'' انسپکٹر خضر نے بھی طنزیہ کاٹ سے کہا تو وہ بولا۔

''وہ باہر میری جیپ میں رکھا ہے، ایک رائفل ہے، اور ایک ایل جی ڈبل بیرل بندوق۔''

''زحمت گوارا نہ ہو تو ذرا باہر چل کر مجھے وہ دونوں ہتھیار دکھانا پسند کریں گے آصف خان صاحب؟''

''بالکل، آئیں میرے ساتھ...'' یہ کہہ کر وہ پورے اعتماد سے اٹھا۔ خضر اور دلبر شاہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں باہر آ کر احاطے میں کھڑی سفید جیپ کے قریب پہنچے، ملازم توفیق بھی ان کے عقب میں چلا آیا تھا۔

آصف نے دروازہ کھولا تو خضر اور دلبر شاہ اندر جھانکنے لگے۔ دونوں شکاری گنیں اندر عقبی سیٹ پر موجود تھیں... کارتوسوں کا ایک ڈبا بھی رکھا نظر آیا تھا۔ دفعتاً خضر حیات کی نظر ایک نیلے رنگ کے کڑھائی کیے ہوئے رومال پر پڑی، جو عقبی سیٹ کے نیچے کہیں دبا اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ رومال کا بہ غور جائزہ لینے کے دوران انسپکٹر خضر حیات بُری طرح چونکا تھا۔ رومال کے ایک طرف کڑھائی سے ایک نام کاڑھا ہوا تھا، اور وہ نام تھا زوار خان۔

☆☆☆

دونوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کو تھامے ہوا تھا۔

توقیر، فوزیہ کو سنبھالے ہوئے تھا، مسلسل غوطے کھانے اور خوف کے باعث فوزیہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ جبکہ توقیر کی خود اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کیونکہ اسے بیک وقت دو کٹھن مرحلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا... ایک طرف پانی کا تیز بہاؤ تھا دوسری طرف فوزیہ کو سنبھالنے کا بوجھ، جس کے نتیجے میں وہ خود بھی تیرنے سے قاصر ہو رہا تھا۔ نتیجتاً خود بھی بری طرح غوطے کھانے لگا۔ فوزیہ کے بے سدھ وجود سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خوف سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ توقیر کی حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح کنارے تک جا پہنچے کہ اچانک نجانے کس مقام پر کسی زیرِ آب ابھرواں چٹانی پتھر سے اس کا سر بڑے زور سے ٹکرایا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا... بے ہوش فوزیہ اس کی گرفت سے نکل کر اس پہاڑی نالے میں دور بہتی چلی گئی۔

☆☆☆

''اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' انسپکٹر خضر نے دھیمے لہجے میں آصف خان سے کہا۔ اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ رومال لہرا دیا تھا، اب اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس رومال کو دیکھ کر آصف کی ساری چالاکی اور ہوشیاری دھری رہ جائے گی۔

بلاشبہ آصف نے بھی قدرے چونک کر اس رومال کو دیکھا تھا اور لمحے بھر کو اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے شانے اچکا کر سرسری لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں معلوم یہ کس کا رومال ہے اور میری جیب میں کیسے آیا...؟''

''یہ زوار خان کا رومال ہے آصف صاحب...! جو آج صبح پُراسرار طور پر لاپتا ہو گیا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیے، اس پر اس کا نام بھی کڑھا ہوا ہے...'' انسپکٹر خضر نے آصف خان کی طرف دیکھ کر گویا ایک ایک لفظ چبانے کے انداز میں کہا تو وہ فوراً مدافعانہ لہجے میں بولا۔

''جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھ سے ایک درخواست کی تھی کہ میں اسے ذرا آگے تک چھوڑ دوں، پھر وہ میری جیپ میں سوار ہو گیا تھا۔ تھوڑی دور اسے اتار کر میں آگے بڑھ گیا تھا۔'' انسپکٹر خضر کو اس کا یہ جواب نہ صرف، سراسر کھوکھلا، بلکہ مبنی بر جھوٹ بھی محسوس ہوا تھا۔ تاہم وہ بولا۔

''بتا سکتے ہیں آپ کہ اسے آپ نے کون سی جگہ پر اتارا تھا...؟''

''میں اس علاقے سے کچھ زیادہ شناسا نہیں ہوں۔ بھلا اس جگہ کا کیا نام بتا سکتا ہوں؟''

''پھر تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں، آپ نے زوار خان کو اتارا تھا۔'' خضر نے سنجیدگی سے کہا تو آصف علی خان یک دم بھڑک کر بولا۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں، انسپکٹر صاحب...؟''

''میں جو چاہتا ہوں، وہ آپ یہاں اپنے کاٹیج میں دیکھ کر اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے۔ قانون سے تعاون کرنا تو ویسے بھی آپ کا فرض بنتا ہے، چہ جائیکہ زوار خان کی آخری ... ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، وہ بلاشبہ آپ ہی تھے۔ میں آپ کو تھانے لے جا کر بھی یہ ساری پوچھ گچھ کر سکتا تھا مگر میں نے ذرا لحاظ سے کام لیا۔ مت بھولیں کہ زوار خان کی گمشدگی کے تانے بانے آپ ہی کے ساتھ نتھی محسوس ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں تو آپ کا ہم سے تعاون کرنا اور بھی لازمی بنتا ہے... بہ صورتِ دیگر میں آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کر سکتا ہوں، مجھے یہاں کے مقامی لوگوں سمیت بڑے خان کا خصوصی تعاون بھی حاصل ہے... اس لیے کہ علاقے میں گمشدگی کی یہ تیسری واردات ہے۔''

انسپکٹر بھی گویا بھرا بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب کسی ملزم کے گرد تفتیش کا دائرہ کار تنگ ہونے لگتا ہے تو وہ اسی طرح بیزار اور عدم تعاون پر اتر آتا ہے۔ لگے ہاتھوں خضر حیات نے ''بڑے خان'' کا تڑکا بھی لگا دیا جس پر اس کی چالاک ملازمہ نسیم اکڑ رہی تھی۔

''میں بھی اپنے یہاں خاصے اچھے تعلقات رکھتا ہوں۔'' جواباً وہ بھی تلخ لہجے میں بولا۔ ''چلیں، میں آپ کے ساتھ چلنے پر تیار ہوں لیکن اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ میں یہاں سیر و شکار کی غرض سے آیا ہوں خوامخواہ کسی قانونی معاملات میں پڑ کر اپنی تفریح کا بیڑا غرق کرنے نہیں...''

''اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہم آپ سے پوری طرح مطمئن ہو جائیں...'' خضر نے بھی ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

یہ لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ آصف خان کی سفید جیپ آگے تھی اور خضر حیات کی پیچھے۔

''سر...! مجھے تو اب سو فیصدی یقین ہو چلا ہے کہ اسی نے زوار خان کو کہیں گم کیا ہے اور پچھلی ایسی ہی دو وارداتوں میں بھی اسی کا ہی ہاتھ ہوگا۔ آصف خان مجھے بردہ فروشوں کے کسی منظم گروہ کا ایجنٹ لگتا ہے۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان، جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار، سامنے جاتی ہوئی آصف علی خان کی سفید جیپ پر بدستور نظریں گاڑے ہوئے، اے ایس آئی دلبر شاہ نے انسپکٹر خضر سے کہا۔

''ہاں...! اب تک کے شواہد سے تو یہی لگتا ہے مگر ابھی بھی ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' خضر حیات نے ہولے سے کہا۔ اس کی نظریں بھی ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔

''زوار خان کا رومال اس کی جیب سے برآمد ہوا ہے سر...!'' اے ایس آئی دلبر پورے جوش سے بولا۔ ''اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں اسے تھانے لے جا کر دبکا شبکا لگاتے ہیں، خود ہی سب سچ سچ بتا دے گا۔''

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے... ایسے چالاک مجرموں پر سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا پڑتا ہے۔ ہر مجرم کی الگ کٹیگری اور ڈگری ہوتی ہے۔ غلط ڈگری استعمال کرنے

سے الٹا مجرم کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بعد میں وہ مجرم سے مظلوم بن کر کورٹ میں پولیس کے خلاف آن کھڑا ہوتا ہے۔'' انسپکٹر خضر نے گھاگ لہجے میں کہا۔

سفر جاری رہا، جو کم و بیش نصف گھنٹے تک محیط تھا۔ ایک مقام پر آصف نے اپنی گاڑی روک دی۔ دلبر نے بھی جیپ اس کے قریب کھڑی کر دی اور نیچے اتر آئے۔ جہاں وہ رکے تھے، وہ کوئی قابلِ ذکر جگہ نہ تھی۔ یہاں گھاس کا میدان، درخت اور چہار اطراف پہاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ ہی آس پاس نزدیک میں کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

''دیکھ لیں اچھی طرح انسپکٹر صاحب...! یہ ہے وہ جگہ، یہاں زوار خان اتر گیا تھا میری گاڑی سے...'' آصف نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

انسپکٹر خضر نے اریب قریب کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد معنی خیز لہجے میں آصف سے کہا۔ ''زوار خان کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ وہ اس وقت کام پر تھا۔ شام چار بجے فارغ ہو کر ہی وہ سیدھا اپنے گھر جاتا تھا۔ جبکہ میری معلومات کے مطابق اسے آج کام پر آئے ہوئے ابھی دو تین گھنٹے ہی ہوئے تھے، اور وہ آپ کے ساتھ کام چھوڑ کر کیوں کر چل پڑا...؟ پھر بھلا اسے یہاں ویرانے میں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ساری باتیں میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہیں۔''

''تو پھر آپ کو اپنا حلق بڑا کروانا پڑے گا انسپکٹر صاحب...! میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے، میں چلتا ہوں...'' آصف خان نے بھنا کر کہا، پھر غصے سے اپنا پاؤں پٹخ کر اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔ انسپکٹر خضر کا چہرہ جوش غیظ کے مارے سرخ ہو گیا۔ اس نے دلبر شاہ سے کڑک دار لہجے میں تحکمانہ کہا۔

''دلبر شاہ...! اس شخص کو گرفتار کر لو، اب اسے تھانے لے جا کر ہی بات ہوگی۔''

دلبر شاہ پہلے ہی اس حکم کا منتظر تھا۔ وہ فوراً آگے بڑھا اور آصف کے ہتھکڑیاں لگا دیں۔

☆☆☆

فوزیہ کو ہوش آیا تو اس نے خود کو خشکی پر پڑے پایا۔ یہاں نالے کا پاٹ قدرے کشادہ تھا اور چوڑا تھا۔ جس کے باعث پانی کا بہاؤ بھی کم تھا۔ ایک موڑ پر آنے کے باعث خوش قسمتی اس کا بے سدھ وجود کنارے جا لگا تھا۔ یہاں جابجا نکیلے پتھر بھی ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پانی بھی یہاں نسبتاً کم ہی گہرا تھا۔ وہ ان پتھروں کے درمیان پھنس گئی تھی۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور ہانپتی کانپتی کنارے پہ آ کر بے دم سی ہو کر گر پڑی۔

چند ثانیے گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ خاصی دیر تک تو اسے اس بات کا بھی ادراک نہ ہو سکا تھا کہ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ کوئی دم کو سپیدہ سحر نمودار ہونے والی تھی۔ اطراف میں تاریکی اور سناٹا تھا۔ فوزیہ کے حواس ٹھکانے آئے تو اسے سب یاد آ گیا۔ وہ تڑپ اٹھی اور توقیر کو پکارنے لگی۔ کبھی جنگل کی طرف منہ کر کے تو کبھی نالے کی سمت اسے آواز لگاتی۔ وہ نالے کے کناروں پہ ابھرے نکیلے پتھروں کی طرف بھی اسے تلاش کرنے گئی کہ شاید اس کی طرح وہ بھی کہیں اٹکا ہوا نظر آ جائے مگر توقیر اسے نظر نہ آیا۔ نہ ہی پکارنے پر اس کا کوئی جواب پلٹا۔

فوزیہ، شوہر کی طرف سے بری طرح تفکر و تشویش کا شکار ہو گئی۔ رات کے اس سمے، تنہا، ویران اور تاریک جنگل میں اسے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر زیادہ اسے توقیر کی طرف سے فکر و پریشانی لاحق تھی۔ اس نے بے اختیار دکھ اور کرب کی شدت سے رونا شروع کر دیا۔ سو طرح کے جان لیوا خدشات اور وسوسے اس کے رنجیدہ دل و دماغ میں سر اٹھا رہے تھے۔ اس نے ہذیانی انداز میں ایک بار پھر توقیر کو پکارنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کا گلا دکھنے لگا اور وہ وہیں بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ اگرچہ وہ اب بھی اپنے حواسوں میں تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ روتی رہی پھر اس نے سوچا اس طرح رونے سے کوئی فائدہ نہیں، کسی محفوظ راستے پر ہو لینا چاہیے شاید کوئی آبادی یا گھر ہی نظر آ جائے اور توقیر کی تلاش وغیرہ کے سلسلے میں کسی سے مدد لی جا سکے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

جنگل میں ہولناک خاموشی طاری تھی۔ البتہ دور کہیں جنگلی جانوروں کے رونے چلانے کی بھی آواز سنائی دے جاتی۔ پورے چاند کی روشنی کسی حد تک اجالا کیے ہوئے تھی۔ اسے ایک ناپختہ راستہ دکھائی دے گیا۔ اس نے سوچا، ضرور یہ راستہ کسی قریبی آبادی تک جاتا ہوگا... وہ اس پر ہو لی۔ اس کا پورا وجود فکر و آلام کے باعث خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ فوزیہ ایک عام سی گھریلو عورت تھی۔ اس قسم کے سنسنی خیز اور خطرناک

حالات سے اس کا آج تک پالا نہیں پڑا تھا۔
ابھی وہ بہ مشکل تیس، چالیس قدم ہی چلی ہو گی کہ اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ اس کے دائیں جانب گھنے درختوں کا سلسلہ تھا اور اس کے جھنڈ میں گھری اس کی نظر ایک لکڑی کی بوسیدہ سی عمارت پر پڑی... عمارت زیادہ بڑی نہ تھی۔ فوزیہ کو حیرت ہوئی کہ اس ویران جنگل میں یہ عمارت کیسی...؟ دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس نے سوچا، ضرور یہ کوئی سرکاری ڈاک بنگلا یا ریسٹ ہاؤس ہو سکتا ہے۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا، یہ سوچ کر کہ... یہاں اسے عارضی پناہ کے علاوہ مدد بھی مل سکتی ہے۔ تنہائی کا خوف، البتہ ہنوز دامنِ گیر تھا۔ اس نے بوسیدہ عمارت کی طرف قدم بڑھا دیے۔

قریب پہنچی تو چاند کی طلسماتی روشنی میں قدیم طرزِ تعمیر کی حامل یہ بوسیدہ عمارت خاصی پُراسرار معلوم ہوئی۔ یہ ایک منزلہ عمارت تھی جس کا احاطہ برائے نام تھا اور لکڑی کا گیٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ فوزیہ نے داخلی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ گیٹ تک پہنچی، پھر لرزیدہ ہاتھوں سے دروازے کو تھوڑا دھکیل کے دیکھا تو وہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

وہ مرتعش قدموں کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ اندر ہلکی روشنی تھی۔ جس کا مخرج معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اندر خاموشی تھی اتھاہ خاموشی... کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیا۔ تاہم باہر ویران تاریک جنگل کے بجائے یہاں اسے ایک عجیب سا سکون بھی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اندازے سے سامنے والے ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی کوئی نہ تھا۔ کمرا کشادہ تھا اور آرام دہ بھی نظر آتا تھا۔ محسوس ایسا ہی ہوتا تھا کہ کوئی یہاں رہتا ہے... کم از کم کوئی رکھوالا یا چوکیدار تو ضرور ہی ہو گا۔ اس نے سوچا مگر اسے حیرت تھی کہ عمارت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے وقت یہ بات تعجب انگیز تھی اور اس سے زیادہ پُراسرار بھی۔ فوزیہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا ستا لینا چاہتی تھی۔ اور شاید کسی کا انتظار بھی کرنے لگی۔ مگر زیادہ دیر تک اس سے یوں کسی کا منتظر ہو کے بیٹھ رہنا، عجیب لگا۔ اسے اپنے شوہر کی فکر ستا رہی تھی کہ نالے میں گرنے کے بعد وہ کہاں تھا؟ کس حال میں تھا...؟

بادلِ ناخواستہ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دو تین بار بلند آواز میں پکارنے لگی۔
''کوئی ہے...؟ یہاں کوئی ہے...؟'' مگر جواب ندارد، اس نے سوچا... لحہ بہ لحہ اس کے ٹھٹکے ہوئے دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک پریشانی پہ دوسری پریشانی غالب آتی جا رہی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ اوپر جانے کے لیے زینہ تلاش کر رہی تھی۔ ابھی اس نے چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ٹھٹکی... آواز کمرے کے دروازے کے باہر سے آئی تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ جو کوئی بھی تھا، اسی طرف آ رہا تھا۔

''کک... کون...؟ کک... کوئی ہے...؟'' اس نے لرزیدہ آواز میں پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا... وہ بدستور بڑھتی رہی، کمرے سے نکلی تو دائیں جانب اسے وہ زینہ نظر آ گیا۔ جو اوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زینے کی طرف بڑھی اور ابھی اس نے پہلا قدم زینے پر رکھا ہی تھا کہ ایکا ایکی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی یکدم اس کے بالکل عقب میں ہو... اس نے دبے دبے خوف سے اپنی گردن بتدریج موڑی اور غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے چیخ سی خارج ہو گئی۔ یہ اس کا فطری ردِعمل تھا، ورنہ اس کے پیچھے جو شخص کھڑا تھا، وہ ایک خوبرو اور پُروجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔

وہ فوزیہ کو دیکھ کر شائستہ انداز میں مسکرایا تھا اور اسی حلیم طبعی سے بولا۔
''سوری...! میرا مقصد آپ کو خوف زدہ کرنا نہیں تھا۔''

فوزیہ کو وہ معقول آدمی ہی نظر آیا تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوصف فوزیہ کو اس بہ ظاہر بھلے مانس آدمی کی مسکراہٹ، حلیم طبعی میں ایک بے تاثرپن بھی محسوس ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی بہ ظاہر مسکراتی آنکھیں بھی ہر قسم کے تاثرات سے عاری محسوس ہوئی تھیں۔ وہ بیک وقت عجیب شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔

جب وہ بولا تو اس کا لہجہ اگرچہ پُراخلاق اور معذرت خواہانہ تھا مگر محسوس کرنے پر سرد اور پُراسرار تھا۔
''خاتون! معافی چاہتا ہوں، اگر میں پہلے ہی آپ کو آواز دے کر پکار لیتا تو شاید آپ اتنی ہراساں نہ ہوتیں۔''
یہ کہہ کر وہ بڑے غور سے فوزیہ کا سرتاپا جائزہ لینے لگا... فوزیہ کو اس کی نظروں کی سرد مہری صاف محسوس ہوئی تھی۔ اس کا جانے کیوں جی گھبرانے لگا تھا...
فوزیہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہیں اس عجیب شخص کے عقب میں پڑیں اور دوسرے ہی لمحے فوزیہ

اپنے حلق سے بے اختیار برآمد ہونے والی چیخ کو روک نہ سکی تھی۔ اس آدمی نے بھی قدرے پریشان ہو کر اپنی گردن موڑ کے پیچھے دیکھا تھا...

☆☆☆

وہ اسے پولیس اسٹیشن لے آئے تھے۔ آصف سارے راستے تلملاتا رہا تھا اور ساتھ ہی انسپکٹر خضر کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیے جا رہا تھا۔

انسپکٹر خضر نے اسے لاک اپ کرنے کے بعد دلبر شاہ کو حکم دیا کہ وہ مکرم شاہ کے فارم پر کام کرنے والے احمد علی نامی آدمی کو بلا لائے۔ تھوڑی دیر بعد ہی احمد علی کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے آخری بار آصف علی خان کو پرانی باؤلی والے نالے کے پاس زوار خان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر آصف کو بھی پیش کیا گیا۔

احمد علی نے آصف کو پہچان کے فوراً اس بات کی تصدیق بھی کر ڈالی کہ یہی وہ شخص تھا جسے اس نے زوار خان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد انسپکٹر خضر نے آصف خان سے کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ اب تم اپنا جرم قبول کر لو اور زوار خان کے بارے میں بتا دو کہ تم نے اسے کہاں گم کیا ہے؟''

''انسپکٹر صاحب! میں ایک شریف آدمی ہوں اور شکار کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا بلکہ آتا ہی رہتا ہوں۔ کیا آپ مکرم شاہ کو جانتے ہیں...؟ میرے ان سے اچھے دوستانہ تعلقات ہیں... وہ بھی میری ضمانت دے سکتے ہیں...'' آصف نے کہا۔

''اس سے پہلے تم کتنی بار یہاں آ چکے ہو...؟''

''دو بار آ چکا ہوں... تیسری بار یہاں آیا تو اس مصیبت میں پھنس گیا۔''

''ٹھیک ہے، ابھی تمہیں حوالات میں ہی رہنا ہوگا۔ میں کل صبح مکرم شاہ سے مل کر تمہارے بارے میں پوچھوں گا...''

''تت... تو کیا میں آج رات حوالات میں گزاروں گا...؟'' آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں۔''

''یہ زیادتی ہے انسپکٹر...! آپ ماورائے قانون اختیارات کا استعمال کر کے ایک شریف شہری کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، بغیر ثبوت کے آپ مجھے ایک دن بھی حوالات میں نہیں رکھ سکتے... میں آپ پر حبسِ بے جا کا کیس دائر کر دوں گا۔''

''بصد شوق۔'' انسپکٹر خضر نے بے نیازی سے کہا اور پھر دلبر شاہ کو مخصوص اشارہ کیا، وہ اسے لے گیا۔

اگلے دن انسپکٹر خضر، مکرم شاہ کی حویلی پہنچا۔ وہ ایک پچاس سالہ اچھی صحت کا مالک آدمی تھا۔ خضر حیات کو دیکھتے ہی وہ پریشانی سے بولا۔

''ارے انسپکٹر صاحب...! آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہو... میں خود ابھی آپ کی طرف آنے والا تھا... بیٹھو... بیٹھو...''

''خیریت تو ہے شاہ صاحب...؟'' ان کی حویلی کی پُرتزئین نشست گاہ کے ایک نفیس و گداز صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے، قدرے چونک کر بولا۔

''خیریت کہاں... میرا بیٹا توقیر شاہ اور بہو کل رات اپنے کسی عزیز کی تلاش میں نکلے تھے۔ صبح ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں لوٹے ہیں...'' مکرم شاہ نے تفکر آمیز لہجے میں بتایا تو انسپکٹر خضر حیات کی پیشانی پر پُرسوچ شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔

''آپ نے اپنے طور پر بیٹے اور بہو کی تلاش میں کچھ کیا...؟''

''ہاں!'' مکرم شاہ بولا۔ ''میں نے تو صبح تڑکے ہی اپنے آدمیوں کو روانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ ان کا کچھ اتا پتا نہیں ملا... مجھے بالکل چین نہیں آ رہا ہے انسپکٹر...! بہت تشویش اور پریشانی ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کروں...؟''

مکرم شاہ بیٹے اور بہو کی طرف سے بہت فکرمند ہو رہا تھا۔

انسپکٹر خضر حیات خود سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ تو یہاں مکرم شاہ کے پاس مشتبہ شخص آصف علی خان کے بارے میں کچھ پوچھنے آیا تھا، مگر یہاں تو خود مکرم شاہ اپنے بیٹے اور بہو کی طرف سے پریشان تھا، ایسے میں خضر حیات نے حوالاتی آصف علی کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا... تاہم پھر بھی وہ موقع کا منتظر تھا۔ چنانچہ وہ مکرم شاہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''شاہ صاحب...! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں بھی ابھی جا کر ایک پولیس کے کھوجی دستے کو آپ کے بیٹے اور بہو کی تلاش میں روانہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے رات میں ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہو اور وہ کہیں جنگل میں مدد کے منتظر ہوں، موسم بھی تو رات بہت خراب تھا۔''

''ہاں...! یہی تو پریشانی ہے، خدا کرے کہ دونوں خیریت سے ہوں۔ تمہارا بھی شکریہ، ویسے میں نے بھی اپنے آدمی بھیج رکھے ہیں۔''

''بہت اچھا...''

''تم بتاؤ انسپکٹر...! کیسے آنا ہوا... میں تو پوچھنا ہی بھول گیا۔'' بالآخر مکرم شاہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

''شاہ صاحب! آپ کسی آصف علی خان سے واقف ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ شکار وغیرہ کے سلسلے میں یہاں آتا رہتا ہے اور آپ سے بھی اس کے اچھے دوستانہ مراسم ہیں؟''

''آصف علی...؟'' مکرم شاہ کچھ یاد کرنے کے انداز میں قندِ مکرر ہوا پھر جب انسپکٹر خضر حیات نے..... صراحت کے ساتھ اسے حقیقت گوش گزار کی تو کہیں جا کر مکرم شاہ کو کچھ یاد آ سکا اور وہ بولا۔

''ہاں! میں اسے جانتا ہوں مگر یہ شناسائی زیادہ پرانی ہے نہ اتنی گہری... بس ایک دن سرسری سی ملاقات ہو گئی تھی اور بس...''

''مگر وہ تو کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اس کے گہرے دوستانہ مراسم ہیں، یہاں تک کہ آپ اس کی ضمانت دینے کو بھی تیار ہو جائیں گے؟''

''میں نے کہا نا کہ میرے اس سے زیادہ یا پرانے مراسم نہیں ہیں بلکہ مراسم بھی کیا سرسری انداز میں سلام دعا ہوئی تھی اور بس، رہی بات میری اسے ضمانت دینے کی تو مجھے اس کے لیے معذرت ہی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ میں اسے زیادہ ... نہیں جانتا بلکہ میں تو اس کا نام بھی بھولا ہوا تھا۔ ابھی تم نے اس کا میرے سامنے تفصیلی تذکرہ کیا تو مجھے یاد آیا۔''

''بہت شکریہ شاہ صاحب...! میں اب چلوں گا...'' انسپکٹر خضر حیات مطمئن ہو گیا تھا۔ پھر وہ مکرم شاہ سے رخصت ہو کر سیدھا تھانے پہنچا۔

''میں مکرم شاہ سے ملاقات کر آیا ہوں اور اس سے تمہارے بارے میں بھی پوچھ لیا۔''

انسپکٹر خضر حیات نے تھانے پہنچ کر آصف کو طلب کر کے اسے بتایا، اور پھر مکرم شاہ نے اس کے بارے میں جو کہا، وہ اسے بتا دیا۔

''اب کیا کہتے ہو؟ تمہارا یہ اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر تو نشانے پر نہیں لگا؟'' خضر نے طنزیہ لہجے میں اپنے سامنے ہتھکڑی لگے آصف علی کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ پریشان نظر آنے لگا پھر بولا۔

''لیکن میں دو تین بار یہاں آ چکا ہوں۔ اس بات کی تو مکرم شاہ نے تصدیق کی ہوگی؟''

''ہاں! مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' خضر حیات نے یقین نہ کرنے والے انداز میں اپنے شانے اچکا کر کہا۔ تو آصف دانت پیس کر بولا۔

''اس سے یہ ہوتا ہے انسپکٹر صاحب کہ اگر مجھے کوئی جرم کرنا ہوتا تو پہلے بھی کر چکا ہوتا۔''

''ممکن ہے تم نے پہلے بھی جرم کیا ہو مگر اس بار تم نہیں بچ سکے...'' خضر نے کہا اور وہ بُری طرح تلملا کر رہ گیا۔

''گویا آپ مجھے زبردستی مجرم بنانے پر تلے ہوئے ہیں؟''

''مجرم بنانے پر نہیں، جرم اگلوانے پر۔''

''دیکھو انسپکٹر! تمہیں میرے بارے میں بہت شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو...''

''تو پھر کون ہو تم...؟''

''میں ایک عام اور امن پسند شریف شہری ہوں۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

''نہیں''

''حیرت ہے، تمہاری عمر چالیس سے اوپر ہے، کھاتے پیتے انسان بھی نظر آتے ہو پھر ابھی تک تم نے شادی کیوں نہیں کی؟'' انسپکٹر خضر کو بسا اوقات غیر متعلقہ سوالات بھی پوچھنا پڑتے تھے... اگرچہ یہ بھی تفتیش کا ایک طرح سے حصہ ہی ہوتے ہیں۔

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے... نان آف یور بزنس...''

''بہت سے ذاتی معاملات میں کبھی کبھی جرم بھی پوشیدہ ہوتا ہے...'' انسپکٹر خضر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اور آگے مستفسر ہوا۔ ''تمہارے ماں باپ، بہن بھائی...؟''

''میں دنیا میں اکیلا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ایبٹ آباد میں کونسی جگہ رہتے ہو؟ اور وہاں کس بینک کے اے وی پی ہو؟''

جواباً آصف علی خان نے اسے ایبٹ آباد میں اپنی رہائش گاہ کا پتا نوٹ کروا دیا۔

''اس بینک کا بھی پتا چاہیے مجھے جہاں تم نوکری کرتے ہو...''

''کرتا تھا، اب میں نے وہ نوکری چھوڑ دی ہے۔''

''ٹھیک ہے باوجود اس کے مجھے اس بینک کا پتا چاہیے...'' خضر نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور بھانپتی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آصف خان کچھ متذبذب اور پریشان سا نظر آنے لگا، بالآخر اسے پتا

لکھ کر دینا پڑا۔

اسی روز انسپکٹر خضر نے دونوں پتے دلبر شاہ کو تھما کے اسے شہر بھیج دیا کہ وہ جا کے آصف علی خان کے بارے میں تفصیلی پوچھ تاچھ کرے۔ دلبر شاہ روانہ ہوگیا۔ سہ پہر کو اس کی واپسی ہوئی تو وہ خاصا پُرجوش نظر آرہا تھا۔ اس نے انسپکٹر خضر کے سامنے مشتبہ ملزم آصف علی خان کے بارے میں بڑے سنسنی خیز انکشافات کیے تھے۔

☆☆☆

وہ جو کوئی بھی تھا بہت کریہہ صورت آدمی تھا...

اس کی آنکھوں سے بھی سنگ دلی مترشح ہورہی تھی۔

وہ خاصے اونچے لمبے اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ رنگت سیاہ تھی۔ آنکھیں موٹی اور کسی بیل کی طرح بھدی اور ابھرواں تھیں۔ چہرے پر دحشت سی برس رہی تھی۔

''یہ کیدار ہے، میرا ملازم، اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں... اس کی صورت ہی ایسی ہے۔'' اس خوبرو شخص نے ہلکی مسکراہٹ سے فوزیہ کے سراسیمہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا پھر کیدار سے تحکمانہ بولا۔ ''تم جاؤ یہاں سے۔''

کیدار نامی یہ عجیب و غریب ملازم، فوزیہ کو عجیب عجیب نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ شخص دوبارہ فوزیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آیئے محترمہ...! اندر آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ شاید کسی مصیبت میں لگتی ہیں، میں شاید آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک کمرے کی طرف بڑھا اور فوزیہ بھی جیسے میکانکی انداز میں اس کے عقب میں ہولی۔ دونوں اندر آکر آمنے سامنے کی نشستوں پر براجمان ہوگئے۔ فوزیہ کا دل گھبرانے لگا تھا۔

''میرا نام آذر نقاش ہے۔ میں کافی عرصے سے یہاں مقیم ہوں، اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ...'' اس نے اپنا تعارف کروانے کی ابتدا کی... دوستوں کے ذکر پر فوزیہ کا چہرہ متغیر سا ہوا، جسے فوراً بھانپ کر آذر نقاش مسکراتے ہوئے بولا۔

''تسلی رکھیے... یہاں میرے اور کیدار کے سوا اور کوئی نہیں رہتا... جبکہ میرے دوست'' وہ کچھ کہتے کہتے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کے فوزیہ سے مستفسر ہوا۔

''آپ، اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟''

فوزیہ نے اپنا سوکھا حلق تر کیا اور پھر اسے اپنی پریشانی کا سبب اور یہاں آنے کا مقصد مختصراً تفصیل سے بتا دیا۔ آذر نقاش بہ غور اس کی بات سنتا رہا۔ چند ثانیے تک جانے کیوں اسے ایک چپ سی لگی رہی، پھر یک دم وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر بولا۔

''آپ کی مدد کر کے یقیناً مجھے خوشی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں اور پریشان بھی مت ہوں، آپ کے شوہر توقیر شاہ اور بھائی ریاض خان کو میرا ملازم کیدار ہی تلاش کرلے گا، وہ مقامی آدمی ہے اور تجربہ کار بھی، اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ آپ ریلیکس ہوجائیں، چلیں آئیں اوپر چلتے ہیں، وہیں کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست ہے۔ میں آپ کا کمرا بھی دکھا دوں، آپ کو اعصابی سکون کی ضرورت ہے۔ اور ہاں اوپر میرے دوست بھی ہیں، ان سے مل کر یقیناً آپ کو بھی خوشی ہوگی۔ آیئے پلیز...''

فوزیہ اس کے دوستوں کے ذکر پر ایک بار پھر پریشان ہوگئی اور اسی لہجے میں بولی۔ ''اس کی ضرورت نہیں، میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔'' آذر نقاش اس کی پریشانی بھانپ کر عجیب اسرار بھری مسکراہٹ سے بولا۔

''میرے دوست بالکل بے ضرر ہیں، پھر اس کمرے میں سردی بھی بہت ہے، پلیز، میرے خلوص پر شبہ نہ کریں۔''

ناچار فوزیہ کو اٹھنا پڑا اور پھر آذر کے عقب میں چلتی ہوئی اوپری منزل پر آگئی، یہاں آکر فوزیہ کو کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ ایک ناقابلِ بیان اور ناگواری بو اس کمرے میں رچی ہوئی تھی۔ یہ ہال نما کمرا تھا، مگر نشست گاہ یا خواب گاہ قسم کا کمرا نہیں لگتا تھا۔ البتہ مختصر سا فرنیچر موجود تھا، جو کہنہ سالی کا منظر پیش کرتا تھا۔

فوزیہ نے بڑے غور سے اس ہال کمرے کا جائزہ لیا اور چونک سی گئی، اور اس نے پھر قدرے سکون کی سانس لی تھی، اب اس کے اندر کا ڈر اور خوف ختم ہوچکا تھا بلکہ وہ ہولے سے دل میں مسکرائی بھی تھی۔ یہ شخص اسے واقعی بے ضرر اور معصوم سا ہی لگا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر اس بھلے مانس آدمی نے اتنا خوفناک صورت ملازم کیوں رکھا تھا۔ شاید اس میں اس کی کوئی مجبوری ہو...؟

کمرے کا جائزہ لیتے ہی فوزیہ کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ آذر نامی یہ آدمی کون تھا اور کیا کرتا تھا، یہ اندازہ اسے کمرے میں پھیلی بے ترتیب اشیا دیکھ کر ہوا تھا۔ ادھورے مجسمے، لوہے کی چھینیاں، چھوٹی چھوٹی ہتھوڑیاں، سمبیاں، پلاسٹر آف پیرس قسم کے مصالحہ جات اور کیمیکل اور وہ سب کچھ جو ایک مجسمہ ساز کے زیرِ استعمال اشیا ہوسکتی تھیں۔

فوزیہ نے دل میں کہا۔ ''ہوں...! تو یہ شخص ایک مجسمہ ساز ہے۔'' ساتھ ہی اسے تسلی بھی ہوئی کہ فنونِ لطیفہ

سے تعلق رکھنے والا یہ شخص بھلا اسے کیا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ وہ اب اس شخص سے مدد کے لیے بھی خاصی پُرامید ہونے لگی تھی۔ ''مگر اس کے دوست؟'' ایک کھٹک باقی رہی تو وہ پھر کچھ بے چین سی ہوگئی۔

''تشریف رکھیے...'' آذر نقاش نے اسے خیالوں میں کھویا پا کے مسکرا کے کہا مگر فوزیہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اسے دائیں بائیں کچھ مجسمے ایستادہ حالت میں بھی کھڑے دکھائی دیے تھے۔ جنہیں پلاسٹک کی شفاف شیٹوں سے ڈھانپ کر رکھا تھا۔ آذر اس کے قریب کھڑا، اس کے اشتیاق کا اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پہ اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری اور پھر اس نے فوراً آگے بڑھ کر وہاں موجود مجسموں کے اوپر سے پلاسٹک کی شیٹس اٹھا دیں۔

''میرے دوستوں سے ملیں...'' آذر نقاش نے مسکرا کر فوزیہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فوزیہ کی یک ٹک نگاہیں ان مجسموں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پہ سنسنی خیزی اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ جانے کیوں پلکیں جھپکائے بغیر ان مجسموں کو تکتی رہ گئی۔ اسے ان پر حقیقت کا گماں ہونے لگا بہت ''پرفیکشن'' اور صفائی تھی آذر کے کام میں۔ اسے قائل ہونا پڑا کہ آذر واقعی ایک اعلیٰ پائے کا فنکار تھا۔ وہ اپنے کام میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ فوزیہ کو اس کے فن کا معترف ہونا پڑا۔

مجسموں کی تعداد سات، آٹھ کے قریب تھی۔ ان میں چند ادھورے اور نامکمل بھی تھے، ان میں کچھ انسانی شکل سے مشابہ ماسک نما چہرے بھی تھے جن کی بظاہر کوئی شبیہ نہ تھی، فوزیہ نے اس کے بارے میں آذر نقاش سے پوچھا کہ ان مجسموں میں یہ انسانی چہروں سے مشابہ سپاٹ ماسک کا کیا ہے؟ تو وہ جواباً اسرار بھری مسکراہٹ سے بولا۔

''کبھی کبھی کسی مجسمے کا چہرہ سپاٹ بھی رکھنا پڑتا ہے یا تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ تب میں اس کے چہرے پر یہ ماسک لگا دیتا ہوں اور اس کے اوپر نقوش کے اسٹروکس لگاتا ہوں۔ اس سے یہ مشکل کام تھوڑا آسان ہوجاتا ہے۔''

فوزیہ کے حلق سے آذر کی یہ بات نیچے نہیں اتری تھی، تاہم وہ خاموش رہی۔

نجانے ان مجسموں میں ایسا کیا سحر تھا کہ وہ اپنی پریشانی... تک کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا بیٹھی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی اور باری باری ہر ایک مجسمے کے قریب جا کے بہ غور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ان مجسموں کو دیکھتے ہوئے فوزیہ کو ایک بات خاص طور پر محسوس ہوئی کہ ان مجسموں کے چہروں پہ مختلف کیفیات و تاثرات جیسے دائمی طور پر ثبت کردیے گئے تھے۔ کوئی چہرہ اداسی لیے ہوئے تھا۔ کوئی خوف زدہ تھا۔ ایک عورت کا چہرہ بھی کرب میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک مرد کے مجسمے کے چہرے پر بڑے پُرغیظ اور طیش کے تاثرات بھی ثبت نظر آئے۔ بے چارگی لیے ہوئے چہرے بھی تھے۔ ایک عورت کے مجسمے کو بے اختیار اس کا چھونے کو جی چاہا تو فوزیہ نے ابھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ قریب کھڑے آذر نقاش نے اسے ٹوک دیا۔

''نا... نا... انہیں ابھی چھونا مت... آپ کے چھونے سے اسٹروکنگ ہوجائے گی۔''

فوزیہ نے ہولے سے ''سوری'' کہہ کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''عنقریب میرے بارہ مجسموں کی فرانس میں نمائش ہونے والی ہے، یہ بین الاقوامی مجسمہ سازی کی نمائش ہوگی، تیرہ ممالک کے مجسمہ ساز اس نمائش میں حصہ لینے والے ہیں۔''

آذر نقاش نے بتایا۔ وہ اب ایک قریب ہی اسٹول نما کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ فوزیہ کی تھکن جاگ اٹھی تھی۔ لہٰذا اس نے بھی ایک کرسی سنبھال لی تھی۔

''آپ بلاشبہ بہت اچھے فنکار ہیں۔ بے داغ کام ہے آپ کا۔ ذرا بھی جھول نظر نہیں آتا۔'' فوزیہ نے گویا نقاد کی سی رائے دی۔ فوزیہ کے توصیفی کلمات پر آذر نقاش کے چہرے پہ پُرغرور مسکراہٹ اُبھری۔ فوزیہ کو جانے کیوں اس

کی مسکراہٹ بالکل اچھی نہیں لگی۔
''آپ تو نقاد لگتی ہیں؟''
''ایسی بات تو نہیں، ویسے بھی ایک فنکار کا فن دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ اور پھر اس سے استفادہ کرنے والے عام افراد کو اتنا شعور تو آ ہی جانا چاہیے کہ وہ فن کار کے کام پر کم از کم اچھے بُرے کی تنقید تو کر سکے...''
''سردی بہت ہو رہی ہے... میں آپ کے لیے گرما گرم کافی بناتا ہوں۔ مجھے بھی طلب ہو رہی ہے۔'' آذر نے کہا اور جلدی سے اٹھا۔ کچن دور نہیں تھا۔ اسی کمرے کے پاس ہی کہیں تھا۔ وہ وہاں چلا گیا۔ فوزیہ کو ایک بار پھر نامعلوم سی بے چینی نے گھیر لیا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اٹھی اور ایک بار پھر مجسموں کے قریب جا کے باری باری ان کا غور سے جائزہ لینے لگی۔ پھر ایک کونے والے مجسمے کے پاس جا کر ٹھہر گئی... یہ ایک جوان عورت کا خوب صورت مجسمہ تھا۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں فوزیہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے پتا نہیں کیوں اس مجسمے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی تھی۔ وہ بہت قریب سے، بہت آگے جھک کر اس عورت کے مجسمے کو دیکھنے لگی۔ اسے مجسمے کے چہرے پر بے چارگی، دکھ اور التجا سی محسوس ہوئی۔ دفعتاً فوزیہ بری طرح چونکی اور بے اختیار ایک ہلکی سی سراسیمہ چیخ مار کے چند قدم پیچھے بھی ہٹ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ خود پر ہنس پڑی۔ مگر اسے یہ بات نہایت عجیب لگی تھی۔ کیونکہ جس عورت کا یہ مجسمہ تھا، وہ عورت اس کی شناسا تھی اور اس کا نام بھی اسے معلوم تھا۔ یعنی گلنار... اس نے سوچا یقیناً آذر نقاش نے اس عورت کو اپنے سامنے بٹھا کر اس کا یہ مجسمہ تراشا ہوگا۔ وہ پھر اسی مجسمے کے قریب بڑھی اور تب اس نے مجسمے کی آنکھوں میں چمک سی اُبھرتے محسوس کی۔ دوسرے ہی لمحے فوزیہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں... مجسمے کی ایک آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا تھا۔

☆☆☆

پہلا انکشاف دلبر شاہ نے یہ کیا کہ مشتبہ ملزم آصف علی خان ایک پرائیویٹ بینک میں فراڈ کے کیس میں ملوث رہ چکا تھا بلکہ ایک سال کی اسے قید بھی ہوئی تھی مگر وہ صرف تین ماہ جیل میں رہا، پھر اسے رہائی مل گئی۔ دوسرا انکشاف یہ تھا کہ اس کا اپنا بیک گراؤنڈ بھی کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ اس کا باپ بھی ایک بڑے مالیاتی ادارے میں فراڈ کے ایک کیس میں پکڑا گیا تھا۔ وہ تشدد پسند بھی تھا، اپنی بیوی، یعنی آصف علی کی ماں کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا، غصے کا تیز تھا۔ ایک دن اپنی بیوی پر اس نے اس قدر تشدد کیا کہ وہ بے چاری جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی۔ آصف علی خان اس وقت لڑکپن میں تھا۔ اس کے باپ کو عمر قید کی سزا ہو گئی اور جو جمع پونجی تھی، وہ آصف کے حصے میں آ گئی۔ اس نے باپ کو بھی جیل میں ہی الوداع کہہ دیا۔ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
آصف علی نے جیسے تیسے اپنی زندگی بنائی۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی نے شادی کے چند ماہ بعد ہی اس سے بیزار ہو کر اس سے خلع لے لی۔ جبکہ دوسری بیوی چند روز بعد ہی پُراسرار طور پر لاپتا ہو گئی اور اس کا آج تک پتا نہ چل سکا۔ اگرچہ آصف نے متعلقہ تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا رکھی تھی۔
''ہوں...''
آصف علی خان کے متعلق دلبر شاہ کے فراہم کردہ اس ''بائیوڈیٹا'' کو بغور سن کے انسپکٹر خضر نے ایک پُرسوچ ہمکاری بھری۔
''میرا تو خیال ہے سر! آپ آصف خان کے ساتھ بالکل بھی نرمی نہ برتیں اور اسے ذرا میرے ساتھ ''سرکاری مہمان خانے'' بھیجیں، پھر دیکھیں یہ دلبر شاہ کس طرح اس کا منہ کھلواتا ہے۔'' دلبر شاہ نے مشورہ دیا۔
خضر سوچ رہا تھا کہ آصف کے ساتھ واقعی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ بہ صورتِ دیگر وہ کبھی بھی اپنا جرم قبول لے گا نہ ہی کچھ بتائے گا بھی۔ چنانچہ اس نے دلبر شاہ کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔
اشارہ پاتے ہی دلبر شاہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ ٹھیک اسی وقت انسپکٹر خضر کی میز پر رکھے فون کی گھنٹی بجی، اور ایک اعلیٰ افسر کی کال پر ''مشکی'' ملزم آصف خان کے بارے میں خضر حیات کو فیصلہ بدلنا پڑ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ مذکورہ اعلیٰ افسر کی کال اٹینڈ کر کے اس نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ تھانے کے باہر ایک لمبی سی ڈبل کیبن جیپ آ کے رکی۔ اس میں سے ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا، اس کے ہمراہ چار عدد گن مین بھی تھے۔ یہ علاقے کی ایک بااثر شخصیت، علاقے میں ''بڑے خان'' کی معروفیت رکھتا تھا۔ وہ آصف علی خان کی ضمانت کے لیے آیا تھا۔
ناچار، خضر کو ''اوپر والوں'' کا حکم ماننا پڑا اور آصف علی خان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔
''سر! اگر اس طرح اوپر والوں کی مداخلت ہوتی رہی تو پھر ہم اپنا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں؟''
ان سب کے جانے کے بعد دلبر شاہ نے انسپکٹر خضر

سے قدرے تلملا کر اور بے بسی سے کہا تو خضر حیات پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔
''ایسا ہوتا رہتا ہے... دلبر! اس میں ہماری بھی غلطی ہے۔''
''کیا آصف علی کو پکڑنا ہماری غلطی تھی؟''
''نہیں مگر ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا۔''
''تو پھر اب آپ کی کیا رائے ہے؟''
''آصف خان پر کڑی نظر رکھنا ہوگی، اب اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا ہوگا۔'' خضر نے کہا۔
دلبر شاہ کو آصف علی خان کے کاٹیج پر خفیہ نگرانی کے لیے تعینات کرنے کے بعد خضر نے اپنی اس ٹیم کے سرکردہ ہیڈ کانسٹیبل غفور احمد سے رابطہ کیا جسے مکرم شاہ کی رپورٹ پر اس کے بیٹے تو قیر شاہ اور بہو فوزیہ کی تلاش پر مامور کیا گیا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔
انسپکٹر خضر ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچتا بن گیا۔ وہ زوار خان اور اس سے پہلے کے دو گمشدہ افراد، جن میں ایک جوان عورت بھی شامل تھی، کا موازنہ توقیر شاہ اور اس کی بیوی کی گمشدگی سے کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا یہ بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہے؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہ معاملہ بہت گمبھیر اور سنگین رخ اختیار کر سکتا تھا۔
انسپکٹر خضر کو اب اس بات کی تشویش ہونے لگی تھی کہ اگر حالات یہی رہے تو، حکامِ بالا کے سامنے اس کی کڑی جواب دہی ہو سکتی ہے... وہ اپنی کرسی پہ بیٹھ کر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔
انسپکٹر خضر ایک تجربہ کار اور گھاگ پولیس افسر تھا، وہ جوان تھا، پولیس کے محکمے میں اسے سات آٹھ سال ہو چکے تھے۔ مگر ان عرصے میں اس نے بڑے بڑے جفادری خطرناک مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔ اس علاقے میں آئے ہوئے اسے بہ مشکل ایک سال ہی ہوا تھا۔ وہ ہاتھ پہ ہاتھ بیٹھ جانے والوں میں سے نہ تھا۔ جب وہ یہاں تعینات کیا گیا تھا تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ علاقہ ویسے ہی پُرامن تھا۔ اور اس کے افسروں نے اسے یہاں متعین کر کے اس کی صلاحیتوں کو ضائع ہی کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے کسی ایسے علاقے میں بھیجتے جہاں جرائم کی شرح زیادہ ہوتی۔ ایک سال کا عرصہ اس نے بڑی کلفت اور بوریت میں گزارا تھا، مگر پھر اچانک سال بھر بعد ہی پُراسرار طور پر لوگوں کی گمشدگی کی وارداتوں نے اسے چکرا کر ہی رکھ دیا تھا۔
خاصی دیر تک وہ انہی تانوں بانوں میں الجھا سوچتا رہا کہ آصف علی کو کس طرح رنگے ہاتھوں پکڑا جائے کہ اچانک .... اس کی میز پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
''ہیلو!'' اس نے جھٹ ریسیور کان سے لگا کر کہا تو دوسری طرف سے کسی لڑکی کی خوف زدہ سی آواز سن کر وہ بُری طرح چونک اٹھا۔

☆☆☆

فوزیہ بُری طرح دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم تصور کیا تھا مگر جب اس نے ذرا ہمت کر کے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کی پور سے آنسو کے اس قطرے کو ہولے سے چھوا تو وہ اس کی پور میں آ گیا۔ وہ یکدم دہشت زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور اسی طرح الٹے قدموں چلتی ہوئی اپنی نشست سے ٹکرائی اور اس پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کی خوف و حیرت سے پھٹی پھٹی نگاہیں ہنوز سامنے، گلنار کے مجسمے پر جمی ہوئی تھیں۔
اس دوران میں آذر نقاش نمودار ہوا۔ فوزیہ کی کیفیت اور چہرے کے تاثرات اس کی عقابی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے۔ وہ خود بھی کچھ الجھن آمیز پریشانی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سادہ سی ٹرے تھی۔ جس پر کافی کے دو مگ رکھے تھے۔
''کیا ہوا؟ خیریت؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔ فوزیہ نے لرزیدہ انگلی سے سامنے گلنار کے مجسمے کی طرف اشارہ کر کے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''وہ... مجسمہ... رو رہا ہے۔ م... م... میں نے ابھی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوئے دیکھا ہے۔''
فوزیہ کی بات پر آذر کی پیشانی پر ایک شکن سی اُبھری، اس نے ٹرے تپائی پر رکھی، پھر وہ تیزی سے مذکورہ مجسمے کی طرف بڑھا۔ چند ثانیے اسے غور سے دیکھتا رہا پھر پلٹا اور ایک کیبنٹ سے گول سا بکس نکالا، دوبارہ مجسمے کی طرف بڑھا پھر اس کے چہرے پر کچھ اسٹروکس لگائے۔ فوزیہ نے دیکھا آذر نے وہی ماسک اس کے چہرے پر لگا دیا۔ اس کے بعد وہ بکس ایک طرف رکھ کے فوزیہ کے سامنے والی نشست پر آ کے بیٹھ گیا۔ اب اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کی جگہ گہری طمانیت نے لے لی تھی۔ اس نے کافی کا ایک مگ فوزیہ کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود پکڑ لیا پھر ایک سپ لینے کے بعد بولا۔
''درحقیقت، آپ نے غور کیا ہوگا کہ میری حتی الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان مجسموں میں رنگینی کا عنصر

غالب رہے، بہ ظاہر یہ پتھر اور پلاسٹر آف پیرس سے بنے مجسمے باتیں کرتے محسوس ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں ان کی آنکھوں پر خصوصی توجہ دیتا ہوں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان مجسموں کی آنکھوں میں آپ کو ایک چمک سی محسوس ہوئی ہوگی، بالکل جیتے جاگتے انسانوں کی طرح اس لیے میں ان کی آنکھوں کو ایک خاص قسم کے موم سے بناتا ہوں، آپ نے جو آنسو اس عورت کے مجسمے سے ٹپکتے دیکھا ہے، وہ یہ موم ہی تھا، جو کسی باعث پگھل کے آنکھ سے بہہ نکلا...'' اس نے اتنا بتایا پھر فوزیہ کو کافی پینے کا کہا، جو ہنوز وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ کافی پینے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا یہ چھوٹا سا کچن نیچے ہی منتقل کرلینا چاہیے... شاید وہاں سے آنے والی حدت کے باعث ہی اس مجسمے کی آنکھ سے موم پگھلا تھا۔'' آذر کافی کا ایک گھونٹ بھر کے بولا۔ کافی مگ کے افق سے اس کی یک ٹک نظریں فوزیہ کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد فوزیہ نے اس سے کہا۔

''آپ شاید نہیں جانتے کہ میں اس عورت کو جانتی ہوں۔ جس کے مجسمے کی آنکھ سے وہ آنسو بہہ نکلا تھا... اس کا نام گلنار فاطمہ ہے۔'' فوزیہ کی بات پر آذر نقاش کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کافی کا مگ چھلک گیا۔ اس کے چہرے کی طمانیت... یکلخت ہوا ہوگئی اور اس کی جگہ پر وہی پہلے والی تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ فوزیہ کو یوں لگا جیسے سامنے بیٹھے آذر کو اس کی بات سے زبردست شاک پہنچا ہو۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی بولی۔

''آپ نے میری بات پر کچھ عجیب محسوس کیا... آذر صاحب؟''

''آں... نن... نہیں تو...'' وہ قدرے گڑبڑا کر بولا۔ ''یہ میرے لیے بھی حیرت انگیز اتفاق ہے کہ جس عورت کا میں نے یہ مجسمہ بنایا ہے وہ آپ کی سہیلی نکلی...''

''یہ میری سہیلی تو نہیں ہے۔'' فوزیہ نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ میری شناسا ضرور ہے، ایک غریب مزدور کی بیوی ہے، میرے سسر مکرم شاہ کے فارم پر اس کا شوہر عزیر خان ملازمت کرتا ہے، حویلی میں اس کی بیوی آتی جاتی رہتی ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے، بھلا اس سیدھی سادی اور گھریلو عورت کو آپ نے کس طرح مجسمہ بنانے پر رضامند کرلیا...؟''

فوزیہ کی حیرت بجا تھی۔ آذر اس کی بات پر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

''میری آنکھ کیمرے کا کام کرتی ہے، ایک بار میں جسے نظر بھر کر دیکھ لوں تو اس کی پوری تصویر میرے دماغ میں چسپاں ہوجاتی ہے اور پھر میں اپنے اسٹوڈیو میں آکے بڑے آرام سے اس تصویر کا مجسمہ تراش لیتا ہوں۔'' اس کی بات پر فوزیہ خاموش ہوگئی۔ باہر اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ آذر نقاش نے اٹھ کر باہر کھلنے والے ایک دریچے سے پردہ ذرا سرکا دیا۔ فوزیہ کو دریچے کے پار سرسبز برف پوش پہاڑیوں کا دلفریب منظر دکھائی دیا۔

وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ کافی پینے کے بعد کچھ کسلمندی دور ہوئی تھی۔ اس نے آذر سے کہا۔

''شاید مجھے چلنا چاہیے، اب تو صبح بھی ہوگئی ہے۔ میں خود اپنے شوہر کو اب تلاش کرسکتی ہوں۔''

''ٹھہریئے... ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں... میرے پاس گاڑی ہے۔ تھانے بھی چلنا ہوگا ہمیں۔ ویسے میں نے کیدار کو بھی بھیج رکھا ہے۔ آپ ذرا بیٹھیں، میں پہلے نیچے جا کر پتا کرتا ہوں، وہ کوئی خبر لایا ہے یا نہیں۔'' اس نے کہا اور پھر زینے طے کرتا ہوا نیچے چلا گیا۔

فوزیہ ایک بار پھر اس کمرے میں تنہا رہ گئی تھی۔ ان بے جان پتھر کے مجسموں کے درمیان وہ بہت عجیب محسوس کرنے لگی... بلکہ اسے ایک وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے سارے مجسمے فریادی انداز میں اس کی طرف گھورے جارہے ہیں اور ابھی وہ سب کے سب اس کی طرف بڑھنا شروع کردیں گے۔

اچانک وہ ٹھٹکی۔ ایک باریک سی آواز اُبھری تھی۔ اس نے اپنا وہم سمجھا مگر دوبارہ وہی آواز ابھری تو فوزیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اس بار اسے وہ آواز ایک سسکی سے مشابہ لگی تھی۔ وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی اور آواز کی سمت پر غور کرنے لگی۔ تب اس پر انکشاف ہوا ہے کہ آواز گلنار کے مجسمے کی طرف سے سنائی دی تھی۔ وہ چونک پڑی اور دھڑکتے دل کے ساتھ فوزیہ نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔ گلنار فاطمہ کے مجسمے کے قریب پہنچی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مجسمے کے لبوں پر ارتعاش تھا اس نے ایک اور سسکاری لی اور فوزیہ مارے دہشت کے بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

☆☆☆

''مم... مم... مجھے بچالو... مم... میری جان خطرے میں ہے، تم جو کوئی بھی ہو، خ خ۔ خ... خدا کے لیے میری مدد کردو۔ مم...''

ایک خوف زدہ سی ہانپتی ہوئی آواز انسپکٹر خضر کو

دوسری طرف سے سنائی دی تھی۔ اس کے بعد خود ہی رابطہ بھی منقطع ہوگیا۔ وہ ہیلو... ہیلو... کرتا رہ گیا... اور بالآخر جواب نہ پاکر اس نے ریسیور رکھ دیا، پہلے تو وہ اسے کسی من چلے کا مذاق اور شرارت سمجھا مگر پھر اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے کوئی واقعی جان لیوا خطرے سے دوچار ہو... اور اسے تھوڑا بہت جتنا بھی وقت ملا، اس نے اندازے سے کوئی ایک نمبر ملا دیا ہو، جو خوش قسمتی سے تھانے کا ہی نکلا۔

بہرحال انسپکٹر خضر نے جب... آنے والی اس گمنام کال کا نمبر ٹریس کروایا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ نمبر اسی علاقے کا تھا۔ اس نے فوراً دلبر شاہ... چند اور پولیس جوانوں کو اپنے ساتھ لیا اور نمبر والے ایڈریس پر پہنچا، تو وہاں ایک اور شاک اس کا منتظر تھا۔ کیونکہ یہ وہی ریسٹ ہاؤس تھا جہاں مشتبہ ملزم آصف علی خان قیام پذیر تھا۔

☆☆☆

فوزیہ کو جب ہوش آیا تو اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے کسی کمرے کی چھت تھی۔ وہ پشت کے بل اور بالکل سپاٹ لیٹی ہوئی تھی۔ چند ثانیے تک وہ اسی طرح خالی الذہنی کے عالم میں گم صم سی پڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اسے یاد آنے لگا کہ وہ کیوں خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ تب اس نے اپنے وجود کو حرکت دینے کی سعی چاہی تو اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ ہلنے جلنے، حتیٰ کہ بولنے سے ہی قاصر تھی۔ البتہ وہ اپنی آنکھوں کو حرکت دے سکتی تھی۔ اس کا دل خوف اور عجیب دل دہلانے والے وسوسوں سے کانپنے لگا۔

اپنی آنکھوں کو چاروں طرف گردش دینے پر اسے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ وہ ایک کمرے کے بالکل وسط میں بڑی ہی کسی میز یا اسٹریچر نما شے پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے وجود کو حرکت دے کر اٹھنے کی کوشش کرے مگر عبث اس نے حلق کے بل چیخنا بھی چاہا مگر سوچ کے رہ گئی، ایک ذرا آواز تک نہیں نکال سکی۔

تب پھر ایک چہرہ اس کے سرہانے کی طرف سے اس پر جھکے ہوئے انداز میں نمودار ہوا، اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحم اور سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں شیطانی چمک لیے ہوئے اس چہرے کو فوزیہ پہچان چکی تھی، جو پہلے اسے بہت پُروجیہہ اور خوبرو لگا تھا اب وہ انتہائی مکروہ نظر آرہا تھا یہ مجسمہ ساز آذر نقاش تھا۔

”مجھے اندازہ ہے، اس وقت تم اندرونی طور پر کن کیفیات سے گزر رہی ہو؟“

معاً اس نے فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور مزید اسی طرح سرسراتے لہجے میں آگے بولا۔

”ہاں...! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم صرف اپنی آنکھوں کو ہی حرکت دے سکتی ہو۔ مجھے دیکھ سکتی ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ میرے بولنے کی آواز اور باتیں بھی سن رہی ہو تم، بس...! ایک یہی خرابی میرے عظیم اور انوکھے دن کی کمزوری بن کے رہ گئی ہے کہ میں ایک زندہ انسان کے جیتے جی اس کے بدن کو بے حس و حرکت تو کرسکتا ہوں... مگر...“

وہ رکا، پھر بولا۔

”اچھا چھوڑو...! تم ایک نایاب مجسمہ کہلاؤ گی، بہت حسین اور بہت خوب صورت، یہی نہیں، مجسموں کی عالمی نمائش میں تم بھی میرے دیگر مجسموں کی طرح ایک نادر و نایاب نمونہ کہلاؤ گی، لیکن مجھے ساتھ ہی اس بات کا افسوس بھی ہوگا کہ“ وہ اتنا کہہ کر پھر تھما اور بڑے سنسنی خیز انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کے پیچھے ہٹ گیا۔

ادھر بے سدھ پڑی فوزیہ زندہ درگور ہو رہی تھی۔ اس کی باتیں اسے بھیانک معلوم ہو رہی تھیں، ایسی بے بسی و لاچارگی کی موت تو کسی کو زندہ دفن کردینے پر بھی محسوس نہیں ہوئی ہوگی، جیسی وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔

ذرا دیر بعد وہ مکروہ چہرہ پھر اس کے سامنے آگیا۔ اب کی بار آذر کے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔ پھر وہ جیسے حظ اٹھانے والے انداز میں فوزیہ کی خوف و دہشت میں ڈوبی آنکھوں میں اپنی مکروہ نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

”ہاں...! تو میں کہہ رہا تھا کہ... مجھے اس بات کا بھی افسوس ہوگا کہ تمہاری جیسی حسین دوشیزہ کو میں ایسی بے کسی کی موت مرتے دیکھوں گا، بس ذرا تھوڑا اور انتظار کرلو... میں ابھی ایک انجیکشن تمہیں اور لگاؤں گا، پھر تمہاری یہ گہری جھیل جیسی آنکھیں بھی ساکت ہو جائیں گی اور تمہارا دھڑکتا ہوا خوب صورت دل بھی... پھر اس کے بعد میں تمہارے دلکش اور مرمریں بدن پر اپنے فن کی ملمع کاری کی صورت میں ایک خاص قسم کا کیمیکل گھلا مصالحہ پیسٹ کردوں گا کہ تم بالکل بے جان پتھر کا مگر بہت خوب صورت اور رئیل ایکسپریشن دیتا ہوا مجسمہ بن جاؤ گی... ہاں... تم نے جو باقی مجسمے دیکھے ہیں یہاں پر... وہ بھی میں نے اسی طرح تیار کیے ہیں... زندہ انسانوں کے مجسمے... ان کی اسی طرح موت بھی واقع ہو جاتی ہے، مگر مجھے ایک مشہور فن کار کا درجہ دلوا کر ان بے چاروں کی اسی طرح خاموشی سے

موت واقع ہو جاتی ہے... گلنار کے سلسلے میں مجھ سے غلطی ہوگئی تھی کہ اس کا دم دیر سے پرواز ہوا اور تمہیں چونکانے کا باعث بن گیا... خیر... او کے معصوم گڑیا... بائے... میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ ہٹ گیا۔

فوزیہ کا پوری قوت سے چلانے کو جی چاہا تھا مگر اس کے جسم کی ساری قوت جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو ہلنے جلنے تک سے قاصر تھی۔ بے بسی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے... اب فوزیہ کو اپنے ان بہتے بے بسی کے آنسو کو محسوس کر کے، بدنصیب گلنار کے مجسمے کی آنکھ سے بہتے آنسو کے اس قطرے کی لاچارگی اور بے کسی کا اندازہ ہو رہا تھا... جو اس کی انگلی پر ٹپکا تھا... وہ ایک فریاد تھی اس کی... آخری فریاد۔

فوزیہ کو ایسے میں اپنا شوہر توقیر یاد آیا، جو اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اگر ہوتا تو اسے کبھی بھی اس قابلِ رحم حالت میں برداشت نہ کرتا، ایسے مشکل، مایوس کن اور بے چارگی کے وقت میں فوزیہ کو خدا یاد آگیا۔ وہ دل سے اللہ کے حضور دعا گو ہوگئی۔ پھر اس نے سوچا، دعا کے ساتھ تدبیر بھی کرنا چاہیے اس طرح دہشت زدہ ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا... اس نے ہمت مجتمع کی، حوصلہ کیا۔ بڑے عزم اور غرور سے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے انسانی وجود اس قدر کمزور نہیں ہوسکتے، بے شک ان کی طاقتیں مفلوج کردی جائیں، مگر عزم و حوصلہ اور قوتِ ارادی تو ایمان تک کو مضبوط کر کے شیطانی اور باطل قوتوں کو ختم کرسکتی ہیں تب فوزیہ نے اپنی آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو یاد کیا... اور پھر دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے وجود کو محض قوتِ ارادی اور اللہ کی مدد کی امید پر حرکت دینے کی کوشش شروع کردی... اور تب ہی اس پر ایک خوشگوار اور حوصلہ افزا انکشاف ہوا کہ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو حرکت دینے میں کامیاب ہوچکی ہے پھر اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی... اس کے بعد ٹانگ کو، اس کی بے حس پڑی رگوں میں جان سی پڑنے لگی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے جسم کو بھی دھیرے دھیرے اور لگاتار کوششوں سے تھوڑا بہت حرکت دینے میں کامیاب ہوگئی مگر... ساتھ ہی ساتھ اسے یوں بھی محسوس ہوا جیسے اس کے وجود کی ساری طاقت اور توانائی سلب کرلی گئی ہو... مگر اس نے ہمت نہ ہاری، بقا کی جنگ سے وہ بہ دستور نبرد آزما رہی یہاں تک کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کو کپکپانے کی حد تک حرکت دینے میں کامیاب ہوگئی۔ فرطِ خوشی سے وہ آبدیدہ ہوگئی۔

بے بسی کی موت کے تاریک اور مایوس کن اندھیاروں میں ڈوبنے والے کو امید کا دیا ٹمٹماتا نظر آئے تو اس کا دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ مگر فوزیہ بھی جانتی تھی کہ ابھی تک وہ پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش چاہی تھی، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں طاقت سمائی... مگر ابھی بہ مشکل وہ تھوڑا ہی اٹھ پائی تھی کہ اس کا دم پھولنے لگا تھا۔ وہ کہنیوں کے بل اسٹریچر جیسی مستطیل میز پر نیم دراز سی تھی، پھر دفعتاً اس نے اپنے وجود کو پوری قوت مجتمع کر کے زور سے حرکت دے ڈالی اور دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے کمرے کے چکنے فرش پر گر پڑی۔ اسے اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ اسے میز سے نیچے پختہ فرش پر گرنے کے باوجود چوٹ کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ شاید یہ اس خبیث آذر نقاش کے لگائے ہوئے انجیکشن کا اثر تھا کہ جس کی وجہ سے اس کے وجود کی تمام حسیات مردہ سی ہوگئی تھیں۔

وہ چند ثانیے فرش پر اسی طرح اوندھے منہ پڑی ہانپتی رہی پھر اس نے دوبارہ اپنے وجود کی قوتِ ارادی کے باعث مقدور بھر بحال شدہ توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے اٹھنے کی سعی چاہی، ایسے میں اس نے قریب رکھی ایک چھوٹی سی اسٹیل کی تپائی کا سہارا لیا اور بہ مشکل اس کے سہارے بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کی ٹانگیں اس بری طرح ڈگمگا گئیں، وہ گرنے لگی، لیکن اس نے خود کو اسٹیل کی میز کے سہارے کپکپاتی ٹانگوں پر خود کو جمائے رکھا۔ میز پر پڑے کچھ آلات بکھرے تھے۔ ٹھیک اسی وقت آذر اندر داخل ہوا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر خضر کے ہونٹوں پہ زہر خند مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ اسے شاید یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ اس چالاک آدمی کو آج رنگے ہاتھوں گرفتار کرلے گا۔ اس نے اپنے ساتھی اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ وہ گنز تانے دروازے کی طرف لپکے، دروازے پر پہلے زوردار دستک دی گئی تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی آصف خان بیٹھا چائے نوش کر رہا تھا اور ایک بوڑھا سا ملازم اس کے قریب کھڑا تھا۔ پولیس والوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں ہی بری طرح چونکے تھے۔ پھر آصف کی نظر انسپکٹر خضر پر پڑی جو اس دوران خود بھی اندر وارد ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر آصف کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات امڈ آئے تھے۔ وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔

”اب کیا لینے آئے ہو انسپکٹر؟“

انسپکٹر خضر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساتھی اہلکاروں کو اس نے مخصوص اشارہ کیا، وہ تیزی سے پورے گھر میں پھیل گئے۔

''آخر اب کیا ہو گیا...؟ کچھ پتا تو چلے...؟'' وہ بھنا کر بولا۔

''پتا چل جاتا ہے...'' خضر نے دانت پیس کر کہا۔ پھر وائرلیس پر دلبر شاہ سے رابطہ کیا۔ ''تم کدھر ہو...؟ اوور۔''

''میں کاٹیج کے پچھواڑے ہوں... اوور...''

''وہاں کیا جھک مار رہے ہو...؟ ہم ادھر موجود ہیں... تم نے کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا...؟ اوور...''

''نہیں سر...! اوور...''

''پھر تم واقعی جھک مار رہے ہو... فوراً پہنچو... اوور... اینڈ آل...''

انسپکٹر نے کچھ اس طرح دلبر شاہ سے باتیں کی تھیں کہ سامنے موجود آصف خان کو اس بات کا شبہ نہ ہو سکے کہ اس نے دلبر شاہ کو کاٹیج کی خفیہ نگرانی پر مامور رکھا گیا ہے۔

ادھر تھوڑی دیر بعد پولیس کے جوان ہانپتے ہوئے آئے اور ایک نے کہا۔

''سر...! پورا گھر چھان مارا ہے... چڑیا کا پتر تک نہیں ملا...'' اس کی بات سن کر انسپکٹر خضر جھلا کے بولا۔

''ابے گدھے کی شکل اور عقل والے... تجھے بندہ تلاش کرنے کو کہا تھا، چڑیا کا پتر نہیں۔''

''سر جی...! میں نے مثال دی ہے۔ کوئی بندہ نہیں ملا...''

''فون کدھر ہے...؟'' خضر نے آصف خان سے پوچھا۔ تو اپنے کاندھے اچکا کر بولا۔

''فون کی لائن تو ایک عرصے سے خراب ہے۔ خود مجھے کہیں فون کرنا ہوتا ہے تو مجھے کسی قریبی دکان یا سپر اسٹور کا رخ کرنا پڑتا ہے...''

''کیا...؟ فون عرصے سے خراب پڑا ہے...؟'' انسپکٹر تقریباً چیخ پڑا۔ وہ بری طرح الجھ گیا اور کلبلا کر سوچنے لگا کہ یہ شخص بہت چالاک ہے، ہر بار چکما دے جاتا ہے، اس سے اب دوسری طرح نمٹنا ہو گا۔ چنانچہ اس نے خود بھی پہلے اچھی طرح اس بات کی تصدیق کر لی۔ پھر واپس لوٹ گیا۔

وہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس کے عقب میں کھڑے آصف علی خان کے ہونٹوں پہ بڑی گہری اور زہر خند مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆☆☆

''آں... ناں... ناں... بے بی! یہاں سے فرار کی کوشش ناکام ہی ثابت ہو گی تمہاری... ویسے تم بہت ہمت اور حوصلے والی ہو۔'' آذر نقاش نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

اس کے ہاتھ میں اب ایک محلول بھرا انجیکشن نظر آ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا فوزیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''پہلے والی ڈوز ہلکی تھی مگر یہ آخری ڈوز ہے... اس کے بعد...'' اس نے ذومعنی لہجے میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ اس کے چہرے سے اب سفاکی ٹپک رہی تھی۔ فوزیہ کا دل کانپنے لگا۔ اسے اب اس ظالم شخص سے خوف کے بجائے طیش آنے لگا تھا۔ پھر وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔

فوزیہ ابھی تک اسٹیل میز کے سہارے بہ مشکل اپنے پاؤں جمائے کھڑی تھی... اور ٹھیک اسی وقت اس کی نگاہ اسٹیل ٹیبل پر رکھے ایک پتھر چھیدنے والے نکیلے اوزار پر پڑی۔

اپنی سی مقدور بھر کوشش سے اس نے وہ اوزار اپنے کپکپاتے ہاتھ سے تھام کر مٹھی میں دبا لیا کہ آذر کی نظر اس پر نہ پڑ سکی اور پھر جیسے ہی وہ اس کے قریب آ کر، اس کی گردن میں سرنج کی سوئی گھونپنے لگا۔ فوزیہ نے اپنے ریختہ وجود کی گویا ساری قوت ایک ہاتھ کی مٹھی میں مجتمع کرتے ہوئے وہ نکیلا اوزار آذر کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

آذر کے لیے اس کی یہ حرکت اچانک ہی نہیں بلکہ غیر متوقع بھی تھی۔ اس کے حلق سے بھیانک غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری... اس کے پیٹ سے خون بہہ نکلا۔ فوزیہ نے ایک بار پھر اپنے وجود کی بحال ہوتی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے، آذر کو ایک ٹکر ماری جو پہلے ہی اپنا مضروب پیٹ پکڑے جھک گیا تھا... ٹھوکر سے پرے لڑکھڑا گیا اور توازن برقرار نہ رکھ پایا تو گر پڑا... فوزیہ دروازے کی طرف جیسے تیسے گرتے پڑتے بھاگی۔ حرکت دینے سے اس کے اعضا بھی گرم ہو کر اپنی قوت میں آ رہے تھے۔

وہ زینے تک آئی تو اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ نیچے لڑھکنے لگی۔ فرش تک پہنچی تو اس کا پورا دماغ گھوم رہا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اوپر پڑی، اسے وہاں آذر کھڑا دکھائی دیا۔ مگر اس طرح کے اس نے اپنے خون آلود پیٹ پر ہاتھ دے رکھا تھا۔ اور آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ فوزیہ کا پورا وجود کانپنے لگا۔ مگر وہ ہمت کر کے اٹھی۔ تو بری طرح دہل گئی۔ اس کے سامنے وہی کرخت چہرے والا کیدار کھڑا تھا۔

''دبوچ لے اس کتیا کو... جانے نہ پائے...'' آذر

اپنے ملازم کو دیکھ کر خوں خوار لہجے میں بولا۔ کیدار کے ہونٹوں پہ بھیانک مسکراہٹ تھی۔ فوزیہ کے ہاتھ سے نکیلا سوا چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ کیدار نے اسے انتہائی بے رحمی سے دبوچ کر کھڑا کر دیا تو فوزیہ بھی جیسے اپنی جان بچانے کے جنون میں مبتلا تھی۔ ایک ہذیانی سی چیخ مار کر اس نے اپنے لمبے ناخن (کیوٹس) کی ایک انگلی، کیدار کی ایک آنکھ میں گھسیڑ دی۔ کیدار بے اختیار ایک چیخ مار کے اپنی زخمی آنکھ تھام کر رہ گیا... اور فوزیہ نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور باہر نکل کر وہ ایک طرف دیوانہ وار دوڑنے لگی... اس کے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت کافی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ شاید آذر نقاش نے اسے ابھی سن کرنے والے انجیکشن کا... پہلا ڈوز دیا تھا۔ وہ دوڑتی رہی حتیٰ کہ اسے ایک کاٹیج نظر آ گیا۔ جس کا دروزہ کھلا ہوا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہاں سے اسے نہ صرف... مدد مل جائے گی بلکہ پناہ بھی۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔

یہ آصف خان کا کاٹیج تھا اور وہ خود اندر موجود تھا۔

''مم... مجھے بچا لو... خ... خدا کے لیے... ان ظالموں سے مجھے بچا لو... وہ... وہ... دونوں مم... مم... میرے پیچھے آ رہے ہیں...''

آصف ذرا چونکا۔ پھر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''فکر مت کرو، یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں...'' یہ کہہ کر وہ بازو والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فوزیہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر دفعتاً ہی اس کی نگاہ قریب رکھے فون پر پڑی، اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ اپنے علاقے کے تھانے کا فون نمبر اسے معلوم تھا۔ وہ اس نے جلدی سے ڈائل کر دیا۔ ابھی اس نے تھوڑی ہی بات کی تھی کہ کسی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا، وہ خوف زدہ ہو گئی۔ فون جھپٹنے والا آصف ہی تھا۔

''کسے فون کر رہی تھیں...؟''

''پ... پولیس کو...''

''یہاں کی پولیس پہلے ہی مجھ پہ شک کیے ہوئے ہے... ابھی اس کی ضرورت نہیں، لو تم پانی پیو، اعصاب کو ذرا سکون ملے گا۔ میں کچھ سوچتا ہوں...'' یہ کہہ کر اس نے پانی کا گلاس فوزیہ کو تھما دیا۔ فوزیہ نے پانی پیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ بری طرح دہل گئی۔ اس نے خود کو دوبارہ اسی منحوس کمرے میں اور اسی اسٹریچر نما میز پر پڑے پایا مگر اس بار اس کے دونوں ہاتھ پاؤں چمڑے کی بیلٹ کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، نیز اس کے سامنے اب تین چہرے تھے۔

آذر نقاش، کیدار۔ اور وہ شخص (آصف علی خان) جس کے پاس وہ مدد کے لیے پہنچی تھی۔ ان تینوں کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ فوزیہ کی آنکھوں میں دہشت سمٹ آئی۔ اسے یہ جاننے میں کیا دیر نہیں لگی کہ یہ تیسرا شخص (آصف خان) بھی انہی کا ساتھی تھا، جس نے دھوکے سے پانی میں کچھ ملا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

آذر نقاش نے اپنی قمیص اتاری ہوئی تھی اور اس کے پیٹ پر اب ڈریسنگ ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جبکہ کیدار کی ایک پھوٹی ہوئی آنکھ میں ''گاز'' بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔

کیدار نے ایک پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پستول سنبھالنے کا انداز اس کا ایسا تھا کہ اس نے اس کے چہرے کی پھوٹی ہوئی ایک آنکھ کو چھپا رکھا تھا۔ فوزیہ کے بالوں کی دراز آوارہ لٹ سے کوئی بندھی جھول رہی تھی، آذر اس سے کھیلتے ہوئے اس سے مکروہ اور سفاک لہجے میں بولا۔

''میں بالکل ایسا ہی تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔ یہ ایک شاندار اور ایکشن ایکسپریشن دیتا ہوا مجسمہ کہلائے گا۔''

''مم... مجھے چھوڑ دو... خ... خ... خدا کے لیے...'' فوزیہ نے لرزیدہ آواز میں ان سے فریاد کی تو آذر غصے سے پھنکار کر بولا۔

''اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا... تم نے مجھے اور میرے ساتھی کو زخمی کیا... اب پہلے تم سے ہم انتقام لیں گے... باری باری انتقام... اس کے بعد میں تمہیں زندہ مجسمے میں تبدیل کر دوں گا...''

فوزیہ یہ سن کر دہل گئی۔ وہ اس شیطان کے باری باری ''انتقام'' لینے کا مکروہ اشارہ سمجھ چکی تھی۔

آصف نے اسے بے ہوش کر کے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ کیدار فوزیہ کو کاندھے پر اٹھا لے گیا تھا۔ بعد آصف نے فوراً اپنے فون کی لائن کاٹ ڈالی تھی۔ اور ٹیلی فون سیٹ وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ جانتا تھا کہ فوزیہ کے فون پر پولیس ادھر پہنچنے والی ہو گی۔ اور وہی ہوا... انسپکٹر خضر آیا تھا مگر اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ بعد میں... اپنی چالاکی پر نازاں فرحاں آصف نے آذر کے کاٹیج کا رخ کیا تھا۔

''مان گئے آصف...! تم نے بڑی چابک دستی کے ساتھ پولیس کو بے وقوف بنایا... ورنہ تو آج ہم سب کا بھانڈا پھوٹ جاتا...'' آذر نے... اپنے ساتھی آصف کی توصیف کی... دونوں شیطانی قہقہے مار کے ہنسنے لگے۔

''میرا خیال ہے... اب اصل کھیل کی ابتدا کر دینی چاہیے... تاکہ میں اپنے کاٹیج کا رخ کروں اور تم اپنا باقی کا کام نمٹا سکو...'' آصف نے ایک ہوس ناک نظر فوزیہ پر ڈالتے ہوئے آذر سے معنی خیز لہجے میں کہا اور فوزیہ ان کے مکروہ شیطانی عزائم جان کر خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگی۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور انسپکٹر خضر ہاتھ میں ریوالور تھامے اپنے ساتھی اہلکاروں اور دو سادہ پوش افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا... یہ دو سادہ پوش افراد... مکرم شاہ اور اس کا بیٹا توقیر شاہ تھے۔ فوزیہ اپنے شوہر کو زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑی۔ توقیر بھی اس کی طرف دیوانہ وار لپکا تھا۔

اس بار خضر حیات نے بھی آصف کو دھوکے میں رکھا تھا۔ فون کال والی مختصر ملاقات کے بعد بہ ظاہر خضر حیات، آصف کے کاٹیج سے لوٹ گیا تھا، مگر اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی، وہ تھوڑی دور جا کر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پھر اس نے دو اور آدمیوں کو اندر جاتے اور باہر نکلتے دیکھا تھا... بے ہوش فوزیہ کو انہوں نے کندھے پر ڈال رکھا تھا... انسپکٹر خضر حیات، اسی وقت ان پر بلہ بول سکتا تھا... مگر اس میں بے ہوش لڑکی (فوزیہ) کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ اور پھر... خضر حیات ان سب کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ کتنے بااثر تھے... یہی وہ وقت تھا جب اسے تھوڑی دیر پہلے مکرم شاہ نے فون کر کے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا توقیر شاہ تو آگیا ہے... مگر بہو کا کچھ اتا پتا نہیں ملا...

خضر حیات کو یقین کی حد تک شبہ ہو گیا کہ یہی بے ہوش لڑکی مکرم شاہ کی بہو ہو سکتی تھی۔ اس نے کاٹیج کی نگرانی کے دوران دو پولیس اہلکاروں کو گاڑی دے کر مکرم شاہ کی حویلی روانہ کر دیا مقصد دونوں باپ بیٹے کو یہاں لا کر مجرموں پر ہاتھ ڈالنا تھا۔ تاکہ مجرموں کے خلاف کیس اس قدر مضبوط بنے کہ وہ خود کو قانون کی گرفت سے چھڑا نہ سکیں۔ کیونکہ خضر حیات کو آصف کے حوالے سے ایسا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اور اس نے اپنے اس ''تلخ تجربے'' سے ہی یہ بات سیکھی تھی کہ مجرموں پر کمزور گرفت، درحقیقت انہیں ''طاقت ور'' بناتی ہے...

بہر حال تینوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ توقیر نے فوزیہ کو بتایا تھا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اس کی طرح وہ بھی نالے میں بہتا ہوا... کسی پتھروں والے کنارے سے جا لگا تھا اور سوئے اتفاق... وہیں... ریاض بھائی اور ثمینہ بھابی بھی، اپنی گاڑی کی خرابی کی وجہ سے، صبح کے انتظار میں سنگلاخ ویرانے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ اس پر پڑی تھی اور یوں انہوں نے اسے نالے میں پھنسا دیکھ کر نکالا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد ہی مجسمہ ساز آذر نقاش کے بارے میں پولیس نے سنسنی خیز انکشافات کیے، جس کے مطابق... آذر نقاش ایک مجرم ذہنیت کا مجسمہ ساز شخص تھا۔ وہ اپنے فن میں بے پناہ شہرت حاصل کرنے کے ایک نفسیاتی جنون میں مبتلا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ماہر اور اچھا مجسمہ ساز تھا، مگر بین الاقوامی شہرت پانے کے لیے اس نے مجرمانہ قدم اٹھایا تھا اور اپنے کام میں ''رئیلٹی'' پیدا کرنے کی خاطر وہ زندہ انسانوں کے مجسمے بنانے لگا تھا۔ جبکہ آصف خان اس کا ساتھی تھا اور اس کام میں اس کی مدد کرتا تھا... جس کا اسے بھاری معاوضہ ملتا تھا۔

آذر نقاش نے مجسمہ سازی کی تربیت مصر سے حاصل کی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی تھی جو خود کو فرعون کے دور کی نسل کے ان مزدوروں سے بتاتا تھا جنھوں نے احرام بنائے تھے اور مردوں کو ''مومیانے'' کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ شخص بھی مجرم ذہنیت کا تھا جو زندہ انسانوں پر اس مہارت سے ملمع کاری کر کے انہیں، ایک خاص قسم کا انجکشن لگا کر پہلے مفلوج کر دیتا تھا اس کے بعد وہ انہیں بے جان مجسموں میں تبدیل کر دیتا تھا۔ اس کے اس طرح کے مجسمے شاہکار مانے جاتے تھے۔

پھر اچانک اس آدمی کا انتقال ہو گیا تو آذر نے اس کے سارے ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور وطن واپس لوٹ آیا اور یہاں فن کی آڑ میں اس نے بھی یہی گھناؤنا کام شروع کر دیا... اس کی شہرت ہونے لگی، اس کے مجسمے مہنگے داموں بکنے لگے... اب اسے بارہ مجسموں کی نمائش کے لیے فرانس جانا تھا۔ نو مجسمے وہ تیار کر چکا تھا، باقی تین درکار تھے۔ علاقے میں اغوا کی وارداتیں بھی وہ ہی آصف خان کے ذریعے کروایا کرتا تھا، ان کا نشانہ سادہ لوح اور غریب لوگ ہوا کرتے تھے۔

مگر برائی آخر برائی ہے بالآخر، انجام کار سے ضرور دوچار ہوتی ہے، اور وہ کبھی پھلتی پھولتی نہیں...... اب یہ تینوں شیطان کڑی سزا بھگتنے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے...

پسِ چہرہ

کاشف زبیر

روح کے اندر کے خزانے آدمی کے چہرے پر حُسن بن کر جھلکتے ہیں... ہر فرد کی روح اس کے چہرے... اس کی آنکھوں اور اس کے جسم کی ہر جُنبش سے عیاں ہو جاتی ہے... ایسے ہی متضاد چہروں کے مالک کرداروں کی نقاب کشائی... علم و فراست زندگی کے وفادار ساتھی ہیں... جو کبھی دغا نہیں دیتے... صرف انسان ہی ایسی ہستی ہے جو اپنے علم و دانش کو بھی دغاباز بنا دیتے ہیں... ذہانت کے ساتھ خیانت کرنے والے ہوس پرست اور خطاکاروں کا دلچسپ ماجرا...

چہرہ در چہرہ... ہر مقام پر ایک نیا روپ اختیار کرتا سرورق

وہ عجیب سی دنیا تھی۔ ہر شخص کے چہرے پر نقاب تھا۔ یہ نقاب انسانی چہرے جیسا تھا۔ آنکھوں کے سوراخ، ایک جیسی ناک جس کے نتھنوں کی جگہ سوراخ تھا اور کھلا ہوا منہ۔ سب ایک جیسے نقاب میں تھے فرق صرف رنگوں کا تھا۔ کسی کا نقاب سرخ رنگ کا اور کسی کا نیلے رنگ کا تھا۔ اس نے سبز نقاب پہنا ہوا تھا اور لوگوں کے درمیان سے ہوتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ جگہ ریل کے ڈبے جیسی تھی مگر یہ کسی ریل کا حصہ نہیں تھی۔ وہ جس جگہ تھا یہاں نقاب پوشوں کا ہجوم تھا۔

وہ سب اپنی اپنی سرگرمیوں میں مگن تھے۔ وہ ان کے بیچ سے ہوتا ہوا اس ڈبے سے دوسرے ڈبے میں جانے والے دروازے تک پہنچا۔ اسے کھولا اور اندر داخل ہوا۔ دروازے کا اوپری حصہ شیشے کا تھا۔ دوسرے ڈبے میں صرف ایک آدمی تھا جو ہلکے نیلے رنگ کے نقاب میں تھا۔ سبز نقاب والا آگے بڑھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ نیلے نقاب والے نے کہا۔ ''تو تم آگئے؟''

''ہاں، تم نے چیلنج کیا تھا، میں تمہارے سامنے ہوں۔'' سبز نقاب والا بولا۔ ''مجھے بے نقاب کردو۔''

''جس وقت تم نے یہاں قدم رکھا تھا تب ہی بے نقاب ہو گئے تھے۔''

''واقعی؟'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ہاں۔'' نیلے نقاب والے نے کہا اور اچانک اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا مگر وہ حیران رہ گیا جب اس نے نقاب کے نیچے بھی نقاب پایا۔ سبز نقاب والا ہنسا تو اس نے مشتعل ہو کر پھر نقاب نوچا مگر اس بار بھی نیچے سے نقاب ہی نکلا تھا۔

''تم مجھے کبھی بے نقاب نہیں کر پاؤ گے لیکن خود بے نقاب ہو جاؤ گے۔'' سبز نقاب والے نے کہا اور واپس دروازے کی طرف بڑھا... دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے پلٹ کر کہا۔ ''اب تم اسی جگہ رہو گے۔ میں نے تمہاری شناخت کو یہاں قید کر دیا ہے۔''

نیلے نقاب والا لپکا مگر اتنی دیر میں وہ دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا مگر وہ لاک تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور نزدیکی دیوار پر لگی کلہاڑی اتار کر دروازے کے شیشے پر ماری۔ شیشہ ٹوٹ گیا اور اس نے ہاتھ باہر نکال کر دروازہ ان لاک کیا اور باہر آیا۔ سبز نقاب والا کچھ دور جا چکا تھا، وہ اس کے پیچھے لپکا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور پھر اس کی نظر ایک طرف لگے آئینے پر گئی۔ اسے آئینے میں اپنی صورت نظر آئی اور وہ بنا نقاب کے تھا۔ اس کی اصل صورت دکھائی دے رہی تھی۔ صرف آئینہ ہی نہیں وہاں موجود سب لوگ اس کی اصل صورت دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ تب اس نے ہاتھ میں دبی کلہاڑی کو دیکھا اور اسے ایک طرف پھینک دیا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ کلہاڑی ایک دھوکا تھا اور اس نے اسے بے نقاب کر دیا تھا۔ وہ چیلنج ہار گیا تھا۔ سبز نقاب والے نے ہاتھ لہرایا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

بڑی سی کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھے ایک مرد اور ایک لڑکی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جب سبز نقاب والے نے نیلے نقاب والے کو بے نقاب کیا اور اس کی اصل شخصیت سامنے لایا تو مرد نے جوش سے میز پر مکا مارا۔ ''ڈیم اِٹ۔''

''کمال کر دیا۔'' لڑکی نے کہا تو آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

''اب ایسا کمال بھی نہیں کیا۔ نیلے نقاب والا زیادہ ہی اعتماد میں تھا اور اسی وجہ سے مار کھا گیا۔ اسے خیال نہیں آیا کہ کلہاڑی دھوکا ہے۔''

''اس نے چیلنج کر کے اسے بُلایا تھا۔'' لڑکی کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''یہ ہمارے کام کا آدمی ہے۔ اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔''

''ہم ہر کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ کئی بار دھوکا کھا چکے ہیں۔'' مرد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اس کے بارے میں جانو اور پھر اسے شامل کرنے کا سوچا جا سکتا ہے۔ آدمی کی کمزوری ہاتھ میں ہو تو اس سے بے خوف ہو کر کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کی کوئی کمزوری تلاش کرو۔''

''میں معلوم کر لوں گی۔'' لڑکی نے اعتماد سے کہا۔ ''آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

آدمی نے سر ہلایا تو لڑکی اٹھ کر چلی گئی۔ آدمی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے اس پر دکھائی دینے والا منظر حقیقی نہیں تھا بلکہ یہ ورچوئل دنیا تھی۔ حقیقی نہ ہوتے ہوئے بھی اس میں حقیقت شامل تھی۔ اس کے سارے کردار اصل میں ہیکرز تھے جو اپنے اپنے کمپیوٹرز پر موجود تھے۔ وہیں سے وہ اس دنیا میں شامل ہو رہے تھے۔ اس آدمی کا طاقت ور کمپیوٹر اسے اپنی میشن کی صورت میں پیش کر رہا تھا جیسے کوئی مووی چل رہی ہو۔ لڑکی کے جانے کے بعد اس نے پھر سے یہ مووی چلا کر دیکھی اور خود سے کہا۔ ''وہ ٹھیک کہتی ہے، اسے میرے پاس ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

نوکیلی بنی مونچھوں اور بے ترتیب سیدھے بالوں والا نوجوان موٹر سائیکل سے اُتر کر ایک موبائل فرنچائز کی طرف بڑھا۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر بائیک کی ٹینکی پر رکھ دیا اور اندر آتے ہی اس نے شیشے کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور جب تک ملازمین سنبھلتے اس نے پستول نکال کر ان پر تان لیا۔ مگر اس طرح کہ باہر سے کوئی پستول دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کوئی نہیں ہلے گا اور نہ حرکت کرے گا ورنہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہو گا۔''

اس شہرِ بے یار و مددگار کا تقریباً ہر فرد کبھی نہ کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ وہاں چار افراد موجود تھے اور انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا لیے۔ اس نے کہا۔ ''کیش یہاں کاؤنٹر پر ڈال دو۔ صرف ایک منٹ میں۔''

کیش والا تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے بکس کھول کر اندر موجود تمام کیش نکال کر کاؤنٹر پر ڈال دیا۔ اس نے ایک نظر رقم دیکھی اور پھر آگے بڑھ کر بکس میں جھانکا جو خالی تھا۔ رقم بارہ تیرہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''منیجر کون ہے؟''

''میں۔'' ایک آدمی نے اقرار کیا تو اس نے آگے بڑھ کر پستول اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ''میں تین تک گنوں گا اور اصل مال نہ ملا تو تمہارا بھیجا دیوار پر چپکا دوں گا۔ یہ بارہ تیرہ ہزار تمہارے کفن دفن کے لیے بھی ناکافی ہوں گے۔''

وہ لرز گیا... اور گنتی کی نوبت آنے سے پہلے اس نے کہا۔ ''دیتا ہوں .... دیتا ہوں اسے ہٹا لو .... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

اس نے پستول ہٹایا تو منیجر نے خفیہ تجوری میں چھپائی ہوئی اصل رقم نکال کر سامنے کر دی۔ یہ دو لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ اس نے ساری رقم ایک بیگ میں ڈالی جو اس کے شانے پر تھا۔ یہ لیپ ٹاپ رکھنے والا بیگ تھا اس کے ایک خانے میں رقم بھی آگئی۔ یہ کام کر کے اس نے خبردار کیا۔ ''کوئی پیچھے نہ آئے۔ مال جا رہا ہے اپنی جانیں محفوظ رکھو۔''

فرنچائز کے باہر عمر رسیدہ گارڈ مزے سے کرسی پر بیٹھا ہوا سڑک سے گزرتا ٹریفک دیکھ رہا تھا اور اسے اندر ہونے والی کارروائی کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے سامنے سے گزر کر بائیک پر بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ پستول اس نے پتلون کی بیلٹ میں باہر آتے ہی اڑس لیا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے ایک تاریک گلی میں بائیک گھمائی اور اپنے سر سے بالوں کی وگ اور مونچھیں اتار کر بیگ میں ڈالیں۔ اب وہ کلین شیو اور سر کے کریو کٹ بالوں کے ساتھ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ ڈاکے کے دوران اس نے اپنے تاثرات اور لہجہ جاہل بدمعاشوں کا سا رکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ پڑھا لکھا اور شریف و ذہین نوجوان لگ رہا تھا۔ وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آیا اور کچھ ہی آگے گیا ہو گا کہ پولیس موبائل کے ساتھ کھڑے پولیس والوں نے اشارے سے روک لیا اور اس کے شانے پر موجود بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

اس نے کھول کر دکھایا۔ ''لیپ ٹاپ ہے، میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔''

پولیس والے نے جانے کا اشارہ کیا اور وہ آگے نکل گیا۔ ذرا دیر بعد وہ شہر کے اس مہنگے ترین علاقے کے ساتھ واقع اس متوسط کالونی میں داخل ہوا۔ یہ یہاں کے لحاظ سے متوسط تھی ورنہ یہاں پر رہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور بائیک پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ دوسری منزل پر واقع ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آیا۔ یہ ون بیڈ لاؤنج کا فلیٹ تھا۔ اس پوری عمارت میں زیادہ تر چھوٹے فلیٹ تھے اس لیے یہاں اکیلے یا مختصر فیملی والے ملازمت پیشہ لوگ رہتے تھے جن کے آفس یہاں سے قریب پڑتے تھے۔ زیادہ تر پڑھے لکھے اور مہذب لوگ تھے جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور پڑوسیوں سے زیادہ میل جول نہیں تھا۔ اسی لیے وہ یہاں سکون سے رہتا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اصل میں کیا کرتا ہے۔ اس کے حلیے سے آس پاس والے اسے کوئی طالب علم سمجھتے تھے۔

لاؤنج میں آ کر اس نے بیگ صوفے کے سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھا۔ ریموٹ سے لاؤنج کا اے سی آن کیا اور خود کچن کے ساتھ رکھا درمیانے سائز کا فریج کھول کر سامنے قطار سے رکھے کولڈ ڈرنک کین میں سے ایک نکالا اور اسے کھولتا ہوا صوفے پر آیا۔ وہ شدت سے پیاسا تھا.... اس نے ایک ہی سانس میں نصف کین خالی کر دیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے بیگ سے لیپ ٹاپ نکال کر باقی بیگ ایک طرف کر لیا۔ اس نے رقم دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ تیرہ ہزار کیش بکس سے نکلی تھی اور دو لاکھ سے اوپر رقم تجوری سے ملی تھی۔ یہ اس کے کئی مہینوں کے اخراجات کے لیے کافی تھی۔ لیپ ٹاپ کھول کر اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور ایک میسنجر کھولا۔ فوراً ہی اس کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ اس کے لیے ایک اجنبی شخص کی طرف سے پیغام تھا۔ ''وانٹ ٹو میٹ۔''

یہ پیغام نیا نہیں تھا بلکہ تیسری بار اس کے پاس آیا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس شخص کو جانتا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے پاس میسنجر میں ایڈ تھا۔ اس کے باوجود اس کے پیغام آ رہے تھے۔ اس کے نام کی جگہ ایک خالی انسانی خاکہ آ رہا تھا۔ پہلی دو بار میں اس نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے اپنے طریقے سے پتا چلانے کی کوشش کی مگر وہ اس تک نہیں پہنچ سکا۔ پیغام

بھیجنے والا یقیناً کہیں زیادہ ماہر ہیکر تھا۔ اس سے زیادہ ماہر تھا ورنہ خود کو یوں نہیں چھپا سکتا تھا۔ وہ پیغام کو گھورتے ہوئے کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اے سی نے آن ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا اور اب لاؤنج ٹھنڈا تھا۔ اس نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے چند گہری سانسیں لیں۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے لکھا۔ ''کب؟''

خلافِ توقع فوراً جواب آیا۔ ''ابھی۔''

وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر اس نے لکھا۔ ''تم مجھے جانتے ہو؟''

''کسی حد تک۔''

''کہاں ملنا چاہتے ہو؟''

''تمہارے فلیٹ پر۔''

ایک لمحے کو اس کی کمر میں سنسناہٹ ہوئی۔ . . . ''تم جانتے ہو، میں کہاں رہتا ہوں؟''

''ہاں۔''

''کیسے؟''

''دروازہ کھولو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیزی سے پستول نکالا اور دبے قدموں دروازے تک آیا۔ ابھی وہ سُن گُن لے رہا تھا کہ کال بیل بجی اور باہر سے ایک دھیمی نسوانی آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو، تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

وہ پھر حیران ہوا۔ اس نے پستول واپس بیلٹ میں اڑسا اور دروازہ کھولا تو ساکت رہ گیا۔ سامنے سحر انگیز حسن کی مالک ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ذرا ترچھے پوز میں اس کی بالوں کی ایک لٹ گھوم کر چہرے سے نیچے گردن تک آ رہی تھی۔ اس نے سادہ سوٹ پہن رکھا تھا مگر درزی کی مہارت نے اسے یوں اس کے متناسب بدن پر فٹ کر دیا تھا کہ یہ سادہ سا لباس بھی سج گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹیب تھا اور وہ یقیناً اسی کی مدد سے اس سے بات کر رہی تھی۔ لڑکی کی عمر چوبیس کے آس پاس تھی مگر نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربے کار تھی۔ جب وہ ساکت اور خاموش رہا تو لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''مسٹر سعد حسن عرف ایس ایچ، کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔''

وہ پھر چونکا۔ یہ میسنجر پر اس کی آئی ڈی تھی۔ اس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ ''کون ہو تم؟''

وہ مسکرائی۔ ''تم پچھلے دو دن سے دیکھے بغیر مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو، اب تو میں تمہارے سامنے ہوں۔ باقی سوال جواب ہم کہیں بیٹھ کر نہ کریں؟''

سعد خفیف ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لڑکی اندر آئی۔ اس نے خوبصورتی سے سجے لاؤنج کا معائنہ کیا اور بولی۔ ''شکر ہے تم عام ہیکرز کی طرح بے پروا اور پھیلاوا پھیلانے والے نہیں ہو۔ مجھے گند پھیلانے والے لوگوں سے نفرت ہے۔''

''مجھے بھی۔'' سعد نے دروازہ بند کیا اور صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو، کیا پیو گی؟''

لڑکی نزاکت سے صوفے پر ٹک گئی۔ اس نے پشت نہیں لگائی اور کمر کے بل سیدھی بیٹھی تھی۔ یوں بیٹھنے سے اس کی نازک کمر کا خم نمایاں ہو رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کا یہ پوز کتنا دلکش لگتا ہے۔ سمٹا ہوا دوپٹا صرف اس کے ایک شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ ''شکریہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے صرف چند منٹ لوں گی۔''

سعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ویسے اسے عجیب سا لگ رہا تھا، آج تک اس کے گھر میں کوئی لڑکی یا عورت نہیں آئی تھی۔ ''کہو میں سُن رہا ہوں۔''

''تم جو کر رہے ہو وہ بہت گھٹیا اور خود کو ضائع کرنے والی بات ہے۔''

وہ چونکا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''میں کیا کر رہا ہوں؟''

''وہی جو کچھ دیر پہلے ایک موبائل فرنچائز پر کر کے آئے ہو۔''

اس نے پستول نکال لیا۔ ''تم جانتی ہو؟''

وہ ذرا متاثر ہوئے بغیر بولی۔ ''میں وہیں سے تمہارے پیچھے تھی۔''

''تم مخبر ہو؟'' سعد کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''تم عجلت میں فیصلہ کر رہے ہو۔ میں مخبر ہوتی تو اس وقت میری جگہ یہاں پولیس ہوتی۔''

''تب تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں نے کہا نا تم گھٹیا کام میں خود کو ضائع کر رہے ہو اور میں چاہتی ہوں تم وہ کرو جس کام کے تم ماہر ہو۔''

''میں تو سمجھتا ہوں کہ میں اس کام کا ماہر ہوں۔'' اس نے پستول لہرایا۔

''تم اس کے بھی ماہر ہو مگر تم اپنی جان اور آزادی کو خطرے میں ڈال کر جتنا کماتے ہو اس سے کہیں زیادہ تم بنا کسی رسک کے کما سکتے ہو۔''

''تم میرے پیچھے ہو، میرا سراغ کہاں سے ملا؟''

''ماسک مین سے۔''

اس بار سعد زیادہ چونکا تھا۔ ''تم اس بارے میں بھی جانتی ہو؟''

''ہمارا ہوم ورک تمہارے بارے میں مکمل ہے اسی لیے تو آفر لے کر آئی ہوں۔''

ماسک مین سعد کا ہیکر نیم تھا۔ وہ ہیکرز کی دنیا میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہم؟''

وہ مسکرائی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں اکیلی ہوں۔ ہماری پوری ٹیم ہے۔''

''کیسی ٹیم؟''

''اسی کام کی۔'' اس نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو کام تم اکیلے اور محدود پیمانے پر صرف شوقیہ کرتے ہو وہی کام ہم وسیع پیمانے اور پروفیشنل کرتے ہیں۔''

معاملہ واضح ہو رہا تھا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں؟''

''ہاں اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم بہت فائدے میں رہو گے۔''

''کیسا فائدہ؟''

''دولت۔'' وہ بولی۔ ''دولت ہی اصل فائدہ ہے اس سے تم سب خرید سکتے ہو۔''

''تم کو بھی؟''

اب تک لڑکی اس پر حاوی تھی اور بہت سکون سے اسے ہینڈل کر رہی تھی مگر سعد کے اس سوال نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا۔ سوال بہت غیر متوقع تھا۔ پہلی بار اس کے انداز میں جذبات کی آمیزش نظر آئی۔ ''یہ بہت گھٹیا سوال ہے؟''

''تم نے سب کچھ کہا تو میں نے پوچھ لیا کہ تم سب میں شامل ہو یا نہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ویسے اندر سے وہ خود حیران تھا کہ اس نے یہ سوال کیسے کر لیا۔ وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہونے والا نوجوان نہیں تھا۔ وہ ایک خاص نوع کی خوش روئی رکھتا تھا، وہ اگر کوشش کرتا تو لڑکیاں اس کی دسترس سے باہر نہیں رہتیں۔ لڑکی نے تڑخ کر کہا۔

''میں ایک انسان اور لڑکی ہوں، کوئی چیز نہیں ہوں۔''

''تب دولت سے سب نہیں خریدا جا سکتا اور تمہاری بات غلط ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''بائی دی وے میں انسانوں کو چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔''

''یہ تمہارا نقطۂ نظر ہے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ ''میں تمہارے پاس ایک پیشکش لے کر آئی ہوں۔''

''اگر میں اسے قبول کرنے سے انکار کر دوں؟''

''کیا تم ایسا کر سکو گے۔'' وہ ذرا آگے جھکی۔ ''جبکہ ہم تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں۔''

''اوہ! یہ پیشکش نہیں بلیک میلنگ ہے۔'' سعد کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

''تم جو چاہے سمجھو مگر تم نقصان میں نہیں رہو گے۔''

سعد سوچ رہا تھا کہ اس سے بڑا نقصان کیا ہو گا کہ اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ اس کا جس طرح سراغ لگایا گیا تھا اور پھر اس لڑکی کی غیر متوقع آمد بتا رہی تھی کہ وہ سنگین صورتِ حال سے دوچار ہے۔ وہ گفتگو کے دوران دل ہی دل میں صورتِ حال کا تجزیہ کر رہا تھا، اسے لگا کہ فوری انکار کرنا اس کے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے اس لیے مہلت حاصل کرنی ہو گی۔ اس نے پستول میز پر رکھ دیا اور پہلی بار مسکرایا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر مسکراہٹ آئی تو اس کا تاثر بدل گیا۔ لڑکی ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ وہی کیفیت تھی جو پہلی بار لڑکی کو دیکھنے پر سعد پر طاری ہوئی تھی۔ لڑکی چونکی تو سعد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہے۔ میں اتنی جلدی کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں؟''

''تم سوچ لو۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''تمہارے پاس کل تک کا وقت ہے۔'' اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کارڈ نکال کر میز پر ڈال دیا۔ ''جب فیصلہ کر لو تو اس نمبر پر کال کر لینا۔''

''کل تک کا وقت کم نہیں ہے۔''

''نہیں، اس سے زیادہ مہلت نہیں مل سکتی۔'' وہ سرد لہجے میں بولی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ جب تک سعد نے اس کی ذات کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا وہ حاکمانہ انداز کے باوجود اچھے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ دب گئی تھی مگر اس کے انداز میں ایک طرح کی خفگی آ گئی تھی۔ سعد نے اس کی توہین کی تھی اور کوئی شریف لڑکی اپنی توہین برداشت نہیں کرتی۔ اب سعد کو افسوس ہو رہا تھا اگر لڑکی ردِعمل نہ دیتی تو اسے اپنی حرکت پر افسوس بھی نہ ہوتا۔ لڑکی نے ردِعمل دیا۔ اسے یہ بات اچھی لگی تھی۔ اس نے عقب سے پکارا۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''یہ غیر ضروری ہے۔'' وہ بولی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سعد اس کے پیچھے آیا تو وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی مگر سعد سیڑھیاں اترنے کے بجائے اوپر کی طرف لپکا اور تیسری منزل کی گیلری سے اس نے نیچے جھانکا یہاں سے اپارٹمنٹ کا داخلی گیٹ نظر آتا تھا۔ اس نے لڑکی کو ایک سیاہ لگژری وین میں جاتے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھی۔ فرنٹ سیٹ خالی تھی اگر پیچھے کوئی بیٹھا ہوا تھا تو وہ اسے نظر نہیں آیا۔ وہ

واپس آیا تو مشکر تھا۔ برسوں سے وہ سکون کی زندگی گزار رہا تھا اور اس نے یہ سکون بہت کوشش کے بعد حاصل کیا تھا۔ رات دیر تک اپنے پسندیدہ مشغلے میں لگے رہنا اور صبح دیر تک سونا اسے بہت پسند تھا۔ دوپہر میں اٹھ کر وہ شام تک اپنے گھر کے کام نمٹاتا۔ صفائی اور لانڈری وہ خود کرتا تھا۔ کچن کی دیکھ بھال اور صفائی معمولی سا کام تھا کیونکہ وہ بہت کم کچھ پکاتا تھا۔ زیادہ تر باہر سے تیار کھانا لاتا تھا جنہیں بس گرم کرنا پڑتا تھا۔ باہر کے کام وہ شام تک نمٹاتا تھا اور تاریکی چھانے کے بعد وہ بہت کم فلیٹ سے باہر جاتا تھا۔

☆☆☆

ساحلِ سمندر سے کچھ ہی دور واقع اس عالی شان کوٹھی کے آس پاس کی جگہیں خالی تھیں اور اگر یہاں دوسری کوٹھیاں بنی ہوتیں تب بھی اس کی پرائیویسی میں فرق نہ آتا کیونکہ یہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ دو منزلہ کوٹھی کی اوپری منزل میں شیشے کا استعمال بہت زیادہ تھا اور یہاں اکثر کمروں کی پوری پوری دیواریں شیشے کی تھیں۔ سعد جس بڑے سے کمرے میں تھا اس کی سمندر کی طرف والی پوری دیوار شیشے کی تھی۔ بارہ بائی بائیس فٹ کا شیشہ بے جوڑ تھا اور سعد حیران تھا کہ اتنا بڑا بے جوڑ شیشہ بنایا اور پھر یہاں لگایا کیسے گیا ہوگا؟ یقیناً یہ بہت زیادہ قیمتی تھا۔ کمرے میں وسط میں نصف درجن اسکرینز اسٹینڈز پر کھڑی تھیں۔ ان کے آگے ایک گردے کی صورت والی گلاس ٹیبل تھی جس پر کی بورڈ اور ماؤس وغیرہ تھے۔ ایک الگ سے ویب کیم رکھا تھا جس میں مائک بھی لگا ہوا تھا۔ ایک مین فریم کمپیوٹر برابر والے کمرے میں تھا۔ یہ کمرا فریج سے زیادہ ٹھنڈا تھا اور اس کا درجۂ حرارت منفی پانچ درجے سینٹی گریڈ تھا۔ اپنے سیکڑوں ہائی اسپیڈ پروسیسرز کی وجہ سے یہ زبردست حرارت خارج کرتا تھا اور اسے ٹھنڈا رکھنے کے لیے سپر اے سی کولنگ لازمی تھی۔ اس کمرے میں جانے کے لیے ایک موٹا شیشے کا مکمل طور پر ائرلاک دروازہ تھا۔ جس کے پار مین فریم کے درمیانے سائز کے فریج جتنے حصے دکھائی دے رہے تھے۔ سعد اسے دیکھ کر سحر زدہ رہ گیا

''خوب صورت۔'' اس نے بے ساختہ کہا تو جیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''شاید تمہیں مشینوں میں ہی خوب صورتی نظر آتی ہے؟''

''ہاں کیونکہ یہ دھوکا نہیں دیتی ہیں۔'' سعد نے کی بورڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ یہ جدید ترین ٹچ بٹن کا شفاف شیشے جیسا کی بورڈ تھا۔ گردے جیسی شکل کی میز کے دوسری طرف اسٹینڈز پر مانیٹرز اس طرح کھڑے کیے گئے تھے کہ کرسی پر بیٹھنے والا بیک وقت سب پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سب سے بڑا مانیٹر وسط میں تھا اور یہ کوئی چالیس انچ کا تھا۔ اس مین فریم پر بیک وقت نصف درجن آپریٹرز الگ الگ کام کر سکتے تھے۔ میز پر ایک جدید لیپ ٹاپ بھی رکھا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے پہلے جیا نے اسے ساحلِ سمندر کے پاس ایک معروف فاسٹ فوڈ چین کے ریستوران کے سامنے سے پک کیا تھا۔ وہ اسی سیاہ وین میں تھی۔ جیا جو کارڈ دے کر گئی تھی اس پر صرف ایک سیاہ دائرہ بنا ہوا تھا اور نیچے ایک موبائل نمبر لکھا ہوا تھا۔ سعد نے کال کی تو جیا نے ریسیو کی تھی اور اس نے اسے ریستوران کے سامنے بلوایا تھا۔ سعد نے کہا۔

''میں صرف ایک صورت میں آؤں گا جب تم اپنا نام بتاؤ گی۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''میرا نام جیا ہے۔''

''نام بھی خوب صورت ہے۔'' سعد نے کہا تو اس نے لائن کاٹ دی تھی۔ سعد مذکورہ ریستوران پہنچا تو وہ وہاں آ چکی تھی۔ اس بار وہ اکیلی تھی اور جب وہ اسے کوٹھی میں لائی تب بھی کوئی اور فرد سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر سعد جانتا تھا یہاں اور لوگ بھی ہوں گے۔ اس نے جیا کی طرف دیکھا۔

''تمہارا سیٹ اپ بہت بڑا ہے، بھلا تمہیں مجھ جیسے عام سے آدمی کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ کون سا آدمی کارآمد ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''تم راضی ہو اس لیے باقی چیزیں ثانوی ہیں لیکن تمہیں اپنی اہلیت ثابت بھی کرنا ہوگی۔''

سعد مسکرایا۔ ''وہ کیسے؟''

جیا نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس پر کچھ معلومات تحریر تھیں۔ ''یہ دو بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات ہیں۔ تمہیں ان کے آن لائن بینکنگ کے پاس ورڈز اور موبائل نمبرز کی مدد سے انہیں ہیک کرنا ہے۔ ایک اکاؤنٹ سے رقم دوسرے میں ٹرانسفر کرنی ہے۔''

سعد نے فائل دیکھی اور کرسی پر آ گیا۔ اس نے کی بورڈ سامنے کیا تھا کہ جیا نے اسے روک دیا اور میز پر رکھے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس سے نہیں، تم یہ استعمال کرو گے۔''

اس نے شانے اچکائے۔ لیپ ٹاپ کا معائنہ کیا

اور اس کے بٹن دبانے لگا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''بائی دی وے، تم نے کہا ہے کہ تم لوگ آدمی خود چوائس کرتے ہو دوسرے کو صرف ہاں یا نہ کا آپشن دیتے ہو۔ پھر تمہیں یوں امتحان لینے کا کیا حق ہے؟ اب میں کام کروں یا نہ کروں تم چُن چکے ہو۔''

''ہم آدمی چن کر لیتے ہیں مگر وہ کام کا نہ نکلے تو اسے استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتے ہیں۔''

سعد مسکرانے لگا۔ وہ ابھی تک اس سے خفا تھی۔ اس نے کاغذ پر موجود معلومات دیکھیں۔ ان میں صرف اکاؤنٹ نمبر، کاؤنٹ ٹائٹل، ای میل اور موبائل نمبر تھا۔ گویا اسے ایک نہیں تین الگ الگ چیزوں تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک نظر جیا کو دیکھا۔ ''تم بہت صاف گو ہو۔''

''ہاں کیونکہ میں مجبور نہیں ہوں۔'' وہ ٹہلتے ہوئے گلاس وال تک چلی گئی اور باہر سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ اس نے اسکن فٹ جینز کے ساتھ کسی قدر ڈھیلی، لمبی اور سیاہ... ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ مگر اس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔ سعد نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تمہاری ٹیم کہاں ہے، اب تک تو میں تمہیں ہی دیکھتا آ رہا ہوں۔''

''جلد تم سب سے ملو گے اگر تم نے خود کو اہل ثابت کر دیا۔'' جیا پلٹ کر اس کی طرف آئی۔ وہ میز کے دوسری طرف تھی۔ ''پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ تم مزید کتنی دیر لگاؤ گے۔''

''کس کام میں؟'' سعد نے شرارت سے پوچھا۔

''جو تم کو دیا تھا۔'' جیا کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''وہ تو کب کا ہو گیا۔ ابھی تو میں گیم کھیل رہا تھا۔'' اس نے کہتے ہوئے لیپ ٹاپ جیا کی طرف گھما دیا۔ اسکرین پر پنگ پانگ کا گیم اوپن تھا۔ جیا نے اسے بند کیا تو بینک اکاؤنٹ کا پیج سامنے آ گیا جس میں رقم منتقل ہوئی تھی اور یہ دوسرے اکاؤنٹ سے آئی تھی۔ وہ حیران ہوئی مگر اس نے فوراً ہی اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ سعد کو عقب سے تالی کی آواز سنائی دی تو اس نے کرسی گھمائی۔ کمرے کے دروازے پر ایک خوش پوش اور تر و تازہ چہرے والا شخص کھڑا تھا۔ اعلیٰ درجے کے تھری پیس سوٹ، مناسب نقوش، سیاہ سلیقے سے بنے بالوں اور ہونٹوں میں دبے ہوئے سگار کے ساتھ وہ ایک باس کا مکمل تاثر دے رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے پچاس کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ وہ تالی بجاتا ہوا آگے آیا اور سعد کا شانہ تھپکا۔

''تم یقیناً تیز ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے متاثر ہوا تھا اور وہ بہت کم کسی سے متاثر ہوتا تھا۔

''عادل احمد۔'' آدمی نے ہاتھ آگے کیا۔

''سعد حسن۔'' اس نے ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ جانتے ہوں گے میرے بارے میں۔''

''اب سے نہیں پچھلے کئی مہینوں سے تمہاری سرگرمیاں نوٹ کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور سعد کو لے کر کونے میں رکھے چھوٹے صوفوں کی طرف آیا۔ وہ بیٹھا تو سعد نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تب آپ نے رابطہ کرنے میں دیر کی ہے۔''

''صحیح آدمی، صحیح وقت اور صحیح جگہ۔'' عادل نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم اسے میری ٹیم کا لوگو بھی کہہ سکتے ہو۔''

''یعنی مجھے بلانے کا وقت اب آیا ہے۔''

''بالکل۔'' عادل نے کہتے ہوئے جیا کی طرف دیکھا۔ ''کچھ ٹھنڈا گرم نہیں ملے گا؟''

''کیوں نہیں سر۔'' وہ مستعدی سے بولی۔ ''آپ حکم کریں۔''

''میرے لیے کافی اور تم.....'' عادل نے سعد کی طرف دیکھا۔

''میرے لیے بھی کافی۔''

جیا کمرے سے نکل گئی۔ عادل اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا اس نے کہا۔ ''میں نے انڈین ہیکر سے تمہارا مقابلہ دیکھا۔ تم نے بہت ہوشیاری سے اسے بے نقاب کیا۔ مگر تمہیں جیا نے تلاش کیا ہے اور وہی تمہیں یہاں لائی ہے۔ وہ زبان کی سخت ہے لیکن دل کی بری نہیں ہے، اگر اس نے تم سے کچھ تلخ اور سخت باتیں کی ہیں تو میں چاہتا ہوں تم انہیں بھول جاؤ اور خوش دلی سے میرے لیے کام کرو۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''پہلے مرحلے میں آپ کے سامنے ہوں۔ میں نے انکار نہیں کیا ہے۔ آگے حالات پر ڈی پینڈ کرتا ہے۔''

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''آگے تمہیں حالات بہتر ملیں گے۔''

''آپ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟''

''اگر تم سوچ رہے ہو کہ ایسا کوئی کام ہے جو تم نے

ابھی کیا ہے تو تم غلط سوچ رہے ہو۔ دونوں اکاؤنٹ میرے ہیں اور رقم ایک اکاؤنٹ سے دوسرے میں آگئی۔ اس لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں، اس قسم کے کام میں بھی بہت سے کر سکتا ہوں مگر آج تک کیے نہیں۔''

''یہ گھٹیا کام ہے۔'' عادل بولا۔ ''ہمیشہ وہ کام کرو کہ پیسا تمہارے پاس آئے اس کے ساتھ کوئی مشکل نہ آئے اور نہ ہی تمہارا ضمیر ملامت کرے۔''

''میں نے آج تک ہیکنگ سے ایک روپے کا فائدہ بھی نہیں اٹھایا مگر آپ لوگوں نے مجھے تلاش کر لیا۔'' سعد نے کہا اس کا مطلب واضح تھا کہ پیسا نہیں آیا مگر مشکل آگئی۔

''دراصل تم نے خود متوجہ کیا۔ خاص طور سے انڈین ہیکر کو جو عبرتناک شکست دی اس سے میرا بھی دل خوش ہوا ہے۔''

''انہوں نے چیلنج کیا تھا اور یہ ملک کی عزت کا معاملہ تھا۔''

''اب بھی سمجھ لو کہ ملک کی عزت کا معاملہ ہے۔'' عادل نے کہا تو سعد چونکا۔ اسی لمحے جیا ٹرے سمیت اندر آئی اور ٹرے میز پر رکھ کر ان سے پوچھا۔

''شوگر، کریم؟''

''لائٹ شوگر، نو کریم تھینکس۔'' سعد نے کہا اور عادل نے شکر بھی نہیں ڈلوائی۔ کافی کا سپ لے کر اس نے کہا۔

''اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا کیسا لگے گا؟''

سعد نے پھر صاف گوئی سے کہا۔ ''سچی بات ہے اگر میں اس بارے میں سوچتا تو وہ سب کیوں کروں جو میں پیسا کمانے کے لیے کر رہا ہوں۔''

''ابھی تم نے انڈین ہیکر سے مقابلے کے لیے ملک کی عزت کا حوالہ دیا تھا؟''

سعد جھینپ گیا۔ ''وہ تو ہے جی، سمجھ لیں کہ اس میں میری عزت کا مسئلہ بھی تھا۔ ماسک مین کی ایک ساکھ ہے۔''

اس کے جواب پر عادل نے کوئی خاص ردِعمل نہیں دیا اور بولا۔ ''ابھی تم ایک دو دن آرام اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔''

وہ خاموشی سے کافی پینے لگے۔ عادل نے کافی کا کپ خالی کر کے نیچے رکھا اور جیا سے کہا۔ ''اب سعد تمہاری ذمے داری ہے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھو گی۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' وہ ادب سے بولی۔ عادل کے سامنے اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ وہ بہت مؤدب اور سنجیدہ تھی۔ عادل کے جانے کے بعد سعد مسکرایا اور معنی خیز انداز میں بولا۔

''تم نے سن لیا ہوگا مس جیا کہ میری ہر ضرورت کا خیال تمہیں رکھنا ہے۔'' اس نے لفظ ضرورت پر زور دے کر کہا تھا۔

اس کے چہرے پر جز بز سے تاثرات نظر آئے۔ ''تم بدتمیز آدمی ہو۔''

''یہ خیال رکھنا تو نہیں ہوا۔''

وہ کچھ دیر سعد کو گھورتی رہی پھر مسکرانے لگی اور یہ بہت پُرکشش مسکراہٹ تھی۔ کسی مرد کے لیے اسے نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ''او کے اب میں خیال رکھوں گی۔''

''کیا مجھے یہیں رکنا ہوگا؟''

''بالکل۔''

''لیکن میرا سامان اور.....''

''سب یہاں مل جائے گا۔'' وہ بولی۔ ''کپڑوں سے لے کر شیونگ کٹ تک سب جو تم چاہو۔''

سعد نے غور سے اسے دیکھا۔ ''اس کے علاوہ بھی اگر میں کچھ چاہوں تو....؟''

''پلیز۔'' جیا کا رنگ گلابی ہو گیا۔ ''تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔''

سعد سنجیدہ ہو گیا۔ ''سوری اگر تمہیں بُرا لگا ہے تو؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' جیا نے کہا اور اسے گراؤنڈ فلور کے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لائی۔ یہاں سب کچھ تھا۔ ایک طرف دو اسٹیپ اونچے حصے میں بڑا سا بیڈ تھا اس کے ساتھ ہی بڑی سی الماری تھی۔ اسی حصے کے ایک کونے میں شیشے کا بنا ہوا مکمل واش روم تھا۔ فرش مکمل کارپٹ تھا۔ اسٹیپ سے نیچے لاؤنج تھا اور وہاں سٹنگ کا مکمل بندوبست تھا۔ دبیز آرام دہ صوفے اور وسط میں بڑی ہی جدید طرز کی مکمل شیشے سے بنی میز تھی۔ یہاں دیوار پر پچاس انچ کا ایل ای ڈی ٹی وی جس میں ڈی وی ڈی اور بلو رے پلیئر بلٹ ان تھا اور جدید ترین اسپیکرز موجود تھے۔ یہ مکمل ملٹی میڈیا سسٹم تھا۔ وہاں فریج تھا جس میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا تھا۔ کھانا گرم کرنے کے لیے مائیکرو ویو بھی موجود تھا۔ ڈسپوزیبل کراکری تک موجود تھی۔ جیا اسے لے کر بیڈ روم والے حصے میں آئی اور دیوار گیر الماری کا سلائڈنگ ڈور کھسکایا اور اندر لٹکے بے شمار کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا سائز ہوگا لیکن اگر مس میچ ہو تو دوسرے

آ جائیں گے۔''

الماری کے نچلے حصے میں درجن بھر جوتے اور سینڈلز رکھے تھے۔ اندر پہننے والے سلیپرز الگ تھے۔ پرفیومز، شیونگ کا سامان، رومال اور موزے اور اسی طرح کی ضرورت کی تمام چیزیں وہاں بہت زیادہ تعداد میں اور اعلیٰ درجے کی موجود تھیں۔ دیواروں اور چھت پر نظر نہ آنے والی لائٹس کی مدد سے روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے کی تمام لائٹس اور اے سی ایک ہی ریموٹ سے کنٹرول ہوتے تھے۔ وہاں سب کچھ تھا مگر وہ چیز نہیں تھی جو اس کی زندگی کا لازمی جزو تھی یعنی کمپیوٹر۔ صرف کمپیوٹر ہی نہیں وہ موبائل سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ریستوران کے سامنے گاڑی میں بیٹھتے ہی جیا نے اس سے موبائل لے کر اسے آف کر کے کلوزٹ میں ڈال دیا تھا۔ گویا اسے یہاں موبائل کے بغیر رہنا تھا اور کمپیوٹر بھی ان لوگوں کی مرضی سے استعمال کرنے کا موقع ملتا۔ جو بات واضح تھی وہ پوچھنا بیکار تھا اس لیے سعد نے کام کی بات پوچھی۔

''میں یہاں سے باہر جا سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''لیکن میرے ساتھ۔''

سعد نے گہری سانس لی۔ ''یعنی مجھے اکیلے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

''دیکھو تم نے ہمارے رویے کی بات کی تھی اور سر نے بتا دیا کہ وہ بہتر ہوگا لیکن اس کا انحصار تم پر بھی ہے۔ اگر تم ٹھیک چلے اور کوئی مسئلہ نہ کیا تو پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ ٹیم میں جو بھی آتا ہے اس پر پابندیاں لگتی ہیں۔ جب میں ٹیم میں آئی تھی تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔''

''تم کب سے یہاں ہو؟''

''میں سر کے ساتھ چھ سال سے ہوں۔''

سعد نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تم بہت کم عمری میں آگئی تھیں شاید اسکول گرل ہوگی۔''

''نہیں، میں نے آئی ٹی میں ماسٹر کیا، اس کے بعد سر کے ساتھ شامل ہوئی۔''

یہ دوسری حیرت تھی۔ ''تب تمہاری عمر کیا ہے، دیکھنے میں تو تم چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی ہو۔''

اس بار وہ دل سے مسکرائی۔ ''میں اٹھائیس کی ہو جاؤں گی آنے والی فروری میں۔''

سعد نے اس سے کام کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ ایک ہیکر ہونے کے ناتے وہ جانتا تھا کہ جتنے جرائم اس

نہ دکھائی دینے والی دنیا میں ہوتے ہیں اتنے دکھائی دینے والی دنیا میں نہیں ہوتے۔ صرف انٹرنیٹ فراڈ کی بلیک مارکیٹ اسلحے اور منشیات کے بعد کمائی کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آ چکی ہے اور اس کی مالیت ان دونوں مجرمانہ افعال سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ شاید دس سال بعد یہ کالی کمائی کے لحاظ سے دنیا میں پہلے نمبر پر آ جائے گی۔ ان میں بینک کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈز کے فراڈ سب سے زیادہ ہیں پھر بینک اکاؤنٹس ہیک ہو جاتے ہیں اور ان سے خریداری کر لی جاتی ہے۔ یا اے ٹی ایم سے رقم نکلوالی جاتی ہے۔ ایسے قانونی دھندے جن کی اخلاقی حیثیت صفر ہے وہ اب یہاں عام بزنس شمار ہوتے ہیں۔ جیسے اینٹی وائرس سافٹ ویئر فروخت کرنے والی کمپنیاں ہی اصل میں وائرس بناتی ہیں۔ وہ پہلے اپنا ایجاد کردہ وائرس پھیلاتی ہیں اور پھر اپنے سافٹ ویئر کی مدد سے اس کا تدارک کرتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو پہلے زہر دے دیا جائے اور پھر اسے تریاق خریدنے پر مجبور کیا جائے۔

پر کلک کی کمائی یعنی آپ جو ویب سائٹ کھولیں گے اس کی ادائیگی اس سائٹ کو کسی نہ کسی ذریعے سے جاتی ہے۔ کھلے عام کمانے والی سائٹ لاتعداد ہیں مگر جو بہ ظاہر فری ہیں ان کی آمدنی بھی بہت زیادہ ہے۔ خاص طور سے سوشل میڈیا سائٹس بہ ظاہر فری ہیں مگر کمانے میں انہوں نے آئی ٹی کمپنیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ کمائی کے یہاں اتنے طریقے ہیں کہ آدمی گننے بیٹھے تو پوری طرح گن بھی نہ پائے۔ معمولی گیمز سائٹ ماہانہ لاکھوں ڈالرز کما رہی ہیں۔ مگر یہ چھوٹے بزنس ہیں۔ اصل بزنس سیکیورٹی کا ہے اور آج کل سب سے زیادہ سیکیورٹی مہیا کرنے والی کمپنیاں کما رہی ہیں۔ بڑے کاروباری اور سرکاری ادارے۔ این جی اوز اور حتیٰ کہ اسپورٹس بزنس والے بھی اپنے رازوں... اور کاروباری طریقوں کی حفاظت چاہتے ہیں۔ وہ ہیکرز کے ہاتھوں سب سے زیادہ خطرے میں رہتے ہیں اور اپنی سیکیورٹی کے بدلے لاکھوں کروڑوں دینے کو تیار رہتے ہیں۔

سعد چاہتا تو انٹرنیٹ سے بہت کما سکتا تھا مگر اسے باقاعدہ کام کا سوچ کر الجھن ہوتی تھی۔ وہ اپنے کام سے خوش تھا کیونکہ وہ اس سے کماتا نہیں تھا اس لیے کرنے پر مجبور بھی نہیں تھا۔ جب اس کا دل چاہتا کام کرتا اور جب نہیں چاہتا تو نہیں کرتا تھا، اسے اپنی یہ آزادی عزیز تھی۔ مگر اب یہ آزادی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے قابو میں تھا اور یہاں آنے کے بعد وہ کسی قدر پچھتا رہا تھا کہ اس نے انکار کیوں نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی شناخت کھل جاتی، وہ کچھ عرصے بعد کسی اور نام سے کسی اور جگہ سے دوبارہ کام شروع کر دیتا۔ مگر یہاں آنے کے بعد انکار کا مطلب تھا کہ شاید اس کا وجود ہی دنیا سے غائب ہو جائے اور کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ سعد حسن کہاں گیا اور نہ کوئی یہ جان پائے گا کہ ماسک مین اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ یہاں مین فریم جیسا مہنگا ترین کمپیوٹر اور یہاں کا سیٹ اپ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اب اس کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ صبر سے موقع کا انتظار کرے۔ اس نے جیا سے پوچھا۔

”مجھے کوٹھی میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے؟“

”ہر جگہ سوائے اوپری فلور کے۔“ جیا نے کہا۔ ”وہاں تم صرف میرے ساتھ جا سکتے ہو۔“

”گویا تم میرے لیے لازم و ملزوم ہو۔“ سعد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر جب میں اس حوالے سے کوئی بات کرتا ہوں تو تم برا مان جاتی ہو۔“

”الفاظ کے برعکس تمہارا لہجہ کچھ اور ہوتا ہے۔“ جیا جھینپ گئی۔

”تم ہمہ وقت میرے ساتھ رہو گی لیکن رات کو تو مجھے اکیلے سونے کا موقع ملے گا نا؟“

جیا کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور اس نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”دیکھا..... دیکھا تم نے پھر معنی خیز بات کی ہے۔“

”حالانکہ میں نے صرف بات کی ہے، معنی خیز تم نے خود اسے بنا لیا۔“ سعد ہنسا مگر پھر اس کے تاثرات دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ ”تم فیل زیادہ کرتی ہو۔“

جیا نے اس کا تبصرہ نظر انداز کیا اور بولی۔ ”تم مجھے کسی وقت بھی کال کر سکتے ہو۔“

”کیسے؟“

”اس ریموٹ پر لگا ہوا سرخ بٹن دبا کر۔“ اس نے کمرے کی لائٹس اور اے سی کا ریموٹ اٹھا کر دکھایا۔

سعد مسکرانے لگا۔ ”اب میں کہوں کہ ریموٹ پر تمہارا بھی بٹن ہے تو تم پھر فیل کرو گی۔“

وہ اسے گھورتے ہوئے چلی گئی۔ جیا کے جانے کے بعد سعد نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر واش روم کا گلاس ڈور کھول کر دیکھا۔ یہ بہت پُرتعیش اور جدید ترین واش روم تھا جس میں شاور کے علاوہ باتھ ٹب بھی تھا۔ شاور والے شیشے کے خانے میں سونا باتھ کا بھی انتظام تھا۔ کموڈ والا حصہ الگ

تھا۔ اتنا شاندار واش روم دیکھ کر اس کا دل نہانے کو چاہا اور اس نے الماری سے کپڑے نکالے۔ جیا کا کہنا درست تھا یہ اسے سائز میں پورے تھے۔ شاور لے کر اس نے کپڑے بدلے اور کمرے میں آ کر دبیز بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی اور ایئر فریشنر کی مدھر خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے خود سے کہا۔

”عیش کرو سعد میاں جب تک نصیب میں ہے۔“

☆☆☆

عادل احمد اس کے سامنے ٹہل کر بات کر رہا تھا۔ ”ہمارے ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں کا بڑا طبقہ ملک کے وسائل میں سب سے زیادہ حصہ حاصل کرتا ہے لیکن جب ملکی خزانے کو دینے کا وقت آتا ہے تو اس کا حصہ عام فرد سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ تم اس کی وجہ جانتے ہو؟“ اس نے رک کر سعد کی طرف دیکھا۔

سعد اس بارے میں صرف عام معلومات رکھتا تھا۔ ”وہ اپنی دولت اور آمدنی چھپاتے ہیں۔ اپنے اثاثے ظاہر نہیں کرتے۔ اس لیے وہ ٹیکس سے بچ جاتے ہیں۔“

”بالکل، صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ عام آدمی کے ادا کیے ہوئے ٹیکس کو بھی ری فنڈ کرا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ ٹیکس دیتے نہیں بلکہ لیتے ہیں۔ اپنی دولت بیرونِ ملک رکھتے ہیں۔ سوئس بینکوں میں ہمارے ملک کے لوگوں کے اثاثے ہمارے مجموعی بیرونی قرضوں سے کہیں زیادہ مالیت کے ہیں۔“

”میں نے بھی اس بارے میں سنا ہے۔“

”یہ حقیقت ہے۔“ عادل نے زور دے کر کہا۔ شخصیت کی طرح اس کا اندازِ گفتگو بھی پُرکشش تھا۔ ”یہ صرف ایک ملک ہے اور دنیا میں ایسے بے شمار ملک ہیں جن میں ہمارے لوگوں کی غیر قانونی یا چھپائی ہوئی دولت موجود ہے۔ یہ دولت اگر ملک میں آ جائے تو ہماری تقدیر بدل جائے۔ ہم قرض لینا بھول جائیں اور ہمارا ملک ایک عشرے میں دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک میں شامل ہو جائے۔ غربت کا نام و نشان مٹ جائے۔ ہر کسی کو تعلیم، صحت، مکان اور روزگار ملے۔ غربت سے جنم لینے والی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔“

بولتے ہوئے عادل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سعد اس کی تقریر سے متاثر ہوا تھا۔ ”کیا کسی طریقے سے اس دولت کا سراغ نہیں لگ سکتا؟“

”یہی تو میں چاہتا ہوں۔“ عادل نے جوش سے کہا۔

مسلسل بولنے سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ”یہی تو میری ٹیم کا مقصد ہے کہ ان چھپے چوروں اور ان کی چھپائی دولت کو سامنے لایا جائے۔ ہمارے ہاں حکومت اور اس کے ادارے اس دولت سے بے پروا ہیں کیونکہ وہ ان ہی جیسے بدعنوان لوگوں کا پیسا ہے اس لیے وہ کیوں چاہیں گے کہ اس ملک کی دولت ملک میں آئے۔ اس لیے یہ کام ہمیں کرنا ہوگا۔“

”ہم کیسے کریں گے؟“ سعد نے پوچھا۔

”سب سے پہلے ہم اس دولت کا سراغ لگائیں گے اور اس کے بعد اس کے مالکان کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنی دولت ملک میں لے کر آئیں۔“

”مجبور کیسے کریں گے؟“

عادل نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ”یہ بعد کا مرحلہ ہے پہلا مرحلہ اس دولت کا سراغ لگانا ہے۔“

سعد کو لگ رہا تھا کہ رفتہ رفتہ معاملات کھل رہے ہیں۔ ”مجھے ..... کیا کرنا ہوگا؟“

عادل اس کی طرف جھکا اور اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ماسک مین یہ کام تمہیں ہی کرنا ہے۔“

”مجھے..... مگر کیسے؟“

عادل نے ایک بار پھر اس کا سوال نظر انداز کیا۔ ”تم باصلاحیت ہو، کر سکتے ہو۔“

سعد نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے آج تک اس پیمانے پر کام نہیں کیا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ میں کر سکتا ہوں۔“

”کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا جب تک اسے کر کے نہ دیکھ لیا جائے۔“ عادل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تم ذہین ہو اور اسی دنیا کے فرد ہو۔ اگر ذرائع کا مسئلہ تھا تو اب وہ بھی نہیں ہے۔ مین فریم جیسا طاقتور کمپیوٹر ہے۔ آئی ٹی سلوشن کے لیے میں ہوں۔ جیا بھی ہیکنگ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ اس کی صلاحیت کا اندازہ اس سے لگا لو کہ اس نے تمہارا سراغ لگا لیا۔ تمہارا کیا خیال لوگوں نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی خاص طور سے ان لوگوں نے جنہوں نے تم سے چوٹ کھائی۔ مگر وہ تمہیں تلاش نہیں کر سکے۔ جیا نے یہ کام کر لیا، وہ بہت ذہین ہے اور تمہیں اسسٹ کر سکتی ہے۔“

سعد سوچ میں پڑ گیا... پھر اس نے پوچھا۔ ”مجھے کرنا کیا ہے؟“

عادل خوش ہو گیا۔ ”یہ ہوئی نا بات، آدمی کو واضح

کے بجائے ہمیشہ واے نات کہنا چاہیے۔ یہ دیکھو.....'' اس نے کی بورڈ پر چند بٹن دبائے اور بڑی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک خوب صورت عمارت دکھائی دینے لگی۔ عادل نے کہا۔ ''یہ ایک سوئس بینک کے ہیڈ آفس کی عمارت ہے، نام تم عمارت پر دیکھ سکتے ہو۔ اس کا شمار سوئس بینکوں میں پہلے دس بڑے بینکوں میں ہوتا ہے۔ دوسرے سوئس بینکوں کی طرح یہ بھی غیر ملکیوں کو خفیہ اکاؤنٹس کی سہولت دیتا ہے۔ ساری دنیا سے اور خاص طور سے تیسری دنیا سے لوگ یہاں اپنی دولت چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان میں بڑی تعداد ہمارے ہم وطنوں کی بھی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہاں ہمارے ملک کے دو سو تیس افراد کی تقریباً بارہ ارب ڈالرز کی دولت موجود ہے۔''

سعد دنگ رہ گیا۔ ''بارہ ارب ڈالرز یا روپے؟''

''ڈالرز۔'' عادل نے زور دے کر کہا۔ ''یہ ہمارا پیسا ہے جو ان لوگوں نے کرپشن یا دو نمبر طریقوں سے کما کر اس بینک میں رکھا ہے۔ بینک نے اپنی پالیسی کے تحت ان لوگوں کے اکاؤنٹس خفیہ رکھے ہیں اور وہ کسی صورت بتائے نہیں جاسکتے اس لیے ہم دوسرے طریقوں سے ان اکاؤنٹس کی تفصیل معلوم کریں گے اور ان مجرموں کو قوم کے سامنے لائیں گے۔''

''ہیکنگ سے؟'' سعد نے کہا۔

''بالکل یہی ایک راستہ ہے۔''

''ہمارے بینک کے اکاؤنٹس ہیک کرنا مختلف کام ہے لیکن ان بینکوں کی سیکیورٹی بھی اسی حساب سے ہوتی ہے اور وہ تقریباً فول پروف ہوتی ہے۔''

''اصل کام فول پروف سیکیورٹی کو توڑنا ہے۔'' عادل نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے ٹھیک کہا یہاں بینکوں کی سیکیورٹی ایسا ہی مذاق ہے جیسا کہ یہ بینک گارڈز کی صورت میں کرتے ہیں۔ بوڑھے اور ناکارہ افراد جنہیں گن بھی ٹھیک سے پکڑنا نہیں آتی، وہ یہاں بینک گارڈز ہوتے ہیں۔''

''ٹاسک کیا ہے؟''

''بینک کے مرکزی سرورز تک رسائی حاصل کرنا۔ جن میں خفیہ ڈیٹا ہوتا ہے وہ اسی عمارت میں ہیں۔ ان سرورز کو ہیکرز سے تحفظ دینے کے لیے فول پروف سیکیورٹی دی گئی ہے۔ یہ مکمل طور پر انٹرنیٹ (اداروں کے اندرونی نیٹ) پر کام کرتے ہیں۔''

''یعنی انٹرنیٹ سے الگ ہوتے ہیں۔'' سعد نے غور کیا۔ ''اس صورت میں یہاں داخل ہونا ناممکن ہے۔''

''میں نے کہا نا کچھ ناممکن نہیں ہے جب تک وہ کام کر کے نہ دیکھ لیا جائے۔'' عادل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بینک کے سرورز کو جو انٹرنیٹ سیکیورٹی کمپنی سیکیورٹی مہیا کرتی ہے اس کے یورپ میں چار مرکزی دفاتر ہیں اور یہ وہیں سے اپنا کام کرتی ہے۔''

جیا وہیں بیٹھی تھی' اس نے پہلی بار کہا۔ ''اگر یہ کمپنی سیکیورٹی دے رہی ہے تو اسے سرورز تک رسائی حاصل ہو گی۔''

عادل نے تالی بجائی۔ ''دیکھا..... راستے نکلنا شروع ہو گئے۔ کمپنی یقیناً انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔''

''تب کام شروع کرتے ہیں۔'' سعد نے کہا اور میز پر مرکزی اسکرین کے سامنے آ گیا۔ اس نے کی بورڈ اپنی طرف کیا اور اس پر انگلیاں چلانے لگا۔ یہ مین فریم کسی بھی آپریٹنگ سسٹم کا محتاج نہیں تھا بلکہ ہر استعمال کرنے والا اس پر اپنی کمانڈز بنا کر ان سے کام کر سکتا تھا۔ سعد کمانڈز بنانے لگا۔ کمپیوٹر اتنا تیز رفتار تھا کہ وہ ابھی انٹرنیٹ کے بٹن سے انگلی بھی نہیں اٹھاتا تھا کہ کام ہو جاتا تھا۔ عادل اور جیا خاموشی سے اسے کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹے میں اس نے اپنا کام مکمل کر لیا اور اپنی بنائی کمانڈز کو محفوظ کر لیا۔ اب مین فریم استعمال کے لیے تیار تھا۔ اس کے بعد اس نے بینک اور اس کی ای سیکیورٹی سے متعلق کمپنی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ بینک تو اعلیٰ درجے کا تھا اس کی ای سیکیورٹی کے لیے کام کرنے والی کمپنی بھی بہت اعلیٰ درجے کی تھی اور اس کا شمار دنیا کی چند گنی چنی ای سیکیورٹی مہیا کرنے والی کمپنیوں میں ہوتا تھا۔ اس کے ملازمین کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ تھی جس میں پانچ سو بہت ٹاپ کے آئی ٹی پروفیشنل تھے۔

یہی آئی ٹی پروفیشنل اس کمپنی کی جان تھے۔ انہیں بہت بھاری تنخواہیں اور سہولتیں دی جاتی تھیں۔ مگر یہ ادائیگیاں ان کی صلاحیتوں کے بدلے نہیں بلکہ اس کام اور متعلقہ امور کو خفیہ رکھنے کے بدلے کی جاتی تھیں جو وہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس مختلف کمپنیوں اور اداروں کا جو ڈیٹا ہوتا تھا اس کی مالیت بہت زیادہ تھی۔ ان کمپنیوں اور اداروں کے حریف مذکورہ معلومات کے بدلے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو جاتے۔ سعد تمام معلومات اسکرین پر لا رہا تھا۔ اس نے کمپنی کے اہم افسران اور ذمے داروں کی پروفائل نکالنا شروع کی۔ ان سب کے مختلف سوشل سائٹس پر اکاؤنٹس تھے۔ انہیں ہیک کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

مگر ایسا کرنے کی صورت میں وہ ہوشیار ضرور ہو جاتے اس لیے سعد نے صرف سامنے کی معلومات حاصل کیں جو کوئی بھی کر سکتا تھا۔

اس کے بعد اس نے ان کے ای میلز اور انٹرنیٹ کے دوسرے اکاؤنٹس تلاش کرنا شروع کیے۔ جیسے مینیجرز کے اکاؤنٹس اور سائنس اکاؤنٹس جہاں جانے کے لیے آئی ڈی لازی ہوتی تھی۔ اسی طرح ان سب کے بینک اکاؤنٹس بھی تھے مگر یہ بیکار تھے۔ اصل کام کی چیز ای میل اکاؤنٹس تھے۔ یہ کام بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سعد نے مطلوبہ افراد کے ای میل اکاؤنٹس نکال لیے۔ مگر اس سے اگلا مرحلہ دشوار تھا۔ اب اسے معلوم کرنا تھا کہ بینک کے سرورز تک کن افراد کی رسائی تھی۔ اس کے لیے ان سب کو فرداً فرداً چھاننا تھا۔ وہ اکیلا یہ کام کرتا تو بہت وقت لگ جاتا اس لیے سعد نے جیا سے کہا۔

''تم بھی آ جاؤ۔''

وہ مین فریم کے دوسرے کی بورڈ پر آ گئی۔ ''کمانڈز میں میری رہنمائی کرو۔''

سعد اسے کمانڈز بتانے لگا۔ اس دوران میں عادل وہاں سے چلا گیا۔ وہ بے آواز طریقے سے آنے جانے کا عادی تھا۔ سعد کو ذرا دیر سے احساس ہوا وہ اب کمرے میں نہیں ہے۔ اس نے جیا کی طرف دیکھا۔ ''عادل چلا گیا ہے؟''

''شاید۔'' وہ بولی۔ ''پلیز، وہ تم سے عمر اور رتبے میں بہت بڑے ہیں اس لیے ادب سے نام لیا کرو۔''

''میں کسی کو.....'' اس سے پہلے کہ اس کا جملہ مکمل ہوتا جیا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

''میرا خیال ہے ہمیں کام پر توجہ دینی چاہیے۔''

سعد نے گہری سانس لی۔ ''اوکے..... ان کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس کھنگالو مگر ہیک کیے بغیر۔ جو بھی کونٹیکٹس ہوں یا دوسرے افراد کے بارے میں معلومات ہوں' وہ جمع کرتی جاؤ۔''

''یہ تو خاصا طویل کام ہے۔'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''لیکن کرنا ہے۔'' سعد نے کہا۔ ''اصل میں ہمیں پورا خاکہ تیار کرنا ہے اور پھر ان افراد تک پہنچنا ہے جو بینک کے سرورز تک رسائی رکھتے ہیں۔ اس کے لیے یہ کام کرنا ہی ہے۔''

جیا نے سر ہلایا اور سعد کے دیے کام میں لگ گئی۔ یہ

بہت طویل، بور اور تھکا دینے والا کام تھا۔ وہ شام کے چھ بجے بیٹھے تھے اور جب سعد نے بھوک لگنے پر گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے انگڑائی لی۔ ''وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔''

جیا کے چہرے سے تھکن نمایاں تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا خیال ہے باقی کل پر نہ رکھا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کام محفوظ کیا اور اسے چھپا دیا۔ اب اسے سوائے اس کے اور کوئی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فولڈر لاک کرنے کے بجائے اسے سرے سے غائب کر دیا تھا۔ جیا دیکھ رہی تھی مگر اس نے اعتراض نہیں کیا۔ ''یہ بہت طویل کام ہے۔ صرف کل یا پرسوں نہیں ابھی یہ بہت دن چلے گا۔''

وہ اٹھ کر باہر آئے۔ کمپیوٹر روم کا دروازہ خودکار طریقے سے بند ہو جاتا تھا۔ پھر اسے جیا ہی کھول سکتی تھی، اس نے پوچھا۔ ''ہم ہیکرز کے طریقے کیوں نہیں استعمال کر رہے ہیں۔''

''وہ بھی کریں گے جب ہم بینک کے سرورز تک پہنچ جائیں گے۔'' سعد نے جواب دیا۔ ''تم جانتی ہو کہ کوئی بھی بریک کرنے کی صورت میں بات کھل جاتی ہے اس لیے ابھی ہمیں شک کا موقع دیے بغیر کام کرنا ہے۔''

وہ نیچے آئے، جیا نے کچن کی لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

''میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' سعد کرسی پر ٹک گیا۔

کوٹھی میں بیڈ رومز اور کچن وغیرہ نیچے تھا۔ مگر انہیں سب خود کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ کوٹھی سینٹرلی ائرکنڈیشن تھی۔ اس کی صفائی جیا خود کرتی تھی۔ کھانا زیادہ تر تیار اور باہر سے آتا تھا۔ کپڑے دھونے کے لیے آٹومیٹک مشین تھی جس میں ایک طرف سے کپڑے ڈالو تو دوسری طرف سے صاف اور خشک ہو کر نکلتے تھے۔ صرف استری کرنے کی کسر باقی رہ جاتی تھی۔ لان کی دیکھ بھال کے لیے مالی آتا تھا مگر وہ پارٹ ٹائم تھا اور چند گھنٹوں میں اپنا کام مکمل کر کے چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں وہ لان تک محدود رہتا تھا اور اسے کوٹھی میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف دس فٹ اونچی دیواروں پر خاردار تاروں کی باڑھ تھی جس میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ سیکیورٹی کے لیے دو درجن کیمرے تھے۔ جن کی زد سے کوٹھی کا بہ مشکل ہی کوئی حصہ محفوظ تھا۔ آنے جانے کے لیے ایک ہی

گیٹ تھا جو خود کار انداز میں کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ سعد کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا کنٹرول کہاں تھا۔

عمارت میں آنے جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور یہ الیکٹرانک لاک تھا جو نمبر اور فنگر پرنٹ دینے سے کھلتا تھا۔ فنگر پرنٹ جیا کا تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمام کھڑکیوں پر جدید قسم کی نہایت مضبوط گرل تھی اور اوپری منزل پر گلاس وال کا شیشہ ناقابلِ شکست تھا۔ گویا وہ کوٹھی سے کیا اس عمارت سے بھی اپنی مرضی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اگرچہ جیا اس کے ساتھ تھی اور بہ ظاہر اس کے بس میں تھی۔ مگر وہ اس کے ساتھ بھی کیا کرسکتا تھا۔ اگر وہ کسی طرح یہاں سے نکل جاتا تب بھی عادل جیسے طاقتور آدمی کو اپنا دشمن بنالیتا۔ یہ سب سوچ کر وہ خود کو ٹھنڈا کرتا رہتا تھا کہ جب اس نے ایک قدم اٹھا ہی لیا ہے تو اب اسے آگے بڑھنا ہے اور اسی میں اپنے لیے محفوظ راستہ تلاش کرنا ہے۔ کمپیوٹر روم میں جیا نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کا کہہ کر سمجھا دیا تھا کہ ان کی باتیں سنی جارہی تھیں اور شاید ریکارڈ بھی ہو رہی تھیں۔ اگلے دن ناشتے کی میز پر اس نے ٹشو پر لکھا۔

''کیا میں یہاں بات کرسکتا ہوں۔''

اس نے لکھ کر جیا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ٹشو دیکھا اور نیچے لکھا۔ ''اس کوٹھی میں کہیں نہیں۔''

جیا نے ٹشو اس کے سامنے کیا اور جب اس نے پڑھ لیا تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ سعد نے سر ہلایا اور بولا۔ ''آج بہت کام کرنا ہے۔''

''مجھے کچھ سامان لینے جانا ہے، میں دوپہر میں آؤں گی۔ تب ہم کام کریں گے۔''

''تب تک میں کیا کروں گا؟''

''آرام اور انجوائے۔'' اس نے جواب دیا۔ اس میں واضح تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کمپیوٹر روم میں نہیں جاسکتا تھا۔ جیا نے ناشتے کے برتن دھو کر کچن صاف کیا اور روانہ ہوگئی۔ وہ تیزی اور صفائی سے کام کرتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سعد نے کوٹھی کا نچلا فلور گھوم پھر کر دیکھا۔ مگر یہاں سوائے لاؤنج، کچن اور اس کے کمرے کے باقی ساری جگہیں لاک تھیں۔ یہاں کوئی فون نہیں تھا۔ وہ کھڑکیوں سے کوٹھی کے لان کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ خاصی بڑی کوٹھی تھی، کم سے کم دو ہزار گز کی اور اس کی مالیت یقیناً نصف ارب روپے تھی کیونکہ یہ شہر کے مہنگے ترین علاقے میں تھی۔ عادل احمد اپنے انداز سے ہی دولت مند لگ رہا تھا۔ سعد نے اس کی بات کا ایک فیصد اعتبار نہیں کیا تھا اگرچہ وہ اس کے اندازِ بیاں سے کچھ متاثر ہوا تھا مگر وہ اسی دور کا انسان تھا اور اسے اپنے گاؤں نما شہر سے یہاں آئے ایک عشرے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ کوئی شخص بنا کسی مفاد کے محض خلوصِ نیت سے کچھ نہیں کرتا ہے۔ یہاں ہر شخص اپنی ذات سے آگے کچھ دیکھنے کو تیار نہیں ہے۔ اگر عادل سچ مچ بھی ملک کے مفاد میں یہ کام کر رہا تھا تو یقیناً اس کے پسِ پشت اس کا بھی کوئی مفاد ہوگا۔ البتہ سعد اس پر حیران تھا کہ یہاں بھی لوگ اب اس شعبے میں اتنے بڑے پیمانے پر کام کرنے لگے ہیں۔ شروع میں جب وہ ہیکنگ کی دنیا میں آیا اور اس نے چند ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں تو خود کو بہت کچھ سمجھنے لگا تھا مگر رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوگیا کہ وہ اس دنیا کا بہت معمولی سا فرد تھا۔ یہاں ایسے لوگ بھی تھے جن کے سامنے کسی سیکیورٹی اور نیٹ ورک کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ پیچیدہ ترین لاک بھی کھول لیتے تھے اور پاس ورڈ معلوم کرلیتے تھے۔ کیونکہ وہ اس سسٹم پر حاوی ہوگئے تھے۔ موجودہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹرز جن حدود میں رہ کر کام کرتے ہیں وہ ان حدود سے ماورا ہوچکے تھے۔

چند ناکامیوں نے اسے سکھایا اور وہ محتاط ہوگیا۔ سب سے اہم بات اس نے یہ سیکھی کہ کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں ہے اور ممکن ہے جو اس نے پہلے بہت آسانی سے کرلیا وہ دوبارہ اسے نہ کر پائے۔ اس نے یہ جانا تھا کہ اپنی حفاظت سب سے اہم ہے۔ یہاں ہر قدم بہت احتیاط سے اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ دنیا بہت وسیع تھی اور اس میں ہر روز نہیں، ہر گھنٹے بھی نہیں ہر منٹ کے بعد ایک نئی چیز سامنے آرہی ہوتی تھی۔ یہاں کچھ بھی حتمی نہیں تھا اور تبدیلی کی رفتار بہت تیز تھی۔ دنیا کے ہر شعبے کی طرح یہاں بھی دولت اور قوت کی بہت اہمیت تھی اور جن کے پاس یہ چیزیں ہوتی تھیں وہی یہاں کے بھی بادشاہ ہوتے تھے۔ سعد جانتا تھا کہ وہ ایک شاہی محل میں نقب لگانے کی کوشش کرنے جارہا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ دوپہر تک وہ سوچتا رہا اور ٹی وی سے دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے ٹی وی اور میڈیا سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جیا دو بجے آئی اور اس نے معذرت کی۔

''سوری! کام زیادہ ہوگیا تھا اس لیے لیٹ ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں مگر لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''میں ساتھ لائی ہوں۔'' اس نے پزا کے ڈبے دکھائے۔ ''ڈائننگ ٹیبل پر آجاؤ۔ ٹھنڈے ہوگئے ہیں لیکن ایک منٹ میں گرم ہوجائیں گے۔''

وہ دونوں لاؤنج میں کھانے کی میز پر آگئے۔ پزا اور کولڈ ڈرنک سپر فاسٹ فوڈ ہے۔ انہوں نے ..... لنچ کیا اور اس کے بعد اوپر کا رخ کیا۔ جیا نے دروازے کھولے اور وہ کمپیوٹر روم میں آئے۔ مین فریم مسلسل آن رہتا تھا۔ اسے شٹ ڈاؤن نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ ایک بار بند ہونے کے بعد اسے دوبارہ سے آن کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ انہوں نے کام جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے آغاز کیا۔ تین سے آٹھ تک مسلسل کام کرنے کے بعد وہ نیچے آئے۔ ڈنر کیا اور دوبارہ کام میں لگ گئے۔ رات جب تھکن سے ان کی آنکھیں بوجھل ہوگئیں اور سر جھکنے لگے تو جیا نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھ سے نہیں ہو رہا۔''

سعد نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''او کے تم بیٹھو، میرا کچھ کام ہے اسے نمٹا کر پھر چلتے ہیں۔''

جیا نے سر ہلایا اور صوفے پر آگئی۔ سعد نے ایک نظر اسے دیکھا اور کی بورڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سیکیورٹی کمپنی کے اہم افراد اور ان سے متعلقہ لوگوں کا ڈیٹا جمع کر رہے تھے اور اسے خاص انداز میں مرتب کر رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد سعد نے جیا کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے ہلایا تو وہ چونک کر بیدار ہوئی اور ایک لمحے کو ہراساں نظر آئی جیسے اسے سونا نہیں چاہیے تھا مگر وہ سوگئی۔ سعد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر نارمل لہجے میں بولا۔ ''آج ہم نے اچھا خاصا کام نمٹا لیا ہے امید ہے ایک دو دن میں اصل کام کا آغاز ہوجائے گا۔''

جیا اپنے بال سمیٹتے ہوئے اٹھی۔ ''ہاں تم بہت تیزی سے کام کرتے ہو، میں تمہارا ساتھ مشکل سے دے پا رہی ہوں۔''

''تم عادی ہو جاؤ گی۔'' سعد نے کہا۔ جیا نے دروازے بند کیے اور وہ نیچے آئے۔ ڈائننگ ٹیبل سے ٹشو لے کر جیا نے اس پر لکھا۔

''تھینک یو۔''

''ویلکم۔'' اس نے جواباً لکھا۔ جیا یقیناً اپنے سو جانے کے حوالے سے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ دونوں بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ جیا کا کمرا ذرا فاصلے پر تھا اور سعد نے اسے اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ اگلی صبح ناشتے پر سعد نے اس سے کہا۔ ''ہم سمندر کے کنارے ہیں، کیا خیال ہے آج شام ساحل پر نہ چلیں۔ بہت دنوں سے کھلی ہوا میں سانس نہیں لیا۔ دماغ فریش ہوجائے گا۔''

''کیوں نہیں۔'' جیا اس کی نظروں سے سمجھ گئی۔

تین بجے تک وہ کام کرتے رہے پھر لنچ کے لیے نیچے آئے اور چار بجے وہ باہر نکلے تھے۔ سردی کا آغاز تھا اور سورج جلد ڈوبنے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا میں ہلکی سی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سڑک کراس کر کے ریت پر آئے۔ دھیمی لہریں بہت سست روی سے آجا رہی تھیں۔ جیا نے کہا۔ ''تم مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں اسی لیے میں نے ساحل پر آنے کو کہا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات نہیں سن سکے گا۔ کوٹھی میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جہاں ہم بات کرسکیں۔''

جیا نے سر ہلایا۔ ''پوری کوٹھی بگڈ ہے۔''

''کیمرے؟''

''وہ بھی ہیں لیکن ہر جگہ نہیں ہیں۔''

''میرے کمرے میں؟''

جیا ہچکچائی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہیں لیکن تم ظاہر مت کرنا۔''

سعد نے خفگی سے کہا۔ ''یہ تو پرائیویسی میں دخل ہے۔'' سعد کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ ''میرا اندازہ ہے کوٹھی کی تمام چیزوں کا اصل کنٹرول اسی کے پاس ہے۔''

جیا نے سر ہلایا۔ ''تم نے ٹھیک جانا مگر تم اپنے انداز میں تبدیلی مت لانا۔''

''یہ کیا چکر ہے؟'' سعد نے موضوع بدل دیا۔ ''عادل اصل میں کیا چاہتا ہے؟''

''صحیح سے تو میں بھی نہیں جانتی لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ اس طرح سے کماتا ہے۔''

''غلط طریقے سے؟''

''مجھے اس کا بھی علم نہیں ہے۔''

''اس کا پس منظر کیا ہے؟''

''اس کا باپ ایک ایمان دار بیوروکریٹ تھا۔ اس نے عادل کو آئی ٹی میں اعلیٰ تعلیم دلوائی مگر وہ اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکا۔ وہ اپنا ذاتی مکان تک نہیں بنا سکا تھا کیونکہ اسے جو پلاٹ اور گریجویٹی ملی وہ سب عادل کی تعلیم پر خرچ کردی۔ عادل امریکا سے پڑھ کر آیا۔ اس نے اپنی یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ اسے وہاں بہت سی اچھی

جابس آفر ہوئیں مگر اس نے ملک واپس آنے کو ترجیح دی۔ یہاں اس نے اپنا کام کیا اور آج وہ اس مقام پر ہے۔''

''یہ کوٹھی اسی کی ہے؟''

''صرف یہی نہیں اس کی نہ جانے کتنی جائداد ہے۔ پہلے وہ خود اسی علاقے میں رہتا تھا مگر اب اس کی رہائش کہاں ہے، میں بھی نہیں جانتی۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کے انداز میں پُراسراریت آگئی ہے۔ مجھے بھی اس سے ڈر لگنے لگا ہے حالانکہ پہلے کبھی مجھے سرسے ڈر نہیں لگا تھا۔''

''تم سے کہاں ملتا ہے؟''

''اسی کوٹھی میں یا پھر سیل پر رابطہ کرتا ہے۔''

وہ ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ دور سی ایگل اڑتے ہوئے آوازیں نکال رہے تھے۔ کچھ ان سے ذرا فاصلے پر لہروں کے ساتھ ٹہلتے ہوئے آنے والے کیڑے مکوڑے اور چھوٹی مچھلیاں کھا رہے تھے۔ سعد نے کہا۔ ''تم چھ سال سے اس کے ساتھ ہو؟''

''ہاں۔''

''پھر بھی اس کے کاموں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہو؟''

''کام کے بارے میں تو سب جانتی ہوں، میں بھی یہی سب کرتی ہوں جو تم کر رہے ہو لیکن تم بہت تیز ہو۔ میں پڑھ کر آئی ہوں اور تم نے اپنی صلاحیتوں سے سب سیکھا ہے۔ میں پروسیجر فالو کرتی ہوں اور تم اپنے راستے خود نکالتے ہو۔''

''مگر تم نے جس طرح مجھ سے رابطہ کیا، وہ بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''میں نے کہا نا میں پروسیجر فالو کرتی ہوں، اس میں بے نقاب ہونے کا چانس کم ہوتا ہے۔ ہیکرز اکثر اسی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں کہ وہ پروسیجر فالو نہیں کرتے۔ دوسرے میں نے ایک مہینا کوشش کی تب کہیں جا کر تم تک پہنچی۔ تم نے ایک موقع پر غلطی کی، اپنا ایک ای میل شو کر دیا تھا حالانکہ اس میں تمہارا کوئی ڈیٹا نہیں تھا مگر میں اس کی مدد سے تم تک پہنچ گئی۔ اس کے لیے مجھے انٹرنیٹ سروس دینے والی کمپنی کا سرور ہیک کرنا پڑا کیونکہ تم نے اپنی آئی پی بلاک کی ہوئی تھی۔''

''یہ بھی کم نہیں ہے۔'' سعد نے اسے پُرتحسین نظروں سے دیکھا۔ ''تم مجھ سے کم ماہر نہیں ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ بولی۔ ''مگر مجھے راستے نکالنا نہیں آتے۔''

''میں سکھا دوں گا۔''

جیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ سیکھنے والی چیز نہیں ہے آدی کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ میں نے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ آئی ٹی پروفیشنل دیکھے ہیں، وہ ہیکنگ نہیں کر پاتے جبکہ اسکول کے بچوں کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔''

سعد نے کچھ دیر پوچھا۔ ''تمہاری رہائش؟''

''اسی کوٹھی میں ہے۔ میں چار سال سے یہاں ہوں جب سے عادل نے یہ کوٹھی لی اور یہاں اپنا سیٹ اپ قائم کیا۔''

''اس سے پہلے؟''

''ایک وومین ہاسٹل میں رہتی تھی۔''

''تمہاری فیملی؟''

جیا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''دو بھائی ہیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، دونوں ملک سے باہر ہیں اور کبھی میری خبر نہیں لی۔ جب وہ گئے تو بابا تھے۔ ان دنوں میں پڑھ رہی تھی، بابا بیمار تھے مگر میری خاطر اپنی بیماری چھپاتے رہے کیونکہ ان کے پاس اتنی ہی رقم تھی کہ مجھے پڑھاتے یا اپنا علاج کراتے۔ انہوں نے اپنی صحت کی قربانی دے دی اور مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔ وہ جان گئے تھے کہ میرے بھائی خود غرض ہیں اور مجھے پلٹ کر نہیں پوچھیں گے۔ جب مجھے پتا چلا تو دیر ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا کہ بابا کا علاج کراتی۔ میں پاگلوں کی طرح جاب تلاش کر رہی تھی پھر مجھے عادل سر مل گئے۔ انہوں نے مجھے جاب دی اور بابا کے علاج کا تمام خرچ برداشت کیا۔ انہیں ہاسپٹل میں داخل کرایا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ بابا کا مرض آخری اسٹیج پر تھا اور وہ صرف ایک ہفتہ اور جیے۔''

''افسوس ہوا۔''

''میرے مقدر میں تھا۔'' وہ بولی۔ ''مگر مجھے خوشی ہے کہ آخری دنوں میں، میں نے بابا کی بہت خدمت کی تھی۔''

''اس کے بعد سے تم عادل کے ساتھ ہو۔''

سعد نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔ مگر اس کی کہیں تہ میں کچھ خاص بات تھی جو جیا نے محسوس کر لی اور اس نے اسی کا جواب دیا۔ ''ہاں اور ایک بات بتا دوں، میں ان کے ساتھ بالکل مطمئن ہوں کیونکہ سیکڑوں بار میں ان کے ساتھ بالکل اکیلی رہی اور مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کبھی ایک بار بھی مجھے لڑکی کے طور پر لیا ہو۔ میں ان کی ماتحت اور

راز دار ہوں، وہ ہمیشہ مجھے اسی حیثیت سے ٹریٹ کرتے ہیں۔''

سعد نے غیر محسوس انداز میں اطمینان کا سانس لیا۔ ''جب تم اس کے ساتھ بالکل مطمئن ہو تب تم نے مجھے یہ سب کیوں بتایا اور خبردار کیوں کیا تھا؟''

جیا نے مخالف سمت میں دیکھا۔ ''میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ ہو۔''

''تم کیوں چاہتی ہو کہ ایک بدتمیز اور بدتہذیب آدی کو کوئی نقصان نہ ہو؟''

جیا نے اس سوال کا جاب گول کر دیا اور بولی۔ ''کیا خیال ہے اندر نہ چلیں ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔''

سعد نے اسے دیکھا اور سر ہلایا اور وہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔ سامنے والی سڑک پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی اور آس پاس اکا دکا کوٹھیاں تھیں مگر کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ سعد نے پوچھا۔ ''تمہیں اس ویرانے میں اکیلے رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟''

''کوٹھی بالکل محفوظ ہے وہاں کوئی نہیں گھس سکتا۔ میں جس گاڑی میں سفر کرتی ہوں وہ بلٹ پروف ہے، میں ہمیشہ گاڑی میں باہر نکلتی ہوں۔ اس میں بھی مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر پھر بھی کوئی خطرہ ہو تو میں صرف ایک کال کروں گی اور دس منٹ میں اس علاقے کی نجی سیکیورٹی والے یہاں آ جائیں گے۔'' جیا نے گیٹ کے نزدیک جاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو یہ صرف مجھے دیکھ کر دروازہ کھولے گا۔'' اس نے کہتے ہوئے اپنا چہرہ اوپر لگے کیمرے کے سامنے کیا اور چند لمحے بعد گیٹ سرک کر کھلنے لگا۔ یہ سرکنے والا گیٹ تھا جس کا فولادی پٹ دائیں طرف دیوار میں چلا جاتا تھا۔ مگر یہ صرف اتنا کھلا کہ وہ اندر جا سکیں۔ اندر جانے سے پہلے جیا نے اشارے سے زبان بندی کا کہہ دیا تھا۔

سعد کا خدشہ درست نکلا تھا۔ عادل اسے استعمال کر رہا تھا اور جیا نے ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دیا تھا کہ کسی غلط حرکت یا بات کی صورت میں اسے نقصان ہو سکتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے نقصان ہو۔ سعد کو لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کی صرف اسی صورت میں پروا کرتی ہے جب اس کے دل میں لڑکے کے لیے کوئی مقام ہو۔ سمندر کے کنارے چہل قدمی نے اسے سچ مچ تازہ دم کر دیا تھا۔ اندر آ کر اس نے جیا سے کافی کی فرمائش کی۔ جیا نے کافی تیار کی اور وہ اپنے مگ لے کر اوپر آ گئے۔ اب تک انہوں نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں اب انہیں صرف ترتیب دینا باقی تھا۔ سعد اس کام میں لگ گیا اور جیا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''اچھا خاصا کچرا ہے یہ۔''

''نہیں اسی کچرے سے اپنے لیے کام کی چیزیں نکالنی ہیں۔''

''میں سمجھتی تھی کہ تم فلموں میں دکھائی دینے والے ہیکرز کی طرح کام کرتے ہو گے۔''

''اس طرح بھی کام کریں گے مگر اس کا وقت نہیں آیا ہے۔'' سعد نے کہا۔ ''اس طرح کی ہیکنگ صرف آخری لمحوں میں کی جاتی کیونکہ اس کے بعد راز کھل جاتا ہے اور آپ مزید کچھ نہیں کر سکتے۔ میں جو کر رہا ہوں اس میں راز کھلنے کا امکان بہت کم ہے۔''

رات تک سعد فارغ ہوا تو جیا ایک بار پھر صوفے پر سو چکی تھی۔ یہاں رازداری کے نقطۂ نظر سے کیمرے نہیں لگائے گئے تھے۔ صرف ایک ویب کیم تھا جو آف تھا۔ اس لیے وہ بے فکر تھی۔ وہ سعد کو بھی جان چکی تھی اس لیے اس کے سامنے سوتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ وہ عادل کی شرافت کی تعریف کر چکی تھی اس کے باوجود وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ خود سعد بھی اس شخص سے ایک طرح کا خوف محسوس کرتا تھا مگر اس نے کبھی اسے ظاہر نہیں کیا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے جیا کو ہوشیار کیا تو وہ بے ساختہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھی۔ سعد کچھ دیر کے لیے سحر زدہ رہ گیا تھا۔ اس کی نظریں محسوس کر کے وہ جھینپ گئی اور جلدی سے اپنا دوپٹا درست کیا۔ اس نے زیرِ لب اسے بدتمیز کا خطاب دیا تو سعد بھی اپنی بے خودی پر جھینپ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے سات افراد کو لسٹ کر لیا ہے۔''

جیا اسے گھورتے ہوئے کمپیوٹر پر آئی۔ سعد اسے ان سات افراد کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ یہ سب اس ای سیکیورٹی کمپنی کے ٹاپ آئی ٹی پروفیشنل تھے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون کون بینک کی سیکیورٹی کو دیکھتا تھا مگر ان سب نے ای سیکیورٹی میں اعلیٰ مہارت حاصل کی ہوئی تھی اور کمپنی کے تمام پروفیشنلز میں وہی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ماہر لوگ تھے۔ یہ بات ان کی ڈگریوں اور تجربے کے سرٹیفکیٹس سے بھی ظاہر تھی۔ اس لیے سعد نے انہیں ہی نقطۂ مرکز بنایا تھا۔ اسے امید کم تھی کہ ان کے پاس سے ایسا کوئی مواد ملے جو بینک سرورز تک ان کی رہنمائی کر سکے مگر امید پر ہی دنیا قائم تھی اور وہ موہوم سی امید کے سہارے یہ طویل اور بور کام کر رہے تھے۔ جیا نے

کہا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”اگر ہم نے کمپنی کے کمپیوٹرز ہیک کرنے کی کوشش کی تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہم پولیس اسٹیشن میں نقب لگائیں۔“

جیا نے سر ہلایا۔ ”یہ بہت رسکی ہوگا۔“

”اس لیے اسے آخری آپشن کے طور پر رکھتے ہیں۔“ سعد نے کہا۔ ”پہلے ہم ان سات افراد تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔“

”ان کے ذاتی اکاؤنٹس تک پہنچنا ہوگا۔“

”بالکل اسی سے ہم شاید کوئی راستہ نکال لیں۔“ سعد نے کہا۔ ”میں نے ان کی ذاتی معلومات جمع کی ہیں۔ اب ذرا ان کا جائزہ لیتے ہیں۔“

وہ باری باری ان ساتوں افراد کی ذاتی زندگی کا جائزہ لینے لگے اور یہ بات سامنے آئی کہ وہ ساتوں فیملی والے تھے۔ طور طریقے سے زندگی گزارتے تھے۔ جیا نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے یہ سب رات جلدی سو جانے والے لوگ ہیں۔“

”اور ہمارے لیے بہترین وقت وہی ہے جب یہ سو رہے ہوں۔ یعنی یورپ میں رات بارہ سے صبح چھ بجے تک کا وقت۔ اس وقت امکان کم ہے کہ یہ اپنے اکاؤنٹس اوپن کرنے کی کوشش کریں۔“

یہ سات افراد چار مختلف ممالک میں تھے مگر ان کے ٹائم زون میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ جیا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں صبح چار بجے اٹھنا ہوگا۔“

”تب بہتر ہے آرام کیا جائے۔“ سعد نے کرسی پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ وہ نیچے آئے انہوں نے ڈنر کیا اور اپنے کمروں کی طرف جانے لگے تو سعد نے جیا کو روکا۔ ”تم مجھے جگا دینا، مجھے الارم کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس کوئی الارم والی چیز ہے۔“

جیا نے سر ہلایا۔ ”میں اٹھا دوں گی۔“

سعد نے سونے سے پہلے شاور لیا۔ پہلے کے مقابلے میں اب وہ پُرسکون تھا اور اسے کام میں مزہ آنے لگا تھا۔ جہاں تک مقصد کی بات تھی تو وہ بھی جلد یا بدیر سامنے آجاتا۔ کام میں دل لگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کامیاب ہوتا تو عادل کا اصل مقصد سامنے آتا۔ بلکہ یہ چیز سامنے آتی کہ وہ اس سے فائدہ کس طرح اٹھاتا ہے۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ عادل یہ سب دولت کے لیے کر رہا تھا۔ سعد کو ایک خیال آیا کہ کہیں وہ بینک سرور ہیک کر کے اکاؤنٹس سے رقم اپنے دوسرے اکاؤنٹس میں منتقل تو نہیں کرے گا۔

ہیکرز ایسا بھی کرتے تھے مگر وہ پوری چین رکھتے تھے۔ کیونکہ رقم ایک بار ایک اکاؤنٹ سے نکالنے کے بعد وہ اسے جلدی جلدی متواتر دس بارہ اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کرتے تھے جو سب ان کے اپنے ہوتے تھے مگر یہ اکاؤنٹس مختلف ممالک میں اور اکثر آف شور بینکوں میں ہوتے تھے۔

ہیک کیے جانے والے اکاؤنٹ کا بینک دوسرے بینک سے جہاں رقم منتقل کی گئی ہوتی تھی، درخواست کرتا اور وہ اگلے بینک سے اور وہ اگلے بینک سے کرتا۔ ہر بینک سے جواب موصول ہونے میں تین سے چار دن لگتے اور درجن بینکوں کی چھان بین میں دو ڈھائی مہینے آرام سے نکل جاتے۔ تب تک رقم کیش کرائی جا چکی ہوتی تھی۔ اکثر بینک اپنے قوانین کے مطابق جواب نہیں دیتے تھے اور بہت سے ملکوں میں قانون بھی بینکوں کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ غیر قانونی منتقلی کے بارے میں جواب دیں۔ ان کے لیے ان کے کسٹمر کی رازداری زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس طرح سے سالانہ اربوں ڈالرز چرائے جاتے ہیں اور انشورنس کمپنیاں یا خود بینک یہ نقصان پورا کرتے ہیں۔ مگر ای بینکنگ سے بینکوں کو اخراجات کی مد میں جو بچت ہوتی وہ اس نقصان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ سعد سوتے وقت تک یہی سوچتا رہا اور اس کا شبہ یقین میں بدلتا رہا کہ عادل ایسا ہی کوئی نیٹ ورک چلا رہا ہے۔ وہ دیر سے سویا اور ٹھیک چار بجے جیا نے اس کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ اس نے غنودہ آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ جیا نے کافی کا مگ سامنے کر دیا۔ ”یہ لو اور اوپر آجاؤ۔“

وہ خود فریش لگ رہی تھی کیونکہ وہ کمپیوٹر روم میں نیند لے چکی تھی۔ سعد نے مگ لے لیا۔ ”میں چند منٹ میں آتا ہوں۔“

وہ فریش ہو کر اوپر آیا تو جیا اپنی نشست سنبھال چکی تھی۔ کافی نے رہی سہی نیند بھی اڑا دی تھی اور اب وہ کام کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے دو الگ الگ افراد کو چنا اور ان کے ای میل اور میسنجر اکاؤنٹس ہیک کرنے میں لگ گئے۔ سعد کے لیے یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا، وہ عام لیپ ٹاپ سے بھی اس قسم کے کام کر جاتا تھا۔ مین فریم تو لیپ ٹاپ سے بہت آگے کی چیز تھی۔ جو کام لیپ ٹاپ دس منٹ میں کرتا تھا یہ چند سیکنڈ میں کر لیتا تھا۔ سعد چاہتا تھا کہ اکاؤنٹس اس طرح ہیک کرے کہ ان کے مالکان کو اس کا پتا نہ چلے۔ وہ سب خود ان چیزوں کے ماہر تھے اور لازمی بات تھی کہ انہوں نے اپنے اکاؤنٹس کو ایسے ہی نہیں چھوڑا ہوگا۔

ان میں نظر نہ آنے والے پھندے اور لاک ہوں گے۔ جو خفیہ طریقے سے آنے والوں کو پکڑ لیں۔ سعد نے یورپ تک رسائی کے لیے چین کا ایک سرور پکڑا تھا۔

مگر یہ بھی براہ راست نہیں تھا بلکہ اس سے برازیل کے ایک سرور سے رابطہ کیا اور پھر ایک جنوبی افریقہ کے سرور سے ہوتے ہوئے وہ یورپ کے سرور تک پہنچا۔ اتنا گھومنے پھرنے کا مقصد اپنی شناخت اور جائے وقوع کو خفیہ رکھنا تھا۔ انہوں نے اپنے سرور کی لوکیشن بھی بدل دی تھی۔ یہ ساری عام سی تدبیریں ہیں جو ہیکرز اختیار کرتے ہیں تاکہ چھپے رہیں۔ اس کے باوجود ان کا پتا چلا لیا جاتا ہے اور اگر وہ کسی ترقی یافتہ ملک میں ہوں جہاں سائبر کرائم کا قانون ہو وہاں ان کو گرفتار بھی کیا جاتا ہے۔ مگر سعد کو امید تھی کہ ایشیا زون میں یہ کام آسان نہیں ہوگا خاص طور سے جنوبی ایشیا اور مڈل ایسٹ میں اس بارے میں کوئی قانون نہیں تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خطرے سے بالکل ہی بے نیاز تھے۔

”ہمارے ملک میں سائبر کرائم کا قانون نہیں ہے۔“ جیا نے کہا۔

”یہاں خطرات زیادہ ہیں۔“ سعد انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔ ”جب مغرب کی طرف سے دباؤ آتا ہے تو ہماری ایجنسیاں متحرک ہو جاتی ہیں اور انہیں آدمی اٹھانے کے لیے کسی سائبر کرائم قانون کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اپنی شناخت اور لوکیشن محفوظ رکھنا لازمی ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھو۔“

”میں نے کر لیا۔“ جیا نے اعلان کیا۔ ”میرے خدا اس کے اکاؤنٹ میں تو لاتعداد ای میل ہیں۔“

”ان بکس کے ساتھ اس کی ای ڈرائیو بھی چیک کرو۔“ سعد نے کہا۔ ”اب زیادہ تر لوگ اپنے کمپیوٹر یا یو ایس بی کے بجائے اہم معلومات ای ڈرائیو میں رکھنے لگے ہیں جو ان کے خیال میں زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔“

ای ڈرائیو سے مراد مختلف سائٹس اور ای میل کمپنیوں کی طرف سے دیا جانے والا ڈیٹا اسٹوریج تھا جس میں عام افراد اور پروفیشنل اپنا خاص ڈیٹا محفوظ رکھ سکتے تھے۔ سعد کامیاب نہیں ہوا تھا وہ ابھی تک کوشش کر رہا تھا۔ جیا اپنے شکار کی ای ڈرائیو دیکھنے لگی اور اس نے جوش سے کہا۔ ”اس کے پاس خاصا ڈیٹا ہے۔“

”سب ڈاؤن لوڈ کر لو۔“

جیا ڈاؤن لوڈ کرنے لگی۔ ان کے پاس سیٹلائٹ انٹرنیٹ تھا یہ بہت مہنگا لیکن بہت تیز تھا۔ درجنوں جی بی کا ڈیٹا تیز رفتاری سے ڈاؤن لوڈ ہونے لگا۔ اس دوران میں سعد نے بھی اپنا کام کر لیا۔ اس نے ای میل کے ساتھ میسنجر کا اکاؤنٹ بھی ہیک کر لیا تھا اور اب وہ ڈیٹا اتار رہا تھا۔ انہیں اکاؤنٹس تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے تھے مگر ڈیٹا مشکل سے دس منٹ میں آگیا۔ اس کے بعد وہ ایسے نشانات مٹانے لگے جن سے ان کے شکاروں کو پتا چل جائے کہ ان کے اکاؤنٹس ہیک کر لیے گئے تھے۔ انہوں نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا مگر اس کا امکان تھا کہ ہیکنگ کا پتا چل جائے۔ جب وہ فارغ ہوئے تو صبح ہو چکی تھی اور سمندر کی طرف سے کہر اٹھ کر گلاس وال پر جمع ہو رہی تھی۔ جیا نے کہا۔ ”ڈیٹا بہت زیادہ ہے اس کی چھان بین کیسے کریں گے۔“

”جیسے کام کیا ہے۔“ سعد نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تھک گیا ہوں اور فریش ہونا چاہتا ہوں۔“

”آرام کر لو، ہم بعد میں کام کریں گے۔“

”آرام کرنے کے بجائے باہر چلتے ہیں۔“ سعد نے فرمائش کی۔ ”میں تازہ ہوا کھانا چاہتا ہوں۔“

”چلو۔“ جیا راضی ہو گئی۔ ”مگر ٹھنڈ ہوگی۔“

جیا نے شال لی تھی مگر سعد نے کچھ نہیں لیا۔ وہ باہر آئے تو ایک لمحے کو اسے پھریری سی آئی مگر پھر وہ نارمل ہو گیا۔ جیا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں سردی نہیں لگتی؟“

”ہاں کیونکہ میں اس سے کہیں زیادہ سردی اس سے بھی کم کپڑوں میں دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ انہوں نے سمندر کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرف سے کہر اٹھ رہی تھی۔ وہ سڑک کے ساتھ فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگے۔ جیا نے کہا۔

”میں نے تمہارا سراغ لگایا تو تمہارا ماضی بہت معمولی سا سامنے آیا تھا۔ ہم بس اتنا جان سکے کہ تم ماہر ہیکرز ہو اور روبری جیسا کام بھی کرتے ہو۔“

سعد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اچھا میں تو سمجھا تھا کہ تم میرے بارے میں سب جان گئی ہو؟“

”ہیکرز کمپیوٹر میں جھانک سکتے ہیں کسی کے دل میں نہیں۔ آدمی کا ماضی تو اس کے اندر محفوظ ہوتا ہے۔“

سعد نے گہری سانس لی۔ ”تم نے ٹھیک کہا، آدمی کا ماضی اس کے اندر محفوظ ہوتا ہے۔ اسے کوئی ہیک نہیں کر سکتا جب تک آدمی خود ایسا نہ چاہے۔“

☆☆☆

اسے کسی سے محبت نہیں تھی نہ انسانوں سے اور نہ ہی کسی چیز سے۔ کیونکہ اس نے محبت پائی ہی نہیں تھی۔ اس کا تعلق ایک بہت نچلے درجے کے گھر سے تھا۔ اس کا باپ اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرتا تھا اور وہاں جو مزدوری ملتی اس سے نشہ کرتا تھا۔ گھر وہ ایک پیسا لانا بھی حرام سمجھتا تھا۔ بیوی اور بچوں کے لیے اس کے پاس سوائے مار پیٹ اور گالی گلوچ کے اور کچھ نہیں تھا۔ فطری طور پر بیوی بچوں کے دل میں بھی اس کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ گھر نہ آیا کرے اور اگر کسی دن وہ اینٹوں کی بھٹی میں گر کر مر جاتا تو اس کے بیوی بچے یقیناً دکھ کے بجائے خوشی محسوس کرتے۔ مگر اس کی گھر میں موجودگی تک یہ وقت نہیں آیا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ بھائی بارہ سال کی عمر میں ہی باپ کے نقشِ قدم پر چل نکلا تھا اور نشہ کرنے لگا تھا۔ پہلے وہ صمد بونڈ کا نشہ کرتا تھا پھر اس نے ترقی کی اور چرس پینے لگا۔

لڑکیاں ابھی چھوٹی تھیں مگر مستقبل کے لیے ہراساں اور خود سے کچھ کرنے پر آمادہ تھیں۔ اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس نے خود سے چھوٹی اور صرف تیرہ سال کی بہن کے پاس کچھ چیزیں دیکھیں جو ان کے گھر میں کبھی نظر نہیں آئی تھیں۔ یہ میک اپ کا سامان اور معمولی درجے کی جیولری تھی۔ مگر ان کے ہاں کبھی یہ بھی نظر نہیں آئی۔ جب اس نے بہن سے پوچھا تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی تھی۔ اس نے ماں سے کہا مگر ماں کو اولاد کی پروا نہیں تھی۔ اس کا کام بس یہ تھا کہ کھانا بنا دے اگر گھر میں پکانے کو کچھ ہو اور پھر چادر لے کر باہر نکل جائے۔ اس کا بیشتر وقت محلے کے دوسرے گھروں میں گزرتا تھا۔ زبان کی تیز تھی اور اس کے پاس محلے کی ساری خبریں ہوتی تھیں اس لیے ہر گھر میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور خوب خاطر تواضع ہوتی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے اچھا کھاتی پیتی تھی۔ ماں کی طرف سے مایوس ہو کر وہ خود بہن کی نگرانی کرنے لگا۔

جلد اسے معلوم ہو گیا کہ بہن کے پاس یہ چیزیں کہاں سے آتی تھیں۔ وہ محلے کے جنرل اسٹور جاتی تھی اور باہر کھڑے ہونے کے بجائے اندر گھس جاتی۔ دکان کا چالیس سالہ باریش مالک اسے دکان کے پچھلے حصے میں لے جاتا تھا اور جب وہ کچھ دیر بعد وہاں سے نکلتی تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ اس نے پیسے بھی دیکھے تھے۔ آج اسے معلوم ہوا کہ یہ سب کہاں سے اور کس قیمت پر آتا تھا۔ اس نے بہن کو مارا تو اس نے خاموشی سے مار کھالی اور پھر یوں مگن ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ چودہ سال کا تھا اور اس نے خود سے ایک سال چھوٹی بہن پر غور کیا تو اسے حیرت ہوئی وہ جوان لڑکی بن چکی تھی۔ اس سے چھوٹی گیارہ سال کی تھی اور ابھی سے بڑی کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

وہ سمجھتا تھا کہ وہ اس ماحول کا عادی ہے اور اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر بہنوں کی یہ روش اور اپنی بے بسی پر اس کے اندر چوٹ سی لگی تھی۔ شاید اس کے اندر کی حس پوری طرح مری نہیں تھی۔ تب ایک صبح وہ اسکول کے بیگ میں اپنے چند جوڑے رکھ کر گھر سے نکلا اور نزدیکی ریل اسٹیشن تک آیا۔ وہاں وہ رکنے والی پہلی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ریل کہاں جا رہی تھی۔ وہ گھر کا واحد بچہ تھا جس نے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ عرصے پہلے اس نے آٹھویں کلاس کا امتحان دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کیسا طالب علم تھا مگر یہ تھا کہ وہ کبھی فیل نہیں ہوا۔ ہر سال باقاعدگی سے پاس ہوتا رہا تھا۔ اس وجہ سے اسے دنیا کا تھوڑا بہت علم بھی تھا۔ ٹرین کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں لوگ یوں بھرے ہوئے تھے جیسے چھتے میں شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ ہوا کی آمد ورفت بھی محال تھی اس لیے یہاں ٹی ٹی کہاں سے آتا۔ ویسے بھی اس زمانے میں ریلوے کا بھٹا بٹھایا جا رہا تھا اور اسے تباہی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس لیے کسی نے اسے چیک نہیں کیا۔

دو وقت بغیر کھانے کے گزرے تو پیٹ میں جیسے خالی بگولے سے چلنے لگے۔ ایسے میں جب کوئی مسافر کچھ کھانے لگتا تو اس کی نظریں خود بہ خود اس کی طرف اٹھ جاتیں اور اسے اپنی نگاہیں واپس کھینچنے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑتا تھا۔ یہ بات اس ادھیڑ عمر آدمی نے محسوس کر لی۔ وہ صورت سے اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے سخت تاثرات والے چہرے پر زخموں کے کئی نشانات تھے۔ رات کے وقت اس نے کھانا منگوایا تو اسے اشارے سے پاس بلایا۔ پہلے وہ سمجھا نہیں مگر آدمی نے جب دوبارہ اشارہ کیا تو وہ جھجک کر اس کے پاس آیا اور کھانے کی ٹرے سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کھانا کھاؤ۔“ آدمی نے مختصراً کہا اور خود کھانے میں لگ گیا۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا مگر چند لمحے بعد اس نے خود کو کھانے میں مصروف پایا۔ وہ عجلت میں جلدی جلدی نوالے نگل رہا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ آدمی اسے کھانے

سے روک نہ دے مگر آدمی نے اسے روکنے کے بجائے خود ہاتھ روک لیا کیونکہ ٹرے میں ایک ہی آدمی کا کھانا تھا۔ ٹرین چل پڑی تھی اور اب اگلے اسٹیشن پر ہی کھانے کو کچھ ملتا۔ پوری ٹرے صاف کر کے بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی مگر پیٹ میں دوڑتے بگولے تھم گئے تھے۔ وہ آدمی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ ایسا نہیں کر سکا اور واپس فرش پر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ آدمی بھی اس سے بے نیاز رہا تھا اس نے سوائے کھانے کی پیشکش کے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حد یہ کہ اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ وہ بیڑی سلگا کر اس سے شغل میں مصروف ہو گیا۔ پیٹ بھرنے کے بعد اس پر خمار طاری ہوا تو وہیں لیٹ گیا اور سو بھی گیا۔

وہ اتنا مدہوش ہو کر سویا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ لوگ اس پر سے آتے جاتے رہے، اسے ٹھوکریں لگتی رہیں۔ کسی نے اس کا بیگ اٹھایا اور اپنے اسٹیشن پر اتر گیا اور بالآخر ٹرین کا آخری اسٹیشن آ گیا۔ اسی آدمی نے اسے ہلایا۔ وہ چونک کر بیدار ہوا اور حیران رہ گیا۔ دن نکل آیا تھا اور ٹرین اسٹیشن کے دور دراز پلیٹ فارم پر رکی ہوئی تھی۔ بیشتر مسافر اتر چکے تھے اور باقی اتر رہے تھے۔ تب اسے اپنے بیگ کی گمشدگی کا احساس ہوا۔ اس نے مضطرب ہو کر آس پاس دیکھا اور مسافروں سے پوچھنے لگا۔ مگر کسی نے نہ تو اس کا بیگ دیکھا تھا اور نہ ہی کسی کو اس سے یا اس کے بیگ سے دلچسپی تھی۔ بیشتر نے جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی اور باقیوں نے نفی میں سر ہلایا کہ انہوں نے اس کا بیگ نہیں دیکھا ہے۔ اس کے بیگ میں کتابوں اور چند پرانے جوڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مگر وہ اس کی کل متاع تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ لوگ ایسی معمولی سی چیز بھی نہیں چھوڑیں گے۔ چرانے والا جا چکا تھا اس کے باوجود وہ پاگلوں کی طرح بیگ تلاش کرتا رہا حتیٰ کہ اس آدمی نے اسے روکا۔

''کیا ہوا بچے، کیا تلاش کر رہا ہے؟''

''میرا بیگ گم گیا ہے۔ اس میں سب کچھ تھا۔''

''تو رات کو ایسا سویا کہ میں سمجھا مر گیا ہے۔'' آدمی ہنسا۔ ''تیری بے خبری کا فائدہ اٹھا کر کوئی لے گیا ہوگا۔ کیا تھا اس میں؟''

''میرا سب کچھ تھا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

تیرا نام کیا ہے؟''

''سعد حسن۔'' اس نے جواب دیا اس کا ذہن ابھی تک بیگ میں اٹکا ہوا تھا۔ ''اب میں کیا کروں گا؟''

''تیرے پاس پیسے ہیں؟''

''نہیں وہ بھی اسی میں تھے۔''

''کیسا چریا ہے۔ پیسا آدمی اپنے پاس رکھتا ہے۔'' آدمی نے کہا اور ٹٹولنے کے انداز میں پوچھا۔ ''بالکل خالی ہاتھ ہے، ادھر کس کے پاس آیا ہے؟''

''کسی کے پاس نہیں۔''

''اتنا بڑا شہر ہے اور تو کسی کے پاس نہیں آیا؟'' آدمی نے کہا۔

''ہاں یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔''

''گھر سے بھاگ کر آیا ہے؟''

وہ حیران ہوا مگر اس نے سچ نہیں بولا۔ ''ہاں، پر رشتے داروں کے گھر سے۔''

''ماں باپ، بہن بھائی؟''

''کوئی نہیں ہے۔''

آدمی اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تیری عمر کتنی ہے؟''

''سولہ سال۔'' اس نے پھر جھوٹ بولا۔ اس کی جسامت ٹھیک تھی اس لیے جھوٹ چل گیا۔ آدمی نے سر ہلایا۔

''میرے پاس کام کرے گا۔ میرا ہوٹل ہے، ادھر ایک لڑکے کی ضرورت ہے۔''

''کروں گا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا کہ اسے ایک سہارا مل رہا تھا ورنہ اس کے پاس تو کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے۔ آدمی کا نام کرامت شاہ تھا اور اس کا ہوٹل ایک متوسط علاقے میں تھا۔ دو دکانیں تھیں جن کے آگے کی جگہ گھیر کر اور چھپر ڈال کر اس نے میز کرسیاں لگا رکھی تھیں۔ ہوٹل میں باورچی اور روٹی بنانے والے سمیت کل چار افراد تھے۔ کرامت خود کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ ایک ویٹر رکھا ہوا تھا۔ کچھ سالن اور چیزیں ہوٹل میں پکتی تھیں۔ بریانی، قورمے اور حلیم کی دیگ پکی پکائی اٹھواتا تھا۔ رش کے وقت ایک آدمی کی کمی تھی جو اس نے سعد کی صورت میں پوری کر لی تھی مگر اس کا اصل مقصد اس وقت کھلا جب ایک بجے ہوٹل بند ہونے کے بعد وہ اسے ہوٹل کے اندرونی حصے میں لایا۔ ویٹر لڑکا وہیں سوتا تھا اور ایک طرح سے چوکیداری بھی کرتا تھا۔ کرامت نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد کرامت شاہ نے سعد سے جو فرمائش کی وہ اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

''تمہارا دماغ درست ہے۔''

جواب میں کرامت نے اسے تھپڑ مارا اور پھر نیچے گرا کر ٹھوکروں سے مارنے لگا۔ ساتھ ہی وہ غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ سعد اپنا دفاع کرتا رہا اور نیچے پڑے پڑے کسی چیز کی تلاش میں رہا۔ بالآخر اس کے ہاتھ میں روٹی تندور سے نکالنے والی سلاخ آئی اور وہ اس نے نیچے سے کرامت کی ران میں اتار دی۔ وہ دہاڑ مار کر نیچے گرا اور سعد کھڑا ہو گیا، اب اس نے سلاخ سنبھالی اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ بس اس نے اتنی احتیاط کی کہ اس کے سر پر وار نہیں کیا باقی اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور جب کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس سے سلاخ چھینی تو کرامت ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس میں اپنا دفاع کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ باہر جانے والا لڑکا شور شرابے پر بھی اندر نہیں آیا تھا۔ اس کا ہاتھ روکنے والا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا اور چہرے سے وہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو بدمعاش نظر آنے والے تومند گرگے اور تھے۔ ادھیڑ عمر نے اسے ان کی طرف دھکیل دیا اور ایک نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ سعد کسمسانے لگا۔ ادھیڑ عمر کرامت شاہ کا معائنہ کر رہا تھا، اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

''چھورا تو نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پر تو نے ایسا کیوں کیا؟''

سعد کی سانس تیز تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے ادھیڑ عمر آدمی کو بتایا کہ کرامت شاہ نے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہا تھا۔ بتاتے ہوئے اسے غصہ آیا اور وہ بل کھانے لگا۔ ''چھوڑو مجھے، میں اس کتے کو قتل کر دوں گا۔ اس کمینے نے سمجھا کیا تھا؟''

''بڑا جوش ہے تجھ میں چھورا۔'' ادھیڑ عمر آدمی معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اسے مرا ہوا سمجھ۔''

''تم کون ہو؟'' سعد نے سوال کیا۔

''بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جھک کر کرامت شاہ کے بال پکڑ کر کھینچے۔ ''تو سمجھتا تھا کہ میں حساب بھول جاؤں گا اور تو واپس کیا سوچ کر آیا ہے۔''

''مجھے معاف کر دو جازی خان، میں تمہاری ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔'' کرامت شاہ گڑگڑا کر بولا۔

''میں تو کسی اور ارادے سے آیا تھا مگر تمہاری حالت پہلے ہی بری ہے، خیر تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے اور میں پھر آؤں گا۔'' وہ سیدھا کھڑا ہوا اور اچانک بھاری سول والی جوتی کی نوک کرامت شاہ کی کنپٹی پر ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جازی خان نے سعد کی طرف دیکھا۔ ''چھورا میرے ساتھ چلے گا؟''

''تم کون ہو؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''چلے گا تو پتا چل جائے گا۔'' جازی خان نے کہا۔ ''میں اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اس کی طرح گندا بھی نہیں ہوں۔''

سعد نے سوچا۔ اس کے پاس نہ تو کوئی ٹھکانا تھا اور نہ پیسا اسے ان دونوں چیزوں کی ضرورت تھی اس لیے اس نے فوری فیصلہ کر لیا۔ ''میں چلوں گا۔''

جازی خان کے ساتھ وہ چند برس رہا۔ جازی خان اچھا آدمی تھا۔ اس نے سعد کی مدد کی اور جب اس نے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نے میٹرک کیا اور پھر کمپیوٹر سائنس میں ڈپلوما کیا۔ کمپیوٹر سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب ایک واردات میں ان کے ہاتھ ایک لیپ ٹاپ لگا۔ جازی خان کے آدمیوں نے ایک گھر میں ڈاکا مارا تھا جہاں باہر سے مال آتا تھا اور وہاں خاصی نقدی اور دوسری قیمتی اشیا کے ہمراہ لیپ ٹاپ بھی ان کے ہاتھ لگا تھا۔ سعد کو اچھا لگا وہ اس نے جازی خان سے مانگ لیا۔ جازی خان کا اصل نام اعجاز ماہی تھا مگر جازی خان کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے منشیات فروشی سے آغاز کیا تھا مگر پھر رہزنی کی طرف آ گیا۔ اس کا گروہ بڑا نہیں تھا، سعد سمیت نصف درجن افراد تھے۔ مگر وہ ہاتھ ہمیشہ چن کر مارتا تھا۔ ڈاکو ہونے کے باوجود اس نے کچھ اصول اپنائے ہوئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ کم مارو لیکن لمبا ہاتھ مارو۔ ہمیشہ کام سے مطلب رکھو بلاوجہ کی دہشت اور دوسروں کو بے عزت کرنے سے گریز کرو۔ آدمی مال آرام سے دے دیتا ہے مگر عزت پر بات آئے تو مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو بے عزت مت کرو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جس گھر میں جاتے وہاں عورتوں سے ہمیشہ نرمی سے پیش آتے اور سعد نے کبھی جازی خان یا اس کے کسی ساتھی کو کسی عورت سے بدتمیزی کرتے نہیں دیکھا۔

ان دنوں وہ میٹرک کر رہا تھا۔ ''کام'' پر جازی خان نے اسے چند دن بعد ہی لگا لیا تھا مگر اس کے ساتھ پڑھائی بھی جاری تھی۔ لیپ ٹاپ سے پہلے اسے کمپیوٹر کی الف بے کا علم بھی نہیں تھا۔ مگر اس کی مدد سے وہ چند دن میں کمپیوٹر کا بنیادی استعمال سیکھ گیا تھا۔ پھر انٹرنیٹ لگوایا۔ آنے والے دو سالوں میں اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا جتنا کمپیوٹرز کے

باقاعدہ کورس کرنے والے بھی نہیں جانتے تھے۔ ''کام'' اور آرام سے ہٹ کر اس کا سارا وقت ہی لیپ ٹاپ کے سامنے گزرتا تھا۔ یہ بہت اچھی کوالٹی اور تقریباً نیا لیپ ٹاپ تھا۔ وہ خود سافٹ ویئرز کی سی ڈیز لاکر یا انہیں انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے انسٹال کر کے ان کو چلانا سیکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے بے شمار سافٹ ویئرز پر عبور حاصل کر لیا پھر وہ ہیکنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا فیس بک اکاؤنٹ ہیک ہو گیا اور یہاں سے اسے ہیکنگ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اس شعبے میں طبع آزمائی کرنے لگا۔ ڈپلومے میں اس نے کئی ایسے کورس سیکھے جن کی مدد سے وہ خود ہیکنگ کے ٹولز اور سافٹ ویئرز تیار کرنے کے قابل ہو گیا۔

وہ تقریباً پانچ سال جازی خان کے ساتھ رہا۔ ڈپلوما کے آخری سال میں تھا کہ جازی خان اور اس کے دو ساتھی دشمنوں کی فائرنگ سے مارے گئے۔ سعد اور باقی دو بچنے کے لیے روپوش ہو گئے۔ روپوشی کے دوران ہی اس نے ڈپلوما مکمل کیا۔ تب تک اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ جازی خان کے دشمن اب اس کے پیچھے نہیں ہیں۔ شاید وہ ان کے لیے غیر اہم تھا۔ اس لیے کسی نے خاص طور سے اس کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی ورنہ جازی خان کے باقی دو ساتھیوں کو انہوں نے تلاش کر کے چند ہفتوں میں ٹھکانے لگا دیا تھا۔ یہ دشمنی پیچھے سے چلی آرہی تھی اس لیے جازی خان کے ساتھی جو اس کے ساتھ شروع سے تھے وہ بھی مارے گئے۔ خوش قسمتی سے سعد کے پاس خاصی رقم تھی اسے جو حصہ ملتا تھا وہ جمع ہوتا رہتا تھا کیونکہ اس کو خرچ کرنے والے شوق ہی نہیں تھے۔ وہ نہ پیتا تھا اور نہ ہی اسے لڑکیوں سے دلچسپی تھی۔ صرف کمپیوٹرز کا شوق تھا۔ وہ اسی پر خرچ کرتا تھا۔

جازی خان اور اس کے ساتھی اس پر ہنستے تھے کہ وہ مشینوں سے دل بہلاتا ہے۔ وہ اسے اکساتے کہ زندہ کھلونوں سے بھی کھیل کر دیکھے مگر نہ جانے کیوں وہ اس طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس کے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی۔ اسی سے اس نے یہ فلیٹ خریدا تھا۔ جب رقم ختم ہونے لگی تو اس نے بہت عرصے سے رکھا پستول نکال کر صاف کیا اور دوبارہ سے وارداتیں شروع کر دیں۔ مگر وہ بھی جازی خان کی طرح بہت دیکھ کر ہاتھ مارتا تھا۔ جازی خان بڑے گھروں اور جگہوں پر ہاتھ مارتا تھا مگر وہ اکیلا تھا اس لیے اس نے اپنے لحاظ سے شکار منتخب کرنا شروع کیا۔ یہ شکار ایسے ہوتے جنہیں وہ اکیلا ہینڈل کر سکتا تھا۔ پہلے پوری طرح ریکی کرتا اور جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ ناکامی کا امکان کم ہے تب وہ واردات کرتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ ایک واردات سے اتنا مل جائے کہ وہ چھ سات مہینے بیٹھ کر کھا سکے۔

اس سے زیادہ وہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ اسے کہیں گولی نہ چلانی پڑے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے صرف اس وجہ سے ڈاکے میں ناکامی قبول کی کہ دوسری صورت میں اس کے ہاتھ سے کسی کے مرنے کا خطرہ تھا۔ اس کے اخراجات اب بھی زیادہ نہیں تھے۔ بلز وغیرہ دیتا اور کھانا پینا یا چند جوڑے کپڑے۔ اسے باہر کھانے کا شوق نہیں تھا، وہ زیادہ تر تیار اشیا لے آتا اور انہیں گرم کر کے کھاتا۔ کولڈ ڈرنک کا شوق تھا، پانی کی جگہ بھی کولڈ ڈرنک ہی پیتا تھا۔ وہ جو سامان لاتا اس میں سب سے زیادہ حصہ کولڈ ڈرنکس ٹن کا ہوتا تھا۔ اصل خرچ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ان کے لوازمات کا تھا۔ وہ اس کا سامان بہت اچھا والا لیتا تھا جو چلتا بھی طویل عرصے تک تھا۔ اس لیے اس پر اوسط خرچ بہت کم تھا۔ مشکل سے مہینے کے پانچ چھ ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔ پانچ سال سے وہ اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ جازی خان کے دشمن اسے بھول گئے تھے۔

ان پانچ سالوں میں اس نے اپنا حلیہ بالکل بدل لیا تھا۔ وہ عام طور سے خوش پوش اور اسٹوڈنٹ والے حلیے میں ہوتا تھا مگر جب واردات کرتا تو اپنا حلیہ نچلے طبقے کے جاہل افراد جیسا کر لیتا تھا۔ دونوں میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ اسے بعد میں دیکھنے والا دونوں کو آپس میں میچ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح وہ ہیکنگ کی دنیا میں معروف تھا مگر اس کی اصل شخصیت کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ حد یہ کہ وہ جن ہیکرز کے ساتھ کام کرتا تھا وہ بھی اسے صرف ماسک مین کے طور پر جانتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ نامور ہیکرز کو ناکوں چنے چبوانے والا ماسک مین ایک معمولی سے فلیٹ میں رہتا ہے اور اس کی گزر اوقات ڈاکا زنی پر ہوتی ہے۔ مگر اس لڑکی نے اچانک ہی آکر اور اس کی خفیہ شناخت ظاہر کر کے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہیکرز بھی جاسوس کی طرح ہوتے ہیں، ان کی شناخت کھل جائے تو وہ بے کار ہو جاتے ہیں۔

لڑکی کے جانے کے بعد وہ تجزیہ کرتا رہا کہ اس کے پاس کیا آپشن ہیں۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو انٹرنیٹ پر اس کی اصل شخصیت سامنے آجائے گی اور اس کے بعد وہ پہلے کی طرح کام نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ نئی خفیہ شناخت بنائے گا تب بھی یہ لوگ اسے پہلے کی طرح پکڑ سکتے تھے۔ بہ قول لڑکی کے اس کی پوری ٹیم تھی۔ اگر وہ سرے سے غائب ہو جائے۔ یعنی یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو اس کے لیے یہ بھی آسان نہیں تھا۔ اس کے پاس اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور نہ ہی اتنی رقم تھی کہ وہ اس فلیٹ کو بے فکری سے چھوڑ جائے۔ اس کو فروخت کرنے کی کوشش کرتا تو اس میں بھی کچھ وقت لگتا۔ جبکہ اس کے پاس کل تک کی مہلت تھی۔ سعد کی چھٹی حس نے بتایا کہ وہ لوگ خطرناک تھے اور اگر اس نے انکار کیا تو بات صرف اس کی شناخت کھلنے تک محدود نہیں رہے گی۔ اس کے پاس انکار کی گنجائش بہت ہی کم تھی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھے۔

☆☆☆

وہ خاموش ہوا تو جیا نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے بہت صاف گوئی سے مجھے سب بتا دیا۔''

''میں نے اس سے پہلے کبھی کسی کو اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ حد یہ کہ میں جن کے ساتھ برسوں رہا وہ بھی بس یہی جانتے تھے کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور میں رشتے داروں کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے گھر سے فرار ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا کہ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔''

''تمہارے گھر والے۔'' جیا نے پوچھا۔ ''تم نے پھر ان کی خبر نہیں لی؟''

''لی تھی۔ چند برس پہلے میں گیا تھا۔ مگر اب وہاں نہ میرا گھر ہے اور نہ گھر والے۔ میں نے ممکن حد تک معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کسی ایک فرد کا سراغ بھی نہ لگا سکا۔ صرف باپ کے بارے میں پتا چلا کہ نشے نے اس کی جان لے لی تھی۔ اس کے بعد ماں، بھائی اور بہنیں کہاں گئیں بالکل پتا نہیں ہے۔'' کہتے ہوئے سعد کا چہرہ ستا گیا تھا۔ ''میں نے یہاں آکر جھوٹ بولا تھا کہ میں اکیلا ہوں، یہ جھوٹ اب سچ بن گیا ہے۔''

''آئی ایم سوری۔'' جیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارا بیک گراؤنڈ اچھا ہوگا اور تم اس راستے پر چل نکلے ہو۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تم کس بیک گراؤنڈ سے یہاں تک آئے ہو اور دوسروں سے بہت اچھے ہو۔''

سعد شرمندہ ہو گیا۔ ''مگر دیکھا جائے تو میں جرم ہی کرتا ہوں اور شاید اب بھی جرم ہی کر رہا ہوں۔''

جیا نے گہری سانس لی۔ ''کبھی کبھی مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے لیکن میں اس چکر سے نہیں نکل سکتی۔''

''نکل نہیں سکتیں یا نکلنا نہیں چاہتی ہو۔''

''اگر نکلنا چاہوں تو اتنی بڑی دنیا میں میرے پاس کیا آپشن ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''روزگار کا مسئلہ نہیں ہے مگر ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی ایک جھلک میں نے اس وقت دیکھ لی تھی جب بابا کے انتقال کے بعد میں دو برس ہاسٹل میں رہی۔ وہاں چند ایک ہی خراب عورتیں تھیں مگر آس پاس کے لوگ اور وہ اوباش جو ہاسٹل کے باہر منڈلاتے تھے سب کو ایک ہی جیسا سمجھتے تھے۔ انہوں نے میرا ایسا جینا حرام کیا تھا کہ میں خودکشی کا بھی سوچ بیٹھی تھی۔ پھر سر کو معلوم ہوا تو وہ مجھے یہاں لے آئے۔ انہوں نے یہ جگہ پوری طرح میرے حوالے کر دی اور اب یہ میرے لیے گوشۂ عافیت ہے۔''

''مگر کب تک؟''

''میں نہیں جانتی لیکن جب تک ہے۔'' جیا نے کہا اور واپس جانے لگی۔ سعد اس کے پیچھے آیا۔ اس نے پہلی بار جرأت کر کے جیا کا بازو پکڑ لیا۔

''میری بات سنو اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم اس مشکل سے نکل سکتے ہیں۔''

جیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تمہاری بھول ہے، تم سر کو نہیں جانتے۔ تمہارا کیا خیال ہے تم پہلے فرد ہو جو یہاں آیا ہو۔ نہیں تم سے پہلے بھی کئی یہاں آچکے ہیں۔''

سعد اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون تھے اور کہاں گئے مگر جیا اس وقت دروازے کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ کر اندر کمپیوٹر نے دروازہ کھول دیا تھا۔

سعد اور جیا نے جو اکاؤنٹ ہیک کیے تھے ان سے ملنے والا ڈیٹا اتنا زیادہ تھا کہ اسے فرداً فرداً دیکھنے میں ان کا پورا دن گزر گیا۔ وہ صبح سے بیٹھے اور رات گئے بیٹھے رہے۔ مگر کام کی چیز نہیں ملی۔ کوئی دستاویز یا ای میل ایسی نہیں تھی جس سے پتا چلے کہ وہ بینک کی سیکیورٹی سے متعلق تھے۔ اگرچہ دوسری بہت سی چیزیں تھیں لیکن ان کے مطلب کی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود انہیں ہر دستاویز کو پوری طرح چیک کرنا پڑ رہا تھا کہ کچھ رہ نہ جائے۔ وقت بچانے کے لیے دونوں الگ الگ چیزیں چیک کر رہے تھے۔ جیا نے جو چیزیں اتاری تھیں ان میں سے ایک فولڈر اس نے کھولا اور گھبرا کر بند کر دیا۔ سعد دیکھ نہیں سکا تھا۔ کچھ دیر بعد جیا نے ہچکچاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میرے پاس ایک فولڈر ہے پلیز تم اسے چیک کرلو۔''

''اس میں کیا ہے؟'' سعد نے ای میل پڑھتے ہوئے کہا۔

جیا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''تم دیکھ لو مگر یہاں اسکرین پر اوپن مت کرنا، لیپ ٹاپ میں دیکھو۔''

''تم بھیجو۔'' سعد نے لیپ ٹاپ اپنی طرف کیا۔ جیا نے بلوٹوتھ سے فولڈر سعد کو بھیج دیا۔ اس نے اوپن کیا اور چند لمحے کو وہ بھی جھینپ گیا تھا۔ یہ سب عریاں اور واہیات تصاویر تھیں۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ ان میں وہ شخص خود مختلف خواتین کے ساتھ موجود تھا جس کے ای میل اکاؤنٹ سے انہوں نے یہ ڈیٹا ڈاؤن لوڈ کیا تھا۔ اتفاق سے وہ پہلی چند تصاویر میں موجود تھا۔ اسی وجہ سے سعد نے پھر پورا فولڈر دیکھ لیا مگر اس میں سوائے تصاویر کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس درجے کا آدمی اس کردار کا نکلے گا سعد نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک نہیں تقریباً نصف درجن خواتین کے ساتھ مختلف تصاویر میں نظر آرہا تھا۔ وہ اسے اڑانے والا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ جیا اپنا کام کر رہی تھی۔ سعد نے لیپ ٹاپ سرکا دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ ان دونوں نے اس فولڈر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ جیا اس کے انداز سے سمجھ گئی تھی کہ اس میں کام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ورنہ سعد اسے بتاتا۔ انہوں نے شام سات بجے تک سب دیکھ لیا اور جیا نے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ کل صبح پھر جلدی اٹھنا پڑے گا۔''

''شاید۔'' سعد نے کہا۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا بس ہلکا پھلکا لیا تھا اس لیے اب بھوک لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سعد لاؤنج کی ڈائننگ ٹیبل پر تھا اور جیا اسٹو تیار کر رہی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دنیا میں سب سے اچھا اسٹو بناتی ہے۔ وقت گزاری کے لیے سعد کولڈ ڈرنک سے شغل کر رہا تھا کہ اچانک ہی عادل آگیا۔ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ہیلو ایوری بڈی، کیا ہو رہا ہے؟''

''سر میں اسٹو بنا رہی ہوں۔'' جیا نے فخر سے کہا۔ جیسے اسٹو بنانا کوئی بہت بڑا کام ہو۔

''رئیلی۔'' وہ بھی کرسی پر ٹک گیا۔ ''تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''کبھی موقع نہیں ملا سر۔'' وہ بولی۔

''ینگ مین تم کیسے ہو؟'' عادل نے اب سعد کی طرف دیکھا۔

''فائن سر، کولڈ ڈرنک لیں گے؟'' اس نے پیشکش کی۔

''تھینکس، اگر کافی مل جائے تو.....''

''میں بنا رہی ہوں۔'' جیا نے کہا اور چند منٹ میں کافی بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ مگ اور سعد کو لے کر لاؤنج کے صوفے پر آگیا۔

''اینی پروگریس۔''

''نو سر۔'' اس نے کہا اور پھر اسے بتانے لگا کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔ عادل کافی پیتا اور سنتا رہا۔ اس نے کوئی ردِعمل نہیں دیا لیکن سعد نے ای میل اکاؤنٹ کے مالک کی ذاتی پورنوگرافی کا ذکر کیا تو وہ چونک گیا۔ اس نے مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اوپر چلو اور مجھے دکھاؤ۔''

ایک منٹ بعد وہ اوپر کمپیوٹر روم میں تھے۔ سعد نے لیپ ٹاپ میں موجود فولڈر اوپن کر کے اس کے سامنے کر دیا۔ عادل تصویریں دیکھنے لگا پھر اس نے پوچھا۔ ''یہ کس پوزیشن کا مالک ہے۔''

''کمپنی کے ٹاپ لیول میں شامل ہے۔''

عادل نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''اور تم کہتے ہو تم نے پروگریس نہیں کی ہے۔''

☆☆☆

جون مولر جرمن تھا اور وہ بون کے ایک پوش علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا تعلق ای سیکیورٹی کمپنی سے تھا اور وہ اس کے اعلیٰ ترین پروفیشنل میں شامل تھا۔ جون شادی شدہ شخص تھا اور اس کی بیوی اور دو بہت پیاری سی بیٹیاں تھیں۔ اس کی بیوی سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر اس کا مکمل وفادار ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ جون اس کمپنی میں آنے سے پہلے نارمل اور بیوی کا وفادار شخص تھا مگر جب وہ اس کمپنی میں آیا اور اس کے اعلیٰ حکام میں شامل ہوا تو اس پر نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ صرف اس پر نہیں بلکہ کمپنی کے تمام اعلیٰ افسران پر ایسی ہی نوازشات کی بارش ہوتی تھی۔ ان نوازشات میں سیکس پارٹیز بھی شامل تھیں۔

عام طور سے نصف رات تک پارٹیاں ختم ہو جاتیں۔ دفتر والوں اور افسران کی بیویوں کو پتا نہیں چلتا تھا کہ ان کے شوہر کیا کر کے آرہے ہوتے تھے۔ جون کی بیوی بھی بے خبر تھی۔ اس نے ان پارٹیوں میں مختلف عورتوں کے ساتھ اپنی بہت سی سیلفیز لی تھیں اور وہ اس کے ای میل میں محفوظ تھیں۔ کبھی وہ گھر میں اکیلا ہوتا تو ان تصاویر کو دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا۔ اس صبح وہ بیدار ہوا اور واش روم میں تیار ہو رہا تھا اس کی بچیاں اسکول جانے سے پہلے ناشتا کر رہی تھیں۔

جون کے موبائل کی بیل بجی تو وہ باہر آیا اور یہ دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں آگئیں کہ اسے ایک انٹرنیٹ سروس سے کال کی جارہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کسی نے نرم لہجے میں کہا۔

''جون مولر۔''

''بات کر رہا ہوں۔''

''اپنا ای میل چیک کرو اس میں تمہارے لیے ایک دلچسپ ای میل ہے۔ میں دو منٹ بعد پھر کال کرتا ہوں۔''

کال کٹ گئی اور جون نے تیزی سے اپنے ٹیب پر ای میل اکاؤنٹ اوپن کیا۔ اس میں نئی ای میل تھی۔ جیسے ہی اس نے ای میل اوپن کی ٹیب اس کے ہاتھ میں کانپنے لگا اور اس وقت اس کے ہاتھ سے گر گیا جب موبائل نے بیل دی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ہاتھوں سے زیادہ کانپتی آواز میں بولا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

☆☆☆

اسکرین پر ایک چابی بنی ہوئی آرہی تھی اور یہ اسپن لے رہی تھی۔ عادل نے کہا۔ ''یہ ہے وہ چابی جس سے سرورز تک رسائی کا لاک کھل سکتا ہے۔''

''مگر اس میں ایک لاک نہیں ہے۔'' سعد نے کہا۔ ''بہت سے لاک ہیں اور سب اس چابی سے نہیں کھلیں گے۔''

''کوئی ایک لاک کھلے گا تو اس کے ساتھ دوسرا لاک کھلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔''

یہ چابی انہیں جون مولر سے ملی تھی۔ مگر یہ صرف اس کی چابی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بینک سرورز تک رسائی کے لیے تین چابیاں استعمال ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تین الگ الگ پاس ورڈز لگانے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر وہ بینک سرورز میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ داخلہ بہت سخت نگرانی اور کڑی شرائط کے تحت ہوتا ہے۔ اس عمل میں بینک کے آئی ٹی ماہرین بھی شامل ہوتے ہیں جو اس عمل کے دوران مسلسل چیک رکھتے ہیں تاکہ وہ کوئی ناجائز حرکت نہ کر سکے۔ سعد اور جیا کے خیال میں یہ خاص کامیابی نہیں تھی مگر عادل مصر تھا کہ وہ اس سے بھی کام کر سکتے تھے۔ سعد نے کہا نہیں مگر اس کے خیال میں عادل نے کھیل خراب کیا تھا۔ اس نے بلیک میل کر کے ایک کامیابی حاصل کر لی تھی مگر اب ان کے لیے دوسرے دروازے بند ہو گئے تھے۔ ابھی تین افراد باقی تھے اور وہ ان کے اکاؤنٹس ہیک کر کے ممکنہ کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ سعد کے خیال میں اب یہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ جون مولر اگرچہ ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو گیا تھا مگر وہ اپنے ساتھیوں کو خبردار کر سکتا تھا۔ یہ صرف اس کی پیشہ ورانہ ساکھ ہی نہیں بلکہ ملازمت کا بھی معاملہ تھا۔ اگر یہ راز کھل جاتا کہ اس نے خفیہ معلومات کسی کو دی ہیں تو اس کا سارا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ سعد عادل کے سامنے تو کچھ کہہ نہیں سکا تھا مگر دو دن بعد وہ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے ساحل پر نکلے تو سعد پھٹ پڑا۔

''کام خراب ہو گیا ہے، سمجھ لو ہماری محنت پر پانی پھر گیا ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں لیکن سر کے سامنے ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' جیا نے گہری سانس لی۔

''مجھے ذاتی طور پر یہ بات پسند نہیں آئی۔ میں نے آج تک کسی کو بلیک میل نہیں کیا۔'' سعد نے بدمزگی سے کہا۔ ''مجھے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا بہت بُرا لگتا ہے۔''

''مجھے بھی یہ بات پسند نہیں ہے۔'' جیا نے کہا۔ ''مگر سر کا کہنا ہے ہمیں بہر صورت اپنا کام نکالنا ہے۔''

ابھی سورج کی روشنی تھی اور آج دن بھی گرم تھا اس لیے وہ ٹھنڈی ریت پر اُتر آئے تھے۔ سعد سوچ رہا تھا۔ اس نے جیا کی طرف دیکھا۔ ''ایک بات پوچھوں، سچ بتاؤ گی؟''

''پوچھو۔''

''مجھ سے پہلے یہاں کتنے ہیکرز آئے؟''

''تین۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

سعد چونکا۔ ''تین ہیکرز اور..... کتنے عرصے پہلے؟''

''ایک ڈیڑھ سال پہلے آیا اور ایک مہینے رہا۔ دوسرا اس کے چند مہینے بعد آیا اور وہ پورا مہینا بھی نہیں رہا تھا۔ تیسرا البتہ ڈھائی مہینے لگا تھا۔ اب سے دو مہینے پہلے وہ بھی چلا گیا۔''

''اب وہ تینوں کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتی مگر وہ اچانک ہی چلے گئے۔''

''چلے گئے مگر کیسے؟ یہاں سے خود سے کون جا سکتا ہے؟''

جیا الجھن میں پڑ گئی۔ ''یہی تو میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکی۔ یہاں سے کوئی میرے بغیر نہیں نکل سکتا۔ مگر وہ تینوں ہی اچانک غائب ہو گئے۔ ذرا بھی نشان نہیں چھوڑا۔''

''کیسے؟''
''بس میں سو کر اٹھی یا کہیں باہر سے آئی تو وہ کوٹھی میں نہیں تھے۔''
''کوئی سراغ پایا گیا جس سے پتا چلتا کہ وہ کیسے نکلے ہیں؟''
''کچھ بھی نہیں۔ سب ویسے کا ویسا تھا۔''
''ان کا سامان؟''
''تمہاری طرح وہ بھی کچھ نہیں لائے تھے۔ اس لیے جب وہ گئے تو سب ویسے کا ویسے ہی تھا۔''
''عادل کا ردِعمل کیا تھا؟''
''انہوں نے اسے میری غلطی قرار دیا اور مجھے ڈانٹا بھی مگر اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔''
''ایک بار نہیں تین بار یہ واقعہ ہوا اور تم نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔''
''غور کیا مگر سمجھ میں نہیں آیا۔''
''عادل نے ان تینوں کو اسی کام کے لیے ہائر کیا تھا؟''
جیا نے ہچکچاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ہاں مگر ان میں سے کوئی کامیاب نہیں ہوا۔''
''انہوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تھا؟''
''دو نے کیا تھا، تیسرے نے بھاگنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اس سے اگلے دن وہ کوٹھی میں نہیں تھا۔''
سعد تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ تین ہیکرز پہلے اسی مشن میں ناکام رہے تھے اور وہ غائب ہو گئے تھے۔ جیا کا خیال تھا وہ چلے گئے تھے مگر سعد کو یہ معاملہ اتنا سادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جتنا کہ جیا سمجھ رہی تھی۔ اب اسے لگا کہ جیا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آئی ٹی میں ذہین سہی لیکن زندگی کے عام معاملات میں اس کی ذہانت عام لڑکی سے زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ عام لڑکی بھی آج کل بہت چالاک ہوتی ہے اور وہ خطرناک معاملوں کو جلد بھانپ جاتی ہے۔ مگر شاید جیا نے ایک محدود زندگی گزاری تھی اور وہ لوگوں کے بارے میں بہت سادہ نقطۂ نظر رکھتی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا کہ آج کی دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کو کیسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر اسے ٹشو کی طرح پھینک دیتا ہے۔ عادل نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''جیا تم بہت سادہ ہو، تم نے سوچا نہیں کہ وہ کوٹھی سے غائب نہیں ہوئے بلکہ اس دنیا سے ہی غائب ہو گئے ہیں۔''
جیا ششدر رہ گئی۔ ''کیا مطلب.....؟ کیا وہ زندہ نہیں ہیں..... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''
''میرا تو یہی خیال ہے۔'' سعد نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ''یہاں سے کون خود سے نکل سکتا ہے۔''
اب جیا سوچ میں پڑ گئی۔ ''سر عادل نے کہا تھا کہ وہ بہت ذہین لوگ تھے اس لیے یہاں سے بھی نکل گئے۔''
''اور ان کے نکلنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس جگہ کا راز بدستور راز رہا؟ اگر ایسا ہے تو پابندی لگانے اور اتنے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے؟''
''سر کا کہنا ہے کہ یہ میرے لیے ہیں تاکہ میں یہاں بے خوف و خطر رہوں۔'' جیا بولی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ عادل کے خلاف کوئی بات اس کے دل و دماغ میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ سعد کی باتیں سن رہی تھی مگر اس سے متفق نہیں ہوئی تھی۔ عادل کے لیے یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ سابق تین ہیکرز کا کیا ہوا تھا اور وہ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ اس کے جواب میں اس کا مستقبل پوشیدہ تھا۔ اگر وہ ناکام رہتا تو اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو ان ہیکرز کا ہو چکا تھا۔ اسے فرار ہونا پڑتا یا وہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا۔ ایک طرف جیا عادل کے خلاف نہیں تھی مگر دوسری طرف وہ اسے ہر بات بتا رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے لاشعوری طور پر اسے آنے والے خطرات سے خبردار کر رہی ہو۔ شاید اندر سے وہ دُہری کشمکش میں تھی۔
عادل اس کا محسن تھا۔ وہ اسے نہ چھوڑ سکتی تھی اور نہ اس کے خلاف کچھ سُن سکتی تھی۔ اگرچہ وہ اس سے ڈرتی تھی۔ دوسری طرف سعد شاید اس کے اندر کوئی خاص مقام حاصل کر چکا تھا۔ جیا خود بھی ابھی اس بات کو نہیں سمجھی تھی۔ مگر وہ ایک طرح سے سعد کا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سوائے عادل کا ساتھ چھوڑنے کے وہ اس کے لیے سب کرنے کو تیار تھی۔ سعد سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ اسے یہاں سے چلنے کو کہے گا تو وہ انکار کر دے گی اور شاید یہ بات عادل کو بتا بھی دے۔ اس صورت میں وہ بھی دنیا سے غائب ہو جائے گا۔ سعد چاہتا تو یہاں سے اس وقت جا سکتا تھا جب وہ ساحل پر ٹہلنے کے لیے جیا کے ساتھ باہر آیا تھا۔ وہ اسے نہیں روک سکتی تھی۔ بے شک اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور اسے اپنا سب چھوڑ کر جانا پڑتا لیکن آدمی کے لیے اپنی جان سب سے اہم ہوتی ہے۔ وہ اسے بچا سکتا تھا مگر وہ نہیں گیا اور اب وہ جان گیا تھا کہ وہ کیوں نہیں گیا تھا۔ وہ جیا کو یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ یہاں رُکنے اور عادل کے لیے کام

کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ جیا نے اچانک کہا۔
''تم یہاں سے چلے جاؤ۔''
سعد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہارے بغیر نہیں۔''
جیا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''میں نہیں جا سکتی۔''
''تم مجبور ہو، عادل کے احسان سے تو میں بھی مجبور ہوں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''
''تمہاری کیا مجبوری ہے؟''
''تم۔'' سعد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میری مجبوری تم ہو۔ ورنہ مجھے عادل اور اس کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''
جیا کی آنکھیں جھک گئیں ..... ''سعد پلیز میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔''
''اس کی ایک ہی صورت ہے تم میرے ساتھ چلو۔''
جواب میں جیا پلٹ کر کوٹھی کی طرف چل پڑی، اس کا جواب واضح تھا۔ وہ عادل کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ سعد نے سرد آہ بھری اور اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ آج اسے جون کے باقی دو ساتھیوں پر کام کرنا تھا جن کے پاس بینک کے سرورز کی مشترکہ چابیاں تھیں۔ اب اسے باقی دو چابیاں بھی حاصل کرنی تھیں۔ آج کل عادل روز آتا تھا اور اس کی آمد عام طور سے رات کے وقت ہوتی تھی۔ وہ ان کی پروگریس دیکھتا اور انہیں مزید تیزی سے کام کرنے کا کہتا تھا۔ بعض اوقات اس کی بے چینی بتاتی تھی کہ اس کے پاس شاید وقت کم ہے اور وہ عجلت میں ہے۔ حسبِ معمول عادل ڈنر کے وقت آیا۔ وہ ان کے ساتھ نہیں کھاتا تھا صرف کافی لیتا تھا۔ مگر اس بار اس نے آتے ہی اعلان کیا کہ وہ کھانا ان کے ساتھ کھائے گا۔ جیا خوش ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''سر میری کب سے خواہش تھی کہ آپ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کچھ کھائیں۔''
''آج تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔
سعد اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اسے عادل کی جیا سے یوں بے تکلفی اچھی نہیں لگ رہی تھی حالانکہ عادل ہمیشہ اسی طرح اس سے بات کرتا تھا۔ سعد نے کبھی جیلسی محسوس نہیں کی تھی مگر چند دن سے اس کے احساسات بدل گئے تھے اور اب وہ جیا کے ساتھ عادل کا رویہ ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر عادل نے کہا۔ ''کیا سوچ رہے ہو ینگ مین؟''
''سر میں سوچ رہا ہوں کہ جیا نے اور آپ نے ٹیم کا ذکر کیا مگر میں نے آج تک آپ دونوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔''
عادل ہنسا۔ ''دو افراد کیا ہوتے ہیں؟ ٹیم ہوتے ہیں نا۔ اب تو ہم تین ہو گئے ہیں۔''
سعد نے بے یقینی سے کہا۔ ''بس آپ دونوں ہی اس ٹیم میں ہیں؟''
''ہاں۔'' عادل سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم جانتے ہو اس فیلڈ میں راز داری کی کتنی اہمیت ہے اور آدمی کسی پر سو فیصد بھروسا کیے بغیر کیسے اپنے ساتھ شامل کر سکتا ہے۔''
''اتنے عرصے میں آپ کو جیا کے سوا کوئی بھروسے کے قابل نہیں ملا؟''
''یہ سچ ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو آزمایا مگر کوئی میرے اعتماد پر پورا نہیں اتر سکا۔''
''آپ نے اکیلے اتنا بڑا اسیٹ اپ بنایا ہے؟'' سعد کے لیے یہ زیادہ ناقابلِ یقین بات تھی۔
''ہاں میں نے یہ سب اکیلے کیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''بظاہر میرا آئی ٹی بزنس ہے جو بین الاقوامی سطح پر کام کرتا ہے لیکن میرا اصل بزنس یہی ہے۔''
''مگر آپ نے کہا تھا کہ آپ ان لوگوں کو سزا دلوانا چاہتے ہیں جو ملک کی دولت لوٹ کر اسے باہر لے گئے ہیں۔''
''ہاں اب ایک مقصد یہ بھی ہے۔ اب تک میں اتنا طاقتور نہیں ہوا تھا کہ ان بڑے لوگوں سے ٹکر لے سکوں۔''
''اور اب آپ اتنے طاقتور ہو گئے ہیں؟''
''کیا تمہیں اس سیٹ اپ سے میری طاقت کا اندازہ نہیں ہوا۔'' عادل نے اعتماد سے کہا۔ ''یہاں موجود کمپیوٹر اس ملک کا طاقتور ترین کمپیوٹر ہے اور اس کی مالیت پانچ ملین ڈالرز ہے۔''
سعد اور عادل لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جیا کچن میں لگی تھی مگر اس کے کان اسی طرف تھے۔ سعد نے آہستہ سے کہا لیکن اس نے سن لیا۔ ''آپ نے اتنی دولت کیسے کمائی؟''
''تمہارا کیا خیال ہے؟''
سعد نے صاف گوئی سے کہا۔ ''معذرت کے ساتھ کوئی درست طریقے سے اتنی جلدی اتنی دولت نہیں کما سکتا ہے۔''
''تم نے درست کہا۔'' عادل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مگر میرا طریقۂ کار تم سے مختلف رہا ہے۔''
''میں آپ سے وضاحت نہیں مانگ رہا سر۔'' اس نے

کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’میں اتنی جرأت نہیں کرسکتا۔‘‘

’’بہتر بھی یہی ہوگا۔‘‘ عادل کا لہجہ سرد ہوگیا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ آہستہ آواز میں بات کریں مگر ذرا سی دیر میں ان کے درمیان ایک محسوس کی جانے والی کشیدگی آگئی تھی۔

’’ڈنر تیار ہے۔‘‘ جیا نے چیچ بجا کر اعلان کیا تو وہ کھانے کی میز پر آگئے۔ ڈنر کے بعد وہ اوپر جانے لگے تو عادل نے جیا کو روک دیا۔

’’تم نے بہت کام کیا ہے، آج آرام کرو، سعد کو میں اسسٹ کروں گا۔‘‘

سعد نے کہا۔ ’’مجھے شرمندہ نہ کریں، آپ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ جیا ٹھیک رہے گی۔‘‘

’’میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ کیا ٹھیک رہے گا۔‘‘ عادل نے سرد لہجے میں کہا اور جیا کی طرف دیکھا۔ ’’تم جا سکتی ہو۔‘‘

جیا غالباً ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر عادل کے حتمی انداز پر وہ باولِ ناخواستہ واپس مڑ گئی۔ عادل اور سعد اوپر آئے۔ عادل نے اپنے فنگر پرنٹ سے دروازے کھولے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کوٹھی میں ہر جگہ آجا سکتا تھا۔ عادل نے مرکزی کرسی سنبھال لی اور سعد اس کے ساتھ آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج اصل کام اسے کرنا تھا اور سعد اسے اسسٹ کرتا۔ عادل نے اس سے پوچھا کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے۔ سعد اسے دکھانے لگا۔ دو افراد کی ای میل اور دوسرا ڈیٹا ہیک کرنا تھا تاکہ وہ باقی دو چابیاں بھی حاصل کرسکیں۔ انہوں نے افراد بانٹ لیے اور کام میں لگ گئے۔ ای میل اور ای ڈرائیو ہیک کر کے وہ ان کے ڈیٹا اور ای میلو تک پہنچے اور پھر انہیں ڈاؤن لوڈ کرنے لگے۔ وہ خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ اچانک عادل نے کہا۔ ’’جیا نے تمہیں میرے بارے میں بتایا ہوگا؟‘‘

’’کیا اسے نہیں بتانا چاہیے تھا؟‘‘

’’وہ نہیں بتاتی۔‘‘ عادل نے جواب دیا۔ ’’مگر اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔‘‘

’’یہ آپ کا اندازہ ہے؟‘‘

’’میں اسے جانتا ہوں۔‘‘ عادل بولا۔ اس کے ہاتھ چل رہے تھے اور گفتگو کے ساتھ وہ اپنا کام بھی کر رہا تھا۔ سعد بھی کام کر رہا تھا۔

’’اس نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے پہلے اسی کام کے لیے یہاں تین افراد اور آئے تھے پھر وہ چلے گئے۔‘‘

’’ہاں وہ کام نہیں کرسکے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے منہ چھپا کر چلے گئے۔‘‘

’’ایسا ہی ہوگا۔‘‘ سعد نے معنی خیز انداز میں کہا تو عادل نے اسے دیکھا۔

’’تمہیں شک ہے؟‘‘

’’سر میں اس دن شک کروں گا جب میں خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا اور ناکام رہوں گا۔‘‘

’’تم پر پابندی ہے مگر تم قیدی نہیں ہو، چاہو تو آج اور ابھی جا سکتے ہو۔‘‘

’’سچ میں۔‘‘ سعد کا لہجہ چبھتا ہوا ہوگیا۔ ’’میں یہاں سے جا سکتا ہوں باوجود اس کے کہ میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ عادل نے ہاتھ روک لیے۔ ’’مگر مجھے امید ہے تم ایسی حماقت نہیں کرو گے۔ خاص طور سے اس وقت جب تم کامیابی کے بہت قریب ہو۔‘‘

’’آپ نے ٹھیک کہا، میں ایسی حماقت نہیں کروں۔‘‘ سعد سنجیدہ ہوگیا اور اس نے دل میں کہا۔ ’بھاڑ میں جائے کامیابی، میں جیا کی خاطر یہاں رہوں گا۔‘

عادل نے سر ہلایا۔ ’’لیٹس ورک ناؤ۔‘‘

انہوں نے رات میں ایک پاس ورڈ اور حاصل کرلیا تھا۔ یہ پاس ورڈ سعد نے دوسرے آئی ٹی پروفیشنل کے ڈیٹا سے حاصل کیا تھا اور تیسرے کے ڈیٹا سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ مگر یہ کامیابی بھی کم نہیں تھی کہ انہوں نے دوسری چابی بھی حاصل کرلی تھی۔ عادل نے خوش ہو کر کہا۔ ’’اب کام آسان ہوگیا ہے۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’کل رات ہم براہِ راست بینک کے سرورز کو ہیک کرنے کی کوشش کریں گے۔‘‘

’’جیسا آپ کہیں ویسے یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ ڈو اور ڈائی والی بات ہوگی۔‘‘

’’ہمیں یہی سوچ کر کرنا ہے۔‘‘

’’آپ دو سال سے اسی کام میں لگے ہیں۔ اب تک کامیابی نہیں ملی۔ اگر آپ کامیاب ہو بھی گئے تو ان لوگوں کا کیا بگاڑ لیں گے۔‘‘

’’تم دیکھو گے۔ ایک دفعہ ان کے اکاؤنٹس سامنے آگئے تو حکومت خود ان کے خلاف ایکشن لینے پر مجبور ہو جائے گی۔‘‘

سعد کو یقین تھا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ اس کا مقصد ان اکاؤنٹس کو ہیک کر کے رقم اپنے کسی اکاؤنٹ میں منتقل کرنا تھا اور جلد یہ سب سامنے آنے والا تھا۔ عادل صبح کے قریب رخصت ہوا۔ سعد اس کے ساتھ ہی نیچے آیا تھا اور اس نے اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔ پورچ میں جیا کی سیاہ وین کے ساتھ اس کی نئے ماڈل کی مرسیڈیز موجود تھی۔ وہ اس میں بیٹھا۔ گیٹ خودکار انداز میں کھلا اور مرسیڈیز نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔ سعد اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے شاور لیا اور سونے کے ارادے سے لیٹ گیا مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ وہ لیٹا ہوا کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے یاد آیا کہ یہاں خفیہ کیمرے ہیں اور اس کی بے چینی ریکارڈ ہو رہی ہوگی اس لیے اس نے کروٹیں لینا ترک کر دیا اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔ اسی اداکاری میں اسے نیند آگئی۔ پھر جیا نے اسے اٹھایا۔ اس نے بوجھل سر کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ سامنے تھی۔

’’کیا بات ہے آج ناشتا نہیں کرنا ہے کیا؟‘‘ وہ بولی۔ ’’اب تو لنچ کا وقت ہوگیا۔‘‘

’’صبح دیر سے سویا تھا اور پھر آنکھ بھی دیر سے لگی۔‘‘ سعد نے جماہی لی۔ ’’میں آتا ہوں۔‘‘

سرد پانی سے منہ ہاتھ دھو کر اس نے خود کو تازہ دم کیا۔ جیا نے ناشتا لگا دیا تھا، اس نے ناشتا کیا اور اسی دوران میں ٹشو پر لکھا۔ ’’مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ اپنا ٹیب بھی ساتھ لینا۔‘‘

جیا نے سر ہلایا اور ٹشو کے ٹکڑے کر دیے۔ کام اب کوئی تھا نہیں کیونکہ عادل کے آنے کے بعد وہ مزید کچھ کرتا اور وہ رات کو آتا۔ آج موسم زیادہ سرد تھا اور آسمان پر سیاہ بادل تھے۔ شمال کی طرف سے تیز سرد اور کاٹ دار ہوا آرہی تھی۔ جیا نے باہر آتے ہی پوچھا۔ ’’تم نے ٹیب کیوں ساتھ لانے کو کہا ہے؟‘‘

’’اس کا نیٹ کوٹھی کے نیٹ ورک سے تو نہیں ملا ہوا ہے؟‘‘

’’نہیں، اس کا نیٹ موبائل تھری جی پر کام کرتا ہے۔‘‘

’’گڈ، مجھے دو میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔‘‘ سعد نے کہا تو جیا نے اپنا ٹیب اسے تھما دیا۔ یہ جدید ترین آئی پیڈ تھا۔ سعد اس کی اسکرین پر انگلیاں چلاتے ہوئے جیا کو اپنی رات کی کارکردگی کے بارے میں بتانے لگا اور عادل سے ہونے والی گفتگو بھی دہرائی۔ جیا کا چہرہ یہ سن کر سفید ہوگیا تھا کہ عادل کو یقین ہے کہ اس نے اسے سب بتا دیا ہے۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

’’تم نے کیوں اقرار کیا کہ میں نے کچھ بتایا ہے۔‘‘

’’جیا ڈرنے اور چھپانے سے کچھ نہیں ہوگا۔‘‘ اس نے ملائمت سے کہا۔

”تم نے اس سے زیادہ ہی کھل کر بات کر لی ہے۔ سعد پلیز تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اسی وقت چلے جاؤ۔“

”میں کہیں نہیں جا رہا۔“ وہ بدستور ٹیب کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ”کم سے کم آج رات مجھے اسی کوٹھی میں ہونا ہے۔“

”پلیز سعد پلیز۔“ وہ التجا پر اتر آئی تھی۔

سعد نے اسکرین سے نظر ہٹا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔“

”میں تیار ہوں ابھی چلنے کے لیے۔“

”مگر میں آج رات کسی صورت نہیں جاؤں گا۔“ وہ دوبارہ ٹیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جیا سمجھ گئی کہ یہ ضدی شخص نہیں مانے گا۔ وہ اپنے نازک لب دانتوں سے کچلنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ آج میں کام مکمل کر لوں گا۔“

”اور اس کے بعد تم غائب ہو جاؤ گے؟“

”ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔“ سعد نے کہا۔ ”اب کچھ دیر مجھے کام کرنے دو۔ ڈسٹرب مت کرنا۔“

وہ سمندر کی طرف رخ کیے فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے تھے۔ سعد تقریباً آدھے گھنٹے کام میں مصروف رہا مگر جیا نے ایک بار بھی نہیں دیکھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اس کا ٹینشن سے برا حال تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے سمجھائے۔ جب سعد نے ٹیب آف کیا اور اس کی طرف بڑھایا تو جیا کو خیال آیا۔ ”تم مجھے کچھ بتانے اور دکھانے کو کہہ رہے تھے؟“

سعد کے کچھ کہنے سے پہلے جیا کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ”عادل سر....“ اس نے کال ریسیو کی۔ ”یس سر.... جی باہر ہیں.... اوکے سر.... ہم جاتے ہیں۔“ اس نے موبائل رکھا اور سعد کو دیکھا۔ ”سر کو معلوم ہے کہ ہم کوٹھی سے باہر ہیں۔“

”ظاہر ہے اندر خفیہ کیمرے جو لگے ہیں۔“ سعد نے تلخی سے کہا۔ ”مجھے تو شبہ ہے کہ تمہارے کمرے میں بھی....“

”نہیں، سر ایسے نہیں ہیں۔“ جیا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں انہیں جانتی ہوں۔“

”تم بہت معصوم ہو، اس دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

”ممکن ہے میں سر کے بارے دوسری باتیں نہیں جانتی ہوں مگر ان کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ جیا نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے اس بارے میں بات مت کیا کرو۔“

جیا کوٹھی کی طرف جانے لگی۔ اس کی خفگی محسوس کر کے سعد اس کے پیچھے آیا۔ ”سوری، میں نے غلط کہا۔“

”اٹس اوکے۔“ جیا نے جواب دیا۔ مگر رات تک اس کا موڈ خراب رہا تھا۔ وہ شام تک اپنے کمرے میں رہی اور پھر باہر آئی۔ اس نے سعد سے چائے کافی کا پوچھا مگر اس کا موڈ نہیں تھا اس نے منع کر دیا۔ کوٹھی میں موقع نہیں تھا کہ جیا اس سے ٹیب پر کیے جانے والے کام کے بارے میں پوچھتی۔ دونوں معمول کی گفتگو کرتے رہے اور درمیان میں خاموشی کے طویل وقفے بھی آتے رہے۔ سعد جو سوچ رہا تھا اور جیا کے دل میں جو خدشات تھے وہ دونوں ہی زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔ جیسے جیسے رات ہو رہی تھی ان کی فکریں اور دلوں کی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں۔ جیا نے کھانے کا پوچھا مگر سعد نے منع کر دیا۔ سعد نے چار بجے کمرے میں ہی لنچ کیا۔ اس نے نگٹس کا ایک پیکٹ کھول کر اسے گرم کر کے اس سے لنچ کر لیا تھا۔ جیا نے پتا نہیں کیا کھایا تھا۔ وہ لاؤنج میں تھے جب اچانک دروازہ کھلا اور عادل اندر آیا۔ وہ ان کے تاثرات دیکھ کر ٹھٹکا پھر آگے آتے ہوئے بولا۔ ”ایوری تھنگ از رونگ۔“

”نتھنگ سر۔“ جیا نے جلدی سے کہا۔

”پھر ایسے منہ کیوں بنا کر بیٹھے ہو؟“

”آج رات بہت اہم ہے۔“ سعد نے کہا۔

”ہاں، میری زندگی کی بھی سب سے اہم رات ہے۔“ عادل صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیا نے کافی کا پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا اور وہ کافی بنانے چلی گئی، اس کے جانے کے بعد عادل نے سعد کی طرف دیکھا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

ایک لمحے کو اسے لگا جیسے عادل جیا کے سلسلے میں اسے الزام دے رہا ہے مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”تم سے پہلے جو تین آئے وہ بھی ماہر تھے مگر تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم ان سے زیادہ ماہر ہو اور مجھے امید ہے کہ آج رات ہم بینک کے سرورز بریک کر دیں گے۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے لیکن اس بریک کے بعد ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا۔ وہاں الارم بج جائیں گے اور وہ شاید ایک گھنٹے کے اندر سرورز کا کنٹرول واپس لے لیں۔“

”ایک گھنٹا بھی بہت زیادہ ہے۔“ عادل نے جیا سے کافی کا مگ لیا۔ ”تم دونوں نے ڈنر کیا؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ سعد نے کہا۔ ”کام کے بعد دیکھوں گا۔“

”مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔“ جیا نے سر ہلایا۔

”تم کھا لو ورنہ رات بھوک سے نیند نہیں آئے گی۔“ عادل نے کہا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ آج بھی جیا ان کے ساتھ نہیں ہوگی۔

”پلیز سر۔“ اس نے التجا کی۔ ”آج رات میں ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ آپ دونوں کی کامیابی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

عادل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اوکے، آج تم بھی ساتھ ہوگی۔“

جیا خوش ہو گئی۔ بارہ بجے وہ کمپیوٹر روم میں آئے۔ عادل نے اپنا کوٹ اتار کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور ٹائی بھی ڈھیلی کر دی تھی۔ مگر آج اس نے مرکزی سیٹ نہیں لی تھی۔ اس نے سعد کو اشارہ کیا۔ ”یہ تمہارا کام ہے اور تم ہی اسے مکمل کرو گے۔“

”تھینک یو۔“ سعد نے کہا اور کرسی پر آ گیا۔ عادل نے دوسری کرسی سنبھال لی۔ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے انہیں ایک ڈیکوئے نیٹ ورک بنانا تھا جس کی آڑ میں وہ بینک کے سرورز میں داخل ہوتے۔ یہ دھوکے پر مبنی نیٹ ورک اصل میں اس کمپنی کے نیٹ ورک سے مشابہ ہوتا جو بینک کے سرورز کو سیکیورٹی مہیا کرتی تھی۔ انہوں نے دو گھنٹے کی محنت سے نیٹ ورک بنا لیا۔ عادل نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”اب اصل کام شروع ہوگا۔“

انہوں نے بینک کے سرورز سے رابطہ شروع کر دیا۔ وہ مخصوص لاک تلاش کر رہے تھے جس میں چابیاں فٹ آتیں۔ اسکرین پر سارا کھیل اینی میشن کی صورت میں پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ خفیہ لاک تلاش کرتے اور پھر ان میں چابی آزماتے۔ لاک بے شمار تھے اور ان میں سے اکثر دھوکا تھے۔ ان میں ہی اصل لاک چھپے ہوئے تھے۔ بالآخر سعد نے پہلا لاک تلاش کر لیا۔ اس میں چابی لگتے ہی باقی نقلی لاک جو پہلے اصل لاک کی طرح نیلے رنگ میں تھے سرخ رنگ میں دکھائی دینے لگے اور باقی دو اصل لاک نیلے رنگ میں سامنے آ گئے۔ دوسرے میں بھی چابی لگ گئی اور اب انہیں تیسرا لاک توڑنا تھا۔ کیونکہ اس کی چابی ان کے پاس نہیں تھی۔ لاک توڑتے ہی وہاں الارم بج جاتا اور بینک کے آئی ٹی ماہرین سرورز پر ان کا قبضہ ختم کرنے کی کوشش شروع کر دیتے۔ یہ کام سعد کر رہا تھا۔ عادل اس کی مدد کر رہا تھا مگر وہ از خود کچھ نہیں کر رہا تھا۔

سعد کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس اس کام کے لیے اپنے وضع کیے ہوئے کچھ سافٹ ویئرز تھے، وہ ان کی مدد لے رہا تھا۔ اسکرین پر تیسرا لاک بدستور بند آ رہا تھا۔ جیا نے آہستہ سے عادل سے کہا۔ ”سر یہ تیسرا لاک آپ نہیں توڑ سکتے۔“

عادل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب میں فریش آیا تھا تو اس وقت ہیکنگ کا طریقہ کچھ اور تھا۔ وہ اتنا مشکل نہیں تھا مگر جیسے جیسے کمپیوٹرز اور ان کی سیکیورٹی طاقتور ہوتی گئی پرانے طریقے متروک ہو گئے اور اب نئے طریقے نئی نسل کے ساتھ آئے ہیں۔ میں اس معاملے میں اپ ڈیٹ نہیں ہو سکا اور ان سے پیچھے رہ گیا۔ میرے پاس دولت اور مشین ہے مگر ہیکنگ کی جدید مہارت نہیں ہے۔“

اسی لمحے تیسرا لاک بھی کھل گیا۔ عادل اچھل پڑا تھا، اس نے جوش سے کہا۔ ”ہم کامیاب ہو گئے۔“

”ہم نہیں آپ۔“ سعد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ صرف آپ کی کامیابی ہے اور آپ کا مقصد وہ نہیں تھا جو آپ نے بتایا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ عادل نے سرد لہجے میں کہا اور اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ ”میرا مقصد وہ نہیں تھا۔“

”سر....!“ جیا نے چیخ ماری۔

”تم خاموش رہو۔“ عادل نے سخت لہجے میں کہا۔

”سعد تم پاکستانیوں کے اکاؤنٹس اوپن کرو۔“

”اور رقم آپ کے بتائے ہوئے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کروں۔“ سعد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں یہ کام میں خود کر لوں گا۔ سیٹ چھوڑ دو اور سامنے رہو۔“ عادل نے پستول کو جنبش دی۔ سعد نے کرسی چھوڑ دی اور سامنے جا کھڑا ہوا۔ عادل نے جیا کی طرف دیکھا۔ ”تم کافی بنا لاؤ۔“

اس نے سر ہلایا اور وہاں سے چلی گئی۔ عادل نے پستول اپنے برابر میں رکھا اور کی بورڈ پر مصروف ہو گیا۔ اس کی انگلیاں بہت تیزی سے چل رہی تھیں مگر وہ سعد کی طرف سے بھی ہوشیار تھا۔ سعد شیشے کی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا اس نے کہا۔ ”کیا میرا بھی وہی حشر ہوگا جو مجھ سے پہلے یہاں آنے والے تین ہیکرز کا ہو چکا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم یہاں سے زندہ

سلامت جاؤ گے۔"
مگر سعد کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ عادل اپنا کام کر رہا تھا کہ جیا اس کے لیے کافی لے آئی، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ عادل نے اسے دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔ "جیا فکر مت کرو کسی کو نقصان نہیں ہوگا۔ پستول میں نے صرف احتیاط کے طور پر رکھا ہے۔ مجھے بہر صورت یہ کام مکمل کرنا ہے۔"
"چاہے تمہیں اس کے لیے کسی کی جان کیوں نہ لینی پڑے؟" سعد نے تلخی سے کہا۔
"میں ناکامی کی سزا ضرور دیتا ہوں لیکن صرف دولت کے لیے کسی کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں۔" عادل نے سکون سے کہا اور ایک ہاتھ سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کافی کا مگ تھام لیا۔ سعد کو تیسرا لاک توڑتے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور یہ وقت کافی تھا۔ عادل نے آخری بار انٹرنیٹ کا بٹن دبایا اور ان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ "میرا کام ہو گیا ہے اور یہ شاید ہماری آخری ملاقات ہے۔"
"آپ ہمیں مار دیں گے؟" جیا نے سہمے لہجے میں کہا۔
"نہیں۔" وہ بولا۔ "میں تم دونوں کو یہاں بند کر جاؤں گا۔ چند گھنٹوں میں پولیس یا کسی ایجنسی کے لوگ یہاں پہنچ جائیں گے اور وہ تمہیں لے جائیں گے کیونکہ انہیں ہیکنگ کا سرا یہاں تک ملے گا اور یہاں تم دونوں ملو گے۔"
"ہمارا اس کوٹھی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" سعد نے نفی میں سر ہلایا۔
"تعلق ہے، یہ کوٹھی جیا کے نام ہے، یہاں خریدی جانے والی ہر چیز کی رسید جیا کے نام پر ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ثابت ہوگا۔"
جیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ نے مجھے پھنسایا ہے۔"
"میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا۔" سعد بولا۔ "مجھے شروع سے اس کی نیت پر شک تھا۔"
"ڈونٹ وری۔" عادل نے اسے تسلی دی۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا کیونکہ تم نے یہاں کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اب تمہارے پاس اس کوٹھی اور اس کے سامان کی صورت میں پیسا ہے، تم آسانی سے بچ جاؤ گی۔"
"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" جیا پھٹ پڑی۔ "اور یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ ہمیں یہاں بند کر کے جائیں گے۔ ہم نہیں پولیس کو آپ یہاں سے ملیں گے۔"
عادل کی بھویں سکڑ گئیں۔ "کیا مطلب؟"
نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑایا اور واپس کرسی
پر ہوتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ اٹھتا سعد نے جھپٹ کر پستول اٹھا لیا۔ عادل اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جیا اپنی جگہ کھڑی تھی۔ عادل نے اس کی طرف دیکھا۔
"کافی میں کچھ تھا؟"
"نیند کی دوا جو آپ نے مجھے لا کر دی تھی جب یہاں شروع میں مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ میں نے وہی پیس کر کافی میں ملا دی۔"
"مگر تم بچو گی نہیں، یہ کوٹھی تمہارے نام ہے۔"
"جو تمہیں لے جائیں گے وہی تم سے سب اگلوا لیں گے۔" سعد نے جھک کر کہا۔ "اور جیا کی فکر مت کرو۔ اب یہ میرے ساتھ ہوگی اور کوئی اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔"
"سنو، مت جاؤ۔ میں تمہیں نصف رقم دوں گا۔"
"میں لعنت بھیجتی ہوں اس رقم پر۔" جیا بولی۔ "اگر سعد نے آپ کی آفر قبول کی تو میں اسے بھی چھوڑ دوں گی۔"
"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" سعد نے کہا اور کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "سسٹم چینج ہو گیا ہے، اب یہ آپ کے فنگر پرنٹس سے کام نہیں کرے گا صرف جیا کے فنگر پرنٹس سے کام کرے گا۔"
"میری بات سنو۔" عادل نے فرش پر دراز ہوتے ہوئے غنودہ آواز میں کہا مگر وہ اس کی سنے بغیر کمرے سے نکل گئے اور دروازہ خودکار انداز میں بند ہو گیا۔ نیچے جاتے ہوئے سعد نے پوچھا۔
"دوا زیادہ تو نہیں ہے؟"
"نہیں صرف چار گولیاں تھیں، اب وہ صبح تک سوتے رہیں گے۔"
وہ باہر دروازے تک آئے۔ انہوں نے کچھ نہیں لیا تھا۔ دروازے پر رک کر جیا نے سعد سے کہا۔ "میں صرف ایک شرط پر اس دروازے سے باہر قدم رکھوں گی۔"
"کیسی شرط؟"
"کہ اب تم کوئی غلط کام نہیں کرو گے اور درست طریقے سے کماؤ گے۔"
سعد نے اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھایا۔
"وعدہ، اب بھی حرام نہیں کماؤں گا۔"
جیا مسکرائی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ باہر نکل آئے اور ساحل کی طرف بڑھ گئے۔ یہاں سے جانے کے لیے انہیں صبح کا انتظار کرنا تھا اور صبح اب زیادہ دور نہیں تھی۔